تاریخِ اسلام کے عظیم مجاہدوں کے حیرت انگیز، جنگی معرکوں کی تاریخ

حافظ محمد احسن

دارالشعور

37 ۔ مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور

بسلسلہ: مشاہیر اسلام

کتاب ⇦ 100 عظیم مسلم جرنیل

مصنف ⇦ حافظ محمد احسن

اشاعت ⇦ 2010ء

کمپوزنگ ⇦ طاہر مقصود

مطبع ⇦ علی فرید پرنٹرز لاہور

برائے

دار الشعور 37۔ مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور

قیمت ⇦ -/500 روپے

اہتمام: محمد عباس شاد

E-mail: m_d7868@yahoo.com
Ph: 042-37239138,8460196

فہرست

○ پیش لفظ 9

(حصہ اوّل)

رسالت وخلافت

1۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ 13
2۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ 26
3۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ 31
4۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ 34
5۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ 38

(حصہ دوم)

صحابہ کرامؓ

6۔ ابوالاعور السلمی رضی اللہ عنہ 45
7۔ ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ 47
8۔ ابودجانہ رضی اللہ عنہ 49
9۔ ابوعبید بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ 51
10۔ ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ 55
11۔ اسامہ بن زید الکلبی رضی اللہ عنہ 62
12۔ امیر حمزہ رضی اللہ عنہ 65

13۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ 70

14۔ جعفر طیار رضی اللہ عنہ 77

15۔ الحارث بن یزید العامری رضی اللہ عنہ 81

16۔ خارجہ بن حذافہ العدوی رضی اللہ عنہ 83

17۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ 85

18۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ 92

19۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ 95

20۔ سراقہ رضی اللہ عنہ 98

21۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ 100

22۔ سفیان بن مجیب الازدی رضی اللہ عنہ 105

23۔ سہیل بن عدی رضی اللہ عنہ 107

24۔ شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ 109

25۔ عبادہ بن الصامت انصاری رضی اللہ عنہ 112

26۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح القرشی رضی اللہ عنہ 116

27۔ عبداللہ بن حذافہ قرشی رضی اللہ عنہ 120

28۔ عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان انصاری رضی اللہ عنہ 122

29۔ عبداللہ بن المعتم العبسی رضی اللہ عنہ 124

30۔ عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ 127

31۔ عقبہ بن نافع قرشی رضی اللہ عنہ 129

32۔ عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ 136

33۔ عکرمہ بن ابی جہل المخزومی رضی اللہ عنہ 138

34۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ 141

35۔ عمیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ 148

36۔ عمیر بن وہب الجمحی رضی اللہ عنہ 150

37۔ قعقاع بن عمرو التمیمیؓ 154
38۔ مثنیٰ بن حارثہ الشیبانیؓ 164
39۔ مجاشع بن مسعود السلمیؓ 168
40۔ معاذ بن جبلؓ 170
41۔ معاویہ بن حدیج السکونیؓ 173
42۔ مغیرہ بن شعبہؓ 176
43۔ نعمان بن مقرن المزنیؓ 179
44۔ ولید بن عقبہؓ 183
45۔ ہاشم بن عتبہؓ 185

(حصہ سوم)

دیگر مسلم جرنیل

46۔ ابن ابی عامر 189
47۔ اُرخان 192
48۔ قاضی اسد بن فرات 194
49۔ اکبر 198
50۔ امام شامل 207
51۔ امیر تیمور 215
52۔ غازی انور پاشا 218
53۔ اورنگ زیب عالمگیر 224
54۔ بایزید یلدرم 228
55۔ جنرل بخت خاں 232
56۔ پیری رئیس پاشا 246
57۔ سلطان ٹیپو شہید 247

58- جہانگیر 266
59- حاجی شریعت اللہ 279
60- حسن پاشا 283
61- حیدر علی 286
62- خیر الدین باربروسا 291
63- رضیہ سلطانہ 295
64- سلطان سلیمان اعظم 298
65- سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ 302
66- سلطان محمود غزنوی 306
67- سلیم اوّل 317
68- سیّد احمد شہید 319
69- شاہ اسمٰعیل شہید 325
70- شاہ جہاں 329
71- سلطان شہاب الدین محمد غوری 351
72- شیر شاہ سوری 355
73- صدام حسین 359
74- سلطان صلاح الدین ایوبی 376
75- طارق بن زیاد 380
76- ظہیر الدین محمد بابر 386
77- عبدالرحمٰن الداخل بن اُمیہ 393
78- عبدالرحمٰن 396
79- امیر سیّد عبدالقادر حسنی الجزائری 401
80- عثمان 409
81- عروج الدین باربروسا 411

82۔ علاؤالدین خلجی 414

83۔ علی رئیس پاشا 423

84۔ عمادالدین زنگی 425

85۔ قتیبہ بن مسلم 429

86۔ کمال اتاترک 438

87۔ محمد احمد (مہدی سوڈانی) 446

88۔ محمد اول 479

89۔ محمد بن عامر منصور 482

90۔ محمد بن قاسم 485

91۔ جنرل محمود خاں 493

92۔ محمود مصلح 500

93۔ مُرادِ اعظم 502

94۔ مراد چہارم 504

95۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا 506

96۔ موسیٰ بن نصیر 513

97۔ نادر شاہ 520

98۔ ناصرالدین محمود 524

99۔ ہمایوں 527

100۔ یوسف بن تاشفین 532

پیش لفظ

دنیا پر محنت فلسفہ ہائے زندگی نے حکمرانی کی ہے۔ جو فلسفہ جتنا مکان و زمان کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا وہ اتنا ہی تیزی کے ساتھ دنیا میں پھیلا۔ اِن فلسفوں کی تعبیر و تشکیل میں انسانی جماعتوں کی صلاحیت اور استعداد نے مؤثر کردار ادا کیا۔ آج جہاں یہ فلسفے، نظریات و افکار زیرِ بحث آتے ہیں، وہاں شخصیات کے ناموں اور کارناموں کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مانا کہ تاریخ محض شخصیات کے حالات کا نام نہیں لیکن کامیاب شخصیات کے بغیر اجتماعیت کا تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔

اجتماعیت کی عملی تشکیل شخصیات کی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہی ہوتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ہماری تاریخ کے بہادر، نڈر اور باصلاحیت سپہ سالاروں، مجاہدوں اور بادشاہوں کے کارناموں کی ایک ہلکی سے تصویر پیش کرتی ہے۔ جس سے ہمیں تحریک ملتی ہے اور ہم اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آج بے پناہ وسائل کی دنیا میں ان عظیم ہستیوں کے حالات حیران کر دیتے ہیں کہ انہوں نے اس دور میں جب کہ ابھی موجودہ ٹیکنالوجی نے جنم نہیں لیا تھا اپنی استقامت اور صلاحیت سے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے ڈالے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی تلواریں ظلم کا راستہ روکتی ہیں اور عدل و انصاف کا نظام قائم کرتی ہیں۔ وہ دشمنوں سے محفوظ شہر آباد کرتے ہیں اور بیرونی حملہ آوروں سے بچنے کے لیے بڑے بڑے قلعے بھی تعمیر کرتے ہیں۔

حضرت محمد ﷺ اپنے جنگی اصولوں میں انسانیت کے مفاد کو سب سے مقدم رکھتے ہیں کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، مذہبی راہنماؤں اور ہتھیار ڈال دینے والوں کو قتل نہ کیا جائے۔ کھیتیاں برباد نہ کی جائیں، درخت نہ کاٹے جائیں، قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

سے پیش آیا جائے، جنگ پر امن اور صلح کو ترجیح دی جائے۔اسلام میں جنگ کا تصور ظلم کے خلاف ہے۔عقیدہ کی بنیاد پر اسلام جنگ کی بات نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے لیے حکمت کا اصول پیش کرتا ہے۔آج کی دہشت گردی اور انتہا پسندی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، اسلام دوسرے مذاہب کے ساتھ مکالمے اور افہام تفہیم پر یقین رکھتا ہے۔آج کے نوجوانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے اسوہ، اکابر صحابہ ؓ اور عظیم مسلم سپہ سالاروں کے اسوہ کو سامنے رکھیں۔جنہوں نے صرف اور صرف ظلم کے خلاف تلوار اٹھائی اور دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آئے۔

حافظ محمد احسن

(حصہ اوّل)

رسالت اور خلافت

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنا کر دنیا میں بھیجا لیکن جب آپ ﷺ کو ایک سپہ سالار جنگ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے یا آپ کی جنگی صلاحیتوں یا فن حرب میں آپ ﷺ کی مہارت کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بعض کم فہم اس کو آپ ﷺ کی صفت رحمت کے خلاف خیال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح جنگ کا میدان بھی آپ ﷺ کی صفتِ رحمت کے ظہور کا مظہر ہے۔

فنِ سپہ گری اور عسکری قیادت نے حضور ﷺ کی بعثت تک متعدد ارتقائی منازل طے کر لی تھیں۔ ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں نے اس فن کو بے حد ترقی دی تھی۔ ایران میں دارا، یونان میں سکندرِ اعظم، کارتھیج میں ہنی بال اور روم میں سیزر ایسے زبردست سپہ سالار گزر چکے تھے۔ ان سب کو فنِ حرب کا بے مثل ماہر سمجھا جاتا تھا۔

حضور ﷺ نے جس معاشرے میں پرورش پائی اس میں اگرچہ فنِ حرب کے ماہر کی حیثیت سے تو ان سپہ سالاروں کا ہمسر کوئی نہ تھا، لیکن اہلِ عرب جنگی مقصدیت کے لحاظ سے ان سپہ سالاروں سے پوری طرح متفق تھے۔

سرزمین عرب میں چونکہ کوئی منظم سیاسی نظام قائم نہ تھا، اس لیے یہ خطۂ ارض جنگ وجدل کا گڑھ بن چکا تھا۔ مختلف قبائل میں آئے دن جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اونٹوں کے لیے چراگاہوں اور پانی کے چشموں کی ملکیت یا قبائل کی سرداری کے قضیے سے عداوت وخصومت کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا جو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ بعض اوقات ایک ہی باپ کی اولاد میں بڑی بڑی خونریز جنگیں چھڑ جاتیں۔ ایک طرف تو ملک میں کوئی ایسی طاقت نہ تھی، جو ان جھگڑوں کا

فیصلہ کرتی دوسری طرف شعراء کی زبانیں دونوں طرف سے اس آگ پر تیل چھڑکتی رہتی تھیں جس سے یہ جنگیں نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ ملک میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول لاگو تھا۔ طاقتور قبائل جب چاہتے کمزور قبائل پر پل پڑتے۔ ان کو تباہ و برباد کر ڈالتے۔ قبائلی جنگ کا مقصد امن و امان کا قیام، عدل و انصاف کا رواج، مظلوم کی امداد اور ظالم کی بیخ کنی نہ تھا، بلکہ اپنے قبیلہ کی دھاک بٹھانا، دوسرے قبیلوں کو دہشت زدہ کرنا اور ان کے حقوق تلف کرنا تھا۔

حربِ فجار

حضور ﷺ نے لڑکپن میں ایک ایسی ہی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ یہ حربِ فجار کہلاتی ہے۔ عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا تھا، ان میں حربِ فجار خطرناک ترین تھی۔ یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبائل میں ہوئی تھی اور چار سال تک جاری رہی۔ قریش کے تمام خاندان اس میں شریک تھے۔ اور ابوسفیان کے والد حرب بن امیہ اس کے سپہ سالار تھے۔ بنی ہاشم کے علمبردار زبیر بن عبدالمطلب تھے اور اسی صف میں جناب رسول اللہ ﷺ بھی شامل تھے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ پہلے بنی قیس اور آخر کار قریش غالب آئے۔ بالآخر صلح پر خاتمہ ہوا۔ بعض روایات کے مطابق حضور ﷺ نے اس جنگ میں عملاً حصہ نہیں لیا۔ یعنی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، حالانکہ آپ ﷺ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا حرام تھا۔ بعض روایتوں کی رُو سے حضور ﷺ نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دستِ مبارک سے تیر بھی چلائے تھے۔ تاہم اس جنگ میں بھرپور شرکت نہ کرنے کے باوجود حضور ﷺ نے عرب کے طریق جنگ کا نہایت قریب سے مشاہدہ فرمایا۔ جنگی چالوں اور فنون حرب کے عملی مظاہرہ کو دیکھنے کا موقع بھی آپ ﷺ کو ملا۔ اس تجربہ و مشاہدہ سے حضور ﷺ نے بعدازاں خوب فائدہ اٹھایا۔

اس جنگ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس سے زمانۂ قبلِ نبوت میں حضور ﷺ کی امن دوستی اور صلح پسندی کا بھرپور اظہار ہوا۔ مسلسل جنگوں کے نتیجے میں رُونما ہونے والی تباہی و بربادی دیکھ کر امن دوست طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی۔ جنگ فجار ختم ہوئی، تو حضور ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے صلح کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ ہاشم، زہرہ اور تیم وغیرہ قبیلے عبداللہ بن

جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ چونکہ یہ ایک مستحسن معاہدہ تھا جس کا مقصد ظلم کو مٹانے کے لیے قبائل کو متحد کرنا تھا، اس لیے حضور ﷺ نے بھی اس میں شرکت فرمائی۔ حضور ﷺ کو یہ معاہدہ اس قدر پسند تھا کہ عہدِ نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ اس معاہدہ کے مقابلے میں اگر مجھے سُرخ اُونٹ بھی دے دیے جاتے تو میں قبول نہ کرتا اور آج بھی ایسے معاہدے کے لیے کوئی دعوت دے تو حاضر ہوں۔

حضور ﷺ نے تیرہ سال تک مکہ میں اسلام کی مسلسل دعوت دی۔ مخالفین نے آپ ﷺ کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں، لیکن آپ اپنے کام میں بدستور مصروف رہے۔ آپ ﷺ کو ہر قسم کا لالچ دیا گیا۔ ہر طرح سے ستایا گیا۔ آپ ﷺ کے اولین صحابہؓ کو اذیتیں دی گئیں لیکن کاروان اسلام مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں آپ نے اسلامی معاشرے اور ریاست کی داغ بیل ڈالی۔ کفارِ مکہ کو اسلام کی اشاعت اور حضور ﷺ کی رفعت و ترقی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ انہوں نے مدینہ میں بھی مسلمانوں کو چین نہ لینے دیا۔ اس صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وہ رہنما اصول دیے جن کی روشنی میں اسلامی معاشرہ آخر کار کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

اسلام خدا کا پسندیدہ ترین دین ہے، کیونکہ یہ انسانیت کے لیے امن کی فضا مہیا کرتا ہے جس میں اس کے ارتقاء کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے اُمتِ وسط قرار دیا ہے۔ جس کا مقصد دنیا کو فتنہ و فساد سے پاک کرنا اور عدل و انصاف اور احترامِ آدمیت کی اقدار سے روشناس کرانا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں طاقت اور قوت ہی کو حق اور سچ کا ہم معنی سمجھا جاتا ہو۔ یہ اعلیٰ اقدار اتنی آسانی سے فروغ نہیں پا سکتیں اس کے لیے اسلام نے ''جہاد'' کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے امن و انصاف کی اعلیٰ قدروں کی ترویج کے لیے تمام جائز ذرائع کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنا۔ ان میں ایک ذریعہ قتال بھی ہے جو اس وقت اپنایا جاتا ہے جب اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو اور پُرامن ذرائع مؤثر ثابت نہ ہوں۔

اسلامی تعلیمات کی رُو سے قتال یا جنگ صرف اسی صورت میں جائز ہے جب اسلام کے دشمن کسی اسلامی ملک پر حملہ کر کے مسلمانوں پر ظلم کرنے کے درپے ہو جائیں یا کسی ملک میں

جبر وتشدد اور ظلم وستم کا دور دورہ ہو اور اس کی وجہ سے انسانی شرف وعظمت کی مٹی پلید ہو رہی ہو اور حق وانصاف کے راستے مسدود کیے جا رہے ہوں تو اہل حق کا فرض ہے کہ اس ملک کے لوگوں کو اس صورتِ حال سے نجات دلائیں۔ چونکہ یہ جنگ خالص رضائے الٰہی کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس کو ''جہاد فی سبیل اللہ'' کہا جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے دنیا کی تاریخِ جنگ میں پہلی مرتبہ واضح کر دیا کہ ہر وہ جنگ جو شہرت، اقتدار، دولت یا زمین کے حصول کے لیے لڑی جائے ممنوع اور حرام ہے۔

''حضرت ابی موسیٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ایک شخص ہے جو مالِ غنیمت کے لیے قتال کرتا ہے، ایک اور شخص اپنی بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ایک اور شخص ہے جو نام ونمود کے لیے جنگ کرتا ہے۔ ان میں سے کون سی جنگ قتال فی سبیل اللہ ہو گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی جس کی جنگ صرف اللہ کے لیے ہو گی۔'' (بخاری۔ مسلم)

اس طرح حضور ﷺ نے جنگ کے نصب العین کو مروجہ معیار سے کہیں بلند کر دیا اور یہی وہ نصب العین ہے جس کی موجودگی میں جنگ عالم انسانیت کے لیے عبادت کا رنگ اختیار کر گئی اور یہی وہ پہلو ہے جس میں حضور ﷺ کی رحمت ورافت کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر اظہار ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کی توجہ سے جنگ وحشت وبربریت کا کھیل نہ رہی بلکہ اس کے کچھ اخلاقی ضابطے مقرر ہوئے۔

چونکہ اسلام میں جنگ کا مقصد فتنہ وفساد کو ختم کرنا ہے، اس لیے حضور ﷺ نے اپنی افواج کو ان تمام کاموں سے روک دیا جن سے فتنہ وفساد میں بجائے کمی کے اضافہ ہوتا تھا۔

کسی ملک کے دفاعی استحکام کا انحصار اس کے اندرونی استحکام پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے سب سے پہلے مدینہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست کو اندرونی استحکام عطا کیا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف مسلم قبائل کو نظم وضبط کی وحدت اور مرکزیت بخشی بلکہ غیر مسلم اور پڑوس کے یہودی قبائل سے بھی اطمینان بخش معاہدے کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے اندر معاشرتی، معاشی اور سیاسی سرگرمیاں روبہ ترقی رہیں۔ دوسری طرف آپ ﷺ نے عسکری وسائل کی فراہمی اور فوجوں کی تنظیم کا کام بھی جاری کیا۔ اخلاقی تعلیم وتربیت تو شروع سے ہی چلی آ رہی تھی اب

مسلمانوں کی جنگی تربیت کا بھی آغاز ہو گیا۔ جنگ کے اسلامی نصب العین اور اصولوں کو ذہن نشین کیا گیا۔ تنظیم اور اطاعتِ امیر کی تربیت دی گئی۔ چھوٹے چھوٹے جنگی نوعیت کے معلوماتی سفر اور مہمیں اور جنگی مشقیں ترتیب دی گئیں تاکہ اسلامی لشکر کو اجتماعی اور عملی تربیت کے مواقع مہیا کیے جائیں۔ حتیٰ کہ وہ وقت بھی آیا جب میدانِ جنگ میں مسلمانوں نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور عملاً اس پر اپنی جنگی برتری ثابت کر دی۔

حضور ﷺ نے دس سالہ مدنی زندگی میں تقریباً تیس جنگوں میں شرکت فرمائی۔ اس تعداد میں وہ مہمیں شامل نہیں جن میں آپ ﷺ شامل نہیں تھے۔ ان تمام جنگوں اور مہموں میں فتح و نصرت نے آپ ﷺ کے قدم چومے۔ اس کی وجہ یہ تھی حضور ﷺ نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح فنِ حرب کو بھی انقلاب آشنا کر دیا تھا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف جنگی نصب العین کو بلند کر دیا، بلکہ عسکری قیادت کا بھی ایسا نمونہ پیش کیا جس کی مثال دُنیا بھر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی عسکری قائد اپنے لشکر میں محبوب اور ہر دلعزیز نہیں رہا اور فنِ حرب میں بھی آپ ﷺ کو دنیا بھر کے عظیم سپہ سالاروں پر برتری حاصل ہے۔

یوں تو ایک کامیاب فوجی قائد میں جو صفات پائی جاتی ہیں ان کا شمار آسان نہیں تاہم عہدِ حاضر کے ایک مسلم ماہرِ فنِ حرب جنرل محمود شیت خطاب (عراقی اکیڈیمی آف سائنسز کے رکن) نے اپنی کتاب ''الرسول القائد'' میں دنیا کے مشہور و معروف ماہرینِ فنِ حرب کی آراء کی روشنی میں ایک اعلیٰ جنگی قائد کی یہ صفات بیان کی ہیں:

1) درست اور فوری تجاویز دینا
2) شخصی شجاعت
3) مضبوط قوتِ ارادی
4) ذمہ داری کو بلاتردد سنبھالنا
5) اصولِ جنگ سے واقفیت
6) باہمی اعتماد کی اہلیت
7) پیش قدمی کی جرأت
8) دُور بینی
9) ماتحت لوگوں کی نفسیات اور قابلیت کا ادراک
10) ماتحتوں سے محبت کرنا اور ان میں محبوب ہونا
11) مؤثر شخصیت
12) حوصلے کی بلندی
13) جسمانی اہلیت
14) شریفانہ زندگی

15) اصولِ مساوات پر عمل پیرا ہونا 16) مشورہ کی اہمیت سے آگاہ ہونا
17) جنگ میں حسبِ ضرورت نئے نئے اسالیب اختیار کرنا۔

فوجی قائد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذاتی طور پر توانا اور بہادر ہو۔ وہ جسمانی نقائص سے پاک ہو اور ایسے جسم کا مالک ہو جو ہر قسم کی تکالیف اور مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ پھر اس کے لیے بلند حوصلہ ہونا بھی ضروری ہے، نہ تو ناموافق حالات میں دل چھوڑ بیٹھے اور نہ فتح و کامیابی کے نشے میں اعتدال و توازن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر ظلم و ستم پر اُتر آئے۔ دونوں حالتوں میں وہ اپنے نصب العین کی بلندی کے احساس سے سرشار رہے۔ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی جملہ جسمانی اوصاف سے بھی متصف تھی اور صبر و استقلال میں بھی اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ جنگِ اُحد میں جب تیراندازوں کے ایک پہاڑی دستہ کی غفلت سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، تو بہت سے مسلمان قدم نہ جما سکے۔ خالد بن ولید کے اچانک حملے سے بڑے بڑے بہادر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، مگر حضور ﷺ کے پائے ثبات میں ذرا بھی تزلزل نہ آیا۔ پتھروں، تیروں، نیزوں کی بارش اور تلواروں کی یورش میں آپ ﷺ نہایت مستقل مزاجی سے کھڑے رہے۔ خود کی کڑیاں فرقِ مبارک میں دھنس گئیں۔ دانت شہید ہو گیا۔ چہرۂ اقدس زخمی ہو گیا اور خون بہنے لگا۔ لیکن حضور ﷺ کی استقامت اور مستقل مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا۔

جنگِ حنین میں توقع کے خلاف مسلمانوں کی ہزیمت کے آثار رونما ہوئے۔ لشکر کے اجزائے ترکیبی، میدانِ جنگ کے وہ طبعی حالات جن میں مسلمانوں کو جنگ کرنا پڑی اور دشمن کے ساتھ پہلی جھڑپ کے نتیجے میں مسلمانوں کا مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑنا، ایسے عوامل تھے جن کے نتیجے میں مسلمانوں کی شکست قرینِ قیاس تھی۔ اس انتہائی نازک اور پُر خطر موقع پر حضور ﷺ نے عزم و ثبات، خود اعتمادی اور جرأت و دلیری کی نادر مثال قائم فرمائی اور جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئی تھیں، لیکن ایک پیکرِ مقدس تھا جو تنہا ایک فوج، ایک ملک، ایک عالم بلکہ مجموعۂ کائنات تھا۔ (ﷺ)

آنحضرت ﷺ نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا "یا معشر الانصار!" آواز کے ساتھ صدا آئی: "ہم حاضر ہیں۔" پھر آپ ﷺ نے بائیں جانب مُڑ کر پکارا۔ اب بھی وہی آواز

آئی۔ آپ ﷺ سواری سے اُتر پڑے اور جلالِ نبوت کے لہجے میں فرمایا: "مَیں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں۔"

بخاری کی دوسری روایت میں ہے:

"انا النبی لا کذب۔" میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں ہے۔ "انا ابن عبدالمطلب۔" مَیں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ حضرت عباس ؓ نہایت بلند آواز تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو۔ انہوں نے نعرہ مارا:

یا معشر الانصار	او گروہ انصار
یا اصحاب الشجرہ	او اصحاب شجر (بیعتِ رضوان والے)

اس پُر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعتہً پلٹ پڑی، جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مُڑ نہ سکے انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے۔ دفعتہً لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔"

یہ تو عین حالتِ جنگ میں حضور ﷺ کی ثابت قدمی کی زریں مثالیں تھیں۔ اب فتح کے بعد آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ بھی ملاحظہ ہو۔ تاریخ عالم میں فتح مکہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مکہ والوں نے حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ ؓ کو پریشان کرنے، تنگ کرنے، ایذا دینے حتیٰ کہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا، لیکن حضور ﷺ نے جب مکہ فتح کیا تو عفو عام کا اعلان فرما دیا اور یہ فرمان جاری کیا کہ اسلام کے سب سے بڑے سابق دشمن ابوسفیان کا گھر دارالامان ہے، جو اس میں داخل ہو جائے گا، امان پائے گا۔ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا، مسلمانوں کی تلواریں اس سے کوئی تعرض نہ کریں گی، جو شخص حرم کعبہ میں داخل ہو جائے گا، محفوظ رہے گا۔ اس پر بس نہیں بڑے بڑے دشمن آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن رحمت للعالمین ﷺ نے لاتثریب علیکم الیوم (آج کے دن تمہیں کوئی ملامت نہیں ہے) کا اعلان فرمایا اور ان سب کو معاف فرما دیا۔

عہدِ حاضر میں کامیاب فوجی قائد اس کو خیال کیا جاتا ہے جو میدانِ جنگ میں اپنے فوجیوں کے شانہ بشانہ دشمنوں کے استیصال کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اس سے جہاں دشمن کے دل پر اس

کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے وہاں اس کی اپنی فوج کا حوصلہ بلند اور اعتماد مستحکم ہو جاتا ہے۔ مذکورہ مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حضور ﷺ نے میدانِ جنگ میں کبھی اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے الگ رکھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ اکثر جنگوں میں بنفسِ نفیس جدال وقتال میں حصہ لیا۔ خاص طور پر مسلمان فوجوں کو جب بھی شدید مشکل درپیش آئی حضور ﷺ بے دھڑک ان کے درمیان آ گئے۔ اور ان کے شکستہ حوصلوں اور منتشر قوتوں کو ازسرِ نو مربوط کر کے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔

ایک اعلیٰ فوجی قائد کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ فوج اور رعایا کے ساتھ مکمل مساوات کا سلوک روا رکھتا ہو، وہ اپنے آپ کو اپنے ماتحتوں سے بلند و برتر خیال نہ کرے۔ سفر ہو یا حضر، جنگ ہو یا امن دونوں حالتوں میں ہر مرحلے میں ان کا ہاتھ بٹانے میں عار محسوس نہ کرے۔ امریکہ کے جنرل واشنگٹن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دن عام لباس میں کہیں جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کی فوج کے چند سپاہی ایک شہتیر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ قریب ہی فوج کا ایک افسر کھڑا تھا اور اپنے ماتحتوں کو پکار پکار کر حکم دینے میں مصروف تھا۔ واشنگٹن نے افسر سے کہا: ''ان لوگوں کے ساتھ آپ بھی کیوں شامل نہیں ہو جاتے؟'' اس نے کہا: ''آپ دیکھتے نہیں کہ میں ان کا افسر ہوں۔'' اس پر واشنگٹن نے سپاہیوں کے ساتھ مل کر زور لگایا۔ شہتیر اٹھا لیا گیا تو واشنگٹن نے اس افسر سے کہا:

> ''آئندہ جب بھی آپ کو محنت کے کام میں کسی آدمی کی ضرورت پڑے مجھے بلا لیجیے۔ مَیں آپ کا سپہ سالار واشنگٹن ہوں۔''

اس واقعہ کو عام طور پر قیادت کی ایک عمدہ مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس کی پوری زندگی کا خاصا نہیں تھا۔ اس قسم کی اِکا دکا مثالیں بعض دوسری شخصیتوں کے حالات میں ڈھونڈے سے مل جائیں گی۔ اس کے برعکس حضور ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ اس طرح کی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ آپ ﷺ نے عہد قبل از نبوت اور اعلانِ نبوت کے بعد گھر کے اندر اور گھر کے باہر ہاتھ سے کام کرنے اور دوسروں کا ہاتھ بٹانے سے کبھی احتراز نہیں فرمایا۔ ایک طرف صحابہ کرامؓ کے عشق و محبت کی یہ کیفیت تھی کہ حضور ﷺ کے اشارۂ ابرو پر گھر بار اور جان و مال لٹا دینے میں سعادت سمجھتے تھے اور دوسری طرف ایسی محبوب اور ہر دلعزیز ہستی کا طرزِ عمل یہ تھا

کہ اجتماعی محنت و مشقت کے کاموں میں آپ ﷺ اپنے ماتحتوں کے ساتھ برابر کے شریک رہتے۔ مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر میں آپ ﷺ نے جس طرح ایک مزدور کی طرح کام کیا، وہ اس طرزِ عمل کا نادر نمونہ ہے۔

ایک سفر میں صحابہ کرامؓ نے بکری ذبح کی اور اس کو پکانے کا کام باہم تقسیم کرلیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔ صحابہ کرامؓ نے لاکھ اصرار کیا کہ جاں نثار اس ادنیٰ کام کے لیے حاضر ہیں آپ ﷺ تکلیف نہ فرمائیں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: "میں امتیاز کو پسند نہیں کرتا۔"

غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں کے پاس صرف ستر اونٹ تھے جو صحابہ کرامؓ میں تقسیم کر دیئے گئے۔ آپ ﷺ کے ساتھ بھی دوسرے لوگوں کی طرح دو آدمی ایک اونٹ میں شریک تھے۔ ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت مرثد بن ابی مرثد۔ دونوں نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ سوار ہوں ہم پیدل چلیں گے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: "تم دونوں مجھ سے طاقتور نہیں ہو، اور نہ میں اجر وثواب کے شوق میں تم سے کم ہوں۔"

غزوۂ خندق میں جب مسلمانوں کو مدینہ کے دفاع کے لیے خندق کھودنا پڑی تو حضور ﷺ بھی اس سخت مشقت میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ شریک تھے۔ خندق کی کھدائی اور مٹی نکالنے اور ڈھونے میں بھی مصروف رہے، بلکہ جب کوئی سخت چٹان آئی اور دوسرے صحابہؓ اس چٹان کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے، تو حضور ﷺ نے آگے بڑھ کر اس چٹان کو پاش پاش کر دیا۔ خندق کی کھدائی کے دوران ایک صحابیؓ نے بھوک اور فاقے کی شکایت کی اور قمیض اٹھا کر پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھایا، تو حضور ﷺ نے کرتہ اٹھا کر شکم مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے دکھائے۔

ایک اعلیٰ سپہ سالار کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اہم امور میں ماتحت افسروں، بلکہ سپاہیوں تک سے مشورہ کرنے میں عار محسوس نہ کرے۔ حضور ﷺ کا قلب مبارک مہبط وحی والہام تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے امن اور جنگ دونوں حالتوں میں "امرھم شوریٰ بینھم" کے اصول کو پیشِ نظر رکھا۔ اس سے مشورہ کا عملی مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کی تربیت بھی مقصود تھی۔ اکثر جنگوں میں حضور ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا ان کی رائے کو قبول کیا حتیٰ کہ بعض

مواقع پر آپ ﷺ اپنی رائے تک سے دستبردار ہو گئے۔

غزوۂ اُحد میں آپ ﷺ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں پناہ گزیں ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، لیکن اس کے برعکس بعض صحابہؓ مثلاً حضرت حمزہؓ، حضرت سعدؓ بن عبادہ اور نعمانؓ بن مالک کی رائے میں مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنا مفید تھا ان کے خیال میں اس اقدام سے دشمن میں خوف و ہراس پھیل جائے گا۔ حضور ﷺ نے ان حضرات کی رائے کو قبول فرمایا اور اپنی رائے سے دستبردار ہو گئے۔

(غزوۂ خندق کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی ؓ کے مشورہ کے مطابق کھلے میدان میں دشمن کے کثیر التعداد لشکر کا مقابلہ کرنے کے بجائے نخلستانِ مدینہ کے قریب خندق کھدوائی۔ دس دس صحابہؓ پر دس دس گز زمین تقسیم فرمائی۔ گہرائی پانچ گز رکھی گئی۔ تین ہزار اصحابہؓ ساتھ تھے۔ 20 دن میں خندق تیار ہو گئی۔ اس خندق کی موجودگی میں دشمن مدینہ میں داخل ہونے کی کوشش میں ناکام رہا۔ حتیٰ کہ اُسے شکست ہوئی۔)

حضور ﷺ کی عسکری قائدانہ حیثیت اس لحاظ سے بھی لاجواب ہے کہ آپ ﷺ نے عرب قبائل کے گھسے پٹے طریق جنگ کو اپنانے کے بجائے نئے نئے اسلوبِ جنگ اختیار کیے جو دشمن کے لیے قطعی غیر متوقع تھے۔ دشمن کی تمام جنگی مہارت ایسے مواقع پر ناکام ہو جاتی تھی اور فتح و کامرانی عساکر اسلام کے قدم چومتی تھی۔

جنگ بدر کے موقع پر کفار قریش روایتی طریق جنگ کے مطابق بڑے کروفر کے ساتھ میدان میں اُترے، لیکن حضور ﷺ نے صف بندی کا اصول اپنایا جو عربوں کے لیے نئی تکنیک تھی۔ آپ ﷺ کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے دشمن اس صف آرائی اور مورچہ بندی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے اور پھر اس پر ایسا جوابی حملہ کیا جائے کہ اپنی کثرتِ تعداد پر اس کا غرور خاک میں مل جائے اور ایسا ہی ہوا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر جب دشمن کی تیاریوں کا آپ ﷺ کو علم ہوا تو مدینہ کے غیر محفوظ حصے میں خندق کھدوا کر آپ ﷺ نے مدینے کو ناقابلِ تسخیر قلعہ کی صورت دے دی۔ دشمن اپنی تمام جنگی مہارت اور کثرت تعداد کے باوجود اس دفاعی حصار کو توڑنے اور آگے بڑھنے میں ناکام رہا۔ دشمن پر حضور ﷺ کی یہ ضربت اتنی کاری تھی کہ دشمن پھر کبھی مدینہ پر حملے کی جرأت نہ کر سکا۔

مکہ پر حملہ کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے جو طریقِ کار اختیار کیا اس نے دشمن کو جنگ کے بغیر ہی زیر کر لیا۔ تقریباً دس ہزار مسلمانوں پر مشتمل لشکر مکمل رازداری کے ساتھ ایک ایسے راستے پر مکہ کی طرف روانہ ہوا جس پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ نتیجہ یہ کہ قریش کے تمام جاسوسی ذرائع اس نقل و حرکت کا پتہ چلانے میں ناکام رہے اور جب لشکر نے مرالظہران کی وادی کی وسعتوں میں پھیل کر رات کو حضور ﷺ کی ہدایت پر آگ جلائی اور پوری وادی روشن ہو گئی تو دشمن کو اپنی کسمپرسی اور عدم تحفظ کا شدید احساس ہوا۔ اس کی تمام دفاعی صلاحیتیں بے کار ہو گئیں اور حضور ﷺ بغیر کسی قابلِ ذکر مزاحمت کے مکہ پر قابض ہو گئے۔

حضور ﷺ کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ جب آپ ﷺ حملہ یا مقابلہ کا فیصلہ کر لیتے تھے تو پھر پوری سرعت کے ساتھ فوجوں کو مجوزہ میدان میں لانے کی قدرت رکھتے تھے۔ وسائل کی کمی، منزل کی دوری، راستے کی دشواری موسم کی ناسازگاری آپ کے آہنی عزم کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ فتح مکہ کے کچھ عرصہ بعد شام کے کچھ سوداگر مدینہ آئے اور اطلاع دی کہ شام میں رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر جمع ہو رہا ہے اور اس کا ہراول دستہ بلقاء تک پہنچ گیا ہے۔ یہ اور اس قسم کی متعدد اطلاعیں آپ ﷺ کو ملیں تو حضور ﷺ نے لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ روم ایک عظیم الشان سلطنت تھی۔ اہلِ عرب اس کے شاہی لشکر سے مقابلہ کا تصور تک نہ کر سکتے تھے۔ پھر مسلمانوں کی حالت بھی انتہائی خستہ تھی۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے 30 ہزار کا لشکر تیار کیا جو آپ ﷺ کی قیادت میں تبوک کی طرف روانہ ہوا۔ یہ نقل و حرکت اس قدر اچانک اور سُرعت سے ہوئی کہ دشمن کے عزائم خاک میں مل گئے اور وہ میدان میں نکلنے کی ہمت نہ کر سکا۔ تاہم حضور ﷺ نے تبوک میں کچھ دن قیام کر کے اردگرد کے قبائل کو مطیع کیا اور نہایت کامیابی و کامرانی سے واپس تشریف لے آئے۔

ایک عظیم سپہ سالار کی حیثیت سے آپ ﷺ کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ آپ ﷺ نہ صرف اپنی فوج کی سہولت اور حفاظت کی پوری پوری تدبیر فرماتے تھے بلکہ دشمن کے کم از کم جانی ضیاع سے زیادہ سے زیادہ جنگی مقاصد حاصل کرتے تھے۔ جن لوگوں کو تاریخ میں سے جنگی قائد کہلانے کا شرف حاصل ہے، وہ سب ایک مشترکہ وصف کے ضرور مالک تھے اور وہ یہ کہ دشمن کی فوج، قوم اور ملک کا اس قدر خون بہایا جائے کہ اوّل تو وہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے اور اگر اس کا کچھ حصہ باقی رہے تو اس میں کبھی سر اٹھانے کی سکت باقی نہ رہے۔

روم وایران اس زمانے کی مہذب ترین سلطنتیں تھیں۔لیکن وحشت وبربریت میں دنیا بھر کے غیر مہذب ممالک سے بھی آگے تھیں۔سکندرِاعظم نے شام کے قدیم تجارتی شہر صور کو چھ ماہ کے سخت محاصرے کے بعد فتح کیا،تو آٹھ ہزار بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور تیس ہزار کو غلام بنالیا۔اشوک نے 261ق م میں کلنگ (اڑیسہ) پر حملہ کیا،تو طرفین کے ایک لاکھ آدمی قتل ہوئے۔ڈیڑھ لاکھ اشوکؔ کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔لاکھوں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوگئیں۔

طیطس رومی نے بیت المقدس فتح کیا تو ڈیڑھ لاکھ آدمی ہلاک اور ستانوے ہزار آدمی گرفتار کیے جن میں سے گیارہ ہزار بھوک کی تاب نہ لاکر مر گئے۔علاوہ ازیں شہر کی تمام حسین لڑکیوں کو اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔

نوشیرواں نے انطاکیہ پر حملہ کیا اور لوٹ کر آگ لگا دی اور ایک دوسرے حملے میں کیپیڈوسیا اور مسیٹیائن کو جلا کر راکھ کر دیا۔

خسرو پرویز نے حضور ﷺ کے قریبی زمانے میں بیت المقدس کو فتح کر کے آگ لگا دی۔اس کے جواب میں ہرقل نے جب ایران پر حملہ کیا تو زرتشت کے وطن اُرمیان ہی کو پیوندِ خاک کر دیا۔

قیصر جسٹینین نے جب افریقہ پر حملہ کیا تو اس نے پانچ لاکھ انسانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کر دیا۔

اگر ان بیانات میں مبالغہ بھی کیا گیا ہو،تو پھر بھی یہ امر مسلمہ ہے کہ حضور ﷺ سے پیشتر اور آپ کے ہمعصر فاتحین کی روایت یہی تھی کہ وہ اپنے دشمن پر فتح پانے کے بعد شہروں کو لوٹ لیتے۔عورتوں اور مردوں کو یا تو قتل کر دیتے یا لونڈی غلام بنا لیتے تھے۔اس کے بعد مفتوح شہروں کو بے دریغ آگ لگا دیتے تھے۔یہی وہ گھناؤنی روایت جس کو عہدِ حاضر کی مہذب اور ترقی یافتہ قومیں ابھی تک اپنائے ہوئے ہیں۔دو عظیم جنگوں میں کروڑوں انسان ہلاک کیے گئے۔لاتعداد شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر دیا گیا۔لیکن حضور ﷺ محض ایک جنگی سالار ہی نہ تھے،بلکہ آپ ﷺ کی اصل حیثیت نبی ومرسل کی تھی۔آپ نسل آدم کا قلع قمع کرنے،خونریزی کرنے نہیں بلکہ اس کے شرف واحترام کو قائم کرنے اور اس کو ترقی، امن،خوش حالی اور نجات کا راستہ دکھانے کے لیے تشریف لائے تھے۔آپ ﷺ خونریزی اور

تباہی کے بجائے انسانی زندگی کے تحفظ اور تعمیر کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے دس سال کی قلیل ترین مدت میں سرزمین عرب کی تمام مخالف قوتوں کو مطیع کر کے ایک عظیم ریاست قائم کر لی اگرچہ آپ ﷺ کو اس کے لیے متعدد جنگیں لڑنا پڑیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ اپنی کتاب ''عہدِ نبوی ﷺ کے میدان ہائے جنگ'' میں لکھتے ہیں ''عہدِ نبوی ﷺ کی جنگیں تاریخِ انسانی میں غیر معمولی طور سے ممتاز ہیں۔ اکثر دُگنی، تگنی اور بعض اوقات دس گُنی قوت سے مقابلہ ہوا اور قریب قریب ہمیشہ ہی فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے چند محلوں پر مشتمل شہری مملکت سے جو آغاز ہوا وہ روزانہ 274 سے بھی زیادہ مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال میں جب آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی، تو دس لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ کا رقبہ آپ ﷺ کے زیرِ اقتدار آچکا تھا۔''

برصغیر پاک و ہند کے برابر وسیع و عریض علاقے کی فتح میں کس قدر جانی نقصان ہوا، صرف اس سوال کا جواب اس امر کی شہادت دے سکتا ہے کہ انسانی خون کی جو عزت اور احترامِ آدمیت کی جو روایت حضور ﷺ نے قائم فرمائی، تاریخِ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان جنگوں میں تقریباً ایک ہزار اٹھارہ جانیں ضائع ہوئیں۔ مسلمانوں کے 259 افراد شہید 127 زخمی اور ایک اسیر ہوا۔ دوسری طرف مخالفین کے 759 مقتول اور 6564 قید ہوئے۔ دشمنوں کے قیدیوں میں سے 6347 کے بارے میں واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو ازراہ لطف و احسان کسی شرط کے بغیر آزاد فرما دیا تھا۔ باقی 217 کے حالات دستیاب نہیں۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے اور مسلم معاشرے کا حصہ بن گئے۔ جنگوں کی تاریخ میں یہ امر انتہائی تعجب خیز ہے کہ ایک عظیم الشان انقلاب برپا ہو جائے اور اتنا تھوڑا جانی نقصان ہو۔ ان جنگوں میں صرف ایک فتح مکہ کو لیجیے جس نے عرب کی سیاسی تاریخ کا دھارا ہمیشہ کے لیے موڑ دیا۔ اس میں صرف تین مسلمان شہید ہوئے اور دشمن کے تقریباً تیرہ آدمی مارے گئے۔ اس کے باوجود حضور ﷺ نے متعلقہ سالار سے جواب طلبی فرمائی کیونکہ آپ ﷺ کو ایک انسانی جان کا نقصان بھی گوارا نہ تھا۔ آپ کا یہ طرزِ عمل جہاں آپ کو ایک عظیم جرنیل ثابت کرتا ہے وہاں آپ انسانی خون کی حرمت کے سب سے بڑے علمبردار بھی نظر آتے ہیں۔

❁..........❁..........❁

2

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضرت محمد ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے بعد اسلامی سلطنت کے انتظامات جن چار بزرگوں نے سنبھالے انہیں خلفائے راشدینؓ کہا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ صرف تیس برس پر مشتمل رہا۔ ان بزرگوں کے مبارک نام حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ تھے۔

خلفائے راشدینؓ ان بزرگوں کو کہا جاتا ہے جو خود بھی نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلتے تھے اور امت کو بھی چلاتے تھے۔ خلفائے راشدینؓ میں پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ 573ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی ولادت رسول کریم ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کے دو برس بعد ہوئی تھی۔ آپ حضور ﷺ سے عمر میں دو برس چھوٹے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا شمار مکہ کے دولتمند تاجروں میں ہوتا تھا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ حسنِ اخلاق، دانائی، علم اور تجربے کی بناء پر لوگوں میں بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ آزاد انسانوں میں جو مرد سب سے پہلے مسلمان ہوا، وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ جب آپ مسلمان ہوئے تو یہ اسلام کے ابتدائی ایام تھے اور دین کی خدمت کے لیے افراد کے علاوہ مال و دولت کی بھی بڑی ضرورت تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے خدمت دین میں اپنا سارا مال خرچ کر دیا تھا۔ خود نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

"ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مال سے بڑھ کر میں نے کسی کے مال سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔"

غزوۂ تبوک کے لیے تیاری کا اعلان سُنا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے گھر آئے اور

گھر کا سارا مال و اسباب اُٹھا کر حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے آئے اور ساتھ ہی اپنے کرتے کی گھنڈیاں بھی اتار کر پیش کر دیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے آپ سے استفسار کیا!

''اپنے بال بچوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟''

''اللہ اور اس کا رسول ﷺ۔'' حضرت صدیق ؓ نے جواب دیا۔

وہ بزرگ جنہوں نے بعد میں اسلام کی خدمت میں نمایاں کارنامے سرانجام دیئے اور پوری دنیا میں مسلمانوں کا سر بلند کیا سب کے سب حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی کوششوں سے مسلمان ہوئے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلا خطبہ دیا تھا وہ تاریخِ اسلام کے صفحات پر سنہری حروف میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ آپ ؓ نے فرمایا:

''لوگو! مجھے تمہارا حاکم منتخب کیا گیا ہے۔ مگر مَیں تم سب میں سے بہتر انسان نہیں ہوں۔ اگر مَیں اچھے کام کروں تو تمہارا فرض ہے کہ میری مدد کرو۔ لیکن مَیں برائی کی راہ پر چلوں تو تمہیں چاہیے کہ مجھے سیدھی راہ پر لگاؤ۔ مَیں سچائی کو امانت سمجھتا ہوں اور جھوٹ میرے نزدیک خیانت ہے۔ مَیں کمزور انسانوں کو طاقت ور سمجھتا ہوں اور ان کا حق واپس کراؤں گا۔ مَیں طاقت وروں کو کمزور سمجھوں گا اور دوسروں کا حق ان سے دلاؤں گا۔ جس قوم نے خدا کی راہ میں جہاد کرنا چھوڑ دیا ہے خداوند کریم نے اسے ذلیل و خوار کر دیا ہے۔ وہ قوم جس میں بدکاری عام ہو جائے خدا اس قوم کی مصیبتوں اور دکھوں میں بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ اگر مَیں خدا اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرتا ہوں، تو تمہیں بھی میری فرمانبرداری کرنی چاہیے۔ اگر مَیں خدا اور رسول ﷺ کا نافرمان بن جاؤں تو تمہیں میری فرمانبرداری نہیں کرنی چاہیے۔''

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا متذکرہ خطبہ انتہائی سادہ اور مختصر ہے۔ لیکن اس میں وہ ساری ضروری باتیں موجود ہیں جس سے عام آدمی کو زندگی میں بار بار سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

رسول خدا ﷺ کے وصال کے بعد عرب میں دو بڑے فتنوں نے جنم لیا۔ پہلا یہ کہ جھوٹے نبی سامنے آئے اور ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنے لگے۔ دوسرا فتنہ یہ تھا کہ بعض لوگوں نے جو دل سے اسلام کے قائل نہ ہوئے تھے اور منافق تھے یہ اعلان کیا کہ وہ حکومت کو زکوٰۃ نہ دیں گے۔ یہ موقع بڑا نازک تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال سے مسلمانوں پر رنج و اَلم کے پہاڑ ٹوٹ

پڑے تھے اور سارے مسلمان حسرت ویاس کی زندہ تصویریں بنے ہوئے تھے۔ بعض لوگوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اس موقع پر زکوٰۃ کی وصولی کے لیے سختی نہ کی جائے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نے یہ مشورہ رَد کر دیا اور فرمایا کہ زکوٰۃ کی وصولی کسی بھی طرح نہ تو مسترد کی جا سکتی ہے اور نہ ملتوی۔ آپ نے ان قبیلوں کی طرف فوجی دستے روانہ کر دیئے جنہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا۔ چودہ سو سال کے سارے نئے پرانے تاریخ لکھنے والوں نے تسلیم کیا کہ اس نازک موقع پر حضرت صدیق ﷛ کے ان سخت اقدامات نے اسلام کی سربلندی اور سرفرازی کے سلسلے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اس موقع کی سختی آئندہ کئی سازشوں اور بغاوتوں کے قلع قمع کا سبب بنی اور دونوں فتنے مٹا دیئے گئے۔

اس زمانہ میں آج کی دو بڑی طاقتوں امریکہ اور روس کی طرح دو بڑی سلطنتیں روم اور ایران تھیں۔ شمال میں مشرقی رومی سلطنت کا مرکز قسطنطنیہ تھا اور مشرق میں ایران کی ساسانی سلطنت تھی۔ کئی عرب قبیلے جو ان سلطنتوں کے ماتحت تھے دین اسلام کی طرف مائل ہونے لگے اور لوگ اسلام قبول کرنے لگے تو ہر دو سلطنتوں کے کارکنوں نے اسلام سے دلچسپی لینے والے لوگوں کو دبانے کی کوشش کی۔ جب رومی سلطنت کے شہنشاہ نے اپنی سرحدوں کے عرب قبیلوں کے وظیفے بند کر دیئے تو ان عرب قبائل نے خود کو آزاد سمجھنا شروع کر دیا۔ دونوں سلطنتوں نے عرب قبیلوں پر سختیاں شروع کیں۔ تو ان قبائل کے آس پاس بسنے والے مسلمان عرب قبیلوں نے اپنے بھائیوں کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور ان کے شانہ بشانہ دونوں سلطنتوں سے لڑائی شروع کر دی۔ اس طرح بیک وقت روم اور ایران سے عربوں کی جنگ شروع ہو گئی۔ ان ایام میں بظاہر کیفیت یہ تھی کہ روم اور ایران دونوں سلطنتیں عربوں کی اسلامی سلطنت کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے طاقتور تھیں، اور بے سرو سامان عربوں کو محض چند ایام میں شکستِ فاش دے سکتی تھیں لیکن حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نائب رسول خدا ﷺ نے مسلمانوں کو اس طریق سے دونوں سلطنتوں کی لاتعداد فوجوں سے لڑایا کہ بالآخر مسلمانوں نے روم اور ایران کی سلطنت کی تمام شان و شوکت مٹی میں ملا دی اور مسلمان فتح یاب ہوئے۔

حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نے ایک فوج حضرت خالد بن ولید ﷛ کی زیرِ قیادت ساسانیوں کے خلاف بھیجی جو دریائے فرات کے مغرب میں حیرہ کا علاقہ فتح کرنے میں کامیاب

ہوگئی۔ حضرت صدیق ؓ نے تین فوجوں کو تین سالاروں کے تحت شمال کی طرف بھیجا اور شام کے اندر تین مختلف حصوں میں ان فوجوں نے پیش قدمی جاری رکھی۔ پھر جب یہ پتا چلا کہ رومی شہنشاہ بہت بڑی فوج جمع کر چکا ہے تو حضرت صدیق ؓ نے حضرت خالد بن ولید ؓ کو بھی شام پہنچنے کے احکامات صادر فرمائے جن کی تعمیل میں حضرت خالد بن ولید ؓ نے ایک انتہائی دشوار گزار صحرائی علاقے میں سے گزر کر شام پہنچ کر ایک عدیم النظیر فوجی کارنامہ سرانجام دیا۔

اسلامی فوجیں دمشق کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں اور ابھی شہر فتح نہیں ہو سکا تھا کہ حضرت صدیق ؓ بیمار پڑ گئے اور 23 اگست 634ء کو آپ ؓ کا انتقال ہو گیا۔ آپ ؓ نے انتقال سے قبل صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے حضرت عمر فاروق ؓ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ آپ ؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنے گزارے کے لیے جو معمولی سی رقم منظور کر رکھی تھی اس کا مکمل حساب کرایا اور فرمایا کہ "میری زمین فروخت کر کے وہ ساری رقم بیت المال میں جمع کرا دی جائے جو مَیں اپنے زمانہ خلافت میں بیت المال سے وصول کر چکا ہوں۔"

آپ ؓ نے یہ وصیت بھی فرمائی کہ اس وقت جو چادریں میرے جسم پر ہیں انہیں دھو کران سے میرے کفن کا انتظام کیا جائے۔

آپ کو جب یہ بتایا گیا کہ آپ کی رقم میں سے کفن کے لیے نیا کپڑا خریدا جا سکتا ہے، تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: "میرے کفن کے لیے یہی پرانے کپڑے مناسب ثابت ہوں گے کیونکہ مردوں کی بہ نسبت زندوں کو نئے کپڑوں کی زیادہ ضرورت ہے، حضرت صدیق ؓ کو حضور نبی کریم ﷺ کے پہلو میں یوں دفن کیا گیا کہ آپ کا سر مبارک حضور نبی کریم ﷺ کے دوش مقدس کے برابر تھا۔

حضرت صدیق ؓ نے ملک کو صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کر کے ہر جگہ دیانتدار اور انصاف پسند حاکم مقرر کیے تھے۔ آپ ہمیشہ ہر معاملہ میں صحابہ کرامؓ سے ضرور مشورہ لے لیتے تھے۔ ہر شخص کو کام سونپتے وقت اس کے فرائض بھی سمجھا دیتے تھے۔ آپ ؓ مدینہ سے باہر ایک گاؤں میں سکونت پذیر تھے؟ جہاں سے مہینوں پیدل آتے رہتے۔ آپ ؓ مسجد میں بیٹھ کر کاروبارِ حکومت سرانجام دیتے اور شام کے وقت نماز کے بعد پیدل گھر لوٹ جاتے۔ جو غیر مسلم اسلامی حکومت کے ماتحت رہتے تھے ان سے فی کس دس درہم سالانہ لینے کا حکم تھا۔ بوڑھوں،

اپاہجوں اور غریبوں سے کچھ نہ لیا جاتا تھا۔ بلکہ بیت المال سے انہیں اپنی گزر بسر کے لیے گزارہ رقم ملتی تھی۔ حیرہ کے عیسائیوں سے جو عہد نامہ طے پایا تھا اس کے تحت عیسائیوں کے گرجے اور خانقاہیں محفوظ تھیں۔ انہیں گرجوں میں گھنٹے بجانے کی اجازت تھی اور تہواروں پر اور جلوسوں میں صلیب نکالنے کی بھی اجازت تھی۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جنگ کے ایام میں مجاہدوں کے لیے حکم تھا کہ وہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو کبھی قتل نہ کریں۔ پھل دار درخت کبھی نہ کاٹیں۔ آباد جگہوں کو کبھی ویران نہ کریں۔ صرف اُن جانورں کو ذبح کریں جنہیں کھانا مطلوب ہو۔ مالِ غنیمت میں خیانت کی سخت ممانعت تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ بزدلی سے سخت اجتناب کی تلقین کرتے تھے اور غیر مسلموں کو نرمی سے اسلام کی طرف بلانے کی تلقین فرماتے تھے۔

اسلام کے مجاہد خلیفہ اوّل امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب حاکم یا منصف غصہ کی حالت میں ہو تو مقدمہ کا فیصلہ نہ کرے۔''

حضرت ابوبکر صدیق نے ایک اور حدیث شریف میں کہا:

''فرمایا نبی اکرم ﷺ نے کہ دو مسلمان اگر ایک دوسرے پر تلوار کھینچ کر آمنے سامنے ہوں تو وہ دونوں دوزخ کے کنارے پر ہیں۔ پھر اگر ان میں سے کوئی قتل ہو جائے تو قاتل و مقتول دونوں دوزخ میں جائیں گے۔''

❁..........❁..........❁

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطاب کے بیٹے تھے۔ مکہ مکرمہ کے قبیلہ قریش کی مشہور شاخ بنوعدی سے تعلق رکھتے تھے۔ عدی کے دوسرے بھائی مُرہ تھے جو رسول پاک ﷺ کے اجداد میں سے ہیں۔ اس لحاظ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ نسب آٹھویں پشت میں رسول پاک ﷺ سے جا کر مل جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا خاندان دورِ جاہلیت میں بھی بڑا ممتاز تھا۔ سفارت کا عہدہ انہی کے پاس رہا۔ ددھیال کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ ننھیال کی طرف سے بھی نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ حنتمہ ہاشم بن مغیرہ کی بیٹی تھیں، اور مغیرہ اس درجہ کے آدمی تھے کہ جب قریش کسی قبیلہ سے نبرد آزمائی کے لیے جاتے تھے تو فوج کا اہتمام ان ہی کے ہاتھ ہوتا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہجرت نبوی سے 40 برس قبل پیدا ہوئے اور مکہ مکرمہ میں نشو ونما ہوئی۔ نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی اور خطابت میں مہارت پیدا کی۔ خصوصاً شہسواری میں کمال حاصل کیا۔ بائیں ہاتھ سے بھی دائیں ہاتھ ہی کی طرح کام کر سکتے تھے۔ دوڑتے گھوڑے پر اچک کر بیٹھ سکتے تھے۔ ابن سند کے بیان کے مطابق زمانۂ جاہلیت میں عکاظ کے میلے میں دنگل میں کشتی بھی لڑا کرتے تھے۔ اِسی زمانہ میں لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ پیشہ تجارت تھا اور اسی سلسلہ میں دُور دُور ممالک عراق وشام کے بکثرت سفر کیے۔ اس سے آپ کو بڑے تجربے اور فوائد حاصل ہوئے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ستائیسواں سال تھا کہ ریگستان عرب میں آفتاب اسلام طلوع ہوا۔ مکہ کی گھاٹیوں سے توحید کی صدا بلند ہوئی۔

قریش کے سرکردہ اشخاص میں ابوجہل اور حضرت عمر اسلام اور آنحضرت ﷺ کی دشمنی

میں سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ ان ہی دونوں کے لیے اسلام کی دعا فرمائی۔ ''خدایا! اسلام کو ابو جہل یا عمر بن الخطاب سے معزز کر'' اس دعا کا اثر یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اسلام کا یہ سب سے بڑا دشمن اس کا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا جاں نثار بن گیا۔ ابن ہشام نے ان کے اسلام لانے کے متعلق دو روایتیں درج کی ہیں: ایک یہ کہ آنحضرت ﷺ کے قتل کے ارادے سے نکلے تھے کہ راہ میں ایک رشتہ دار نے کہا ''پہلے اپنے گھر یعنی بہن بہنوئی کی خبر لو، وہاں کچھ تکرار کے بعد قرآن کے کچھ اجزاء دیکھے اور پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ ایک دن چھپ کر آنحضرت ﷺ کی نماز میں تلاوت سُنی اور اس سے متاثر ہوئے، بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ قرآن پڑھ کر یا سن کر اسلام کی توفیق پائی۔

علامہ شبلی نعمانی کے بیان کے مطابق بہن اور بہنوئی کو لہولہان کر دیا اور پھر وہاں قرآن سن کر دل پسیج گیا اس وقت آنحضرت ﷺ ارقم کے مکان پر تھے کہ حضرت عمر نے آ کر وہاں دستک دی۔ چونکہ شمسیر بکف تھے۔ صحابہ ؓ کو تردد ہوا لیکن حضرت حمزہ ؓ نے کہا آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے ورنہ اِسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔ حضرت عمر نے اندر قدم رکھا تو رسول پاک ﷺ خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا کیوں عمر! کس ارادے سے آئے ہو؟ نبوت کی پر جلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت عاجزی سے عرض کی ''ایمان لانے کے لیے'' آپ ﷺ اور صحابہ ؓ نے بے ساختہ اللہ اکبر کا نعرہ اس زور سے مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اس وقت چالیس یا اس سے کم وبیش آدمی مسلمان ہو چکے تھے، لیکن وہ نہایت بے بسی اور مجبوری کے عالم میں تھے۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا گویا ہر قسم کے خطروں کو دعوت دینا تھا۔ کعبہ میں نماز پڑھنا تو ناممکن تھا۔ حضرت عمر ؓ نے مشرکین کو جمع کر کے اعلانیہ اپنے اسلام کا اعلان کیا اور پھر مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حق، باطل کے مقابلہ میں سر بلند ہوا، اور حضرت عمر ؓ کو اس صلہ میں دربار نبوت سے فاروق کا لقب مرحمت ہوا۔

حضرت عمر فاروق ؓ 7 نبوی میں اسلام لائے تھے اور 12 نبوی میں ہجرت ہوئی اس طرح گویا انہوں نے تقریباً چھ سات برس تک قریش کے مظالم برداشت کیے۔ آنحضرت ﷺ سے اجازت لے کر ہجرت مدینہ کے ارادہ سے مسلح ہو کر نکلے، مشرکین کے مجمعوں سے گزرتے

ہوئے خانہ کعبہ پہنچے، نہایت اطمینان سے طواف کیا۔ نماز پڑھی، پھر مشرکین سے مخاطب ہو کر کہا جس کو مقابلہ کرنا ہو وہ مکہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرلے لیکن کسی کو ہمت نہ ہوئی اور وہ مدینہ روانہ ہو گئے۔

بدر، اُحد اور تمام غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جنگ کی انتہائی سختیوں میں بھی ہمیشہ ڈٹے رہے اور آنحضرت ﷺ کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ غزوۂ بدر میں تو فاروقی تلوار نے ان کے مشرک ماموں کا صفایا ان کے ہاتھ سے کروادیا تھا۔ غزوۂ تبوک کے لیے اپنا آدھا مال لا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رکھ دیا۔ آپ ﷺ نے انہیں غزوۂ خندق کے ایک حصہ کی حفاظت پر مامور فرمایا تھا۔ غزوۂ حنین میں بھی ان کی ثابت قدمی مثالی تھی۔

آنحضرت ﷺ نے آپ کو کئی مہموں کی قیادت بھی سپرد کی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی مبارک زندگی میں ان کے بہت ہی قریب اور مشیر رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ان کے دست راست مشیر اور قاضی رہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد خلافت کی باگ ڈور سنبھالی اور ہر ایک شعبہ کو ایسی ترقی دی کہ وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی، آپ ہی کے عہد خلافت میں رومی اور ایرانی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا اور ایک ہی وقت میں اسلامی افواج کو دو مختلف محاذوں پر اس سلیقے سے لڑایا کہ ہر ہر محاذ پر فتح حاصل کی اور دشمن پر دھاک بٹھا دی۔ فوج کو پوری طرح منظم کیا، ان کی تنخواہیں مقرر کیں اور مختلف شہروں میں چھاؤنیاں بنائیں اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ نظمِ حکومت کو ایسا انصاف عطا کیا کہ جس پر خود انصاف کو بھی ہمیشہ ناز رہے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کل ساڑھے دس برس حکومت کی۔ لیکن اتنی ذرا سی مدت میں روم اور ایران کے پرخچے اڑا دیے۔ قیصر و کسریٰ جن کے نام سے کبھی عربوں کے بدن پر کپکپی پیدا ہو جاتی تھی، اب ان کے تخت انہی بدوؤں کے ہاتھ میں تھے، وہی عرب جو درختوں اور بتوں کے آگے سر جھکاتے تھے اب کسی بادشاہ کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور نہ کسی فوج سے ڈرتے تھے۔ لوگ حیران ہیں کہ اچانک یہ کیا ہو گیا اور کیسے ہو گیا لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ہی ایسی زبردست تھی کہ جہاں ایک بار اسلام کا اثر ہوا اور اللہ کا خیال دل میں جما پھر کیا تھا ساری دنیا قدموں کے نیچے تھی۔ وہ اللہ کے ہو گئے تھے اور اللہ ان کا ہو گیا تھا۔

❀..........❀..........❀

4

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بنی اُمیہ میں سے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عفان اور دادا کا نام ابی العاص تھا، جو اُمیہ کے بیٹے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ''ذوالنورین'' (دو نوروں والا) اور ''غنی'' مشہور تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ کا گھر حضور نبی کریم ﷺ کی دو صاحبزادیوں کے نور سے روشن ہوا تھا۔ حضور نبی کریم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کی شادی آپ رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر جب حضرت رقیہؓ کی وفات ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دوسری صاحبزادی اُم کلثومؓ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دے دی تھی۔ اس لیے وہ ''ذوالنورین'' مشہور ہو گئے تھے۔ غنی کہلانے کی وجہ آپ رضی اللہ عنہ کی سخاوت تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ دل کے بہت سخی تھے۔ کسی سائل کو کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے۔ انتہائی مہمان نواز بھی تھے۔ اپنے مہمانوں کو تو پر تکلف کھانا پیش کرتے لیکن خود سادہ اور معمولی غذا کھاتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو سخاوت کی وجہ سے غنی کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے پہلے سال ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سمجھانے پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ کے چچا نے سخت تکلیفیں دیں۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ صبر سے کام لے کر سب کچھ برداشت کر گئے۔ آخر کار آپ رضی اللہ عنہ کے چچا کو ہار ماننا پڑی۔ جب مکہ کے کافروں نے مسلمانوں کو ستانے پر کمر باندھ لی اور ان کی زیادتیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ اپنی بیوی حضرت رقیہؓ کے ساتھ 5 ہجری میں ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ کچھ دن کے بعد وہاں سے لوٹے تو مسلمانوں نے مکہ کی سکونت ترک کر کے مدینہ جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ چنانچہ مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو حضرت عثمان

بن عفان ﷛ بھی مدینہ آ گئے اور یہاں تجارت سے کافی دولت کمانے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت عثمان غنی ﷛ غزوۂ بدر کے سوا سارے غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔ آپ ﷛ کی غزوۂ بدر میں عدمِ شرکت کی وجہ یہ تھی کہ اس جنگ کے زمانے میں حضرت رقیہؓ سخت بیمار تھیں، آپ ﷛ انہیں چھوڑ کر مدینہ سے نہیں نکل سکتے تھے۔ رسولِ خدا ﷺ قریش کو شکست دے کر واپس تشریف لائے تو حضرت رقیہؓ کی وفات ہو گئی۔ اس پر حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت اُم کلثومؓ سے آپ ﷛ کا نکاح کر دیا۔

ذیقعد 6 ہجری میں حضور نبی کریم ﷺ عمرہ کے ارادے سے روانہ ہوئے تو چودہ صحابی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ عرب کے پرانے دستور کے مطابق اس زمانہ میں ساری لڑائیاں بند ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن قریش کو حضور نبی کریم ﷺ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ جنگ پر آمادہ ہو گئے حالانکہ حضور نبی کریم ﷺ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ حرم کی حد پہنچنے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ معہ صحابہؓ رُک گئے، اور قریش سے بات چیت کے لیے حضرت عثمان ﷛ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ کسی نے یہ افواہ پھیلا دی کہ قریش نے حضرت عثمان غنی ﷛ کو شہید کر ڈالا ہے۔ یہ سن کر حضور نبی کریم ﷺ نے سارے مسلمانوں سے عہد لیا کہ ہم عثمان ﷛ کا بدلہ لینے کے لیے اپنی جانیں دے دیں گے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر صحابہؓ سے جو بیعت لی تھی اسے ''بیعت رضوان'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسی بیعت جو خدا کی خوشنودی کا باعث ہوئی۔ گو جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ حضرت عثمان ﷛ کے شہید ہونے کی خبر غلط تھی لیکن اس موقع پر بیعت رضوان کے تحت قریش دس سال کے لیے صلح پر مجبور ہو گئے تھے اور حالت امن میں مسلمانوں کو اسلام پھیلانے کا موقع مل گیا تھا۔ اس واقعہ کے دو تین سال بعد مکہ فتح ہو گیا تھا اور پورے عرب نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

حضور نبی کریم ﷺ اور مسلمان مکے سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تو اس زمانہ میں مسلمانوں کی مالی حالت بہت کمزور تھی اور وہ بڑی مشکل سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دنوں مدینہ کے قریب ایک کنواں تھا جس کا پانی میٹھا تھا۔ اس کا مالک ایک سنگدل اور لالچی یہودی تھا۔ جو اس کنویں کا پانی مسلمانوں کے ہاتھ بہت مہنگے داموں فروخت کرتا تھا۔ مدینہ کے سارے مسلمان اس سنگدل یہودی کے اس رویہ سے بہت تنگ تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کی اس تکلیف کو دیکھا تو ایک روز مسجد میں اس شخص کو جنت کی بشارت دی جو یہودی سے کنواں خرید کر

وقف کردے۔ حضرت عثمان غنیؓ یہ سن کر چپ چاپ اُٹھے اور یہودی سے چار ہزار درہم میں کنویں کا آدھا حصہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ بعد میں یہودی نے مجبوراً بقایا حصہ بھی چار ہزار درہم میں حضرت عثمانؓ کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس طرح مدینہ کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تکلیف دُور ہوگئی۔

ایک بار مدینے میں قحط پڑا تو حضرت عثمانؓ نے غلہ کے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ تاجروں کی اس پیش کش کے باوجود کہ وہ دوگنا نفع دے رہے تھے، مدینہ کے محتاجوں میں مفت تقسیم کر دیئے اور قحط ختم ہو گیا۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر سارے صحابہ کرامؓ نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق جہاد کے لیے مال جمع کرایا تھا۔ اس موقع پر حضرت عثمان غنیؓ نے نصف فوج کے سارے اخراجات خود ادا کیے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ نوسو پچاس گھوڑوں اور اونٹوں کا بھی انتظام کیا تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں ایران کی فتح مکمل ہوئی تھی اور جو علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے سے باقی رہ گئے تھے۔ وہ بھی مسلمانون کے قبضے میں آگئے۔ آپؓ کے عہدِ خلافت میں آذربائیجان، آرمینیا، فارس اور خراسان میں بغاوتیں ہوئیں جنہیں بڑی بہادری سے دبا دیا گیا۔ طبرستان کو کئی جنگوں کے بعد شکستِ فاش دی گئی۔ آپؓ ہی کے زمانہ میں مسلمانوں نے کابل تک فتح حاصل کر لی تھی اور ہندوستان کی مغربی سرحد پر پہنچ گئے تھے۔ مغربی جانب طرابلس (موجودہ لیبیا) فتح ہوا تھا اور پیش قدمی جاری تھی۔

حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے بحری جنگی جہاز اور کشتیاں بنائیں اور قبرص وروڈس کے جزیروں کو بھی فتح کر لیا۔ رومیوں کے کئی جنگی بیڑوں کو شکست فاش دی اور مصر کے ساحل تک ان کا تعاقب کر کے ہرا دیا۔ بحیرۂ خزر کے آس پاس کے علاقے فتح کیے، بلخ کو فتح کیا۔

حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے پہلے چھ سال تو بڑے آرام وسکون سے گزرے تھے۔ اس کے بعد فتنے سر اٹھانے لگے۔ دراصل جو قومیں نئی نئی مسلمان ہوئی تھیں ان میں بعض منافقوں نے پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کو کمزور کرنا چاہا۔ ان نومسلموں میں ایک یہودی عبداللہ بن سبا اور بعض نومسلم ایرانیوں نے جو مسلمانوں کی ترقی دیکھ کر جلتے تھے، غلط افواہوں کے تحت لوگوں کو بھڑکا دیا تھا۔

اسلام کے ان دشمنوں کے جوڑ توڑ کی بدولت حضرت عثمان غنی ﷛ 18 ذوالحجہ 35 ہجری کو شہید کر دیئے گئے۔ آپ ﷛ چاہتے تو باغیوں کو فوجی قوت سے کچل سکتے تھے مگر آپ ﷛ اس پر راضی نہ تھے اور آپ ﷛ نے فرمایا تھا کہ "میں رسول اللہ ﷺ کے حرم میں خون نہ بہنے دوں گا۔" شہادت کے وقت آپ ﷛ کی عمر 82 سال تھی۔

حضرت عثمان ﷛ ایک نہایت بردبار، نرم دل، نیک اور معاف کر دینے والے صحابی تھے۔ آپ ﷛ کے دَورِ حکومت میں مسلمانوں نے بہت سے ممالک فتح کیے۔ آپ ﷛ نے قرآن کی نقلیں کرا کے مختلف صوبوں میں روانہ کیں تاکہ مسلمان قرآن پڑھتے وقت زیر زَبر کی غلطیاں نہ کریں۔ آپ ﷛ کے اس کام نے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد بیت المال سے ایک کوڑی تک نہ لی۔ آپ ﷛ کی حیاداری کا یہ عالم تھا کہ خود حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "عثمان ﷛ کی حیا سے فرشتے بھی شرماتے ہیں۔" آپ ﷛ نے مسجد نبوی پتھر سے بنوائی اور سارے اخراجات خود برداشت کیے۔ عوام کی بہتری کے لیے آپ ﷛ نے زرعی ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ جابجا نئے بند بنوائے، بحری بیڑا سب سے پہلے آپ ﷛ ہی کے زمانہ میں تیار ہوا تھا۔ آپ ﷛ حافظ قرآن تھے اور رات رات بھر تلاوت کرتے رہتے تھے۔

حضرت عمر فاروق اعظم ﷛ نے اپنی وفات سے قبل وصیت کی تھی کہ ان کے بعد حضرت عثمان ﷛، حضرت علی ﷛، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷛، حضرت سعد بن وقاص ﷛، حضرت زبیر ﷛ اور حضرت طلحہ ﷛ میں سے کسی کو خلیفہ بنایا جائے۔ تین دن تین راتوں کے غور و فکر کے بعد حضرت عثمان ﷛ خلیفہ منتخب ہوئے تھے تو سارے مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔

حضرت عثمان غنی ﷛ کی فضیلت کا اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمان غنی ﷛ کا بدلہ لینے کے واسطے مکہ والوں سے جنگ کرنے کے لیے جو بیعت رضوان لی تھی، اسی بیعت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیعت الرضوان کے نام سے موسوم فرمایا ہے اور بیعت کرنے والے مسلمانوں کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ ترجمہ:

"اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا ہے۔ جب انہوں نے درخت کے نیچے تجھ (حضور نبی کریم ﷺ) سے بیعت کی۔"

5

حضرت علی کرم اللہ وجہہ'

حضرت علی کرم اللہ وجہہ' آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی اور چوتھے خلیفہ تھے۔آپ چھوٹی عمر کے لوگوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔آپ میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں۔آپ کی شہرت جہاں ایک بڑے خطیب کی تھی وہاں آپ بطور عظیم جرنیل بھی جانے جاتے ہیں۔آپ بچپن میں ہی آنحضرت ﷺ کے زیر تربیت آگئے تھے اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس جوہر کو چمکا دیا تھا۔ ہجرت کی رات رسول اللہ ﷺ کے بستر پر رات گزارنے کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا۔آپ کی دلیری اور بہادری کا یہ ثبوت تھا کہ آپ یہ جانتے ہوئے کہ کفار حضور اکرم ﷺ کی جان کے دشمن ہوئے پھر رہے ہیں اور وہ اس رات نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنا چاہتے ہیں، اس کے باوجود آپ آنحضرت ﷺ کے بستر پر بے خوف جا لیٹے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ' کو غزوہ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ نے تمام غزوات اور جنگوں میں انتہائی ماہرانہ طریق پر جنگ لڑی اور بطور ایک عظیم جرنیل کے اپنے آپ کو منوالیا۔

جب مکے کی زمین مسلمانوں پر تنگ کر دی گئی تو مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی لیکن کفر وظلم کے رکھوالوں نے یہاں بھی مسلمانوں کا تعاقب کیا۔سب سے پہلی جنگ جس کی نوعیت کافروں اور مسلمانوں کے درمیان آئی وہ جنگ بدر تھی جس میں ظالم کافروں نے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی۔مسلمان منظم ہو کر اپنے دفاع کو نکلے تو آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی:

''میرے مولا! یہ گنتی کے لوگ تیرے حکم پر جہاد کے لیے نکلے ہیں، بے سروسامان ہیں انہیں سروسامان عطا کر اور اپنے دشمنوں پر انہیں غلبہ عطا فرما!''

سخت گرمیوں کے دنوں میں دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں دونوں طرف کے بہادر دادِ شجاعت کے لیے بے تاب دکھائی دے رہے تھے۔ کافروں کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ اپنے بیٹے ولید اور بھائی شیبہ کو لے کر میدان میں نکلا ان کے مقابلہ میں حضرت حمزہ ؓ، حضرت علی ؓ اور حضرت عبیدہ ؓ آگے بڑھے اس موقع پر حضرت علی ؓ نے وہ جوہر شجاعت دکھایا کہ نہ صرف اپنے دشمن کو جہنم واصل کیا بلکہ حضرت عبیدہ ؓ کے مقابل شیبہ کو بھی آگے بڑھ کر قتل کر دیا سارے لشکر پر حضرت علی ؓ کی دھاک بیٹھ گئی اور مسلمانوں کا یہ جرنیل کافروں کی صفوں میں گھس کر ان کے سروں کی فصل کاٹتا رہا اور اسلام کے نظام کے غلبہ کا راستہ صاف کرتا رہا یہاں تک کہ اس غزوے میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کافر عبرت انگیز شکست سے دوچار ہو کر اپنے زخم چاٹتے ہوئے میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔

جنگ اُحد میں جب کافروں نے مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی اور کفار کی طرف سے طلحہ بڑی شان سے نمودار ہوا اور للکارنے لگا کہ کس کو جنت کی تمنا ہے؟ کون ان حوروں سے ملنے کے لیے بے تاب ہے؟ وہ میدان میں آئے اور ہماری تلوار کی کاٹ دیکھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آنحضرت ﷺ کی طرف دیکھا اور میدان میں آکر جواب دینے کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اجازت ملنے پر کودے اور بجلی کی طرح طلحہ کے مقابل آکر کھڑے ہو گئے۔ طلحہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مختصر جسامت دیکھی اور حقارت سے آگے بڑھا اور کہنے لگا علی تمہیں جوانی عزیز نہیں تم کیسے جنت کے شوق میں میرے مقابل آ گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جواب دیا میرے اوپر ابھی جنت کا دروازہ نہیں کھلا لیکن جہنم تمہارے انتظار میں ہے۔ طلحہ اس جواب سے بگڑا، پینترا بدلا اور حملہ کیا آپ نے اس کے حملے کو ڈھال پر روکا۔ طلحہ نے پھر پینترا بدلا اور دوبارہ حملہ کیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ وار اپنی

تلوار پر روکا اور طلحہ کو للکارا اور کہا طلحہ سنبھلو میں آ گیا ہوں۔ طلحہ کے جسم پر زرہ تھی چار آئینہ سے سینہ اور پیٹھ محفوظ تھی۔ سر پر خود تھا تلوار کے زخم کا اسے کوئی فکر نہ تھا۔ وہ بولا علی کیا کہتے ہو تمہاری کیا مجال ہے کہ مجھے نقصان پہنچاؤ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اللہ کا نام لیا اور اس پھرتی سے اس پر وار کیا کہ خود کٹ گیا اور سر دو ٹکڑے ہو گیا۔ حتیٰ کہ داڑھی اور دامن بھی دو پارہ ہو گئی۔ طلحہ کا بے جان لاشہ ریت پر جا پڑا۔ آنحضرت ﷺ اور مجاہدین نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت اور جنگی مہارت کی داد دی۔ جنگ میں جب لڑائی نے مسلمانوں کے خلاف پلٹا کھایا اور آنحضرت ﷺ کافروں میں گھر گئے تو اس وقت بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضور اکرم ﷺ کو آگے بڑھ کر اپنے حصار میں لیا اور محفوظ مقام کی طرف لے گئے۔

جنگ خندق جس میں کافروں کی تمام پارٹیاں اپنے ظلم کے نظام کو بچانے کے لیے اکٹھی ہو گئی تھیں اور مسلمانوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے خندقیں کھود کر ان سے مقابلہ کرنے کی حکمت عملی اختیار کی تھی اس میں بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی بہادری اور جنگی مہارت کے جوہر دکھلائے۔ عمرو بن عبدود ایک سر پھرا کافر تھا۔ اس نے عکرمہ بن ابی جہل سے کہا خندق تک آ کر واپس لوٹنا بزدلی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک مختصر دستہ لے کر آگے بڑھے اور اسے وہیں روک لیا۔ عبدود اپنے لباس سے سرداری کا روپ دھارے ہوئے تھا اس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا میرا راستہ چھوڑ دو ورنہ میری تلوار تمہارے خون سے رنگین ہو جائے گی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بڑی بے نیازی سے کہا دیوانے میری بات کا جواب دے! کیا تو نے یہ عہد کیا تھا کہ اگر کوئی قریشی مجھے دو چیزوں کی دعوت دے گا تو میں ایک قبول کر لوں گا۔ اس نے کہا ہاں کیا تھا تم کیا چاہتے ہو تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا میں تمہیں اسلام کے نظامِ عدل، اللہ پر ایمان اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو ماننے کا کہتا ہوں!

اس نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں دوسری بات کہو!

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اسلام کی دولت تمہاری قسمت میں نہیں تو آؤ تلوار کے ذریعہ فیصلہ کریں اس نے کہا دیکھو بھتیجے میں تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا تم میرا راستہ چھوڑ دو اور میری تلوار کو

اپنے خون سے آلودہ ہونے سے بچاؤ!

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا مگر میں تو اپنی تلوار کو سونت کر کھڑا ہوں اور تمہیں قتل کرنے کو تیار ہوں!

عبدود غضب ناک ہو کر گھوڑے سے کود کر نیچے آ گیا تلوار کے ایک ہی وار سے اپنے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں اور اس کے منہ پر مکّہ مار کر پیچھے ہٹا دیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر حملہ آور ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کمال مہارت سے ایسا وار کیا کہ عبدود کے دو ٹکڑے ہو کر سلع پہاڑی کے دامن میں بکھر گئے۔

جنگِ قریظہ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اسلامی پرچم عطا کیا تھا یہ آپ پر آنحضرت ﷺ کا جنگی اعتماد تھا آپ ﷺ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ایک ماہر اور تجربہ کار جرنیل کی حیثیت دیتے تھے۔

جنگِ خیبر میں آنحضرت ﷺ نے پہلے دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اسلامی پرچم دیا۔ لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا دوسرے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اسلامی جھنڈا دیا گیا لیکن قلعہ فتح نہ ہوا۔ یہودی قلعے کے اندر ڈٹے بیٹھے تھے اور مسلمانوں کے لیے فتح مشکل ہو رہی تھی کئی روز کی جنگ کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم کل میں ایسے شخص کو جھنڈا عطا کروں گا جو خیبر کے قلعہ کو فتح کیے بغیر نہ لوٹے گا۔

رات گزری صحابہؓ انتظار میں تھے دیکھیں کون شخص ہے جس پر آنحضرت ﷺ کی نظر پڑتی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بلوایا ان کی آنکھیں آشوب چشم کی وجہ سے دُکھ رہی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھوں میں لگایا تو وہ ٹھیک ہو گئیں اور آج کا جھنڈا انہیں عطا کیا گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ قلعہ کی طرف بڑھے۔ مرحب کو تاؤ آ گیا وہ اپنی بہادری پر فخر کرنے لگا وہ غرور سے پھولا نہ سماتا تھا اس نے سوچا مسلمان اَب تک کچھ نہیں کر سکے اب کیا کر لیں گے۔ کیوں نہ قلعہ سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کیا جائے چنانچہ اس نے خود پہن، زرہ سے بدن

چھپایا، تلوار، نیزہ، خنجر، تیر کمان اٹھائے اور فوج کو لیے ہوئے قلعہ سے باہر نکل آیا۔ اس نے قلعہ کے سامنے فوج کو آراستہ کیا اور خود رجز پڑھتا بہادرانہ شان دکھاتا میدان میں آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ ''سب جانتے ہیں کہ مَیں مرحب ہوں۔'' حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی لن ترانیاں سنیں اور آگے بڑھے اور فرمایا مَیں وہ ہوں جس کا نام ماں نے شیر رکھا ہے۔ دونوں بہادر آمنے سامنے ہوئے۔ مرحب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر وار کیا آپ ﷺ نے اسے ڈھال پر روکا۔ مرحب نے ڈھال سر پر رکھ کر دوسرا وار کرنا چاہا تو آپ نے آگے بڑھ کر وار کیا تلوار ڈھال کو کاٹ کر سر تک پہنچ گئی اور مرحب کا کام تمام ہو گیا۔

❁..........❁..........❁

(حصہ دوم)

صحابہ کرامؓ

(6)

حضرت ابوالاعورالسلمی رضی اللہ عنہ

ابوالاعور عمرو بن سفیان السلمی رضی اللہ عنہ غزوۂ حنین میں شریک تھے مگر اس وقت اسلام نہیں لائے تھے، اس وقت وہ مشرکین کے قائد مالک بن عوف النصری کے ہمراہ تھے۔ پھر اس کے بعد دونوں اسلام لے آئے صحیح قول کے مطابق وہ صحابی تھے، انہوں نے نبی پاک ﷺ سے ایک حدیث بھی روایت کی ہے۔ (اسد الغابہ) غزوۂ حنین کے بعد کے غزوات میں بھی شرکت کی۔

شام کی سرزمین کے تمام معرکوں میں پیش پیش رہے، جنگِ یرموک میں ایک دستے کی کمان کی تھی۔ پھر دمشق کی فتح میں بھی شریک رہے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے انہیں دوسرے کمانڈروں کے ساتھ ''فحل'' بھیجا۔ بعدازاں شُرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مجاہدینِ اسلام جب بیسان پہنچے تو ابوالاعور رضی اللہ عنہ نے طبریہ کی راہ لی۔ جب شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ جنگ فِحل سے فارغ ہوئے تو انہوں نے بیسان کا محاصرہ کرلیا۔ چند دن کے بعد وہاں کے رہنے والوں نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ شرجیل نے بیسان والوں سے دمشق کی طرح صلح کرلی۔ اہلِ طبریہ کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے شرجیل کے پہنچنے سے پہلے ہی ابوالاعور رضی اللہ عنہ سے صلح کرلی جب پورا اُردن فتح ہوگیا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ حمص آگئے، اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے فلسطین کا رُخ کیا اور اس کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اسے بھی فتح کرلیا۔

اور انہوں نے ابوالاعور رضی اللہ عنہ کو اردن میں اپنا قائم مقام بنادیا تاکہ مسلمانوں پر پیچھے سے یا کسی اور طرف سے حملہ نہ کیا جاسکے اور یہ کہ اردن مسلمانوں کے لیے امن کی بیس (Base) ہو جس سے وہ ارضِ شام کو پورے طور پر فتح کرسکیں، پس ابوالاعور نے اردن پر ایسا مکمل کنٹرول کیا کہ عساکرِ اسلام کو کسی طرف سے بھی کوئی نقصان نہ پہنچا۔

ابوالاعور ؓ جنگِ عموریہ شام میں بھی شریک رہے، اِسی طرح انہوں نے معاویہ بن سفیان کی کمان میں جزیرۂ قبرص میں بھی شرکت کی، اور وہ اہلِ شام کی صفوں میں آخرِ عمر تک جہاد کرتے رہے۔

ابوالاعور ؓ حضرت ابوسفیان ؓ بن حرب اموی کے حلیف تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ ؓ سے ان کے تعلقات مخلصانہ رہے۔ حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں وہ معروف و مشہور کمانڈروں میں سے تھے۔ حضرت عمر ؓ نے لکھا تھا کہ انہیں ہر کام کے لیے باصلاحیت لوگوں کی ضرورت ہے۔ انہیں بصرہ، کوفہ، شام اور مصر سے چار آدمی بھیجے گئے وہ سب بنی سلیم سے تھے۔ امیرِ شام کی طرف سے ابوالاعور ؓ کو منتخب کر کے بھیجا گیا۔ اس سے ان کی گوناگوں صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص ؓ اور شرجیل ؓ نے انتہائی نازک حالات میں اردن کا نظم و نسق ان کے حوالے کیا تھا۔ وہ حضرت عثمان ؓ کے زمانہ میں بھی اردن کے والی رہے پھر پورا شام حضرت معاویہ ؓ کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔ پھر حضرت معاویہ ؓ کے حکم سے وہاں کے عامل رہے۔ وہ اہلِ شام کے سرکردہ لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ابوالاعور ؓ بڑے دلیر بہادر اور آگے بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والے تھے وہ بڑے سمجھدار اور اچھے منتظم تھے۔ اِسی وجہ سے وہ حضرت عمر ؓ، حضرت عثمان ؓ اور حضرت معاویہ ؓ کی نظر میں معتمد رہے۔ شام اور سمندری فتوحات میں انہوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں، انہیں کسی جنگ میں بحیثیت کمانڈر یا ماتحت کمانڈر شکست کا سامنا کرنا نہیں پڑا، ان کا جنگی پلان ہمیشہ صحیح ہوتا تھا وہ عقل و تلوار دونوں سے لڑا کرتے تھے۔

تاریخ ارضِ شام اور یرموک میں ابوالاعور ؓ کے جہاد کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ان کا اردن ہی میں وصال ہوا۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ (آمین)

❁..........❁..........❁

7

حضرت ابوامامہ الباھلی رضی اللہ عنہ

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کا اصل نام صُدی بن عجلان ہے اور باھلہ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔غزوۂ حدیبیہ سے پہلے اسلام لائے اور حدیبیہ میں موجود تھے اور جب یہ آیت "لقد رضی اللہ عن المومنین" (الخ) نازل ہوئی تو انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے درخت کے نیچے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، تو رسولِ پاک ﷺ نے فرمایا "انت منی وانامنک" آپ مجھ میں سے ہیں اور میں آپ سے ہوں۔ (اصابہ:24:3)

آنحضرت ﷺ نے انہیں ان کی قوم باھلہ کی طرف بھیجا، اس وقت انہیں بھوک محسوس ہو رہی تھی اور وہ لوگ خون کھا رہے تھے۔انہوں نے ان سے کہا جاؤ انہوں نے کہا کہ میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں اس کام سے روک دوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ رسولِ پاک ﷺ کی نظر میں قابلِ اعتماد تھے۔انہیں آنحضرت ﷺ کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا اور ان کے جھنڈے تلے لڑنے کا بھی۔

مدینہ سے ارضِ شام کی طرف جاتے ہوئے وہ یزید بن ابی سفیان کے لشکر میں تھے راستے میں حضرت یزید کو معلوم ہوا کہ رومیوں نے "العربہ" (عقبہ اردن کے قریب) میں اپنی طاقت اکٹھی کر لی ہے تو انہوں نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے انہیں شکست دی۔حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے بعد شام میں یہ پہلی جنگ تھی۔رومی داثنِ (غزہ فلسطین کے قریب) تک پیچھے ہٹ گئے۔وہاں بھی حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے انہیں شکست دی۔ اس سے ایک طرح سے مسلمانوں کا مورال بلند ہوا اور رومیوں کا مورال تباہ ہوا۔

اس کے بعد وہ تمام معرکوں میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح کی کمان میں لڑتے

رہے۔قورس کی فتح میں بھی وہ ان کے ہمراہ تھے۔وہ ہر جگہ بڑی بے جگری اور بہادری سے لڑے۔

آنحضرت ﷺ نے انہیں ان کی قوم باھلہ کی طرف مبلّغ بنا کر بھیجا۔چنانچہ وہ ان کے ہاتھ پر اسلام لے آئی۔انہوں نے آنحضرت ﷺ سے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں،جن کی تعداد 270 ہے اور جیسے انہوں نے سُنی تھیں آگے اِسی طرح سنا دیا کرتے تھے۔

جنگِ صفین میں وہ حضرت علی المرتضیٰ ؓ کے ساتھ تھے۔پھر مصر جا ٹھہرے پھر وہاں سے حمص منتقل ہوئے اور وہیں قیام کیا۔وہاں 86 ہجری میں وصال ہوا،وہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ میں سے آخری آدمی تھے جن کا شام میں انتقال ہوا۔اس وقت ان کی عمر 106 سال تھی۔ان کی ولادت ہجرت سے بیس سال پہلے کی تھی۔

وہ بڑے مہربان،مہمان نواز،جری،غیرت مند،سچے،وفادار،متقی اور پارسا تھے۔اپنے عقیدہ کی خاطر سب کچھ قربان کر دینا چاہتے تھے،وہ اسلام سے پہلے اور بعد میں بھی اپنی قوم کے سرکردہ افراد اور صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔

بحیثیت کمانڈر جب ہم ان کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں وہ دشمن پر بڑھ بڑھ کر اور اچانک حملہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔وہ بڑے بہادر کمانڈروں میں سے تھے،کیسے بھی حالات ہوں وہ ان کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔دو معرکوں میں ان کا رومیوں سے سامنا ہوا اور وہ وہاں پہلے سے تیار ہو کر آئے بیٹھے تھے مگر انہوں نے شکست کھائی۔اس سے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور بلند حوصلہ تو آدھی فتح ہوتی ہے اور رومیوں پر فتح حاصل کرنے میں ان کی تمام قائدانہ صفات نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔افسوس ہے کہ تاریخ میں ان کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ نہیں ملتا جس سے ان کی مجاہدانہ زندگی پر مزید روشنی پڑتی۔حضرت اسامہ بن زید ؓ کے بعد یہ دوسرے کمانڈر ہیں جنہوں نے رومیوں کو شکست دی ابوامامہ ؓ نے اپنی فتوحات سے اہلِ شام کے دل جیت لیے تھے اور دوسرے کمانڈروں نے شام کے دوسرے علاقے فتح کر لیے۔

اللہ تعالیٰ اس فقیہہ،محدث،صحابی اور قائد فاتح سے راضی ہوں۔(آمین)

❀..........❀..........❀

8

حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ

آپ رضی اللہ عنہ کا نام سماک اور کنیت ابودجانہ تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے والد کا نام خرشہ اور یہ قبیلہ خزرج سے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ قبل از ہجرت مشرف باسلام ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں حصہ لیا۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنی بہادرانہ اور شجاعانہ صفات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے دور میں ایک جانثار مجاہد اور بہادر جرنیل کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ جنگِ بدر میں آپ رضی اللہ عنہ نے کافروں کے خلاف بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ کافروں پر آپ کے نام سے لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ غزوہ میں اس قوت اور جانی جذبہ سے لڑے کہ آنحضرت ﷺ نے خصوصی طور پر آپ رضی اللہ عنہ کی جنگی مہارت اور بہادری کی تعریف فرمائی۔

غزوہ احد میں رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی اور فرمایا کہ اس تلوار کا حق کون ادا کرے گا۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے کہا میں! اسی طرح بعض دوسرے مجاہد بن نے اپنی خواہش کا اظہار فرمایا آخر میں حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ اس کا حق کیا ہے! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یہ تلوار دشمنوں پر چل چل کر ٹیڑھی ہو جائے اور اس سے کسی مسلمان کا خون نہ بہے اور تم کافروں سے جنگ کرتے ہوئے نہ بھاگو!

حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں اس کا حق ادا کروں گا۔ آپ ﷺ نے تلوار حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرما دی۔ ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے سرخ رنگ کے کپڑے کی پٹی اپنے سر پر باندھی اور کافروں کے سامنے ٹہلنے لگے۔ مسلمان انصاریوں نے کہا ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے موت کی پٹی سر پر باندھ لی ہے۔ اَب کافروں کی خیر نہیں ابودجانہ رضی اللہ عنہ کافروں کے سامنے ٹہلتے

ہوئے رجز پڑھنے لگے اور کہنے لگے۔

مَیں ایسا شخص ہوں جس سے میرے جگری دوست نے یہ عہد لیا ہے کہ مَیں فوج میں پچھلی صفوں میں نہ رہوں گا مَیں اس تلوار سے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں کو مارتا رہوں گا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی اس چال کو آنحضرت ﷺ بھی ملاحظہ فرما رہے تھے۔ فرمایا ایسے موقع کے علاوہ اس طرح کی چال اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

جب جنگ شروع ہوئی گھمسان کا رَن پڑا آپ نے جوہر دکھائے کہ میدانِ جنگ پر ایسے سوار ہو گئے جیسے کوئی کھلاڑی کھیلتا ہے۔ آپ میدانِ جنگ میں کافروں کو تہ تیغ کر رہے تھے اور کشتوں کے پشتے لگا رہے تھے۔ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا یہ جرنیل میدانِ جنگ میں ایک جگہ ہندہ بن عتبہ تک پہنچ گیا۔ وہ آپ کی تلوار کی زد میں تھی۔ قریب تھا کہ اس کا سر اڑا دیا ہوتا، لیکن آپ کو خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار کسی عورت پر نہیں چلنی چاہیے۔ عورت خواہ دشمن ہو لیکن وہ کمزوری کی علامت ہوتی ہے۔ ایک بہادر جرنیل کی تلوار بہادر دشمن پر ہی وار کرتی ہے۔

عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جھوٹے نبی سیلمہ کے خلاف جنگ لڑی اس جنگ میں مسیلمہ نے ایک باغیچے میں پناہ لے لی اس تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کسی طرح مجھے اٹھا کر باغیچے کے اندر پھینک دو تو مسیلمہ کو قتل کرنے کی کوئی تدبیر ہاتھ آسکتی ہے۔ چنانچہ ان کو باغیچے میں پھینکا گیا لیکن گرتے ہی ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ مگر ہمت نہ ہارے گھسٹ کر اندر سے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے اور مسیلمہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ ٹانگ ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ زخموں سے چور ہو گئے اور شہادت کی دعا مانگنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے انہوں نے شہادت نصیب فرمائی۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ اپنی جنگی مہارت، بے مثل کارناموں اور اپنے شجاعانہ اوصاف کی بنیاد پر ایک عظیم جرنیل کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

❀............❀............❀

9

حضرت ابو عبید بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ

رسول پاک ﷺ غزوۂ تبوک سے جب 9 ہجری میں واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو ثقیف قبیلے کا وفد بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے اور قبیلے کی طرف سے اسلام لانے کا اعلان کیا، ابو عبید بھی اپنے قبیلے کے ہمراہ اسلام لائے اور مرتے دَم تک اسلام پر ڈٹے رہے۔ وہ اگر چہ صحابی رسول تھے مگر انہیں آنحضرت ﷺ کی قیادت میں جہاد کی سعادت نہ مل سکی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے ایران پر حملے کے لیے اپنے لوگوں کو متوجہ کیا، مگر اس وقت ایران کی طرف حملے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی، چوتھے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر جس مجاہد صحابی نے لبیک کہی وہ حضرت ابو عبید بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے بعد سعد بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ اور سلیط بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ نے پیش کش کی۔ جب اس مہم کی روانگی کی بات طے ہوگئی تو کسی کہنے والے نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مہاجرین و انصار میں سے جو پہلے اسلام لانے والے ہیں ان میں سے کسی کو سپہ سالار مقرر کر دیجیے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''ایسا نہیں ہوسکتا اس لیے کہ مہاجرین و انصار میں سے کسی نے پہل تو کی نہیں، مَیں ان پر اسے مقرر کروں گا جس نے پہل کی ہے وہ ابو عبید ہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو عبید، سعد اور سلیط کو بلایا اور سعد اور سلیط کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اگر تم دونوں میں سے کسی نے پہل کی ہوتی تو میں قیادت تمہارے سپرد کرتا۔ پھر ابو عبید سے یوں مخاطب ہوئے۔ ''نبی کریم ﷺ کے ان صحابہ کی بات ماننا، انہیں سے مشورہ لیتے رہنا اور ہرگز جلدی نہ کرنا بلکہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔ اس لیے کہ یہ جنگ ہے اور جنگ میں ہمیشہ کامیاب وہی رہتا ہے۔ جو متحمل مزاج ہو اور جسے پوری مہارت حاصل ہو اور جسے معلوم ہو کہ کب حملہ کرنا مفید ہوگا اور کب نہیں۔'' پھر

فرمایا کہ ''تم ایسی سرزمین کی طرف جا رہے ہو جس میں ہیر فریب اور مکر و خیانت ہے۔ اپنے راز ہرگز افشانہ کرنا اور اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔''

مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ؓ مدینہ منورہ سے اپنے لشکر کی طرف جلدی سے روانہ ہو گئے جو اس وقت عراق میں تھا۔ ان کے فوراً بعد ابو عبید ؓ پانچ ہزار مجاہدین کے ساتھ ان کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں اور مجاہد بھی اس لشکر میں شریک ہوتے گئے۔ مثنیٰ بن حارثہ کے ایک ماہ بعد ابو عبید ؓ تیرہ پہنچے، مثنیٰ ؓ اور ابو عبید ؓ دونوں نے لشکرِ اسلام کو پوری طرح منظم کیا۔ پھر ابو عبید ؓ کی کمان میں، اسلامی لشکر ''نمارق'' کے مقام پر ایرانی سپہ سالار جابان اور اس کی سپاہ سے نبرد آزما ہوا، بڑی سخت جنگ کے بعد مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور ایرانی سپہ سالار جابان کو قید کر لیا گیا۔ مگر جابان نے مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے اس مسلمان مجاہد سے امان لے لی جس نے اسے قید کیا تھا۔ جب یہ بات ابو عبید ؓ تک پہنچی تو بہت سے لوگوں نے کہا کہ اسے قتل کر دینا چاہیے کہ یہ ایرانی فوج کا سپہ سالار ہے اور اس نے فریب سے کام لیتے ہوئے امان حاصل کی ہے۔ مگر ابو عبید ؓ کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ''تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں، ان میں سے کسی کا عہد و پیمان سب کا عہد و پیمان ہے اس لیے ہمیں اس کا پابند رہنا چاہیے اور اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔'' چنانچہ جابان کو رہا کر دیا گیا۔

مسلمانوں کا دوسرا معرکہ وسط شہر کے قریبی علاقہ ''ستساطیہ'' میں ہوا، یہاں بھی فریقین بڑی بہادری سے لڑے اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی۔ ابو عبید ؓ نے کسکر کے مقام پر پڑاؤ کیا اور مثنیٰ بن حارثہ ؓ کو قریبی علاقوں میں بھیجا وہ اس مشن میں کامیاب رہے۔

یہیں کسانوں کے سرکردہ لوگوں نے حضرت ابو عبید ؓ کی خدمت میں طرح طرح کے کھانے پیش کیے جنہیں ابو عبید نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ابو عبید اپنے ان سپاہیوں کے بغیر یہ نفیس کھانے کیسے کھا سکتا ہے جو اس کے کنبے پر جانیں قربان کر رہے ہوں اور بڑی بڑی قربانی دے رہے ہوں۔ آپ کا شکریہ، ہم وہی کھائیں گے جو ہمارے مجاہد سپاہی کھائیں گے۔

ایرانی فوج کے کمانڈر انچیف رستم نے مسلمانوں کے خلاف جالینوس کی کمان میں ایک اور لشکر بھیجا، اسے بھی شکست کا سامنا ہوا، پھر ابو عبید ؓ نے حیرہ پر پڑاؤ ڈالا، رستم کو ایرانیوں کی مسلسل شکست سے بہت کوفت ہوئی۔ اب اس نے بہمن جاذویہ کی کمان میں ایک بہت بڑی فوج

مسلمانوں کے مقابلے میں بھیجی۔ جس نے کوفہ کے قریبی گاؤں قس ناطف میں آ کر پڑاؤ ڈالا۔ ابو عبید بھی اپنی سپاہ کے ساتھ مروحہ کے مقام پر پہنچے، دریائے فرات فریقین کے درمیان تھا۔ ایرانی سپہ سالار نے پیغام بھیجا کہ تم دریا کو عبور کر کے ہماری طرف آؤ گے یا پھر ہم آئیں؟ ابو عبید ؓ کو مشیروں نے بہتیرا سمجھایا کہ ہمیں دریا عبور کر کے ہرگز اس طرف نہیں جانا چاہیے مگر ابو عبید ؓ نے ان کی ایک نہ سُنی اور دریا عبور کرنے کا حکم دے دیا۔ ابھی مسلمانوں کے قدم جمنے بھی نہ پائے تھے کہ ایرانی سپاہ نے ہاتھیوں کے ساتھ بڑا زوردار حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ ابو عبید ؓ نے پیادہ پا لڑنے کا حکم دے دیا، مجاہد لڑتے گئے، مگر یہ ہاتھی مسلمانوں کے گھوڑوں کے لیے پرابلم بنے ہوئے تھے۔ ابو عبیدہ ؓ نے آگے بڑھ کر سفید ہاتھی کی سونڈ کاٹ ڈالی، بپھرے ہوئے ہاتھی نے ابو عبید ؓ کو پاؤں تلے روندھ ڈالا اور انہوں نے موقع پر ہی شہادت پائی۔ مسلمانوں نے سخت حملہ کر کے ہاتھی کو مار کر اس کے پاؤں سے اپنے قائد کو نکالا۔ ثقیف قبیلے کے ساتھ بہادروں نے یکے بعد دیگرے عَلَم اٹھایا اور بہادری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ آخر میں عَلَم مُثنیٰ بن حارثہ ؓ کے ہاتھ میں آیا، انہوں نے زوردار آواز میں کہا کہ مجاہدو! اطمینان سے دریا پار کرو، مَیں اپنے آدمیوں کے ساتھ دشمن کے سامنے کھڑا رہوں گا۔" اس طرح بقیہ مسلمان مجاہد اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

بحیثیت انسان ابو عبید ؓ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، وہ سچے مسلمان اور متقی سپہ سالار تھے۔ وہ بڑے بہادر اور جان باز تھے، انہوں نے اپنے عقیدہ کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور 13ھ میں شہادت پائی۔

بحیثیت قائد ان کا سلوک اپنے ماتحتوں کے ساتھ مثالی تھا، وہ انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سپاہ ان پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ شجاعت کی مثال تھے، پُل کی اس جنگ میں بھی انہوں نے اپنے ہاتھ سے چھ سے لے کر دس آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنی رائے پر ڈٹ جاتے تھے اور پھر کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور یہی چیز مسلمانوں کی ناکامی کا سبب بنی کہ انہیں حضرت عمر ؓ کی نصیحت بھی یاد نہ رہی کہ ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرنا اور ان کی بات ماننا، دراصل ابو عبید ؓ جتنے بڑے سپاہی تھے اتنے بڑے سپہ سالار نہ تھے، ممتاز سپہ سالار کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنے مشیروں کی صحیح بات کو قبول کرتا ہے۔

مگراس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ابو عبید ﷺ سچے مجاہد کے لیے ایک عمدہ مثال تھے، وہ شہادت کے متمنی تھے، اور انہوں نے اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی خاطر اپنی قیمتی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

انہوں نے کم سپاہ کے ساتھ بڑی زیادہ سپاہ کا مقابلہ کیا اور آخری جنگ کے علاوہ ہر جنگ میں غالب رہے، وہ مجتہد تھے، اپنی رائے پر مُصر رہنے کی وجہ سے ان سے خطا ہوئی، اور مجتہد کو اگر وہ صحیح فیصلہ تک پہنچے تو دُہرا ثواب ملتا ہے اور اگر خطاء ہو جائے تو اکہرا ثواب ملتا ہے۔

انہوں نے دریا عبور کرنے کی پہل صرف اِسی بناء پر کی تھی کہ مسلمانوں کو کوئی بزدلی کا طعنہ نہ دے سکے، جبکہ مسلمانوں کی آخری آرزو فتح یا شہادت ہوتی ہے۔ دریا کو عبور کرنے میں مسلمانوں کے مورال کو بلند کرنا اور دشمن کے مورال کو تباہ کرنا بھی مقصود تھا۔

وہ ایمان وعقیدہ کی خاطر بہادری، اور جان و مال کی قربانی پیش کرنے میں ایک عمدہ مثال تھے۔ مثنیٰ کے بعد وہ دوسرے آدمی تھے۔ جنہوں نے ایران کے خلاف لڑنے میں لبیک کہی تھی۔

معرکۂ جسر میں مسلمانوں کو بقول جنرل محمود شیت ٹیکٹس (Tactics) کے لحاظ سے ناکامی اور سٹریجی کے لحاظ سے فتح ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ اس فاتح قائد وسپہ سالار، سچے مجاہد، بہادر شہسوار اور نامور شہید سے راضی ہوں۔ آمین۔

❀..........❀..........❀

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ

امین الملت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ عہدِ فاروقی میں لشکرِ اسلام کے سپہ سالارِ اعظم تھے۔ شام کو جو سلطنتِ رُوم کا ایک زرخیز ترین صوبہ تھا، آپ ہی نے فتح کیا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ بھی اُن دس صحابہؓ میں سے ایک تھے جنہیں اُن کی زندگی ہی میں آنحضرت ﷺ نے بہشت کی بشارت دی تھی۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ ایک آزمودہ کار عظیم جرنیل مدبر اور حاکم تھے۔ آپ نے روم کی مضبوط ترین منظم اور تربیت یافتہ فوجوں کو شکست پر شکست دے کر سارے شام کو فتح کر لیا۔

حضرت عبدالرحمٰن ؓ بن عوف کی کوشش سے ابتدا میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا۔ اُن ہی میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ بھی تھے۔ اِس لیے آپ کو پہلے مسلمانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ نے بھی دیگر صحابہؓ کے ساتھ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تھی اور جنگ بدر میں شرکت کا شرف حاصل کیا تھا۔ جنگ اُحد میں آپ اُن چند صحابہؓ میں تھے جنہوں نے کفار کے نرغے میں جان پر کھیل کر حضور رسالت مآب ﷺ کی حفاظت کا فرض ادا کیا۔ رسالت مآب ﷺ اِس معرکہ میں زخمی ہو گئے تھے، حضور ﷺ کا دانت مبارک شہید ہو گیا تھا، رُخساروں میں فولادی خود کے ٹکڑے ٹوٹ کر چبھ گئے تھے اور حضور ﷺ ایک گڑھے میں گر پڑے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ نے حضرت سرور کائنات ﷺ کے رُخساروں سے خود کے ٹکڑے اپنے دانتوں سے کھینچ کر نکالے۔ اِس کشمکش میں آپ کے دو دانت شہید ہوئے۔

سنہ 7 ھ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ ؓ کے ہمراہ 300 صحابہؓ کو بحیرہ قلزم کی طرف تبلیغ اِسلام کے لیے بھیجا۔ یہاں بنی جہینہ کے قبائل آباد تھے۔ یہ لوگ حضرت ابوعبیدہ ؓ

کی تبلیغ سے بہت متاثر ہوئے لیکن دیر تک قیام کی وجہ سے صحابہ ؓ کی خوراک کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی اتفاقاً ایک بڑی مچھلی قدرت نے کنارے پر پھینک دی بیس یوم تک 300 صحابہ کرامؓ نے اِس مچھلی پر گزارا کیا۔

آٹھ ہجری میں جب مکہ فتح کیا گیا تو اِسلامی فوج چار حصوں میں تقسیم کر کے شہر مکہ میں داخل کی گئی۔ جو حصہ فوج مہاجرین پر مشتمل تھا وہ حضرت ابوعبیدہ ؓ کے زیرِ کمان مکہ میں جبل ہند کی طرف سے داخل ہوا۔ بعد میں آنحضرت ﷺ نے ابوعبیدہ ؓ کو بحرین کا گورنر مقرر کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے 12ھ میں لشکر اسلام کے کئی حصے کیے۔ ایک حصہ حضرت خالد بن ولید ؓ کی ماتحتی میں عراق عرب کی طرف بھیجا۔ دوسرے حصے کو عمرو بن عاص ؓ کے ماتحت فلسطین کی طرف روانہ کیا۔ تیسرا حصہ یزید بن ابی سفیان ؓ کے سپرد کیا۔ انہیں دمشق پر حملہ کرنے کا حکم ملا۔ شرجیل کو اُردن پر حملہ کرنے کی ہدایت ہوئی لیکن حضرت ابوعبیدہ ؓ کو ان تینوں محاذوں کا سپہ سالارِ اعظم مقرر کیا گیا۔

جنگ تبوک میں جو آنحضرت ﷺ کے وقت میں ہوئی قیصر رُوم شکست کھانے کے بعد بہت برافروختہ ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنے ایک نامور جرنیل روبیس کو شام کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اور اُسے ایک لاکھ چیدہ سپاہی دے کر حکم دیا کہ شام کی سرحدات پر جن علاقوں میں مسلمان داخل ہو چکے ہیں وہاں اُن کا قتل عام کر دیا جائے۔

حضرت ابوعبیدہ ؓ نے جب قیصر کی تیاریاں دیکھیں تو آپ نے حضرت ابوبکر ؓ کو حالات سے مطلع کیا۔ حضرت ابوبکر ؓ نے خالد ؓ کو بھی حکم بھیجا کہ وہ عراق میں مثنیٰ ؓ بن حارث کو اپنا جانشین مقرر کر کے خود ابوعبیدہ کو کمک پہنچائیں۔ حضرت خالد ؓ اس اثنا میں عراق کے کئی شہر فتح کر چکے تھے اور مدائن پر جو کسریٰ کا پایۂ تخت تھا حملہ کرنا چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکر ؓ کے احکام پہنچ گئے۔ چنانچہ خالد ؓ نے شام کی طرف کوچ کیا۔ اور مدائن کی سعادت بعد میں حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کو نصیب آئی۔

اب حضرت ابوعبیدہ ؓ کے ماتحت چار بڑے جرنیل تھے۔ یعنی خالد بن ولید ؓ، یزید ؓ بن ابی سفیان، شرجیل ؓ اور عمرو ؓ بن العاص۔ رُومی سپہ سالار روبیس نے دس ہزار فوج ایک تجربہ کار جرنیل کے ماتحت عرب کی سرحدوں کی طرف بھیج دی۔ عمرو ؓ بن عاص

نے بھی حضرت عبداللہ ﷺ بن عمر کے ہمراہ ایک ہزار فوج آگے بھیج دی۔شام کی سرحد پر اس فوج کا رومیوں سے مقابلہ ہوا۔رومی جرنیل حضرت عبداللہ ﷺ بن عمر کے ہاتھ سے مارا گیا۔اور رومی فوج تتر بتر ہوگئی۔اِس معرکے میں صرف سات مسلمان شہید ہوئے۔لیکن رُومی ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔

اِدھر حضرت خالد ﷺ عراق سے چل کر حضرت ابوعبیدہ ﷺ سے آ ملے انہوں نے آتے ہی بصرہ فتح کرلیا۔آگے دمشق تھا۔وہاں قیصر روم کا جرنیل عزرائیل بہت بڑی فوج لیے پڑا تھا۔یہاں بھی خوں ریز معرکہ ہوا آخر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔حضرت ابوعبیدہ ﷺ دمشق میں مقیم ہوئے اور خالد ﷺ کو اجنادین کی طرف بھیجا۔آپ نے چند روز ہی میں اجنادین فتح کرلیا یہاں پچاس ہزار رُومی قتل ہوئے۔اجنادین کی فتح کے بعد خالد ﷺ واپس دمشق آگئے۔اب تک مسلمان دمشق میں داخل نہیں ہوئے تھے۔محاصرے کی سی حالت تھی۔لیکن اب مسلمان دمشق میں داخل ہوگئے۔تمام باشندوں کو امان دے دی گئی۔کسی سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا۔اس کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں دمشق کے کل باشندے مسلمان ہوگئے۔

13ھ میں حضرت ابوعبیدہ ﷺ کو خبر ملی کہ ابی القدس کا قلعہ دمشق سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔آپ نے حضرت عبداللہ ﷺ بن جعفر طیار ﷺ کو ابی القدس کو فتح کرنے کے لیے بھیجا۔عبداللہ ﷺ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ حاکم شہر کی لڑکی کی شادی ہے۔اور وہاں اندازے سے زیادہ لوگ جمع ہیں۔عبداللہ ﷺ نے وہیں قیام کیا۔اور حضرت ابوعبیدہ ﷺ کو اطلاع بھیجی۔ حضرت خالد ﷺ رات کو کمک لے کر روانہ ہوگئے۔اور علی الصباح ابی القدس پر حملہ کردیا۔ بطریق مارا گیا۔یہاں کے لوگ بھی بعد میں مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

13ھ میں حضرت ابوعبیدہ ﷺ نے صفوان بن عامر کو دمشق کا گورنر مقرر کیا اور خود حضرت خالد ﷺ کو ساتھ لے کر حمص کی طرف بڑھے۔راستے میں قنسرین واقع تھا۔یہاں کا حاکم ہرقل (شہنشاہِ روم) کا باج گزار تھا۔اِس نے پہلے تو جزیہ ادا کرکے صلح کرلی لیکن بعد میں ہرقل سے مسلمانوں کے خلاف امداد طلب کی۔حضرت خالد ﷺ نے علی الصباح شہر کے باہر حاکم قنسرین کو جالیا اور اُسے قتل کردیا۔اتنے میں حضرت ابوعبیدہ ﷺ بھی مجاہدین کا لشکر لے کر شہر پر حملہ آور ہوئے۔اب کیا تھا رُومی فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔قنسرین فتح ہوگیا اور لوگوں کو امان

دے دی گئی۔

قنسرین سے آگے بعلبک تھا یہاں بعل نامی بُت کی پرستش کی جاتی تھی۔ حاکم کا نام ہربیس تھا۔ وہ پانچ ہزار سپاہ لے کر مقابلے کے لیے نکلا لیکن شکست کھائی۔ زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔ حضرت ابوعبیدہ ﷛ نے آگے بڑھ کر بعلبک کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

رُومی فصیل پر سے اِس شدت کے ساتھ تیر برسا رہے تھے کہ مسلمان برداشت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ ﷛ نے اپنے جرنیلوں سے مشورہ کر کے فوج کو پیچھے ہٹا لیا اور اُس کے کئی حصے کر کے اِدھر اُدھر پھیلا دیا۔ کفار یہ سمجھے کہ مسلمان ہمارے تیروں کی تاب نہ لا کر محاصرہ اُٹھا کر چلے گئے۔ ہربیس مسلمانوں کے تعاقب کے لیے نکلا۔ اور مسلمانوں جرنیل چاروں طرف سے اِس پر ٹوٹ پڑے۔ آخر ہربیس نے صلح کا علَم بلند کر دیا۔ حضرت ابوعبیدہ ﷛ نے فوراً لڑائی بند کرنے کا حکم دیا۔ اہلِ بعلبک کو امان دے دی گئی۔

حضرت ابوعبیدہ ﷛ رافع بن عبداللہ کو بعلبک کا حاکم مقرر کر کے خود حمص کی طرف روانہ ہوئے۔ حمص پر مریس نامی ایک بہادر شہسوار حکمران تھا۔ حمص کے لوگ بھی بہت بہادر اور جنگجو تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کا بہت سا نقصان ہوا۔ کئی مقتدر صحابہؓ اِس جنگ میں شہید ہوئے۔ لیکن مسلمان پیچھے نہیں ہٹے اور سعید بن زید ﷛ نے مریس کا کام تمام کر دیا۔ حمص فتح ہو گیا لوگوں نے امان طلب کی۔ حضرت ابوعبیدہ ﷛ نے فوراً جنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ اہلِ شہر ہراساں تھے۔ عورتیں، بچے آہ وزاری کر رہے تھے کہ خدا جانے ہم سے کیا سلوک کیا جائے گا۔ چونکہ اِس جنگ میں مقتدر صحابہؓ شہید ہوئے تھے اِس لیے اہلِ شہر ڈرتے تھے کہ لازماً اُن کے قتل کا اِنتقام لیا جائے گا۔ لیکن حضرت ابوعبیدہ ﷛ نے امنِ عامہ کا اعلان فرما دیا۔ لوگ مسلمانوں کے عفو ورحم کے قائل ہو گئے۔

انطاکیہ قیصر رُوم کے ایشیائی ممالک کا دارالسلطنت تھا۔ دمشق، حمص اور بعلبک وغیرہ سے شکست کھا کر جو عیسائی بھاگے وہ سیدھے انطاکیہ پہنچے۔ قیصرِ روم مسلمانوں کی فتوحات کے سیلاب سے خائف ہو کر ایشیائی ممالک کو چھوڑ دینے کا ارادہ کر رہا تھا۔ لیکن شام اور اطرافِ شام کے عیسائیوں کے قافلوں کے قافلے جب انطاکیہ پہنچ گئے تو قیصر نے مسلمانوں سے ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے کی تیاری شروع کر دی۔

اب حضرت ابوعبیدہؓ نے سرداران فوج سے مشورہ کیا کہ آیا ہمیں یہیں ٹھہر کر رُومی فوجوں کا انتظار کرنا چاہیے یا قیصر کے پایۂ تخت انطاکیہ کی طرف بڑھنا چاہیے۔ حضرت خالدؓ نے رائے دی کہ ہمیں نہ انطاکیہ کی طرف بڑھنا چاہیے نہ یہاں ٹھہرنا چاہیے بلکہ کھلے میدان میں جنگ لڑنی چاہیے۔ دشمن کی تعداد ہم سے دس گنا زیادہ ہے ایسا نہ ہو کہ تنگ جگہ میں وہ ہمیں چاروں طرف سے گھیر لے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ لشکرِ اسلامی کو یرموک کی طرف کوچ کرنا چاہیے۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے حمص سے ان حالات میں کوچ کرنے سے پہلے حمص کے لوگوں کا ایک لاکھ روپیہ ''جزیہ'' یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ چونکہ ہمیں ایک عظیم الشان جنگ درپیش ہے اِس دوران میں ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے۔ اِس لیے جزیہ واپس دیتے ہیں۔ حمص کے لوگ حضرت ابوعبیدہؓ کی دیانت داری پر عش عش کر اُٹھے۔ انہوں نے توریت ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ ہم قیصر کی فوجوں کو ہرگز اس شہر میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ خدا آپ کو فتح دے اور آپ جلد واپس آ کر اِس شہر کی حکومت سنبھالیں۔

جب ہامان کو پتہ چلا کہ اِسلامی فوج یرموک کی طرف بڑھ رہی ہے تو اُس نے بھی چاروں جرنیلوں کو یرموک کی طرف کُوچ کرنے کا حکم دیا۔ یرموک پہنچ کر ہامان نے صلح کا پیغام بھیجا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو بات چیت کرنے کے لیے بھیجا۔ ہامان کے دِل میں کھوٹ تھا۔ وہ حضرت خالدؓ کو گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خالدؓ جان پر کھیل کر صاف نکل آئے۔

حضرت ابوعبیدہؓ یرموک کی فتح کے بعد واپس حمص گئے۔ اور حضرت خالدؓ کو قنسرین روانہ کیا۔ شہر والوں نے پہلے مقابلہ کیا۔ مگر پھر جزیہ پر صلح کر لی۔ یہاں عرب کے قبیلہ متنوخ کے لوگ آباد تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے انہیں ہم قومی کے خیال سے اسلام کی ترغیب دی۔ چنانچہ یہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ قنسرین کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حلب کا رُخ کیا۔ شہر سے باہر بہت سے عرب قبائل آباد تھے۔ انہوں نے جزیہ پر اطاعت قبول کر لی۔ شہر کے لوگوں نے قلعہ میں پناہ لی۔ چنانچہ مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بعد ازاں عیسائیوں نے جزیہ دے کر اطاعت قبول کر لی۔ حلب کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ انطاکیہ روانہ ہوئے۔ چونکہ یہ قیصر کا ایشیائی دارالحکومت تھا۔ یہاں بہت سے عیسائیوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ قیصر نے تو

یرموک کی شکست کے بعد ایشیائی مقبوضہ ممالک کو چھوڑ کر، ہمیشہ کے لیے اپنی یورپی مملکت پر قناعت کر لی۔ حضرت ابوعبیدہ ﷺ نے جب انطاکیہ کا محاصرہ کیا۔ تو عیسائیوں نے جزیہ پر صلح کر لی۔ اِس طرح ہرقل کا ایشیائی پایۂ تخت مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب ہر عیسائی سردار خود بخود حاضر ہو کر اور جزیہ پیش کر کے اطاعت قبول کرنے لگا۔

حضرت ابوعبیدہ ﷺ نے انطاکیہ پر قبضہ کرنے کے بعد چاروں طرف فوجیں پھیلا دیں۔ بوقا، جوما، سرمین، توزی، قورس، تل، عزاز، دبوک، رعبان، یہ چھوٹے چھوٹے مقامات آسانی سے فتح ہو گئے۔ جرجومہ والوں نے کہا کہ ہم جزیہ نہیں دیں گے۔ بلکہ جنگ میں امداد دیں گے۔ چونکہ جزیہ فوجی خدمت کا معاوضہ ہے۔ اِس لیے اُن کی یہ درخواست منظور کر لی گئی۔

15ھ میں حضرت ابوعبیدہ ﷺ نے بیت المقدس کا رُخ کیا اور عیسائیوں کا محاصرہ کر لیا گیا انہوں نے اِس شرط پر صلح کی درخواست کی کہ بیت المقدس کی عظمت کے خیال سے معاہدہ صلح حضرت عمر فاروق ﷺ کے دستِ مبارک سے لکھا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ ﷺ نے حضرت عمر فاروق ﷺ کو مطلع کیا۔ حضرت عمر ﷺ خود مدینہ سے چل کر بیت المقدس میں تشریف لائے۔ عہد نامہ حضرت عمر ﷺ کی طرف سے لکھا گیا۔ جس میں ایلیا کے لوگوں کو امان دی گئی۔ اُن کے جان، مال، گرجا اور صلیب کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا۔ اِس عہد نامے پر اللہ، رسول ﷺ، خلفاء اور جملہ مسلمین کو ضامن قرار دیا گیا۔ اِس عہد نامے پر حضرات عمر فاروق ﷺ، خالد بن ولید ﷺ، عمرو ﷺ بن العاص، عبدالرحمٰن ﷺ بن عوف اور معاویہ ﷺ بن ابی سفیان کے دستخط ثبت ہوئے۔ یہ معاہدہ 15ھ میں لکھا گیا۔

17ھ کے آخر میں شام و مصر و عراق میں طاعون پھیل گیا۔ حضرت عمر ﷺ کو جب اطلاع پہنچی تو انتظامات کے لیے خود مدینے سے تشریف لائے۔ حضرت عمر ﷺ نے حکم دیا کہ مسلمان حمص سے نکل جائیں۔ فوجوں کو بھی کوچ کے احکام دے دیئے۔ لیکن حضرت ابوعبیدہ ﷺ تقدیر کے بڑے معتقد تھے انہوں نے نقل مکانی پسند نہ کی اور حضرت عمر ﷺ کو کہا ''عمر ﷺ تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو'' عمر ﷺ نے کہا ''ہاں''۔ مگر تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں۔'' مگر ابوعبیدہ ﷺ نہ مانے۔ حضرت عمر ﷺ واپس مدینہ چلے آئے۔ اور یہاں آ کر حضرت ابوعبیدہ ﷺ کو لکھا کہ فوجوں کو کسی اچھے مقام پر لے جاؤ۔ وہاں رہ کر مسلمانوں کی جانیں مفت نہ گنواؤ۔ چنانچہ 18ھ

میں حضرت ابوعبیدہ ؓ فوجوں کو جابیہ میں لے گئے۔ وہاں پہنچ کر چند روز کے بعد بیمار ہو گئے۔ جب بیماری نے زیادہ شدت کی تو مسلمانوں کو آخری وصیت کی اور معاذ ؓ بن جبل کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد عالم اسلام کا یہ عظیم جرنیل اور فاروق اعظم ؓ کا چہیتا جرنیل ہمیشہ کے لیے مسلمانوں سے جدا ہو گیا۔ اِس وَبا میں 25 ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

حضرت ابوعبیدہ ؓ نے ان تمام جنگی مہمات میں اسلامی فوج کی راہنمائی کی جو آپ کی جنگی صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ دنیا کے بیشتر جرنیلوں نے اس عظیم جرنیل کی زندگی سے جنگی گُر سیکھے ہیں دنیا کی جنگی تاریخ میں آپ کو ایک عظیم سپہ سالار اور جرنیل کے طور پر مانا جاتا ہے۔

❀..........❀..........❀

حضرت اسامہ بن زید الکلبی رضی اللہ عنہ

حضرت اُسَامَہ بن زید حارثہ بن شراحیل بن عبدالعزیٰ کے فرزند تھے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ رسول پاک ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی والدہ اُمِ ایمن رسول پاک ﷺ کی کھلایا تھیں، وہ رسول پاک ﷺ کے والد حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کی باندی تھیں، ان کے وصال کے بعد رسول پاک ﷺ کی ملکیت میں آ گئیں۔ آپ ﷺ نے انہیں آزادی بخشی اور ان کا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر دیا اور ان سے اُسَامَہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

آنحضرت ﷺ اُم ایمن کا بہت احترام کرتے تھے، فرماتے تھے "اُمّ ایمن اُمی بعدَ اُمّی" میری امی کے بعد اُم ایمن میری ماں ہیں۔ جہاں تک ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے وہ رسول پاک ﷺ کے متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) اور غلاموں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے تھے۔ وہ بڑے بہادر اور تیر پھینکنے میں تاک تھے۔ رسول پاک ﷺ کی کمان میں بدر، اُحد، خندق، حدیبیہ اور حنین میں کفار کے خلاف خوب خوب دادِ شجاعت دی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے حکم پر سات مہموں کی قیادت کی۔ جب رسول پاک ﷺ غزوہ مریسع کے لیے روانہ ہوئے تو انہیں مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ "آپ ﷺ جب بھی کوئی مہم بھیجتے تو زید رضی اللہ عنہ کو اس کی کمان دیتے۔ روم کے خلاف جو تین ہزار کا لشکر آپ ﷺ نے مقابلہ کے لیے بھیجا اس کی قیادت بھی زید رضی اللہ عنہ کو سونپی اور فرمایا: "علیکم زید ابن حارثہ، فإن اصیب زید فجعفرٌ، فعبد اللّٰہ بِن رواحہ." (ابن ہشام)

"تمہارے امیر زید رضی اللہ عنہ ہوں گے اگر وہ کام آ جائیں تو پھر جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہوں گے۔"

غزوہ موتہ میں رومیوں کے خلاف دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے آپ نے ان کی بخشش کی دعا مانگی اور رُو پڑے۔ آپ زید ؓ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ''بخدا اُمارت کے زیادہ اہل ہیں، اور مجھے بہت ہی پیارے ہیں۔

یہ تھا اُسامہ کا خاندان کہ ان کے والد تو رسول پاک ﷺ کے اتنے قریب تھے اور ان کی والدہ ام ایمن کو رسول پاک ﷺ اپنی والدہ کے بعد جگہ دیتے تھے۔ حضرت اسامہؓ نے رسول پاک ﷺ کے دامنِ پرورش میں تربیت پائی۔ وہ اور ان کے والد اللہ کے رسول کو بہت پیارے تھے۔

اسامہ ؓ کا کہنا ہے کہ رسولِ پاک ﷺ مجھے اور حضرت حسن ؓ کو اٹھا لیتے اور فرماتے: ''اے اللہ یہ دونوں مجھے پیارے ہیں تجھے بھی پیارے ہوں۔'' اسامہ ؓ مکہ کے ایک اسلامی گھرانے میں پیدا ہوئے، اور وہیں دامن نبوت میں نشوونما پائی، پھر مدینہ ہجرت کی۔ اسلامی تعلیمات کا درس براہِ راست نبی اسلام ﷺ سے لیا۔ غزوۂ احد میں چونکہ عمر چھوٹی تھی اس لیے آپ ﷺ نے انہیں واپس کر دیا تھا۔ البتہ اس کے ایک سال بعد 15 سال کی عمر میں غزوۂ خندق میں شرکت کی اجازت عطاء ہوئی۔ غزوۂ موتہ کے علاوہ تمام غزوات میں رسول پاک ﷺ کی کمان میں دادِ شجاعت دی۔ غزوۂ موتہ میں وہ اپنے والد حضرت زید ؓ کی کمان میں لڑے تھے۔ غزوۂ حنین میں جم کر لڑے اور پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ اس دوران میں کافی زخمی بھی ہو گئے، حنین کے پہلے حملہ میں جب مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے تو یہ رسولِ پاک ﷺ کے ساتھ ہی رہے۔ اسامہ ؓ شروع ہی سے بڑے بہادر اور دلیر تھے، انہیں آپ ﷺ نے کئی مہموں کی قیادت سونپی اور وہ ان سب میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ وہ رسول پاک ﷺ کے معتمد اور پیارے تھے۔

اپنے وصال سے کچھ پہلے آنحضرت ﷺ نے انہیں روم کے خلاف روانہ کیا، ابھی آپ مدینہ ہی کے آس پاس تھے کہ رسول پاک ﷺ کی علالت کی اطلاع ہوئی، واپس آ گئے اور وصالِ نبی ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر ؓ نے جو پہلا حکم دیا وہ انہی کی روانگی کے بارے میں تھا۔ حرف میں لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور وہیں سے حضرت ابوبکر ؓ نے اسے خدا حافظ کہا اس حال میں کہ اُسامہ ؓ گھوڑے پر سوار اور حضرت ابوبکر ؓ پیدل تھے، اُسامہ ؓ نے عرض کیا کہ یا تو آپ بھی سوار ہوں یا پھر میں بھی اترتا ہوں۔ فرمایا نہ مَیں سوار ہوتا ہوں اور نہ تم اترو، میری خواہش

یہ ہے کہ کچھ دیر کے لیے میرے قدم بھی اللہ کی راہ میں غبار آلود ہو جائیں، اور غازیوں کا ثواب ملے جو ہر قدم کے عوض ساٹھ سو نیکیوں کی صورت میں ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں ان سے اجازت لی کہ چاہیں تو انہیں میرے پاس رہنے دیں۔ اُسامہؓ نے انہیں حضرت ابو بکرؓ کا ساتھ دینے کو کہا۔ حضرت ابو بکرؓ نے لشکر کو اپنی مفید نصیحتوں سے بھی نوازا۔ حضرت اسامہؓ تین ہزار کے لشکر کے ساتھ اس مہم پر روانہ ہو گئے، اور بیس دن کے بعد شمالی موتہ کے علاقہ آبل کے ان لوگوں سے دو دو ہاتھ کیے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف رومیوں کی مدد کی تھی۔ پھر ارضِ فلسطین کے علاقوں بلقاء اور داروم میں رسول پاک ﷺ کی ہدایت کے مطابق ساری کارروائی مکمل کی۔ چالیس یا ستر دنوں کے بعد فاتحانہ طور پر واپسی ہوئی۔ ہر ایک کی زبان پر رسول پاک ﷺ کا یہ فرمان تھا: انہ خلیق للامارۃ. یقیناً یہ قیادت کے اہل ہیں اور ان کے والد زید بھی قیادت کے اہل ہیں۔

پھر حضرت ابو بکرؓ نے انہیں یمامہ میں حضرت خالدؓ کی امداد کے لیے بھیجا وہ ان سے جا ملے اور ان کے ساتھ جنگ یمامہ میں حصہ لیا۔ رسول پاک ﷺ کے بعد بھی اُسامہؓ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرامؓ کی نظر میں برابر محبوب و محترم رہے۔

فتح دمشق کے بعد کچھ عرصہ مزہ اور پھر وادی القریٰ میں رہے، پھر مدینہ واپس آ کر جرف میں مقیم ہوئے اور یہیں 54ھ میں وصال ہوا اور مدینہ میں دفن کیے گئے۔ اس وقت عمر 63 سال تھی۔

جنرل محمود شیت خطاب لکھتے ہیں:

> ''حضرت اسامہؓ نہایت بہادر، شجاع اور بڑے سمجھدار تھے، وہ نہایت ہی متقی اور پارسا تھے۔ دینی امور پر گرفت مضبوط تھی، ان سے لوگ مسائل پوچھتے تھے۔ انہوں نے رسول پاک ﷺ سے 128 حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان میں تمام قائدانہ صفات موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول پاک ﷺ نے انہیں چھوٹی عمر کے باوجود کمان دی تھی۔ وہ پہلے مسلمان سپہ سالار ہیں جنہوں نے رومی شہنشاہیت سے ٹکر لی اور مسلمانوں کو اس سے ٹکرانے کی جرأت دلائی۔ اللہ ان سے راضی ہو۔''

حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ

داستانِ امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی کوئی نہ کوئی حکایت آپ نے بھی ضرور پڑھی یا سُنی ہو گی۔ وہ کتاب افسانوں سے پُر ہے۔ اور اُس کا اکثر بیان مبالغہ آمیز، خلاف فطرت اور خلاف عقل ہے۔ لیکن جناب امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے وہ شجاعانہ کارنامے جو اُن کے اسلام لانے کے بعد ظہور میں آئے اُن کا صحیح بیان تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔ جو مبالغہ، عبارت آرائی اور شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

افسانوی روایت میں مذکور ہے کہ شہنشاہ ایران نوشیرواں نے ایک عجیب خواب دیکھا کہ ایک کوّا مشرق سے آیا۔ جو شہنشاہ کا تاج اپنی چونچ میں لے اُڑا۔ پھر نوشیرواں نے دیکھا کہ مغرب کی جانب سے ایک باز آیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے کوّے کو زیر کر لیا اور اُس سے تاج چھین کر نوشیرواں کو واپس کر دیا۔

نوشیرواں کے وزیر بزرجمہر نے اِس خواب کی تعبیر یہ بیان کی کہ مشرق کی طرف سے غنیم حملہ آور ہو گا جو شاہ ایران کو تاج وتخت سے محروم کرے گا۔ مگر شہر کا ایک بہادر اپنی جوانمردی کی بدولت نوشیرواں کو حکومت واپس دلائے گا۔

لکھا ہے کہ اِس کے بعد بزرجمہر شہر مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ مشرقی لڑکا پیدا ہو چکا ہے۔ پھر دوسرا مغربی لڑکا وزیر کی موجودگی میں پیدا ہوا اور اس کا نام حمزہ رضی اللہ عنہ رکھا گیا۔

سردار مکہ حضرت عبدالمطلب نے وزیر کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ یہ سردار ہاشمی اور قریشی تھے۔ (اور آنحضرت ﷺ کے بزرگ دادا) بزرجمہر نے ہاشمی سردار کو شہنشاہ کی جانب سے گراں قدر تحائف اور انعام و اکرام دیئے اور حمزہ رضی اللہ عنہ کی پرورش و تربیت کا بار بھی حکومت ایران نے اپنے ذمے لیا۔

حمزہ ؓ جوان ہوئے تو ان کی شجاعت کے جوہر کھلنے لگے۔ چنانچہ وہ کشتی وغیرہ میں اپنی عمر سے بڑوں پر بھی غالب آنے لگے۔ اور دیکھنے والے ان کی قوت دیکھ کر عش عش کرنے لگے۔

ایک روز حضرت رسول اللہ ﷺ کوہ صفا کے ایک ٹیلے پر بیٹھے تھے کہ اتنے میں وہاں ابوجہل آ پہنچا اور آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے لگا۔ مگر آنحضرت ﷺ خاموش بیٹھے رہے اور ابوجہل کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت امیر حمزہ ؓ کی ایک لونڈی وہاں موجود تھی۔ اس نے یہ گستاخی دیکھی اور جب شام کو امیر حمزہ ؓ گھر تشریف لائے۔ تو سارا حال اُن سے عرض کیا۔ باوجودیکہ امیر نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن غیرت انسانی نے جوش مارا اور حضور ﷺ کی بے کسی اور مظلومی پر رحم آیا۔ حضرت امیر حمزہ ؓ کو آنحضرت ﷺ کی راست بازی، دیانت داری اور نیک کرداری کا بخوبی علم تھا۔ لونڈی سے یہ سانحہ سُن کر آپ فوراً کعبہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابوجہل اُس وقت قریش کے آدمیوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ امیر حمزہ ؓ نے اُس سے پوچھا کہ تو نے میرے بھتیجے محمد (ﷺ) سے بدزبانی کیوں کی؟ اور اتنا کہہ کر اُس کے سر پر کمان سے ضرب لگائی۔ ابوجہل کے رشتہ دار بھڑک اُٹھے۔ ابوجہل کو امیر ؓ کے زور و قوت کا علم تھا لہٰذا وہ ڈرا کہ معاملہ طول نہ پکڑ جائے اُس نے اپنے حامیوں کو روکا اور کہا کہ حمزہ ؓ کا غصہ بے جا نہیں ہے۔ مَیں نے واقعی اِس کے بھتیجے سے بدسلوکی کی تھی۔

امیر حمزہ ؓ نے اگلے روز آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ میرے نیک بھتیجے! مَیں نے ابوجہل کی گستاخی کا بدلہ اُس کے سر پر کمان مار کر لے لیا ہے اب آپ خوش ہو جائیں۔ مگر رسول کریم ﷺ نے یہ سُن کر فرمایا چچا مَیں اس طرح کی باتوں سے خوش نہیں ہوتا۔ البتہ اگر آپ مشرف بہ اسلام ہو جاتے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہتی۔

رسول خدا ﷺ کے معجزۂ اخلاق سے متاثر ہو کر جنابِ امیر ؓ کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے آپ کی انقلابی جماعت کے رکن بن گئے۔

حضرت امیر حمزہ ؓ کے قبولِ اسلام سے ایک طرف مسلمان پھولے نہ سماتے تھے اور سجدۂ شکر ادا کر رہے تھے تو دوسری طرف کفارِ قریش کے گھروں میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

اَب تک کم و بیش چالیس قریش مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ زید ابن ارقم کے مکان میں تشریف رکھتے تھے۔ اُس وقت مسلمانوں کی جماعت کی تعداد بہت کم تھی۔ اور

مشرک انہیں بہت تنگ کرتے تھے۔امیر حمزہؓ کے مسلمان ہوتے ہی مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔مسلمان اس وقت تک نماز بھی چھپ کر پڑھتے تھے۔امیر حمزہؓ کے اسلام قبول کرنے پر مسلمان نماز اعلانیہ پڑھنے لگے۔لیکن کفار میں مسلمانوں کے خلاف جوش بڑھ گیا حتیٰ کہ انہوں نے تہیہ کرلیا وہ اسلام کو ہی ختم کر دیں گے۔مگر تقدیر الٰہی کون بدل سکا ہے۔

ہجرت

قبیلہ خزرج اور قبیلہ اوس کے ذریعہ اسلام مدینہ میں پہنچ چکا تھا۔جب مسلمانوں کو مکے میں بہت اذیتیں پہنچنے لگیں تو حضور سرورِ عالم (ﷺ) نے مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔چنانچہ بعض مسلمان ہجرت کر کے حبش پہنچ گئے۔یہ اسلام میں پہلی ہجرت تھی۔پھر حضور ﷺ نے بعض صحابہؓ کو مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دی چنانچہ بہت سے صحابہؓ مدینے چلے گئے اُن میں امیر حمزہؓ بھی تھے۔اس کے بعد خود حضور سرورِ کائنات ﷺ نے بھی 622ء میں ہجرت فرما کر مدینہ کو منور فرمایا۔

جنگِ اُحد

مکے کے مشرکوں نے (جن کا سردار ابوسفیان تھا) ۲ھ میں مدینہ منورہ پر چڑھائی کی۔مشرکین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر آئے تھے۔مگر بدر کے مقام پر صرف 313 صحابہ کرامؓ نے انہیں شکست فاش دے دی۔مشرکوں نے اِس شکست کا بدلہ لینے کے لیے ۳ھ (مطابق 665ء) میں مدینے پر حملہ کیا۔ابوسفیان اِس بار بڑی تیاری کر کے آیا تھا اور اس نے حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے والے کے لیے بیش بہا انعام مقرر کیا تھا۔

ابوسفیان کے ساتھ تین ہزار جنگجو تھے۔جن میں سات سو زرہ پوش، دو سو گھڑ سوار اور باقی شُتر سوار تھے۔راستے میں دیگر قبائل بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اس طرح مشرکین کی فوج 5 ہزار تک پہنچ گئی تھی اور اُن کی عورتیں رجز پڑھتی طبل اور دف بجاتی ہوئی آگے آگے آ رہی تھیں۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی ابوسفیان کے ہمراہ تھی۔اور مشتعل کرنے والے گانے گا گا کر مشرکین کے دل بڑھا رہی تھی اور اس نے وحشی نامی غلام کو حضرت امیر حمزہؓ کے قتل پر مامور

کیا تھا۔ مشرکین کی یہ فوج بدھ کے روز مدینہ منورہ کے قریب پہنچ گئی اور وہاں کے کھیتوں اور باغوں کو اُجاڑنے لگی۔

آنحضرت ﷺ صرف سات سو صحابہؓ کے ہمرکاب، ہزار ہا مشرکین کے مقابلہ کے لیے مدینہ منورہ سے باہر نکلے۔ لیکن اِن سات سو میں امیر حمزہ ؓ، حضرت علی ؓ، حضرت عمر ؓ اور حضرت ابوبکر ؓ ایسے شیر دل موجود تھے۔ جن میں سے ہر ایک ہزاروں پر بھاری تھا۔ مقامِ اُحد پر کفر و باطل کا مقابلہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے سات سو جاں نثاروں میں سے دو سو تیر اندازوں کو پہاڑی کے درّے پر مامور فرما کر انہیں حکم دیا کہ تم یہاں سے ہرگز نہ ہٹنا۔ اور حضور ﷺ نے باقی 500 مجاہدین کو لے کر 5 ہزار کفار کے ٹڈی دل سے مقابلہ شروع کیا۔ لشکرِ اسلام میں صرف 2 گھوڑے تھے اور ہتھیار بھی بہت کم تھے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو سب سے پہلے ابو عامر اپنے قبیلے کے ساتھ آگے بڑھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مدینے کے انصار اُس کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ لیکن انصار نے دشمن پر پتھروں کی ایسی بوچھاڑ کی کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے اس کے بعد طلحہ (جو عبدالعزا کا پوتا تھا) اور قریش کا علمبردار تھا آگے بڑھا تو حضرت علی ؓ اُس پر شیر کی طرح جھپٹے اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اب طلحہ کا عَلَم اُس کے بھائی عثمان نے سنبھالا تو اس کے مقابلے کے لیے امیر حمزہ ؓ آگے بڑھے۔ اور انہوں نے عثمان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ بعد ازاں عثمان کے تین بیٹے یکے بعد دیگرے میدان میں نکلے۔ مگر قتل ہو گئے۔ قریش نے یہ حال دیکھا تو گھبرا کر عام ہلہ بول دیا۔ اس وقت حضرت حمزہ ؓ، حضرت علی ؓ، حضرت ابو دجانہ ؓ اور حضرت زبیر ؓ نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کی بقیۃ السیف فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنا بے شمار سامان بھی میدان میں چھوڑ گئی۔

جب دشمن بھاگ نکلے تو مسلمان ہتھیار چھوڑ کر مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ حتیٰ کہ 200 جوانوں کا وہ دستہ بھی جسے رسول خدا ﷺ نے پہاڑی کے درّے کی حفاظت پر متعین فرمایا تھا اِس عمل میں شامل ہو گیا۔ خالد بن ولید (جو ابھی مشرک ہی تھے) نے اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنے 200 سپاہیوں کے ساتھ پہاڑی کے اُسی خالی مورچے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین بے ہتھیار تھے۔ علاوہ ازیں مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف تھے۔ اِس اچانک حملے سے مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ مشرکین نے صحابہ کرامؓ کو گھیر لیا۔ اِسی اثناء میں وحشی کا داؤں چل

گیا۔ چنانچہ اُس نے نیزہ کا ایک بھرپور ہاتھ مار کر حضرت حمزہ ؓ کو شہید کر دیا۔ اور آپ کا جسدِ مبارک اُٹھا کر ہندہ (ابوسفیان کی بیوی) کے پاس لے گیا۔ تاکہ انعام حاصل کرے۔

اِس جنگ میں حضور اکرم ﷺ بھی مجروح ہو کر ایک غار میں گرے۔ جس سے مغفر کی کڑیاں رُخسارِ مبارک میں پیوست ہو گئیں اور حضور ﷺ کا ایک دانت شہید ہو گیا۔ دشمنوں نے سمجھا کہ خدانخواستہ حضور ﷺ شہید ہو گئے لہٰذا وہ فتح کے نعرے لگانے لگے۔ حضرت علی ؓ اور بعض دیگر صحابہ ؓ حضور ﷺ کے پاس موجود تھے۔ حضرت علی ؓ نے حضور ﷺ کو اُٹھایا۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ نے آپ ﷺ کے رُخساروں سے خود (لوہے کی ٹوپی) کی کڑیاں اپنے دانتوں سے کھینچ کھینچ کر نکالیں۔

ظاہر ہے کہ یہ فتح ان 200 جوانوں کی غلطی سے شکست میں تبدیل ہو گئی۔ جنہیں حضور ﷺ نے درّے پر متعین فرمایا تھا۔ اِس جنگ میں امیر حمزہ ؓ اور کئی مقتدر صحابہ کرام ؓ شہید ہوئے۔ مشرکین نے حضرت حمزہ ؓ کی نعش سے نہایت وحشیانہ سلوک کیا۔ ہندہ نے دل اور جگر نکال کر دانتوں سے چبایا اور کان، ناک اور گوشت کے ٹکڑے دھاگوں میں پرو کر ان کے ہار بنائے۔ اور انہیں زیور کی طرح پہن کر پھرنے لگی۔ اور بعض دیگر صحابہ ؓ کی نعشوں کی بھی اِسی طرح بے حرمتی کی گئی۔

حضور انور ﷺ اور صحابہ کبائر ؓ نے مشرکین کے یہ ہولناک اور وحشیانہ مظالم سہے مگر اسلام کے نوخیز پودے کو اپنے خون سے سینچا۔

حضرت امیر ؓ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ مسلمان ہونے سے پہلے ان کی عادت تھی کہ علی الصبح باہر نکل جاتے۔ اور سارا سارا دن شکار کھیلتے رہتے اور جب شام کو واپس آتے تو پہلے کعبے کا طواف کرتے، یار دوستوں سے ملتے اور پھر گھر آتے۔

حضرت حمزہ ؓ اگرچہ شروع میں ایمان نہیں لائے۔ مگر انہوں نے طبیعت نیک پائی تھی۔ اِس لیے حضور ﷺ سے محبت تھی۔ شجاعت میں مشہور تھے۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت کے بہادروں میں آپ کا بہت ذکر آتا ہے۔ اِسلام قبول کرنے کے بعد بھی آپ نے ہر موقع پر دادِ شجاعت دی اور آخر کار جنگِ اُحد میں اِسلام پر قربان ہو گئے۔

❁ .... ❁ .... ❁

13

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں ایسی صفات تھیں کہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں مگر آپ میدانِ مقابلہ و مقاتلہ کے مردِ میدان نہیں تھے لہٰذا اپنی رعایا کے ساتھ شدت کا برتاؤ نہیں کرتے تھے کیونکہ آپ بہت بردبار تھے۔ باوجودیکہ آپ کسی کا خون بہانا پسند نہیں کرتے تھے مگر پھر بھی مرتدوں کے ساتھ قتل وقتال میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ یہ مشہور ہے کہ مسیلمہ کذاب کو آپ ہی نے قتل کیا تھا۔ اپنے بھائی یزید بن ابی سفیان کے ساتھ فینیقیا اور اُردن کو فتح کیا اور اس بحری بیڑے کی قیادت کی جو فتح قبرص کے لیے شام سے روانہ ہوا تھا۔ اس سے پیشتر مسلمان بحیرۂ روم میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے قبرص کی جنگ کی درخواست کی مگر انہوں نے اجازت نہ دی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ کو لکھا کہ قبرص ہم سے قریب ہے اور اس کی فتح آسان ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ اگر آپ اپنی بیوی کے ساتھ سمندر کا سفر کریں تو آپ کو اجازت ہے ورنہ نہیں۔ لہٰذا معاویہ رضی اللہ عنہ سمندر میں عکا سے سوار ہوئے۔ آپ کے ساتھ بہت ساری کشتیاں تھیں، رفیقِ سفر فاختہ بنتِ قرظہ آپ کی بیوی بھی تھی۔

جب مسلمان وہاں پہنچے تو وہاں کے حاکم نے صلح کا پیغام بھیجا۔ تمام باشندے آپ کے فرماں بردار ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اُن سے سات ہزار دو سو دینار سالانہ پر صلح کر لی اور بازنطینیوں نے بھی اتنی ہی مقدار پر صلح کر لی۔ یہ دونوں قومیں خراج دیتی رہیں مگر انہوں نے یہ شرط لگائی کہ مسلمان انہیں اس امر سے نہیں روکیں گے کہ وہ زیرِ صلح روم کو بھی بھیجتے رہیں۔

مجاہدین کے ساتھ جو شرائط انہوں نے کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اگر کوئی ہم پر حملہ کرے تو مسلمان ہماری طرف سے مدافعت نہیں کریں گے اور یہ کہ وہ مسلمانوں کو روم کی طرف سے ادھر آنے دیں گے لہٰذا جب کبھی اموی سمندر کا سفر کرتے تو اہلِ قبرص انہیں کچھ نہ کہتے، نہ ان کی مدد کرتے اور نہ اُن کے خلاف کسی کی مدد کرتے۔

جب 32ھ (652ء) آیا تو انہوں نے سمندری لڑائی میں رومیوں کا ساتھ دیا۔ انہیں کشتیاں دیں اور شرائط کا پاس لحاظ نہ کیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے (33ھ 653ء) میں ان سے جنگ کی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پانچ سو کشتیاں تھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اموی بحری بیڑہ کتنا بڑا تھا، آپ نے قبرص کو بزورِ شمشیر فتح کر لیا، لڑنے والوں کو قتل کیا اور قید کیا پھر انہیں صلح پر برقرار رکھا۔

بلاذری لکھتا ہے، ''آپ رضی اللہ عنہ نے اہلِ قبرص کی طرف بارہ ہزار لوگ بھیجے جو آپ کے دفاتر میں ملازم تھے۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر مسجدیں بنوائیں اور ایک گروہ بعلبک سے ادھر چلا گیا اور ایک شہر آباد کیا۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح بہادر سپاہی نہیں تھے۔ مگر اول درجہ کے منتظم جنگ تھے۔ چنانچہ سوریا کا لشکر اسلامی لشکروں میں قوت و انتظام کے اعتبار سے سب سے بڑا تھا۔ عراقیوں نے جنگِ صفین میں آپ کے لشکر کو دیکھا تو تعجب کیا اور ایک عراقی نے کہا۔

کیا تم دیکھتے نہیں کہ شامی کتنے اچھے ساز و سامان والے ہیں اور ہم کیسے بدحال ہیں۔ پھر یہ کہ شامی لشکر میں سے جو بھی جنگِ صفین پر گیا اس نے اس پامردی سے جنگ کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مجبور ہو گئے کہ اپنے لشکر میں زندگی کی لہر دوڑائیں چنانچہ آپ نے فرمایا۔

''ان کے صبر و استقلال سے ڈرنا نہیں کیونکہ قسم بخدا ان میں حمیتِ عربیہ صرف اپنے مرکز و علم کی حد تک ہے۔''

سوریا لشکر چونکہ بلاد بازنطیہ سے جنگ آزما رہتا تھا لہٰذا ان میں حرکت و مشقِ قتال پائی جاتی تھی۔ مگر بغاوتوں کے فرد کرنے کے لیے صوبہ جات کے لشکر ہی کام آتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے شامی لشکر کو صوبہ جاتی لشکر سے علیحدہ ہی رکھتے تھے شاید اس لیے کہ یہی لوگ تو ان

کی حکومت کی بنیاد تھے۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ دوسروں سے مل کر اپنے اصلی اوصاف کو نہ کھو بیٹھیں۔ حضرت امیر معاویہ ؓ باغیوں کے سرغنوں کو بہت کچھ زر کثیر خرچ کر کے خرید لیا کرتے تھے تاکہ امن وسلامتی کا دورہ دورہ رہے اور آپ کا مخلص لشکر صحیح وسالم رہے۔

اگر ہم عراقی اور شامی لشکر میں تقابل کریں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اول الذکر پر مہمات میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ان میں تمرد وسرکشی زیادہ تھی۔ چنانچہ حضرت علی ؓ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ معاویہ اکھڑ جاہلوں کو بلاتا ہے تو وہ بغیر عطیہ اور داد و دہش کے اس کا اتباع کرتے ہیں اور سال میں دو تین بار جدھر چاہے ادھر انہیں لے جاتا ہے اور مَیں تمہیں بلاتا ہوں حالانکہ تم لوگ عقلمند ہو اور عطیات پاتے رہتے ہو مگر تم میری نافرمانی کرتے ہو، میرے خلاف کھڑے ہو جاتے ہو اور میری مخالفت کرتے ہو۔''

اہلِ شام کی اطاعت وفرماں برداری پر ابنِ طفیل کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے، ''اے معاویہ ؓ آپ شام میں تھے تو سب آپ کے فرماں بردار تھے۔'' اور قیس بن ہیثم نے اہلِ عراق سے خطاب کرتے ہوئے کہا وہ بھی اس امر پر دلیل ہے کہ شامی بہت زیادہ اطاعت پذیر تھے، ''مَیں نے اہلِ شام کو دیکھا کہ وہ سردارِ شام کی بات خوشی خوشی مانتے ہیں اور ہم لوگ موسمِ گرما کے غزوات میں ہوتے ہیں اور ایک کے پاس ہزار اونٹ ہوتے ہیں مگر شامیوں کے سردار کے پاس صرف ایک گھوڑا ہوتا ہے بلکہ ایک آدمی وہ اور پیچھے بٹھا لیتا ہے۔''

حجاج نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ وہ کہتا ہے، ''اہلِ عراق اہلِ شقاق ہیں۔''

معاویہ ؓ جانتے تھے کہ لشکر کے دلوں کو کیسے موہنا چاہیے، انہوں نے لوگوں کو معمولی وظائف دینے کے علاوہ اور دو چند سہ چند دیا، درآنحالیکہ زیاد اور مغیرہ کے زمانے میں عراقی لشکر کو وظائف بھی پابندی سے نہیں دیئے جاتے تھے اور اگر دیئے جاتے تھے تو بہت تھوڑے، انہوں نے اپنی قوم میں سے ہر فرد کے لیے دو دو ہزار درہم مقرر کر رکھے تھے اور اگر کوئی مر جاتا تو اس کے چچا زاد کو جنگ کے دوران میں اسی قدر رقم ملتی رہتی۔

حضرت عمر بن الخطاب ؓ نے اشراف کے لیے جو رقم مقرر کی تھی یہ رقم اس کے مماثل تھی۔ علاوہ بریں جب کبھی حضرت معاویہ ؓ کسی لشکری میں حسنِ خدمت کا جذبہ دیکھتے تو

اسے اور زیادہ دیتے اور جو بھی لشکر فتوحات کے لیے روانہ ہوتا آپ انہیں اموال دیتے اور ان کے گھر والوں کی خبر گیری کرتے اور ان کی تعزیت داری کرتے۔ جب رودس اور دوسرے شہر فتح ہوئے تو آپ نے ایسا ہی کیا۔ رودس پر جنادہ بن ابی اُمیہ ازدی نے چڑھائی کی تھی جو حدیث کے راویوں سے ہیں حضرت معاویہ ﷛ نے آپ سے کہا تھا کہ رودس میں کچھ مسلمانوں کو آباد کر دیں۔ یہ واقعہ 52ھ م 672ء کا ہے۔

رودس بڑا سرسبز و شاداب جزیرہ ہے۔ زیتون، انگور، پھل اور شیریں پانی کی بہتات ہے۔ حضرت معاویہ ﷛ اپنے اس لشکر کو عطیات بھیجتے رہتے تھے۔ رومی ان سے بہت خائف ہو گئے تھے۔ پھر یزید نے ان لوگوں کو اپنے پاس بلوالیا تھا اس بحری قائد کے ہاتھوں جزیرہ اردیٰ بھی فتح ہوا۔ یہ قسطنطنیہ کے قریب واقع ہے اس کی فتح 54ھ م 673ء میں ہوئی اور کریت پر بھی آپ نے چڑھائی کی جسے مؤرخینِ عرب باقریطش کہتے ہیں۔

معاویہ ﷛ کے لوگوں میں بحری جنگ کا ماہر صرف ایک جنادہ بن ابی اُمیہ ہی نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے، جیسے معاویہ بن خدیج کندی جس نے صقلیہ پر جنگ کی تھی، اور عبداللہ بن قیس بن مخلد، جس نے اس جزیرے کے لوگوں کو قید کیا تھا اور سونے چاندی کے بُت اٹھا لیے تھے، جن پر جواہرات کے تاج تھے۔ یہ بت بعدازاں ہندوستان فروخت کے لیے بھیج دیئے گئے تھے۔ فتوحاتِ امویہ بحر و بر میں پھیل گئی تھیں۔ حبیب بن مسلمہ حضرت معاویہ ﷛ کے زمانہ خلافت میں ارمینیا کی طرف گیا پھر قالقیلا آیا۔ وہاں پڑاؤ کیا، وہاں کے باشندے لڑنے کے لیے بڑھے، وہ ان سے لڑا، حتیٰ کہ وہ شہر بند ہو گئے، پھر انہوں نے جلاوطنی اور جزیہ پر صلح کر لی تو بہت سے لوگ جلاوطن کر دیئے گئے اور وہ بلادِ روم میں داخل ہو گئے۔

بلاذری کی روایت ہے کہ حضرت معاویہ ﷛ نے دو ہزار آدمی قالقیلا کی سکونت کے لیے بھیجے اور انہیں بہت سی جاگیریں دیں اور سرحد کا نگہبان بنایا۔

فاتحین بنواُمیہ اپنی لڑائیوں میں لوگوں کے ساتھ بہت نرمی کا برتاؤ کرتے تھے جیسا کہ صلح نامہ دبیل (ارمینیا) سے واضح ہوتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ دستاویز حبیب بن مسلمہ کی طرف سے دبیل کے نصاریٰ مجوس، یہودی، حاضر و غائب ہر ایک کے لیے ہے۔ مَیں نے تمہاری جانوں، مالوں، کنیسوں،

گرجوں، شہر پناہوں کو امان دی۔ تم مامون ہو۔ ہمارے ذمہ عہد کی پابندی ہے۔ جب تک کہ تم لوگ وفا کرو اور جزیہ وخراج دو۔ اللہ گواہ ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔ حبیب بن مسلمہ نے مہر لگائی۔"

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر شمال میں قسطنطنیہ تک جا پہنچے تھے۔ جبکہ آپ نے بلادِ روم (اناضول) کی طرف ایک بڑا بھاری لشکر بھیجا تھا اور سفیان بن عوف کو سپہ سالار بنایا تھا اور اپنے بیٹے یزید کو اس کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ مسلمان ایک دن بازنطینیوں سے لڑے مگر لشکر میں بھوک اور بیماری کا دور دورہ ہوگیا۔ لہٰذا واپس چلے آئے۔ یہاں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور شہر پناہ کے قریب دفن کر دیئے گئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے افریقہ میں بھی اپنا اچھا اثر چھوڑا کیونکہ آپ کے گورنر نے دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ ادھر حملہ کیا تھا اور اسلام کی بنیاد ڈالی۔ یہاں کے قیروان کو چھاؤنی بنایا اور اسے بربری لشکر کے لیے جائے پناہ ٹھہرایا۔ یہی وہ مرکز ہے جہاں سے اہلِ عرب نے جہاد کیا اور پھر ان سے ایک جرار لشکر تیار کیا جو فتوحات ہسپانیہ میں کام آیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت جانبِ غرب میں قیروان تک اور جانب شرق میں ہندوسندھ تک پھیلی۔ ہندوسندھ کی فتوحات میں جن سپہ سالاروں نے حصہ لیا۔ ان میں مہلب بن ابی صفرہ، عبداللہ بن سوار، راشد بن عمرو الجدیدی اور دیگر سپہ سالار شریک تھے۔

اگر ہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکومت وسلوک پر غور کریں گے تو ہمیں آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ اتنی دُور دُور کی حکومتوں پر کس طرح کنٹرول کرتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کرسی عدالت پر بیٹھتے تو کمزور، بدو، بچے، عورتیں اور جس کا کوئی بھی وارث نہ ہوتا آتے اور کہتے مجھ پر ظلم کیا گیا ہے تو آپ فرماتے اس کی عزت کرو۔ کوئی کہتا مجھ پر دست درازی کی گئی ہے تو آپ فرماتے اس کی مدد کے لیے بھیجو اور کوئی کہتا میرے ساتھ زیادتی ہوئی تو فرماتے اس کے معاملے میں غور کرو۔

جب آپ سردارانِ قبائل اور اشراف کے ساتھ بیٹھتے اور معاملات پیش کیے جاتے تو بس اسی قسم کے جملے فرماتے کہ فلاں کو دے دو۔ ان سے معاہدہ کرو، انہیں دو، ان کی ضروریات پوری کرو، ان کی خدمت کرو۔ اسی لیے کسی نے آپ کا بُرا نہیں چاہا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے زیرک، عقلمند اور دانا تھے۔ رات کے ایک تہائی حصے تک اخبارِ عرب، ایام عرب و عجم، ملوک عجم، ان کی سیاست، تمام دنیا کے بادشاہوں کی لڑائیوں، مکاریوں اور پچھلی امتوں کے حالات وغیرہ کا مطالعہ کرتے۔

آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایسی کتابیں پڑھی جایا کرتی تھیں جن میں بادشاہوں کے سوانح، عادات و حالات ہوتے، کچھ لڑکے اس خدمت پر متعین تھے، وہ پڑھتے اور آپ سنتے۔ اس طرح ہر رات سیر، آثار و سیاست سے آپ کو نئی نئی باتیں معلوم ہوتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تاریخ اسلام میں ایک درخشاں شخصیت کے مالک تھے، کیونکہ آپ ایک حکومت کے بانی تھے، بہت سے امراء، خلفاء، شجاعت، زہد اور علوم کی سرپرستی میں آپ سے فائق ہوئے ہیں مگر وہ بات اُن کو میسر نہ ہوئی جو معاویہ کو حاصل تھی۔ یہ وہ شخص ہے جس نے حکومتوں کی تربیت کی، امتوں کی قیادت کی اور ملکوں کی نگہبانی کی۔

اگر ہم ان بنیادوں اور ان تقلیدوں کا مطالعہ کریں جن پر ابتداء سے دولتِ عربیہ کی بنیاد رکھی گئی تھی تو ہم انہیں فاسد پاتے ہیں کیونکہ ایک بڑی تحریک کیسے کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ اس کے وسائل ناقص ہوں۔ ہاں حکومتوں کی تاسیس اور ان کا انتظام شہروں کے امن، مملکت کے عناصر میں اتحاد اور فاتح و مفتوح میں باہمی مفاہمت چاہتا ہے۔ اگر ہم ان شرائط کا حکومتِ معاد میں کھوج لگائیں جب کہ وہ شروع شروع میں مسندِ شاہی پر بیٹھے تو ہمیں یہ چیزیں نہیں ملتیں اور مل بھی کیسے سکتی ہیں جب کہ یہ باتیں تب ہی ہو سکتی تھیں کہ وہ قبائل کو مٹا دیتے، قدیم قوانین کو اڑا دیتے اور تفاخر و انتقام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جب اس حالت کا اندازہ لگاتے ہیں جس پر اہلِ عرب تھے پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ ایک اچھے منتظم اور عمدہ لیڈر ہیں کہ سب کو اپنے ساتھ فتوحاتِ امم کے لیے چلتے ہیں۔ ان امتوں پر فتوحات کے لیے جو تہذیب و تمدن میں اُن سے بہت آگے ہیں اور شہریت و عمران میں اُن سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں تو ہمیں آپ کی طاقت پر تعجب ہوتا ہے اور ہمیں ان کے احترام کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ وسائل جن سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حالات کا مداوا کیا اور انہیں عالمِ وجود کی طرف لائے، ان امراض کی نسبت بہت ہی کم تھے جو امت میں پھیلے ہوئے تھے ان تمام باتوں کے باوجود مؤرخین عرب نے اُن کو اُن کا صحیح مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق

تھے۔ بالخصوص شیعہ حضرات نے، اور یہ بات بنا بر تعصب کے ہوئی۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جیسا کہ لامنس کہتا ہے، دولتِ اسلامیہ کا دوسرا موسسِ کبیر ہے۔ اس لیے کہ آپ نے عادات وتقالیدِ عرب، اور آیاتِ قرآنی سے ایک بلند پایہ حقیقی سیاسی حکومت قائم کردی کہ جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی حکومت کی طرح صوفیانہ حکومت نہیں تھی، آپ نے تمام عالمِ اسلام کی نظریں دمشق کی جانب پھیر دیں اور اس کو دار الخلافہ بنا کر مرکزِ جاذبیت بنا دیا۔ فتوحاتِ اسلامیہ دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ صرف اس لیے ہوا کہ اہلِ عرب اپنے دشمنوں کے مقابلے میں جنگی مہارت زیادہ رکھتے تھے لیکن اہلِ عرب کو ملانا یہ کام امیر معاویہ کی اقتصادی تدابیر ہی کا تھا۔ یہ نوجوان جو اپنے مشہور تاجر باپ کی گود میں پرورش پاتا ہے، کی قوتِ مملکت پر یہ واضح دلیل ہے کہ حکومتِ اسلامیہ کے قائم کرنے، عراق کے خلفاء کو دور کرنے، چوری، قتل اور آگ لگانے کی روک تھام میں جو مشکلات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیش آئیں آپ نے خوبی کے ساتھ ان پر کنٹرول کیا۔ حالانکہ اہلِ بصرہ وکوفہ ان چیزوں کے عادی تھے۔ اگر امویوں کی مہارت اور ان کے حاکموں یعنی زیاد بن ابیہ، عبید اللہ بن زیاد، حجاج بن یوسف اور خالد القسری کی پختہ کاری نہ ہوتی تو ان اطراف میں ان کی حکومت کے جھنڈے لہراتے نظر نہ آتے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان پر ہیجان قبائل سے ایک قومی لشکر مرتب کیا جس سے داخلی خلفشار دُور ہو گیا اور بیرونی جہاد بھی خوب ہوا اور بدو قریشیوں کا مرتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ وہ لوگ امیر البحر بنے جب کہ حکومتِ امویہ سمندروں کی رانی قرار پائی اور اس نے اپنی سطوت سے بازنطینیوں کے دار الحکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے خلفاء نے قدیم قواعد وقوانین اور تقالید ورسومات کو مانجھا اور جہاں کہیں کہ اُن کے جھنڈے لہراتے تھے انہیں روحِ بلاد کے مناسب بنایا، پھر انہوں نے شوریٰ کا خاتمہ کر دیا جو ان کے زمانہ میں مرکزِ اضطراب واختلال تھا۔

اموی، حیاتِ اسلامیہ میں ایک قومی رکن کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے خلفاء اس حقارت کے مستحق ہیں جس کے بارے میں مسلمان مؤرخین کبھی بخل نہیں کرتے حالانکہ ان لوگوں میں اسلام کے بڑے بڑے کار پرداز ہو گزرے ہیں؟

حضرت جعفر طیارؓ رضی اللہ عنہ

حضرت جعفرؓ آنحضرت ﷺ کے چچا ابو طالب کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے بھائی تھے۔ جب کفار مکہ نے مسلمانوں کی جماعت پر بہت زیادہ سختیاں شروع کیں۔ تو آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو حبشہ کی طرف ہجرت کی راہنمائی فرمائی۔ کافروں نے سمندر کے کنارے تک اِن مسلمانوں کا پیچھا کیا۔ لیکن یہ مسلمان جہاز میں بیٹھ کر بحیرۂ قلزم کو پار کر گئے اور حبشہ پہنچ گئے۔ اِس زمانے میں وہاں نجاشی بادشاہ حکمران تھا۔ مکہ کے قریش اس کے پاس وفد لے کر گئے۔ اور اُسے کہا کہ ہمارے چند مجرم آپ کے ملک میں آئے ہیں۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو۔ نجاشی نے انہیں دربار عام میں پیش ہونے کا حکم دیا۔ اور اُدھر مسلمانوں کو بھی عام دربار میں بلوالیا۔

اگلے روز قریش کا وفد اور مہاجر مسلمان نجاشی کے دربار میں آمنے سامنے ہوئے۔ قریش کا دعویٰ سننے کے بعد مہاجرین کی طرف سے حضرت جعفر طیارؓ جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپؓ نے فرمایا:

”اے بادشاہ ہم جاہل اور گمراہ تھے۔ بُت پوجتے، مردار کھاتے، بدکاریاں کرتے، لڑکیوں کو زندہ دفن کرتے تھے۔ ہمسایوں پر سختیاں کر کے کمزوروں کا مال کھا جاتے تھے۔ جُوا، شراب خوری، زنا، لہو ولعب ہماری جبلت میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک عرصے سے ہماری یہی حالت تھی۔ مگر خدا نے ہمارے پاس ایک پیغمبر بھیجا۔ جس کا خاندان عالی ہے۔ جو راستباز، ایمان دار اور پاک دامن ہے۔ اس کی ان خوبیوں سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ اُس نے ہمیں ایک خدا کی طرف بلایا۔ اور بتایا کہ ہم اسی کی عبادت کریں۔ بُتوں اور پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں۔

چنانچہ اس تعلیم سے ہم تمام بُری باتیں چھوڑ کر راستباز اور ایمان دار بن گئے۔ قریش نے ہمیں اس دین میں داخل ہونے سے روکا۔ ہم نہ رُکے تو ہم پر طرح طرح کی سختیاں کیں اور جب سختیوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رہی تو ہم اپنا گھر بار چھوڑ کر آپ کے ملک میں آ گئے تا کہ ہم پر ظلم وستم نہ ہو۔"

شاہ نجاشی کے دل پر حضرت جعفرؓ کی اس تقریر کا اس قدر اثر ہوا۔ کہ اُس نے حضرت جعفرؓ سے قرآن مجید سنانے کی خواہش کی۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی تلاوت فرمائی۔ اللہ کا کلام سُن کر بادشاہ اور اس کے درباریوں کے دل ایسے نرم ہوئے کہ وہ رونے لگے۔ اور بے اختیار چلا اُٹھے کہ بے شک یہ کلامِ الٰہی ہے اور اُسی کا کلام ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت نازل کی۔ بے شک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور بے شک وہ وہی نبی ﷺ ہیں جن کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بادشاہ نے حضرت جعفرؓ سے کہا "اگر بادشاہی کا بوجھ میرے ذمہ نہ ہوتا تو مَیں ضرور محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اور آپ ﷺ کی جوتیاں اُٹھاتا۔ یہ کہہ کر نجاشی نے قریش کے وفد کو دربار سے نکال دیا۔ اور مسلمانوں کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دے دی۔

عرب کی سرحدوں پر جن قوموں کا قبضہ تھا۔ ان میں سے کچھ قیصرِ روم کے ماتحت تھیں اور کچھ کسریٰ (شاہِ ایران) کے ماتحت۔ یہ لوگ سرحدوں پر ہمیشہ لُوٹ مار کرتے تھے۔ ان کی لُوٹ مار کی وجہ سے عرب کا امن ہمیشہ خطرہ میں رہتا تھا۔ چونکہ یہ قومیں دنیا کی دو بڑی عظیم سلطنتوں کے ماتحت تھیں۔ اس لیے ان قوموں کی مخالفت کرنا بہت مشکل تھا۔ مگر آنحضرت ﷺ کو خداوند کریم نے فتح کی بشارتیں دی تھیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے عرب کی ان سرکش اور فسادی قوموں کو زیر کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے 8ھ بمطابق 629ء میں صرف تین ہزار صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت حضرت زیدؓ کے ہمراہ بھیجی۔ اور اُن کو ہدایت فرمائی کہ پہلے سرحدی قوموں کے سامنے قرآن پیش کریں اور انہیں اسلام کی خوبیاں بتائیں۔ اگر وہ ایمان لے آئیں تو پھر اُن سے کوئی تعرض نہ کریں اور انہیں اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی ہدایت کریں۔ اور اگر وہ ایمان نہ لائیں اور جنگ پر آمادہ ہوں تو پھر اُن سے جنگ کی جائے۔ نیز فرمایا کہ جب جنگ میں حضرت زیدؓ شہید ہو جائیں۔ تو حضرت جعفرؓ کو اپنا سپہ سالار بنائیں جب وہ بھی شہید ہو

جائیں تو عبداللہ بن رواحہ ؓ کو سردار مقرر کیا جائے۔ انہیں بھی شہادت نصیب ہو تو پھر عام مشورے سے کسی کو امیر چُن لیا جائے۔

حضرت زید ؓ کے ہمراہ جب تین ہزار صحابہ ؓ کی یہ قلیل جماعت روانہ ہوئی۔ تو سرحدی اقوام نے فوراً جنگ کی تیاری شروع کر دی اور ایک لاکھ کے قریب فوج جمع کر لی۔ لیکن صحابہ کرام ؓ کی فوج صرف تین ہزار تھی۔

جب اسلامی فوجیں بڑھتی ہوئی بلقاس پہنچیں۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ مقابلے میں افواج کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود ہے۔ اِس لیے مسلمانوں نے پیچھے ہٹ کر موتہ کے مقام پر ڈیرہ ڈالا۔ اور صرف اللہ کی امداد کے بھروسہ پر آمادۂ جنگ ہوئے۔ رومی فوجیں زرق برق وردیوں اور ہتھیاروں سے آراستہ سمندر کی موجوں کی طرح مسلمانوں کی طرف بڑھیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا حضرت زید ؓ کمال بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اِن کے بعد حضرت جعفر ؓ نے فوراً علَم سنبھالا اور گھوڑا بڑھا کر میدان میں نکل آئے۔ آپ بڑی بہادری اور جانبازی سے لڑ رہے تھے کہ آپ کا داہنا ہاتھ تلوار کی ایک ضرب سے کٹ گیا۔ آپ نے علَم فوراً بائیں ہاتھ میں لے لیا اور جب بایاں ہاتھ بھی لڑتے لڑتے کٹ گیا۔ تو آپ نے علَم کو دونوں بازوؤں میں لے لیا اور زخمی شیر کی طرح برابر لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک شقی ازلی نے تلوار کے ایک وار سے آپ کا سرِ مبارک جسمِ اطہر سے جُدا کر دیا۔ فوراً عبداللہ بن رواحہ ؓ نے علَم ہاتھ میں لے لیا۔ اور جب آپ بھی شہید ہو گئے تو عام مشورہ سے حضرت خالد بن ولید ؓ کو سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ خالد ؓ اِس جوش اور ولولے سے لڑے کہ رومیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ (حضرت خالد بن ولید ؓ کے کارنامے ان کے عنوان کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں) ایک لاکھ کا ٹڈی دل میدان سے بھاگ نکلا۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور یہ فتح آئندہ فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اگلے روز شہدا کو وہیں دفن کر دیا گیا۔ حضرت جعفر ؓ کی نعش مدینے بھیج دی گئی۔ آپ نے بے شمار زخم کھائے تھے مگر پشت پر کوئی زخم نہ تھا۔

جب میدانِ جنگ میں حضرت جعفر ؓ کے دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے اور انہوں نے اپنے بازوؤں میں علَم تھام لیا تھا۔ اس وقت آپ اُڑنے والے پرندہ سے مشابہ تھے۔ اِس لیے لوگوں نے آپ کو جعفر طیار ؓ (اُڑنے والا جعفر) کا خطاب دیا۔

غرض جنگ موتہ میں حضرت زید ؓ، حضرت جعفر طیار ؓ اور عبداللہ بن رواحہ ؓ کی شہادت کے بعد تین ہزار صحابہ کرام ؓ نے ایک لاکھ رومیوں پر فتح پائی۔

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

حضرت جعفر طیار ؓ نہ صرف ایک عظیم جرنیل بلکہ اعلیٰ درجے کے خطیب اور مقرر بھی تھے۔ بادشاہ نجاشی کے دربار میں انہوں نے کمال فصاحت و بلاغت کے ساتھ تقریر کی تھی۔ یہاں تک کہ بادشاہ اور اس کا سارا دربار اسلام کی خوبیوں اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا قائل ہو گیا۔ اور آپ کے زورِ تقریر کے مقابلے میں مکہ کے مشرکین کا کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا۔

حضرت جعفر ؓ کٹے ہوئے بازوؤں میں علَم کو تھامے ہوئے ظالم فوجوں کی سرکوبی میں مصروف رہے۔ حضرت جعفر ؓ کا یہ کارنامہ ہی ایسا ہے جو دنیا کی جنگی تاریخ میں ایک انوکھا واقعہ ہے کیونکہ کوئی سپہ سالار اور جرنیل دونوں ہاتھوں کے کٹ جانے کے بعد مد مقابل فوجوں کے سامنے ٹھہرتا ہوا نظر نہیں آتا لیکن حضرت جعفر ؓ ہاتھ کٹ جانے کے بعد بھی جوہر شجاعت دکھاتے ہیں اور دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے اس عظیم جرنیل کی یہ روایت دنیا کی جنگی تاریخ میں ایک روشن مثال کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

❁..........❁..........❁

15

حضرت الحارث بن یزید العامری رضی اللہ عنہ

الحارث بن یزید العامری رضی اللہ عنہ صحابی رسول تھے۔ تاریخ میں ان کے ابتدائی حالات اور اسلام قبول کرنے کی صحیح تاریخ مذکور نہیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ذریعہ معلوم ہوا کہ دجلہ وفرات کے درمیانی علاقہ الجزیرہ کے لوگوں نے اہلِ حمص کے خلاف ہرقل کی مدد کی ہے اور اہل ہیت کی طرف ایک لشکر بھی روانہ کیا ہے تو انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ عمر بن مالک کی قیادت میں ان کے خلاف ایک لشکر بھجیں جس کے ہراول دستے میں الحارث بن یزید العامری ہوں۔" اس حکم کی تعمیل میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر روانہ کیا جب عمر بن مالک کو یہ معلوم ہوا کہ "اہلِ ہیت" نے خندق کھود کر اپنے علاقہ کا دفاع کر رکھا ہے تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آدھی فوج تو ہیت کا حصار توڑنے کے لیے یہاں رکھی جائے اور بقیہ آدھی فوج کے ساتھ وہ قرقیسیاء پر قبضہ کرلیں، اہل ہیت کے مقابلہ کے لیے جو فوج چھوڑی گئی اس کے کمانڈر الحارث بن یزید العامری رضی اللہ عنہ تھے۔

"عمر بن مالک نے قرقیسیاء پر قبضہ کرلیا اور الحارث کو لکھا کہ اگر اہلِ ہیت باہر نہیں نکلتے تو ان کے مقابلہ کے لیے متوازن خندق کا انتظام کریں۔"

اس پر الحارث رضی اللہ عنہ نے اہلِ ہیت کو پیغام بھیجا کہ وہ ہیت کی فتح تک اس محاصرہ کو برابر جاری رکھیں گے اور ہیت کا دفاع کرنے والوں میں سے جو لوگ اپنے گھروں کو واپس جانا چاہیں گے انہیں امان دے دی جائے گی۔ اہلِ ہیت کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ یہ محاصرہ تو ان کی موت تک ختم ہونے والا نہیں، اور ہیت شہر مسلمانوں کے حوالہ کر کے جان بچا کر نکل جانے کا یہ ایک سنہری موقع ہے تو انہوں نے الحارث رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ وہ شہر چھوڑ کر اپنے شہروں کو واپس

جانا چاہتے ہیں۔اس پر الحارث ﷛ ہیت میں داخل ہو گئے اور ہیت کو اسلامی شہروں میں شامل کر دیا۔

''جنرل محمود شیت خطاب لکھتے ہیں کہ:

''الحارث بن یزید ﷛ بڑے دین دار، سخی، مہمان نواز، جری، شجاع اور بڑے ہی مضبوط عقیدہ کے مالک تھے۔وہ اپنے ماتحت عملہ کے ساتھ بڑا پیار کرتے تھے۔وہ اتنے بہادر اور شجاع تھے کہ آگے بڑھ بڑھ کر حملہ کیا کرتے تھے۔وہ مصائب و تکالیف کی پرواہ کیے بغیر اپنے مشن کو جاری رکھتے تھے۔وہ ایک اچھے قائد اور عمدہ مسلمان تھے۔ان میں قائدانہ صفات موجود تھیں۔ ان قائدانہ صفات میں سے ایک ''صبر جمیل'' ہے۔محاصرہ کے دوران صبر ہی کام آتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تحمل و بردباری اور مکمل بیداری و ہوشیاری کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے تاکہ دشمن کی نقل و حرکت پر پوری نظر ہو۔ چنانچہ الحارث ﷛ اور ان کی سپاہ ان تمام اوصاف سے متصف تھیں۔ الحارث ﷛ جلد اور صحیح فیصلہ کرنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

الحارث بن یزید ﷛ کے تعارف کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ وہ ہیت کے فاتح تھے۔اللہ تعالیٰ ان کے درجے مزید بڑھائیں۔

❀..........❀..........❀

حضرت خارجہ بن حذافہ العدوی رضی اللہ عنہ

حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ بن غانم عَدَوِی قریشی تھے ان کی والدہ کا نام فاطمہ بنت عمرو تھا وہ قریش کے مشہور شہسواروں میں سے تھے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک ہزار سوار کے برابر تھے۔ وہ صلح حدیبیہ کے موقع پر اسلام لائے۔ آنحضرت ﷺ سے وِتر کی نماز والی حدیث انہوں نے روایت کی ہے۔ انہیں آنحضرت ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا مگر غزواتِ رسول ﷺ میں ان کا نام نہیں آیا۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے جھنڈے تلے مصر کی فتح میں وہ موجود تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب کو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی فکر ہوئی تو انہوں نے چار ہزار مجاہدوں کو ان کی مدد کے لیے بھیجا اور ہر ہزار آدمی پر ایک ایسا آدمی مقرر کیا جو ہزار کے برابر تھا۔ وہ حضرت زبیر بن العوام، مقداد بن اَسود، عبادۃ بن الصامت اور خارجہ بن حذافہ تھے۔ انہوں نے اُم دنین والوں کو ایک دن صبح سے کچھ پہلے اپنے پانچ سو مجاہدوں کے ساتھ جالیا۔ اس سے قلعہ بابلیون کا دفاع کرنے والوں پر بہت بڑا اور بُرا اثر ہوا۔ جب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فتح اسکندریہ کے لیے روانہ ہوئے تو قلعہ بابلیون میں انہوں نے جو سپاہ پیچھے چھوڑی اس کے قائد حضرت خارجہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

جب اسکندریہ کے محاصرہ نے طول کھینچا تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے کچھ دستوں کو دلتا اور صعید کی فتح کے لیے اور خارجہ رضی اللہ عنہ کو فیوم اور اشمونین، اخمیم اور بشرودات کی فتح کے لیے بھیجا جہاں انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ خارجہ رضی اللہ عنہ مصر ہی میں ٹھہر گئے اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے وہاں کے قاضی اور ایک روایت کے مطابق پولیس کے سربراہ تھے۔ موسمِ حج کے موقع پر تین خارجیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا کام تمام کرنے کا جو

پروگرام بنایا تھا اس کے تحت انہوں نے صبح کی نماز میں ان پر حملہ کرنا تھا۔ 17 رمضان 40 ہجری میں انہوں نے اس پر عمل کیا۔ حضرت علی ؓ نے شہادت پائی۔ امیر معاویہ ؓ زخمی ہوئے اور عمرو بن العاص ؓ اس دن نماز پڑھنے کے لیے نہ آسکے اور ان کی جگہ خارجہ ؓ نے امامت کے فرائض انجام دیئے اور اِسی دوران شہید ہوئے، قاتل نے سمجھا کہ وہ عمرو بن العاص ؓ ہیں، اور اس نے یہ کہا کہ:

"اَردتُ عمرواً او أرد الله خارجه"

حضرت خارجہ ؓ 40 ہجری کو شہید ہوئے اور مصر میں ان کی قبر مشہور ہے۔ انہوں نے رسول پاک ﷺ سے تین حدیثیں روایت کی ہیں۔

وہ فقہ کے عالم، دینی امور میں عادِل، متقی اور بڑی اچھی سیرت و کردار کے مالک تھے، اسی وجہ سے عمرو نے انہیں قاضی مقرر کیا تھا۔

حضرت خارجہ ؓ بڑے بہادر تھے، وہ قریش کے ان معدودے چند سواروں میں سے تھے جو ایک ہزار کے برابر ہوں۔ اِسی وجہ سے حضرت عمر بن الخطاب ؓ نے انہیں ایک ہزار مجاہدوں کا امیر بنا کر بھیجا تھا اور ان کے بارے میں فرمایا تھا۔

"انه رجل مقام ألف"

کہ یہ تنہا ایک ہزار کے برابر ہیں۔

ان کا ماضی شاندار تھا اور شجاعت قابلِ قدر تھی۔ ان کی جنگی سکیم بڑی صحیح ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صعید کا علاقہ تیزی سے فتح کر لیا اور جانی نقصان بھی کوئی خاص نہیں ہوا۔ تاریخ حضرت خارجہ ؓ کو مصر میں ان کے نمایاں جہاد، اور فتح صعید کی وجہ سے یاد رکھے گی۔

اللہ تعالیٰ انصاف والے قاضی، فاتح کمانڈر اور جلیل القدر صحابی حضرت خارجہ بن حذافہ عدوی ؓ سے راضی ہوں۔

❀..........❀..........❀

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

حضرت خالد رضی اللہ عنہ عرب کے مشہور قبیلہ بنی مخزوم سے تھے۔ اس قبیلہ کے افراد عرب میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ اور نسلوں سے قریش کی سپہ سالاری کا عہدہ اسی خاندان میں تھا۔ والد کا نام عبدالشمس الولید تھا، جو مکہ کے بڑے دولت مند اور بارسوخ شخص تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایسے ماحول میں تربیت پائی جہاں شہ سواری، نیزہ بازی اور تلوار چلانے کے داؤ گھات کے سوا اور کسی چیز کا ذکر کم ہی ہوتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے نہایت پھرتیلے اور نڈر تھے۔ وہ جب ذرا بڑے ہوئے تو مکہ کے منتخب جوانوں میں شمار ہونے لگے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ مکہ کی فوج میں ایک بڑے عہدے کے مالک تھے۔ اُحد کی لڑائی مسلمانوں کے خلاف بڑی بہادری اور دلیری سے لڑے۔ انہی کی ایک جنگی چال کی وجہ سے جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی تھی۔

سب سے پہلے جس جنگ میں انہوں نے اسلام کی خاطر اپنی بہادری کے جوہر دکھائے، وہ جنگ موتہ ہے۔ ہوا یہ کہ رسولِ خدا ﷺ نے اسلام کی اشاعت کے لیے مختلف بادشاہوں اور حاکموں کے پاس خط بھیجے تھے۔ ایک خط بصرہ کے بادشاہ کے پاس بھی بھیجا۔ مگر اُس نے خط لانے والوں کو شہید کر دیا۔ رسولِ خدا ﷺ کو جب یہ خبر ملی، تو حضور ﷺ کو بہت رنج ہوا۔ اور اس خونِ ناحق کا بدلہ لینے کے لیے دو ہزار فوج حضرت زید رضی اللہ عنہ بن حارث کی سرداری میں روانہ کی۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اگر زید رضی اللہ عنہ شہید ہوں تو جعفر طیار رضی اللہ عنہ اُن کی جگہ لیں۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ سردار بنائے جائیں۔ لڑائی شروع ہوئی، تو تینوں سردار لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اس پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جھنڈا سنبھالا اور فوج نے انہیں اپنا سردار

مان لیا۔ اس وقت لڑائی بڑے زوروں پر تھی، اور دونوں طرف سے سپاہی بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ اتنے میں شام ہو گئی۔ اور دونوں لشکر اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ صبح ہوئی تو حضرت خالد ﷛ نے اسلامی لشکر کی ترتیب اس طرح سے بدلی کہ دیکھنے والا یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ وہی لشکر ہے جو کل لڑ رہا تھا۔ دشمن نے جب لشکر کو نئی ترتیب سے دیکھا تو ڈر گئے، اور سمجھے کہ رات ہی کو مسلمانوں کی تازہ دم فوج مدد کے لیے آ پہنچی ہے۔ وہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اسلامی فوج کی ترتیب بدلنا حضرت خالد ﷛ کی ایک ایسی جنگی تدبیر تھی جس سے مسلمانوں کو مزید نقصان اٹھائے بغیر پوری فتح حاصل ہوئی۔ اِس فتح کے بعد حضور ﷺ نے خالد ﷛ کو سیف اللہ کا خطاب دیا اور فرمایا "یا الٰہی! خالد ﷛ تیری تلوار ہے۔ تو اس کو ہمیشہ فتح مند رکھنا۔"

اس کے بعد حضور ﷺ کی زندگی میں حضرت خالد نے کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ فتح مکہ کے بعد حنین کی لڑائی میں وہ اُس دستے کے سردار تھے جو سب سے آگے تھا۔ حضرت ابوبکر ﷛ کو خلیفہ ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا، کہ ایرانیوں نے عراق کی سرحد پر چند عربی قبیلوں پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر ﷛ سے امداد کی درخواست کی۔ جنہوں نے حضرت خالد ﷛ کی سپہ سالاری میں ایک فوج روانہ کر دی۔ بصرہ کے قریب ایک ساحلی مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اِسلامی فوج دس ہزار تھی، اور ایرانیوں کی اس سے کئی گنا زیادہ۔ ایرانی سپہ سالار ہرمز تھا۔ اُسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ایرانی سپاہی مسلمانوں کی بہادری سے بہت مرعوب ہیں اس لیے اس نے یہ تدبیر کی کہ سپاہیوں کو لمبی لمبی زنجیروں سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا۔ تاکہ کوئی بھاگنا چاہے تو بھاگ نہ سکے۔ اِس لیے اس جنگ کو جنگِ سلاسل یعنی زنجیروں کی لڑائی بھی کہتے ہیں۔ لڑائی شروع ہونے سے قبل حضرت خالد ﷛ نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو مخاطب کر کے ایک پُر جوش تقریر کی۔ انہوں نے کہا:

"میرے بھائیو! آج ہم عرب سے باہر نکل کر غیر ملکی لشکر کے مقابل ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے تو ہم آپس ہی میں لڑتے بھڑتے رہے۔ لیکن اب ہمارا مقابلہ ایرانی لشکر سے پڑا ہے، اور یہ بڑی زبردست سلطنت ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہمیں حقیر سمجھتے ہیں کیونکہ ہم خانہ جنگیوں کے باعث اپنی تمام طاقت باہمی کشت و خون میں صرف کر دیتے تھے، لیکن اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں

اپنے فضل وکرم سے ایک قوم بنادیا، اسلام کے نور سے منور کردیا اور اپنے پیارے حبیب اور رسول خدا ﷺ کے طفیل گمراہی سے نکال کر ہدایت بخشی۔ ہمارے باہمی تفرقے مٹ گئے۔ عداوتیں دُور ہو گئیں اور ہم اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ قوم بن گئے۔ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہمارا۔ دیکھو، دشمنوں کی کثرت سے نہ گھبرانا۔ اللہ تعالیٰ نے لشکرِ اسلام کو ہمیشہ دشمنوں پر فتح دی ہے۔ تم خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا یہ وعدہ سچا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیصر وکسریٰ کے خزانے مومنوں کو عطا فرمائے گا۔ خوب یاد رکھو کہ جس شخص نے میدان سے منہ موڑا، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نافرمان ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب دشمن کے مقابلے پر نکلو، تو اس کو پیٹھ مت دکھاؤ کیونکہ پیٹھ دکھانے سے تم اپنے اللہ اور رسول ﷺ کو دشمنوں کی نگاہ میں شرمسار کرو گے۔ مَیں اِعلان کرتا ہوں، کہ جس شخص میں کمزوری کا مرض ہے اور اسے اپنی جان اسلام سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اس لشکر سے جدا ہو جائے اور اسلام کو بدنام کرنے والا نہ بنے۔''

یہ تقریر سُن کر سپاہیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے، اور انہوں نے کہا۔ ''کچھ بھی ہو ہم میدان سے منہ نہ موڑیں گے۔'' جب صفیں مرتب ہو گئیں، تو ہرمز نے اپنے لشکر کو حملہ کا حکم دیا۔ اِدھر سے اسلامی فوج بھی آگے بڑھی۔ دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ مگر اسلامی فوج کے پہلے ہی حملہ سے ایرانی سہم گئے۔ اور دیکھتے دیکھتے ایرانی سپاہیوں کی لاشوں سے میدان بھر گیا۔ یہ دیکھ کر ہرمز کو سخت طیش آیا۔ اور اُس نے میدان میں نکل کر پکارا کہ اس طرح کشت وخون کرنے سے کیا فائدہ؟ مَیں بھی میدان میں نکلتا ہوں اور اُدھر سے مسلمانوں کی فوج کا سپہ سالار بھی میدان میں نکلے۔ ہم دونوں لڑیں گے۔ اگر مَیں نے اُسے مار لیا، تو اسلامی فوج میرے سامنے ہتھیار ڈال دے، اور اگر اُس نے مجھے چت کر لیا تو ہم اس کی اطاعت قبول کر لیں۔ حضرت خالد ؓ نے یہ بات منظور کر لی۔ وہ میدان میں آئے اور اپنے مقابل کو لڑائی کے لیے بلایا۔ اُن کی آواز سُن کر ہرمز بھی مقابلہ کے لیے نکلا اور میدان میں پہنچا۔ حضرت خالد ؓ نے نہایت آسانی سے اُس کی تلوار چھین لی۔ اور پیشتر اِس کے کہ کوئی اُس کی مدد کو بڑھتا، ہرمز کا کام تمام کر دیا۔ ایرانی یہ دیکھ کر ڈر گئے اور بھاگ نکلے لیکن زنجیروں کی وجہ سے زیادہ دُور نہ جا سکے اور ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔

عراق کی فتح کے بعد حضرت ابو بکر ؓ نے حضرت خالد ؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ اب

شام کا رُخ کریں۔ شام پر رومیوں کی حکومت تھی۔ اور ان کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو حقیر سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے جتنے ہم مہذب اور بہادر ہیں، دنیا کی اور کوئی قوم نہیں ہے۔ وہ آئے دن مسلمانوں کے خلاف سازشیں بھی کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ظلم وستم سے شام کے باشندوں کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کا فرض تھا، کہ وہ اِن باشندوں کو ظلم وستم سے نجات دلائیں اور رومیوں کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیں۔ چنانچہ شام میں مختلف فوجیں روانہ کردی گئی تھی۔ ان کے مقابلے کے لیے رُومی شہنشاہ ہرقل نے ایک بہت عظیم الشان فوج جمع کرلی تھی۔ دشمن کی اتنی کثیر تعداد دیکھ کر مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ سے امداد طلب کی۔ چنانچہ نہ صرف حضرت خالدؓ کو ان کی مدد کے لیے بھیجا گیا، بلکہ انہیں تمام فوجوں کا سپہ سالار بھی مقرر کردیا گیا۔ حضرت خالدؓ عراق سے روانہ ہوئے اور شام میں داخل ہوکر کئی شہروں کو فتح کرتے ہوئے مشہور شہر دمشق کے سامنے پہنچ گئے اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ ابھی یہ شہر فتح نہ ہوا تھا کہ حضرت خالدؓ کو خبر پہنچی، کہ یہاں سے تھوڑی دور اجنادین میں رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر جمع ہورہا ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ فی الحال محاصرہ اُٹھا کر کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ حضرت خالدؓ نے اُن فوجوں کو بھی جو اِدھر اُدھر پھیل گئی تھیں، حکم دیا کہ وہ سب اجنادین میں جمع ہوجائیں۔ جب مسلمان سپاہی اجنادین پہنچے، تو انہوں نے دیکھا کہ میدانِ جنگ رومی فوجوں سے بھرا پڑا ہے۔ حضرت خالدؓ نے اجنادین پہنچنے کا ایسا راستہ اختیار کیا جس میں پانی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ مگر ان کی ہمت اور جانبازی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہ ہوسکتی تھی۔ رومیوں کی صفوں میں ایک ایک ہزار آدمی تھے۔ مسلمانوں کی تعداد صرف پینتالیس ہزار تھی۔ اس سے زیادہ بڑا اور کوئی لشکر اب تک مقابلے میں نہ آیا تھا۔ لڑائی شروع ہوئی۔ بڑے معرکہ کا رن پڑا۔ مسلم خواتین نے بڑے کارہائے نمایاں دکھائے۔ ہزاروں عیسائی جرنیلوں نے عزت کی موت کو بے عزتی کی زندگی پر ترجیح دی اور بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ بالآخر رومیوں کو سخت شکست ہوئی۔ پچاس ہزار رومی ہلاک ہوئے اور باقی جان بچا کر بھاگ گئے۔ کوئی تین ہزار مسلمان بھی شہید ہوئے اِس فتح کی خبر جب مدینہ پہنچی، تو مسلمانوں کو بے حد خوشی ہوئی اور عرب کے قبیلوں میں جہاد کا جوش پیدا ہوگیا۔

دمشق کی فتح کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہوگئے تھے۔ اِدھر رومیوں میں بھی

جوش پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے کئی جگہ ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر انہوں نے آخری مقابلے کے لیے یرموک کو پسند کیا، اور یہاں ایک بڑا لشکر لے آئے، جس کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ اُن کے جوش کی یہ حالت تھی کہ فوج جس راستہ سے گزرتی تھی، وہاں راہب اور پادری خانقاہیں اور گرجے چھوڑ کر فوج میں شامل ہو جاتے تھے۔ اسلامی فوج کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو نئے طریقے پر ترتیب دیا اور کہا۔ ''ہار جیت تعداد کی کمی یا زیادتی پر نہیں، بلکہ خدا کی مدد پر موقوف ہے۔'' رومیوں نے بھی فوج کو کئی دستوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر ایک دستے کے آگے پادری تھے، جو انجیل کی آیتیں پڑھ کر سپاہیوں کو برکت دے رہے تھے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے رات کو رومیوں نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بہتر ہو گا کہ انہیں روپے پیسے کا لالچ دے کر واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ایک سفیر اسلامی فوج میں بھیجا کہ مسلمانوں کا کوئی نمائندہ رومی فوج کے سپہ سالار باہان سے مل لے۔ کیونکہ ضروری بات چیت کرنی ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اگلے دن رومی لشکر میں گئے۔ رومیوں نے اپنی شان و شوکت دکھانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ اِدھر اُدھر کی بات چیت کرنے اور ڈرانے دھمکانے کے بعد باہان اصلی مقصد کی طرف آیا۔ اُس نے کہا۔ ''اگر تم یہاں سے چلے جاؤ، تو ہم انعام کے طور پر سپہ سالار کو دس ہزار دینار اور تمہارے افسروں کو ایک ایک ہزار اور ہر سپاہی کو ایک ایک سو دینار دیں گے۔''

تھوڑی دیر اور گفتگو ہوتی رہی۔ مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر لڑائی شروع ہوئی جو کئی دنوں تک ہوتی رہی۔ اس کا تیسرا دن مسلمانوں کے لیے بڑا سخت تھا۔ اس دن رومیوں کے حملے کی شدت سے مسلمان تین دفعہ پیچھے ہٹے۔ لیکن ہر بار عورتوں نے غیرت دلا کر انہیں پھر آگے بڑھایا۔ انہوں نے خیموں کی چوبیں اُکھاڑ لیں اور کہا۔ اگر تم پیچھے ہٹے تو ہم تمہیں چوبوں سے مار ڈالیں گی۔ اس کے باوجود دشمن کے بہت سے سپاہی مارے گئے اور مسلمان بہت کم شہید ہوئے۔ اگلے دن بھی بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ اُس دن حضرت خالد رضی اللہ عنہ بڑی بے جگری سے لڑے، اور ان کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں، انہوں نے اپنی ہمت اور بہادری سے دشمن کی صفوں میں قیامت برپا کر دی اس سے اگلے دن حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور بھی بے خوفی سے لڑے۔ مسلمان سپاہیوں نے بھی پوری طرح ان کا ساتھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس ہزار رومی مارے گئے۔ یہ ناممکن تھا کہ

رومی اب زیادہ دنوں تک مسلمانوں کا مقابلہ کرتے۔ آخر انہیں شکست ہوئی اور میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا، اور انہیں قتل اور گرفتار کرتے دُور تک چلے گئے۔ اِس لڑائی میں ایک لاکھ رومی قتل اور چالیس ہزار گرفتار ہوئے۔ مسلمان شہیدوں کی تعداد چار ہزار تھی۔ یرموک کی فتح بڑی عظیم الشان تھی۔ اتنا بڑا لشکر اب تک مسلمانوں کے مقابلہ میں نہ آیا تھا۔ اس فتح سے شام کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ مسلمانوں کا سیلاب اب کسی سے نہیں رُک سکتا تھا۔ وہ دُور تک بڑھتا چلا گیا۔ حضرت خالد ؓ کی تلوار نے اسلام کے دشمنوں پر ایک ہیبت طاری کر دی اور اس کی قوت کو تسلیم کر لیا۔ حضرت عمر کو جب اِس فتح کی خبر ملی تو وہ سجدے میں گر گئے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

حضرت خالد ؓ کا شمار دنیا کے بڑے بڑے جرنیلوں اور فاتحوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی سو لڑائیاں لڑیں، جن میں اُن کی فوج دشمن کی فوج کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی تھی۔ لیکن کسی ایک میں بھی شکست نہ کھائی۔ پھر ان کے ہمراہ عرب کے غیر تربیت یافتہ سپاہی ہوتے تھے، جن کے مقابلہ پر شہنشاہ روم اور شہنشاہِ ایران کی منظم اور آہن پوش فوجیں ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ بے شمار اور اعلیٰ درجہ کے ہتھیار ہوتے تھے۔ کھانے پینے کی کوئی کمی نہ ہوتی اور انہیں ہر وقت ہر قسم کی مدد مل سکتی تھی۔ اس کے برخلاف مسلمان سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کے پاس تلوار ہے تو نیزہ نہیں۔ اگر نیزہ ہے تو ڈھال نہیں اور اگر گھوڑا ہے تو اس پر زین نہیں۔ پھر اپنے وطن سے دُور پرائے ملک میں جا کر ایسی بے سروسامانی کی حالت میں رومیوں اور ایرانیوں کی عظیم الشان سلطنتوں کو شکست دینا معجزے سے کم نہ تھا۔ حضرت خالد ؓ نے کبھی یہ پروا نہ کی کہ ان کے پاس فوج کم ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی بہادری اور حسنِ تدبیر سے لڑائیوں میں فتح پائی۔ دوسروں کے بنائے ہوئے قاعدوں اور طریقوں پر کبھی عمل نہیں کیا۔ بلکہ اکثر اپنے جنگی قاعدے بنائے۔ کئی دفعہ انہوں نے صرف صفوں کی ترتیب بدل کر دشمن کو مار بھگایا۔ کئی موقعوں پر اپنی فوج کو چند قدم پیچھے ہٹا کر فتح حاصل کی بعض موقعوں پر عام فوجی اصولوں کے خلاف تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کی بڑی سے بڑی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ کبھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دشمن پر اُن کی اُمید کے خلاف ہلّہ بول دیا۔ غرض موقعہ اور ضرورت کے مطابق انہوں نے اپنے لیے خود قاعدے بنائے اور اس بات کو نہیں دیکھا کہ دنیا کے ماہرینِ جنگ نے ایسے موقعوں کے لیے کیا طریقے بتائے ہیں۔

اُن میں بہادری اور شجاعت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خطروں کو وہ کچھ نہ سمجھتے تھے۔ لڑائیوں میں اپنی زندگی کو کبھی عزیز نہ رکھا۔ وہ ہمیشہ پہلی صف میں رہ کر دشمن سے دست بدست جنگ کرتے تھے۔ وہ دشمن کی جنگی چالوں کو سمجھنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، اور انہیں ناکام بنانے کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرتے کہ مخالف حیران رہ جاتا۔ انہیں اپنے سپاہیوں کی جان اور عزت کا ہر وقت خیال رہتا تھا اور اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ لڑائی میں فتح ہو۔

انہوں نے ہمیشہ اپنے عہد کا پاس کیا۔ جو کچھ کہا اس پر عمل کر دکھایا۔ وہ بڑے فرض شناس تھے۔ کیا مجال کسی کام میں بھی ذرا سی کوتاہی ہو جائے ان کے سپاہی اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ جس لڑائی میں وہ شامل ہوں، اس کے متعلق پہلے ہی سے یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ اس میں فتح حاصل ہو گی۔ ایک ایک مؤرّخ نے انہیں دنیا کا سب سے بڑا جرنیل کہا اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔

❁............❁............❁

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

حضرت زبیر قرشی اسدی رسول اللہ ﷺ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی، ہم زلف اورام المومنین حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھتیجے تھے۔ والدہ حضرت صفیہ ؓ بنت عبدالمطلب اور والد عوام بن خویلد تھے۔

حضرت زبیر اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ حدیث کے مطابق وہ پانچویں شخص تھے۔ جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی۔ اطبقات ابن سعد کے مطابق اس وقت سولہ سال کے تھے۔ وہ ان دس حضرات میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی آنحضرت ﷺ نے بشارت دی تھی۔ حضرت زبیر ؓ انتہائی مصائب اور تکالیف کے باوجود رسول پاک ﷺ کے دامن سے وابستہ رہے۔ انہوں نے حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شرکت کی۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد ان کا رشتہ موافات حضرت سلمہ بن سلامہ کے ساتھ باندھا گیا۔ بعدازاں وہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کی تمام بڑی بڑی لڑائیوں میں حصہ لیتے اور دادِ شجاعت دیتے رہے۔

غزوہ بدر میں مسلمانوں کے لشکر میں دو شہسوار تھے۔ ایک حضرت زبیر اور دوسرے حضرت مقدار بن الاسود۔ حضرت زبیر میمنہ پر متعین تھے اور حضرت مقدار ؓ میسرہ پر۔ غزوۂ بدر میں بھی خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ اور کئی کافروں کو تہ تیغ کیا، اسی دوران میں آپ کے مشرک چچا نوفل بن خویلد بھی آپ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ لڑائی میں خود بھی زخمی ہوئے تھے۔

غزوۂ احد میں بھی بڑی بہادری سے لڑے اور اس نازک مرحلہ میں بھی ثابت قدم رہے۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق اس غزوہ میں رسول پاک ﷺ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی تھی۔ جنگ کے دوران رسول پاک ﷺ نے دیکھا کہ ایک کافر مسلمانوں کو سخت جانی نقصان پہنچا

رہا ہے۔ فرمایا، ''زبیر اس کی خبر لو۔'' حضرت زبیر اس پر ٹوٹ پڑے، دودو ہاتھ کیے اور بالآخر اسے قتل کر دیا۔

غزوۂ خندق میں بھی برابر آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ امام ذہبی کا کہنا ہے کہ ''نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیر ؓ کو ''الحواری'' کا لقب ان کی خدمات کے سلسلہ میں عطا فرمایا تھا جو انہوں نے بنو قریظہ سے جنگ کے دوران میں بطور مخبر انجام دی تھیں۔ آپ نے اس موقع پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔'' ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ؓ ہے۔

غزوۂ خندق میں آپ نے حضرت زبیر کو بنو قریظہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے تین مرتبہ بھیجا اور اسی جنگ کے موقع پر انہوں نے تیر اندازی کے خوب جوہر دکھائے۔ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ کی نظروں میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک بار جناب رسول اللہ ﷺ نے ان سے گفتگو کے دوران میں یہ الفاظ ''فداک ابی وامی'' ''کہ تجھ پر میرے ماں باپ قربان'' ارشاد فرمائے تھے۔ (خود حضرت زبیر ؓ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احد اور خندق کے دوران میں دو مرتبہ مجھے فرمایا تھا کہ ''تم پر میرے ماں باپ قربان!''

غزوہ خیبر میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ فتح مکہ کے دن حضرت زبیر ؓ کے ہاتھ میں دو جھنڈے تھے۔ ان کا شمار بڑے بہادر اور دلیر صحابہ کرام ؓ میں ہوتا ہے۔

غزوہ حنین میں انہوں نے اتنی تیر اندازی کی کہ مشرکین اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکے، حضرت ابوبکر ؓ کے دورِ خلافت میں جنگِ یرموک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسلامی فوجوں کے ایک حصہ کی قیادت بھی کی۔ رومیوں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے اور ان کی صفوں میں شگاف ڈال دیتے تھے۔ اسی دوران میں کافی زخمی بھی ہوئے۔

حضرت عمر ؓ کے عہد خلافت میں حضرت ابوعبیدہ ؓ بن الجراح کو بھیجی جانے والی امدادی سپاہ کے کمانڈر رہے۔

حضرت عمرو بن العاص ؓ نے فتح مصر کے لیے جب حضرت عمر ؓ سے امداد مانگی تو انہوں نے حضرت زبیر ؓ کی سرکردگی میں 12 ہزار مجاہدین اسلام کو روانہ کیا، اور ایک روایت چار ہزار کی بھی ہے۔ ان میں بڑے بڑے مرتبہ والے صحابہ ؓ بھی شامل تھے۔ حضرت عمرو بن العاص

ؓ کی کمان میں فتح مصر میں بھی شریک رہے۔

قلعہ بابلیون کی فتح میں بھی پیش پیش رہے بلکہ حضرت عمرو بن العاص ؓ کو رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں اور سیڑھی کے ذریعے قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا جس سے دشمن کے حوصلے ختم اور مجاہدین اسلام کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے آگے بڑھ کر قلعہ فتح کرلیا۔

حضرت زبیر آنحضرت ﷺ کے معتمد تھے۔ اور آپ ﷺ ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت عمر ؓ کے مشیر اور دستِ راست تھے اور وہ بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت عمر ؓ ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ''زبیر ؓ دین اور اسلام کا رکن اور ستون ہیں۔''

حضرت عثمان ؓ کے عہد خلافت میں بھی ان کے مشیر رہے۔ 36ھ میں بصرہ سے مکہ آتے ہوئے ''وادیٔ سباع'' میں نماز کے دوران انہیں عمرو بن جرموز نے شہید کردیا۔ اس وقت عمر ؓ 64 سال تھی۔

حضرت زبیر ؓ بڑے متقی اور پارسا تھے، وہ بہت بڑے تاجر اور مالدار بھی تھے۔ وہ اپنا مال اللہ کی راہ میں خوب خرچ کیا کرتے تھے۔ انہوں نے آپ سے 38 حدیثیں روایت کی ہیں۔ وہ بہت بڑے مجاہد اور قائد تھے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے عمرو بن العاص ؓ سے ان کی بابت پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''وہ بہت ہی بڑے بہادر ہیں۔'' حضرت علی ؓ مسجد نبوی میں تھے کہ ان سے سب سے بڑے بہادر اور شجاع کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے حضرت زبیر ؓ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ''وہ ہیں۔ ان کا غصہ چیتے کا اور حملہ شیر کا ہوتا ہے۔''

حضرت عمر فاروق ؓ نے عمرو بن العاص ؓ کی امداد کے لیے جو چار ہزار مجاہدین اسلام روانہ کیے تو ان کے ہمراہ ایسے بلند مرتبہ بہادر صحابہ ؓ بھی تھے۔ جن میں سے ایک ایک ہزار کے برابر تھا۔ اور حضرت زبیر ؓ ان چار ہزار کے بھی کمانڈر تھے ان میں تمام قائدانہ صفات موجود تھیں۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات اور بڑھائیں، اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب ہو۔ آمین۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

حضرت زید بن حارثہ قبیلہ بنو قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے اور غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے آپ ایک آزاد خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ایک قبیلہ کے غارت گروں نے آپ کو بچپن میں ان کے خیمہ کے سامنے سے اٹھا کر بازار عکاظ میں فروخت کر دیا تھا۔ وہاں سے حکیم بن حزام نے خرید کر اپنی پھوپھی اُم المومنین حضرت خدیجہؓ کو دے دیا تھا۔ یوں آپ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ نے حضور اکرم ﷺ کی غلامی کو ہزاروں آزادیوں پر ترجیح دی تھی اور اپنے باپ اور چچا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

آپ کی جنگی مہارت، شہسواری زبان زد عام تھی لوگ آپ کو ایک عظیم جرنیل کے طور پر جانتے تھے کیونکہ بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جس فوج کشی میں زید ہوتے تھے اس میں سپہ سالار اور جرنیل آپ ہی کو آنحضرت ﷺ مقرر فرماتے تھے۔ مسلمان جب مدینہ ہجرت کر آئے تو ان کے بعض رشتہ دار مسلمان مکہ میں رہ گئے تھے۔ ان کو کافروں کے نرغے سے نکال کر لانا ایک مشکل کام ہوتا تھا جسے کوئی بہادر اور سپہ سالار ہی انجام دیتا تھا۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے اہلِ خانہ کو مدینہ لانے کے لیے حضرت زید رضی اللہ عنہ ہی کو حکم دیا اور آپ حضرت فاطمہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور اُم المومنین حضرت سودہؓ اور اپنی اہلیہ اُم ایمنؓ کو کافروں کے نرغے سے نکال کر مدینہ منورہ لائے اس طرح کچھ عرصہ بعد پھر آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنی بیٹی ابوالعاص بن ربیع کی اہلیہ حضرت زینبؓ کو مکہ سے لانے کا حکم دیا اور آپ لے کر آئے۔ اس بہادرانہ کام کے لیے آنحضرت ﷺ کا آپ پر اعتماد دراصل آپ کی فوجی اور جنگی مہارت کو خراج تحسین پیش کرنے کے مترادف ہے۔ غزوۂ بدر میں آپ کفار کی صفوں میں دور تک جا کر لڑتے رہے اور آنحضرت ﷺ کے گرد بھی رہے

تا کہ آنحضرت ﷺ پر اپنی جان قربان کر سکیں۔ حضرت سلمہ بن اوع فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہم پر حضرت زید ؓ کو امیر بناتے تھے کیونکہ آپ فنون حرب کو جاننے والے سمجھدار جرنیل اور بہادر تھے۔

حضرت زید نے ایک سر کیا جس کا نام اُم قرفہ ہے میں کامیابی سے سرخرو ہو کر لوٹے تو آنحضرت ﷺ نے باہر دروازے پر جا کر ان کا استقبال کیا۔ ان کو گلے سے لگا لیا اور بوسہ دیا اور آپ ﷺ نے فرمایا سرکیا کے بہترین جرنیل زید بن حارثہ ؓ اور رعایا کے لیے سب سے زیادہ منصف اور انصاف کرنے والے ہیں۔

حضرت زید ؓ تیر اندازی میں خاص کمال رکھتے تھے اور ان کا شمار ان مشہور صحابہؓ میں ہوتا تھا جو اس فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر سے غزوۂ موتہ تک جتنے بھی معرکے ہوئے ان سب میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے بڑی بے جگری سے لڑے، غزوۂ مریسیع میں البتہ وہ شریک نہیں ہو سکے تھے کہ رسولِ پاک ﷺ نے انہیں مدینہ میں اپنی جانشینی کا شرف بخشا تھا۔

مشہور معرکوں کے علاوہ کئی چھوٹی مہموں میں انہوں نے سپہ سالاری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ''جس فوج کشی میں زید ؓ شریک ہوتے ان میں امارت کا عہدہ انہی کو عطا ہوتا تھا۔'' اس طرح نو دفعہ سپہ سالار بنا کر بھیجے گئے اور ہر مرتبہ کامیاب واپس آئے۔

موتہ دمشق کے قریب ایک جگہ ہے، حضرت حارث بن عمیر ازدی ؓ جو شاہِ بصرہ کے دربار میں، سفارت کی خدمت انجام دے کر واپس آ رہے تھے کہ اسی مقام پر شرجیل ابن عمر غسانی کے ہاتھ سے شہید ہوئے، یہ پہلا واقعہ تھا کہ دربار رسالت کے ایک سفیر کے ساتھ اس قسم کی جسارت کی گئی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے انتقام کے لیے تین ہزار مجاہدوں پر مشتمل ایک لشکر ترتیب دیا اور زید کو اس کی قیادت سونپی، ارشاد فرمایا کہ: ''اگر زید ؓ شہید ہوں تو جعفر ؓ اور ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ ؓ اس جماعت کے امیر ہوں گے۔'' (بخاری باب غزوہ موتہ)

جمادی الاولیٰ 8ھ میں یہ مہم روانہ ہوئی۔ دشمن کو اس کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی اس لیے تقریباً ایک لاکھ کا لشکر میدان میں لے آئے۔

حضرت زید ؓ نے دشمن کی کثرت کی کوئی پرواہ نہ کی اور عَلم سنبھال کر پیادہ پا دشمن کی

صف میں گھس گئے، ان کے ساتھ تمام مسلمان فوج نے بھی دشمن پر سخت حملہ کر دیا، دیر تک بڑے زور کی لڑائی ہوتی رہی حضرت زید ﷛ دادِ شجاعت دیتے ہوئے میدانِ کارزار میں شہید ہوئے، ان کے بعد حضرت جعفر طیار ﷛ نے علَم سنبھالا اور بڑی دلیری اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے، ان کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ ﷛ نے کمان سنبھالی اور بڑی جرأت و بہادری سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ ان کے بعد حضرت خالد بن الولید ﷛ نے کمان سنبھال لی اور دشمن پر اتنا زوردار حملہ کیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور اس طرح یہ اپنی فوج کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے صحیح وسالم بچا کر لے آئے۔

آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زید، جعفر، اور عبداللہ کی شہادت کی اطلاع مل گئی اور آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت زید ﷛ کی ایک صاحبزادی، شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ تو آپ ﷺ بھی ضبط نہ فرما سکے اور آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعد بن عادہ ﷛ نے رونے کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جذبہ محبت ہے۔

اللہ تعالیٰ رسولِ پاک ﷺ کے اس محبوب غلام اور شہید کے درجے اور بلند فرمائیں! آمین۔

❀............❀............❀

20

حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ

حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ عمرو بن لبنہ کے فرزند تھے۔ انہیں صحابی رسول ہونے کا شرف تو حاصل ہوا مگر آپ ﷺ کے جھنڈے تلے جہاد کرنے کی سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ یا تو اس وقت ان کی عمر کم تھی یا پھر وہ دیر سے اسلام لائے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں باب الابواب کی مہم سونپی (جو دریائے خزر کی ایک بندرگاہ ہے) اور شہر کا والی مقرر کیا اور فتوحات کے سلسلہ میں ان کی امداد کے لیے ہراول دستے میں عبدالرحمٰن بن ربیعہ الباھلی اور فوج کے ایک بازو پر حذیفہ بن اسد اور دوسرے پر بلکیر بن عبداللہ اللیثی کو مقرر کیا۔ ان کی مزید امداد کے لیے حبیب بن مسلمہ کو جزیرہ سے بھیجا۔

باب الابواب والوں نے جزیہ پر صلح کر لی اور آپ نے باب الابواب اہل ارمینیہ اور ارمن کو امان دے دی۔ اور اس امر کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کر دی۔ باب الابواب کی تسخیر کے بعد انہوں نے اپنے دوسرے کمانڈروں کو مزید مشن دیئے جن میں بلکیر بن عبداللہ نے آذر بیجان کے علاقہ ''موقان'' کو فتح کر لیا۔

حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ بڑے باکمال شاعر بھی تھے، ان کے اشعار زیادہ تر جہاد اور میدانِ جہاد سے متعلق ہیں۔ جن میں معرکوں کا عمدہ نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہِ انتخاب ان پر پڑی اور انہیں اس منصب پر فائز کیا۔

ان باب الابواب ہی میں 22 ہجری میں وصال ہوا اور وصال سے کچھ پہلے عبدالرحمٰن بن ربیعہ الباہلی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔

جنرل محمود شیت خطاب لکھتے ہیں کہ:

''سراقہ بڑے بہادر اور جری تھے۔صحیح فیصلے کرنے میں بڑے ماہر تھے، باب الابواب کے بادشاہ سے ان کے صلح نامہ سے ان کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے پھر اس فیصلہ کی باقاعدہ اطلاع مرکز اعلیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھجواتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس فیصلے کو سراہتے ہیں۔

حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ مضبوط ارادے کے مالک تھے، ان کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔

ان کی ارمینیہ کے شمالی علاقے باب الابواب کی فتح تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

انہوں نے اپنی پوری زندگی جہاد میں بسر کی اور اسی حالت میں اپنے ملک سے دور مسافری کے عالم میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں۔(آمین)

❁............❁............❁

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

آپ کا اسمِ گرامی سعد اور کنیت ابواسحاق ہے۔لیکن آپ سعد بن ابی وقاص کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔آپ رشتے میں آنحضرت ﷺ کے ماموں لگتے تھے۔کیونکہ آپ آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی تھے۔

آپ نے 17 سال کی عمر میں اسلام قبول کر لیا تھا۔آپ چوتھے مسلمان تھے۔آپ سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان لا چکے تھے۔آپ ان اصحاب رسول میں شامل ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ نے دنیا ہی میں جنت کی خوشخبری سنا دی تھی۔آپ رضی اللہ عنہ کی بہادری اور الوالعزمی مشہور ہے۔کیونکہ آپ نے تمام غزوات میں شرکت کی ہے اور اسلام کے دشمنوں سے دیوانہ وار لڑے ہیں اور اپنی بہادری، شجاعت اور کامیاب جرنیل کے نقوش قائم کیے ہیں۔غزوہ بدر میں بعض انتہائی خطرناک اسلام کے دشمن آپ کی تلوار ہی سے جہنم واصل ہوئے تھے۔

غزوہ اُحد میں جب ایک گھاٹی کو مسلمان چھوڑ گئے تھے اور وہاں سے دشمن حملہ آور ہوا تھا تو یہ ایک بہت ہی سخت لمحہ تھا۔جب آنحضرت ﷺ دشمنوں میں گھر گئے تھے تو آپ کی حفاظت کے لیے صرف (9) نو صحابہؓ رہ گئے تھے۔جن میں سات انصاری اور دو قریشی تھے۔یہ دو قریشی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے دشمنوں نے آنحضرت ﷺ کو ہدف بنایا۔صحابہؓ آپ پر جانیں نچھاور کرتے تھے۔یہاں تک کہ تمام انصاری صحابہؓ شہید ہو گئے۔حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ رہ گئے لیکن اپنی جانوں کو آنحضرت کے لیے قربان کرنے کو تیار تھے۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سامنے آنحضرت ﷺ نے اپنا ترکش کھول دیا اور فرمایا!

اے سعد تیر پھینکو! تجھ پر میرے ماں باپ قربان! حضرت سعد ﷺ دشمن کے سامنے پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے اور زبردست تیراندازی کی آپ نے تقریباً ایک ہزار تیر چلائے۔ اِسی لحہ ایک بڑا جنگی ماہر کافر آنحضرت ﷺ پر حملہ آور ہوا لیکن حضرت سعد ﷺ نے ایسے ماہرانہ انداز سے اسے نشانہ بنایا کہ ایک ہی تیر نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ اسی دوران ایک دوسرے کافر طلحہ بن ابی طلحہ نے حملہ آور ہونا چاہا۔ آپ ﷺ نے ایسا تاک کر اس کے حلق میں تیر مارا کہ اس کی زبان باہر آ گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور اپنے بہادرانہ کارناموں کے باعث داد وصول کرتے رہے۔

آپ ﷺ کی بہادری اور جنگی مہارت صحابہؓ میں مشہور تھی۔ حضرت عمر فاروق ﷺ کے دور میں جب ایرانیوں کے ساتھ معرکہ پیش آیا تو سب ہی نے حضرت سعد ﷺ کا نام سپہ سالاری کے لیے پیش کیا۔ حضرت عمر ﷺ نے اسلامی فوج کی قیادت انہی کو سونپی۔ حضرت سعد ﷺ نے اسلامی لشکر کو ساتھ لیا اور قادسیہ جا کر مقام کیا اور حضرت عمر ﷺ سے برابر راہنمائی لیتے رہے۔

حضرت عمر ﷺ نے رستم کا مقابلہ کرنے کے لیے سعد بن ابی وقاص ﷺ کی سپہ سالاری میں مجاہدین کی ایک تازہ دم فوج بھیجی، اس فوج میں حضرت طلحہ ﷺ حضرت زبیر ﷺ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ جیسے بلند مرتبہ صحابہؓ بھی موجود تھے۔ حضرت سعد ﷺ نے قادسیہ جا کر قیام کیا اور امیر المومنین کی ہدایت کے مطابق چودہ آدمیوں کو سفیر بنا کر یزدگرد کے پاس بھیجا۔ بادشاہ نے پہلے اپنی شان وشوکت اور قوت سے انہیں مرعوب کرنا چاہا، پھر روپے پیسے کا لالچ دے کر کہا کہ تم اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ مگر وہ نہ مانے اور کہا کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ یا جزیہ دینا قبول کرو ورنہ ہم تم سے جنگ کریں گے، یزدگرد نے غصہ میں آ کر کہا کہ "جاؤ! ہمیں تمہاری شرطیں منظور نہیں ہیں، رستم آ رہا ہے وہ تم سب کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا۔"

رستم کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی مگر وہ مسلمانوں کا سامنا کرنے سے گریز کرتا تھا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک لڑائی کو ٹالتا اور مصالحت کی کوشش کرتا رہا مگر ناکامی ہوئی۔

حضرت سعد ﷺ نے فوج کو تیاری کا حکم دیا، اور سپاہیوں کو اسلام کی عزت قائم رکھنے اور اللہ کا نام بلند رکھنے کی نصیحت کی اور اس راہ میں جان کی بازی لگانے پر آمادہ کیا، آپ کی اس تقریر نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک آگ سی لگا دی۔

محرم 14ھ میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ حضرت سعدؓ بیمار ہونے کی وجہ سے حرکت سے معذور تھے، خالد بن عرفہ کو نیچے کھڑا کر دیا تھا اور خود پرچوں پر حکم لکھ لکھ کر اور گولیاں بنا بنا کر نیچے پھینکتے جاتے تھے، خالد ان ہدایات کے مطابق فوج کو احکام پہنچاتے تھے۔

اللہ اکبر کے نعروں سے جنگ شروع ہوئی، دن بھر ہنگامۂ محشر بپا رہا، شام کو جب تاریکی چھا گئی تو دونوں حریف اپنے اپنے خیموں میں واپس آ گئے۔ قادسیہ کا یہ پہلا معرکہ تھا، عربی میں اس کو ''یوم رماث'' کہتے ہیں۔

اس روز بظاہر ایرانی غالب نظر آتے تھے، اور اس کی وجہ ان کے ہاتھی تھے۔ لڑائی شروع ہوئی تو ایرانی ہاتھیوں نے مسلمانوں کا بڑا نقصان کیا۔ قبیلہ بنی اسد نے بڑی جانبازی سے ہاتھیوں کے ریلے کو روکا، لڑائی جاری تھی کہ رات ہو گئی اور دونوں فوجیں اپنے اپنے کیمپوں میں واپس آ گئیں۔

دوسرے دن عربوں نے بھی اونٹوں کو کالے برقعے پہنا کر ہیبت ناک بنا دیا جس سے ایرانی گھوڑے بدکنے لگے۔ آدھی رات تک جنگ جاری رہی۔ مولانا معین الدین لکھتے ہیں:

''قادسیہ کی دوسری جنگ ''یوم الاغواث'' کے نام سے مشہور ہے۔''

اس معرکہ میں مہم شام کی چھ ہزار فوج عین جنگ کے وقت پہنچی اور حضرت عمرؓ کے قاصد بھی جن کے ساتھ بیش قیمت تحائف تھے عین جنگ کے موقع پر پہنچے اور پکار کر کہا: ''امیر المومنین نے یہ انعام ان لوگوں کے لیے بھیجا ہے جو اس کا حق ادا کریں۔ اس نے مسلمانوں کے جوش و خروش کو اور بھی بھڑکا دیا۔

تمام دن جنگ ہوتی رہی، شام تک مسلمان دو ہزار اور ایرانی دس ہزار مقتول و مجروح ہوئے مگر فتح و شکست کا کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ تیسرا معرکہ ''یوم العماس'' کے نام سے مشہور ہے، اس میں مسلمانوں نے سب سے پہلے کوہ پیکر ہاتھیوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی کیونکہ ایرانیوں کے مقابلے میں مجاہدین اسلام کو ہمیشہ اس کالی آندھی سے نقصان پہنچا تھا۔ اگرچہ قعقاع نے اونٹوں پر سیاہ جھول ڈال کر ہاتھی کا جواب ایجاد کر لیا تھا۔ تاہم یہ کالے دیو جس طرف جھک پڑتے تھے صف کی صف الٹ جاتی تھی۔ حضرت سعدؓ نے ضخم و سلم پارسی نومسلموں سے اس کے متعلق مشورہ طلب کیا، انہوں نے کہا کہ ان کی آنکھیں اور سونڈ بیکار کر دیئے جائیں۔ حضرت سعد

ؓ نے فوج کو مخاطب کر کے کہا:

''میرے بہادرو! ہماری فتح ان ہاتھیوں پر قابو حاصل کر لینے پر موقوف ہے۔ کوشش کر کے ان ہاتھیوں سے نمٹ لو، بہت جلد فتح کا جھنڈا تمہارے ہاتھوں میں ہوگا۔''

نیز انہوں نے قعقاع، حمال اور ربیع کو اس خدمت پر مامور کیا۔ انہوں نے ہاتھیوں کو نرغے میں لے لیا اور برچھے مار مار کران کی آنکھیں بے کار کر دیں۔ قعقاع نے آگے بڑھ کر سفید ہاتھی کی سونڈ پر ایسی تلوار ماری کہ مستک الگ ہوگئی، ہاتھی جھرجھری لے کر بھاگا اس کا بھاگنا تھا کہ تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہو لیے، اِس طرح دم کی دم میں سیاہ بادل چھٹ گیا۔

اب بہادروں کو حوصلہ افزائی کا موقع ملا، گھمسان کا رَن پڑا۔ مجاہدین اسلام کے نعروں سے زمین دہل اٹھتی تھی۔ رستم پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔ آخر میں زخموں سے چور چور ہو کر بھاگ نکلا اور ایک نہر میں کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے مگر ہلال بن علقمہ نامی مجاہد نے اس کا تعاقب کیا اور ٹانگیں پکڑ کر نہر سے باہر کھینچ لایا اور تلوار سے کام تمام کر دیا۔ رستم کی موت کے ساتھ سلطنت ایران کی قسمت کا بھی فیصلہ ہوگیا۔ ایرانی سپاہیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مسلمانوں نے دور دور تک تعاقب کر کے ہزاروں نعشیں میدان میں بچھا دیں۔ خدا کی شان دیکھیے کہ رستم مسلمانوں کو قادسیہ کی خندق میں دفن کرنے آیا تھا لیکن آج انہی ناتواں ہاتھوں سے اس کی طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اس کی بے گور و کفن لاش قادسیہ کے میدان میں پڑی تھی۔

قادسیہ کے میدان میں ایرانی عظمت ختم ہوئی۔ وہ محلات، باغات، چشمے، کھیت اور صحت افزا مقامات جن میں خدا کے باغی رنگ رلیاں منایا کرتے تھے چھوڑ کر بھاگ گئے اور قرآن مجید پر چلنے والے مسلمان ان کے وارث بنے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر غور کیجیے:

كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝

كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝

''کافر بہت سے باغ اور چشمے اور کھیت اور عمدہ مکانات اور آرام کا سامان چھوڑ گئے جس میں وہ باتیں بنایا کرتے تھے، یونہی ہوتا تھا اور یہ سب سامان ہم نے دوسری قوم کو عطا کر دیا۔ نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ انہیں مہلت دی گئی۔'' (سورۃ الدخان: آیت ۲۵ تا ۲۹)

ایرانیوں کی شکستِ فاش پر ایرانی محلات میں داخل ہوتے ہوئے فاتحِ ایران حضرت

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور زبان پر بے ساختہ یہی مذکورہ آیات جاری ہو گئیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے شاہی محل میں نمازِ شکر ادا کی، پھر وہیں صفر 16ھ کو جماعت کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کی گئی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ فتح کے بعد دو مہینے تک قادسیہ ٹھہرے جب ان کی فوجیں تازہ دم ہو گئیں تو دوبارہ خلافت کے حکم کے مطابق مدائن کی فتح کے ارادے سے آگے بڑھے۔ زہرہ بن حویہ کی سرکردگی میں آپ نے کچھ فوج آگے روانہ کردی تھی مقام برس میں زہرہ کا ہرمز سے مقابلہ ہوا اور اسے شکست دی اور وہ بابل کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنی فوج لیے ہوئے فرات کو پار کر کے بابل پہنچے یہاں بہت سے ایرانی سردار فیروز، ہرمز، مہران اور مہر جان وغیرہ اپنی فوجیں لیے پڑے تھے۔ لیکن مسلسل شکستوں سے کچھ ایسے مرعوب ہو گئے تھے کہ مقابلہ میں ٹھہر نہ سکے اور پہلے ہی حملے میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بہرہ شیر کا رُخ کیا اور دو ماہ تک محاصرہ کیے رکھا۔ ایک دن محصورین نے قلعہ سے جوش و خروش کے ساتھ نکل کر مقابلہ کیا۔ لیکن آخرکار بھاگ نکلے اور دریا کو پار کر کے مدائن میں داخل ہو گئے۔

❁............❁............❁

حضرت سفیان بن مجیب الازدی رضی اللہ عنہ

حضرت سفیان بن مجیب اُزدی رضی اللہ عنہ قدیم صحابہ میں سے تھے۔ آخری حج میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی قیادت میں غزوات میں حصہ لیا تھا۔ اِس طرح انہیں رسولِ پاک ﷺ کی صحبت اور آپ ﷺ کی قیادت میں لڑائی کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے سرزمینِ شام کے جہاد میں بڑھ چڑھ کر قائدانہ حصہ لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب امیر معاویہ شام کے والی تھے تو انہوں نے حضرت سفیان رضی اللہ عنہ کو طرابلس کی فتح پر مامور کیا، انہوں نے وہاں جا کر اپنے لوگوں کے لیے ایک قلعہ بنایا اس قلعہ کا نام انہی کے نام سے تھا۔ انہوں نے اہلِ طرابلس کا محاصرہ کر کے ان کا دانہ پانی بند کر دیا۔ جس سے مجبور ہر کر انہوں نے شاہ روم سے مدد مانگی کہ فوج بھیجی جائے یا پھر کشتیاں بھیجی جائیں تا کہ ہم جان بچائیں چنانچہ اس نے کشتیاں بھجوا دیں اور یہ لوگ راتوں رات ان میں بیٹھ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت سفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے آدمی رات کو اپنے قلعہ میں ہی ہوتے تھے جب صبح اٹھے تو انہیں طرابلس کا قلعہ خالی نظر آیا، اور انہوں نے جا کر اس پر قبضہ کر لیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فتح کی خوشخبری لکھ بھیجی۔

حضرت سفیان رضی اللہ عنہ بعلبک کے والی رہے۔ وہ بڑے متقی، پارسا، سچے، وفادار، خوددار، بہادر اور نہایت شریف تھے۔

انہوں نے رسولِ پاک ﷺ سے صرف ایک حدیث روایت کی ہے۔ طرابلس ایک قلعہ نما شہر تھا، اس میں قلعہ بند ہو کر دفاع کرنے والوں کا سمندر کے ذریعہ روم سے باقاعدہ رابطہ تھا۔ رومیوں کو اپنے بحری بیڑے کی وجہ سے مسلمانوں پر برتری حاصل تھی، اسی وجہ سے وہ کافی

عرصہ تک قلعہ بند رہے اور مسلمانوں کو دیر تک محاصرہ کی مشقت برداشت کرنا پڑی۔

محاصرہ کے دوران وہی کمانڈر کامیاب رہ سکتا ہے جس میں انتہائی ضبط اور انتہائی صبر ہو، اور اس کی سپاہ میں بھی ضبط اور اطاعت کی صفات موجود ہوں، طویل محاصرہ کے بعد مسلمانوں کی فتح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بے مثال صبر وضبط کے حامل تھے اور اعلیٰ تربیت یافتہ۔

روم کے خلاف خود اپنے اور سپاہ کے لیے انہوں نے قلعہ بنایا، رات اس میں گزارتے اور صبح دشمن پر ہلّہ بول دیتے تھے۔ اس طرح ایک طویل عرصہ تک محاصرہ قائم رکھنے میں آسانی کے ساتھ کامیاب رہے۔

حضرت سفیان ﷺ کے قلعہ بنانے کی سوچ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان میں انتظامی امور کی قابلیت اعلیٰ درجے کی موجود تھی۔ قلعہ بنانا آج بھی کوئی آسان کام نہیں انہوں نے اس زمانے میں کیسے یہ قلعہ بنایا ہوگا؟

وہ بڑے عقل منداور صاحبِ بصیرت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فیصلے صحیح ہوتے تھے وہ مضبوط شخصیت اور پختہ عزم کے مالک تھے، ان کے اعصاب بھی مضبوط تھے۔ وہ اپنے آدمیوں سے پیار کرتے تھے اور ان کا سلوک بھی ان سے بڑا پیارا تھا۔ وہ بڑے بہادر اور آگے بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والے تھے تاریخ حضرت سفیان ﷺ کو فاتحِ طرابلس کے نام سے یاد رکھے گی اور یہ بھی یاد رکھے گی کہ وہ پہلے عرب مسلمان کمانڈر ہیں کہ جنہیں قلعہ بنانے کی سوجھی، جس سے دشمن کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے اور اس سے رومیوں کا مورال بھی تباہ ہوا اور انہیں وہاں سے ہٹانے میں آخر تک کامیاب نہ ہو سکے اور قلعہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

اللہ تعالیٰ اس صابر و مجاہد اور فاتح و قائد صحابی سفیان بن مجیب ازدی ﷺ سے راضی ہوں۔

❁.........❁.........❁

حضرت سہیل بن عدی رضی اللہ عنہ

حضرت سہیل رضی اللہ عنہ قبیلہ انصار کی مشہور شاخ خزرج سے تعلق رکھتے تھے کافی پہلے اسلام قبول کیا۔ آنحضرت ﷺ کی قیادت میں غزوۂ بدر، احد، اور دیگر تمام غزوات میں خوب دادِ شجاعت دی۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی کمان میں جو لشکر ارضِ شام کی طرف روانہ ہوا، اس میں شامل تھے اور یہاں بڑی بہادری کے ساتھ لڑے۔ وہاں سے واپس آئے۔ تو مرتدوں کے خلاف لڑے۔ پھر ارضِ عراق کا رُخ کیا اور وہاں کی تمام جنگوں میں شریک رہے۔ معرکۂ جسر میں ان کے بھائی حارث نے دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت پائی۔

قادسیہ اور دوسری جنگوں میں وہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی کمان میں لڑے اور بہادری، دلیری اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ سہیل بن عدی کو فوج کی کمان دے کر رقہ روانہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے فوج دے کر سہیل رضی اللہ عنہ کو رَقہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے جا کر رقہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہل رقہ نے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ اس کے بعد سہیل رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج عیاض کی فوج میں ملا دی اور حران پر ہلہ بول دیا۔ حران والوں نے کہا کہ ہم جزیہ دیں گے۔ بعد ازاں حضرت سہیل رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عتبان نے رہا کا رُخ کیا۔ انہوں نے بھی جزیہ دینا منظور کر لیا۔ اس لحاظ سے جزیرہ کی فتح بآسانی ہوگئی۔ اس کے بعد سہیل کوفہ رضی اللہ عنہ آئے اور پھر بصرہ پہنچے وہاں انہیں عَلَم دے کر کرمان کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا۔ اِسی دوران انہوں نے جنگِ نہاوند میں حصہ لینے والی ایرانی سپاہ کو بہت پریشان کیا۔ ان کی رسد کے راستے بند کر دیئے اور اہل نہاوند کے لیے اپنی فوج کی امداد کو

ناممکن بنا دیا۔ جب مسلمانوں کو نہاوند میں اللہ تعالیٰ نے فتح دی تو سہیل ؓ اپنے مشن پر کرمان روانہ ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان ؓ بھی اپنی امدادی فوج کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ کرمان میں بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں ایرانی سپاہ کا بڑا سخت جانی نقصان ہوا اور اُسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

مکران کی لڑائی میں بھی حضرت سہیل ؓ اپنی فوج کے ہمراہ امدادی فوج کی حیثیت سے شریک رہے۔ اس طرح مسلمانوں کا پلہ ایرانیوں پر بھاری رہا۔ اور مجاہدینِ اسلام نے اللہ کی مہربانی سے مکران بھی فتح کر لیا۔

حضرت سہیل ؓ بن عدی بڑے عمدہ شعر کہتے تھے جو زیادہ تر جہاد اور معرکوں سے متعلق ہوتے تھے۔

جنرل محمود شیت خطاب لکھتے ہیں:

> ''وہ بڑے مضبوط ایمان و عقیدہ کے مالک تھے اور اِسی کی خاطر بے جگری سے لڑتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے جزیرہ میں اسلام کا بول بالا کر دیا۔ وہ بڑے مخلص تھے۔ انہوں نے اپنا سب کچھ جہاد کی راہ میں قربان کر دیا تھا۔ وہ حرص و لالچ سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ بڑے وفادار، شریف، سخی، مہمان نواز، دلیر، بہادر، غیرت مند اور قول و فعل میں انتہائی سچے تھے۔''

انہوں نے اپنی تھوڑی فوج کے ساتھ ہمیشہ بڑی فوج کا مقابلہ کیا اور فاتح رہے۔ ان میں تمام قائدانہ صفات موجود تھیں۔ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بہت عمدہ سلوک کرتے تھے اس لیے وہ بھی ان پر مرتے تھے۔ ان کی فتوحات سے مسلمانوں کے مورال پر بڑا خوشگوار اثر پڑا۔

اللہ تعالیٰ اس جلیل القدر صحابی اور فاتح سہیل بن عدی ؓ کے درجے مزید بلند کریں اور ہمیں ان کی پیروی کی توفیق نصیب ہو۔ (آمین)

❀..........❀..........❀

حضرت شُرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ

شُرجیل بن حسنہ بن عبداللہ بن المطاح بن عمرو بن کندہ بنو زہرہ کے حلیف تھے، کنیت ابوعبداللہ تھی، والدہ کا نام حَسَنَہ ہے۔ والد کی جگہ والدہ کا نام اس لیے غالب ہے کہ ان کے والد ان کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے، اور انہوں نے اپنی والدہ کی گود میں پرورش پائی، اور انہی کے پاس رہے، ان کا تعلق یمن سے تھا۔

بہت پہلے مکہ میں اسلام قبول کیا۔ حبشہ کی دوسری ہجرت میں شریک تھے، وہ رسولِ پاک ﷺ کے اونچے درجہ کے صحابہ ؓ میں سے تھے۔ رسولِ پاک ﷺ کی کمان میں کئی غزوات میں حصہ لیا، اس طرح انہیں رسولِ پاک ﷺ کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا اور ان کے جھنڈے تلے لڑنے کی سعادت بھی ملی۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حضرت عکرمہ ؓ بن ابی جہل کو مسیلمہ کذاب کے خلاف لشکر دے کر بھیجا، پھر ان کے بعد حضرت شرجیل بن حسنہ کو روانہ کیا۔ لیکن عکرمہ ؓ نے جلدی سے کام لیا اور دشمن پر حملہ کر دیا تا کہ مسیلمہ کی تباہی کا اعزاز انہی کے حصہ میں آئے۔ مگر وہ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے، شرجیل ؓ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ انہیں حضرت ابوبکر کا ؓ خط ملا جس میں انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ سرِ دست یہیں ٹھہریں اور دوسرے حکم کا انتظار کریں، پھر انہیں حضرت خالد بن ولید ؓ کو لکھنے سے پہلے لکھا کہ "جب خالد بن الولید ؓ تمہارے پاس پہنچیں اور تم اپنے کام سے فارغ ہو جاؤ تو قضاعہ سے جا ملیں یہاں تک کہ تم اور عمرو بن العاص ؓ ان منکروں اور مخالفوں کے سر پر جا پہنچو۔" مگر شرجیل ؓ نے بھی جلدی سے کام لیتے ہوئے دشمن پر حملہ کر دیا، اور اس حملہ کا نتیجہ بھی حضرت عکرمہ ؓ کے حملے سے مختلف نہ تھا، اس پر حضرت

خالد ؓ جب وہاں پہنچے تو انہوں نے انہیں جلدی کرنے پر ملامت کی۔

حضرت خالد ؓ ہراول دستے کی قیادت کرتے ہوئے مسیلمہ کی طرف روانہ ہوئے شُرجیل ؓ بھی ان کے ہمراہ تھے، اور وہ ان مجاہدین کی قیادت کر رہے تھے جنہوں نے بنو حنیفہ اور ان کے حلیفوں (مسیلمہ کے لشکر) سے عقرباء کے مقام پر شکست کھائی تھی اور انہیں کافی آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔

جنگِ یمامہ (جس میں مسیلمہ کذاب کو تہس نہس کر دیا گیا تھا) کے بعد ظاہر ہے کہ شرجیل ؓ حضرت خالد بن الولید ؓ کے ہمراہ رہے، اور عراق کی مہم میں بھی ان کے ساتھ رہے اور اس دوران 12 ہجری میں لڑی جانے والی تمام جنگوں میں شریک رہے، جب شرجیل ؓ حضرت خالد ؓ کی طرف سے حضرت ابوبکر ؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے شرجیل ؓ کو شام جانے کا حکم دیا اور کچھ اور لوگوں کو بھی ان کے ہمراہ کیا، اس طرح 13 ہجری میں شام میں انہیں اسلامی لشکروں میں سے ایک لشکر کی قیادت کا موقع ملا۔

شرجیل ؓ نے تبوک کے راستے شام کا رُخ کیا۔ حضرت ابوبکر ؓ کمانڈروں کی امداد کے لیے برابر مجاہدین بھجواتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت شرجیل ؓ کے پاس سات ہزار پانچ سو کی تعداد ہو گئی، حضرت ابوبکر ؓ نے انہیں ساتھ ہی اردون کا والی بھی مقرر کر دیا تھا۔ عساکرِ اسلام برابر شام پہنچ رہے تھے۔ ہرقل نے بھی اپنے لشکر اور کمانڈر بھجوا دیئے تاکہ اصل حملہ سے پہلے مسلمانوں کو مشغول رکھا جائے۔ انہیں کمزور کر کے ان کا مورال ختم کیا جائے۔ مگر عساکرِ اسلام کے کمانڈروں نے باہمی مشورہ اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی تائید کی، یرموک میں کیمپ کیا، اور اس طرح ہرقل کا وہ منصوبہ خاک میں مل گیا۔ جنگِ یرموک میں حضرت شرجیل ؓ مہاجرین و انصار کے ان سو نامور مجاہدین میں سے تھے جنہیں حضرت خالد ؓ نے گوریلا ایکشن کے لیے چُنا تھا۔ ان میں ہر شہسوار ہزار کے برابر تھا اور مقصد اصل جنگ سے پہلے رومیوں کے مورال کی تباہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جنگِ یرموک میں میمنہ کے دستوں کی قیادت کر رہے تھے اور روم کے خلاف مسلمانوں کی اس فتح میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اِسی طرح انہوں نے حضرت خالد بن الولید ؓ، حضرت ابوعبیدہ ؓ اور یزید ؓ بن ابی سفیان کی معیت میں بصریٰ کی فتح میں بھی حصہ لیا تھا۔ پھر یہ سب عمرو بن العاص کی امداد کے لیے فلسطین پہنچے، اور اجنادین میں

پڑاؤ کیا، وہاں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو رومیوں پر فتح دی۔

ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے "فحل" کا قصد کیا۔ ہراول دستے میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن الولید اور قلب پر شرجیل تھے۔ بازوؤں پر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے۔ فحل کے رہنے والوں نے "بیسان" کا رُخ کیا، اور وہاں پانی چلا دیا جس سے پورا علاقہ پانی سے بھر گیا۔ کچھ عرصہ محصور رہنے کے بعد وہ لوگ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے پوری رات اور اگلا دن لڑائی ہوتی رہی لڑائی بہت ہی سخت تھی، پھر جب رات آ گئی تو پسپا ہوئے اور انہیں شکست ہوئی، انہیں راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس جنگ میں ان کا سخت جانی نقصان ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

اس جنگ میں رومیوں کی تباہی کا سہرا زیادہ تر شرجیل رضی اللہ عنہ کے سر ہے، وہ دن رات پوری طرح ہوشیار رہتے اور دشمن کی معمولی نقل و حرکت پر ان کی نظر ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دشمن نے اچانک حملہ کیا تو مسلمانوں کو پوری طرح مستعد پایا، ورنہ مسلمان تباہ ہو جاتے۔

جب شرجیل رضی اللہ عنہ معرکہ فحل سے فارغ ہوئے تو مجاہدین کے ہمراہ بیسان روانہ ہوئے ان کے ساتھ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی تھے، وہاں کے رہنے والے قلعہ بند ہو گئے۔ شرجیل رضی اللہ عنہ نے محاصرہ کر لیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ باہر نکل آئے اور مسلمانوں سے لڑنے لگے مگر انہیں شکست ہوئی۔ باقی لوگوں سے دمشق کی صلح کے مطابق صلح ہو گئی۔

طبریہ والوں کو جب بیسان کا حال معلوم ہوا، تو انہوں نے بھی انہی شرائط پر شرجیل رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی، اس طرح شرجیل رضی اللہ عنہ نے اردن کی فتح مکمل کر لی۔

❀............❀............❀

حضرت عبادہ بن الصامت انصاری رضی اللہ عنہ

آپ کا تعلق قبیلہ انصار کی شاخ خزرج سے تھا۔ والد کا نام قیس تھا۔ وہ اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔

عقبہ ثانیہ کے موقع پر دوبارہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انصار کے دیگر حضرات کے ساتھ رسول پاک ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ اگر آپ ﷺ تشریف لائیں تو ہم جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح آپ ﷺ کی بھی کریں گے۔ وہ انصار کے بارہ سرداروں میں سے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے اور ابی مرثد الغنوی کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ رسول پاک ﷺ کی قیادت میں غزوہ بدر، اُحد، خندق اور دیگر تمام غزوات میں شرکت کی۔ رسولِ پاک ﷺ نے انہیں صدقات کی وصولی کے لیے بھی مقرر فرمایا تھا اور ہدایات دی تھیں۔

بنو قینقاع جس طرح مشہور منافق عبداللہ بن اُبی کے حلیف تھے اِسی طرح حضرت عبادہ کے بھی حلیف تھے۔ جب بنو قینقاع نے رسولِ پاک ﷺ سے جنگ کی تو عبداللہ بن ابی نے کھڑے ہو کر ان کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اے محمد ﷺ! میرے حلیفوں سے اچھا سلوک کریں۔ اس پر رسولِ اکرم ﷺ کے رُخِ انور پر ناگواری اور غصہ کے آثار نمایاں ہوئے۔ جہاں تک حضرت عُبادہ کا تعلق ہے انہوں نے نہ ان کا ساتھ دیا اور نہ حمایت کی بلکہ رسولِ پاک ﷺ کی خدمت میں آ کر ان سے بیزاری کا اعلان کیا اور عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اس کے رسول اور مومنوں سے دوستی ہے اور اپنے ان کافر حلیفوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ اِسی پر قرآن کی یہ آیت اتری:

"اے مومنو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ، وہ (تو) آپس

میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو تم میں سے ان سے دوستی کرے گا پس وہ انہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔" (المائدہ:۵۱)

حضرت عبادہ ﷺ امانتِ اخلاق اور گہرے ایمان کی مثال تھے۔ حضرت یزید بن ابی سفیان نے حضرت عمر فاروق ﷺ کو لکھ بھیجا کہ "اہلِ شام کی تعلیمِ دین اور فقہ" کے لیے کچھ آدمی بھجوا دیجیے۔" اس پر حضرت عمر فاروق ﷺ نے معاذ بن جبل، عبادہ اور ابوالدرداء کو بھجوا دیا۔ چنانچہ عبادہ ﷺ حمص میں رہے، اور جب ابوعبیدہ بن الجراح ﷺ لاذقیہ کی فتح کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو انہیں اپنی جگہ قائم مقام مقرر کیا۔ پھر "انطرطوس" کی فتح پر مقرر کیا اور انہوں نے اسے فتح کر لیا۔

مصر کی فتح میں بھی شریک تھے۔ حضرت عمر فاروق ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص ﷺ کی مدد کے لیے چار ہزار مجاہد روانہ کیے اور ہر ہزار مجاہد پر ایک ایسا آدمی مقرر کیا جو بذاتِ خود ہزار آدمی کے برابر تھا۔ وہ زبیر بن العوام، مقداد بن الاسود، عبادۃ بن الصامت اور خارجہ بن حذافہ تھے۔ حضرت عمر ﷺ نے انہیں لکھا کہ "میں چار ہزار مجاہدوں کی کمک بھیج رہا ہوں اور ہر ہزار پر ایک آدمی ایسا مقرر کیا ہے جو ایک ایک ہزار کے برابر ہے۔

مقوقس نے حضرت عمرو بن العاص ﷺ سے بات چیت کے لیے کچھ آدمی بھجوانے کو کہا تاکہ ہم کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ حضرت عمرو ﷺ نے دس آدمی منتخب کیے جن میں ایک حضرت عبادہ ﷺ بھی تھے۔ مقوقس نے کہا کہ "ہم زیادہ اور طاقت ور ہیں جبکہ تم کمزور اور غریب لوگ ہو، تم میں ہمارے مقابلہ کی سکت کہاں؟ اس لیے تم واپس چلے جاؤ، میں تمہارے ہر آدمی کو دو، تمہارے امیر کو سو اور تمہارے خلیفہ کو ہزار دینار دے دیتا ہوں۔"

اس کے جواب میں حضرت عبادہ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی کم مِن ...... (کتنی ہی تھوڑی سی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔) (البقرہ) اور کہا جہاں تک مقابلہ کا تعلق ہے تو ہم میں سے ہر مسلمان صبح و شام اپنے رب سے شہادت ملنے کی دعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہماری معاشی حالت بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے امیر اور خلیفہ کا حکم یہی ہے۔ ہم تین باتیں آپ کے سامنے رکھتے ہیں ان میں سے جسے چاہے اختیار کر سکتے ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ اگر آپ اسلام قبول کر لیں تو عرب یہاں سے

واپس چلے جائیں گے۔ دوسری یہ کہ اگر اسلام قابلِ قبول نہیں تو پھر جزیہ دیں پھر مسلمان آپ کی حمایت اور دفاع کریں گے، اور اگر یہ دونوں منظور نہیں تو پھر جنگ کے سوا اور کوئی بات باقی نہیں رہ جاتی۔

طرفین کے درمیان بابلیوں کے قلعہ کے آس پاس جنگ شروع ہو گئی جس میں اللہ پاک نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

مصر کی تمام فتوحات میں وہ حضرت عمروؓ کی کمان میں لڑے اور بڑی بہادری سے لڑے، اور انہوں نے ہی اسکندریہ فتح کیا۔ پھر واپس شام آگئے اور یہاں حضرت امیر معاویہ کی کمان میں جزیرہ قُبرص کی فتح میں شریک ہوئے، اس جزیرہ کی فتح میں بھی ان کا حصہ نمایاں تھا۔ حضرت عُبادہؓ اولین مسلمانوں اور سرکردہ لوگوں میں سے تھے (وہ عقبہ اولیٰ، ثانیہ اور ثالثہ میں شریک رہے) رسولِ پاک ﷺ کے زمانہ مبارک میں جمع قرآن کی خدمت کی سعادت بھی حاصل کی وہ سچی بات کے کہنے میں کبھی کسی کی رورعایت نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اہلِ شام کے لیے انہیں معلم بنا کر بھیجا تھا اور اس سے قبل وہ اہلِ صفہ کو قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ وہ فلسطین کے پہلے قاضی مقرر ہوئے، انہوں نے رسولِ پاک ﷺ سے 181 حدیثیں روایت کی ہیں (وہ مفتی اور فقیہہ صحابہ میں سے تھے) ابوعبیدہؓ نے انہیں حمص کا والی مقرر کیا، پھر جہاد کے لیے بھیجا اور جب حضرت ابوعبیدہؓ کا وصال ہوا تو حضرت عمرؓ نے انہیں حمص کا والی مقرر کیا، پھر مصر کے جہاد کے لیے بھیجا۔ پھر وہ واپس شام آگئے 72 سال کی عمر میں رملہ یا بیت المقدس میں وصال ہوا۔ ہجرت سے کوئی 37 سال پہلے ان کی ولادت ہوئی۔

حضرت عبادہؓ ممتاز صحابی، عالم، فقیہہ، محدث، انتہائی متقی اور پارسا تھے انہوں نے اپنی جان سے زیادہ اپنے عقیدہ کے لیے کام کیا بلکہ اپنے عقیدے کی خاطر تو وہ اپنے آپ کو بھی بھول گئے تھے۔

حضرت عبادہؓ تنہا ایک ہزار آدمی کے برابر تھے اور وہ یوں کہ وہ ذاتی شجاعت کے ساتھ انتہائی مضبوط ایمان وعقیدہ کے مالک تھے۔ وہ دشمن پر بڑھ بڑھ کر حملہ کرتے اور جنگ کی شدتوں اور سختیوں کی ہرگز پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے وجود سے مسلم سپاہ کا مورال ہمیشہ بلند رہا، اور وہ شہادت کے ہمیشہ متمنی رہے، وہ موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ (بلکہ وہ تو اس کی تمنا

کرتے تھے) اور اس بات کا اثر ان کے ماتحت عملہ پر بہت زیادہ ہوتا تھا۔ وہ بڑے مدبر اور سمجھدار تھے وہ دشمن کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر کے جنگی نقشہ تیار کیا کرتے تھے جو ہمیشہ صحیح ہوتا۔ ان کا بے داغ ماضی، ان کے زیرِ کمان لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا اور دونوں میں محبت و اعتماد کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔

حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ اپنی ذات میں تنہا ایک امت تھے۔ اللہ تعالیٰ اس جلیل القدر صحابی، محدث، فقیہہ، قاضی، عادل، قائد اور فاتح عبادہ بن الصامت کے درجے مزید بلند کریں۔ آمین

❁............❁............❁

26

حضرت عبداللہ بن سعد بن اَبی سرح القرشی رضی اللہ عنہ

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بن حبیب بن حذیمہ بن حسل بن عامر بن لوی القرشی العامری کی کنیت ابویحییٰ تھی۔ ابوسرح انام الحسام تھا۔ ان کی والدہ مہاتبہ بنت جابر اشعری قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اس طرح عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دودھ شریک بھائی تھے۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ کاتب وحی تھے۔ پھر اسلام سے پھر گئے اور مکہ چلے آئے جب آپ ﷺ اور مسلمانوں نے مکہ فتح کیا تو آپ ﷺ نے جن چند کافروں کا خون مباح کر دیا تھا ان میں عبداللہ بن سعد بھی تھے۔ وہ دوڑ کر اپنے دودھ شریک بھائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے انہوں نے انہیں چھپا دیا اور پھر ان کے لیے امن کی درخواست کی۔ آپ بہت دیر تک خاموش رہے اور پھر امن دے دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ میری خاموشی اس لیے تھی کہ تم میں سے کوئی اٹھ کر اس کا کام تمام کر دے۔ ایک انصاری نے عرض کی آپ ﷺ نے اشارہ کر دیا ہوتا۔ فرمایا کہ نبی کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی کو اشارہ سے قتل کرے۔

اس کے بعد عبداللہ رضی اللہ عنہ سچے دل سے اسلام لے آئے اور پھر اس کے بعد برابر اس پر عمل پیرا رہے۔ رسولِ پاک ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی مگر شرم سے سامنے آنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس کا تذکرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کیا تو فرمایا: ''اسلام سے پہلے کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔'' اس کے بعد عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو سلام بھی کرتے اور مجلس میں بھی بیٹھتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان کی زندگی جہاد اور خدمتِ اسلام میں گزری۔

ارض شام کی فتوحات میں اسلامی لشکر میں شریک رہے۔ جب حضرت عمرو بن العاص ﷛ فتح مصر کے لیے روانہ ہوئے تو عبداللہ ﷛ ان کے ساتھ تھے اور میمنہ کے قائد تھے۔ حضرت عمرو بن العاص ﷛ انہیں افریقہ بھیجتے اور یہ غازی بن کر واپس آتے۔ حضرت عمر ﷛ نے انہیں صعید (مصر) کا والی مقرر کیا۔

حضرت عثمان ﷛ نے اپنے عہدِ خلافت میں انہیں صعید کے علاوہ پورے مصر کا والی مقرر کیا انہوں نے اس کے بعد افریقہ میں اپنے دستے بھیجے جوان مہموں میں کامیاب رہے اس پر عبداللہ ﷛ نے حضرت عثمان ﷛ کو لکھا اور افریقہ کو فتح کرنے کی اجازت بھی دی اور مدینہ سے بہت سے حضرات عبداللہ بن عباس ﷛، عبداللہ بن عمر ﷛، عبداللہ بن عمرو العاص ﷛، عبداللہ بن زبیر ﷛ عبداللہ جعفر ﷛ اور حضرت حسن ﷛ وحسین ﷛ بھی روانہ ہوئے اس لشکر کو عبادلہ کا لشکر اس وجہ سے کہتے تھے کہ اس میں کئی عبداللہ شامل تھے۔

26 ہجری میں عبداللہ بن سعد ﷛ نے بیس ہزار کے لشکر کے ساتھ افریقہ کا رُخ کیا۔ جب بَرقہ پہنچے تو وہاں انہیں اپنے لشکر کے ہمراہ ملے۔ ان سب نے مغربی طرابلس کا رُخ کیا اور پھر وہاں سے افریقہ کا رُخ کیا۔ عبداللہ ﷛ نے تمام اطراف میں اپنے آدمیوں کو پھیلا دیا۔ طرابلس سے طنجہ تک جرجیر کی حکومت تھی، اس کا ہیڈ کوارٹر قرطاجز میں تھا۔ قیصر روم ہرقل نے اسے افریقہ کی ولایت دی تھی اور وہ ہر سال باقاعدگی سے خراج بھجواتا تھا۔

عقوبہ کے مقام پر جرجیر کے عظیم لشکر (جس کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی) سے مجاہدینِ اسلام کا سامنا ہوا۔ عبداللہ ﷛ نے جرجیر کو دعوت اسلام دی اور اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں جزیہ کی جسے جرجیر نے بڑے متکبرانہ انداز میں رڈ کر دیا۔ عبداللہ ﷛ نے جرجیر کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اتنے میں حضرت عبداللہ ﷛ بن زبیر کی قیادت میں مسلمانوں کی مدد کے لیے مزید کمک آ پہنچی۔ جب جرجیر کو اس کی اطلاع ملی تو اسے کافی دھچکا لگا۔

جانبین میں صبح سے ظہر تک لڑائی ہوتی پھر دونوں فریق اپنے اپنے خیموں میں واپس آ جاتے۔ جرجیر نے اعلان کر دیا کہ جو عبداللہ سعد ﷛ کو قتل کرے گا وہ اسے ایک لاکھ دینار انعام دینے کے علاوہ اپنی بیٹی بھی اسے بیاہ دے گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ﷛ نے حضرت عبداللہ ﷛ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ بھی منادی کے ذریعہ ایسا ہی اعلان کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے کرا دیا۔ اس

کے نتیجہ میں جرجیر بہت زیادہ خائف ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ نے حضرت عبداللہ ؓ کو مشورہ دیا کہ لڑائی طول کھینچ رہی ہے اور ہم وطن سے دور ہیں۔ کمک بھی نہیں پہنچ سکتی اور دشمن کو یہ سہولت ہر وقت حاصل ہے۔ ہمیں اپنے نامور مجاہدین کو اپنے خیموں میں عبادت اور دعا کے لیے چھوڑ کر دشمن سے مقابلہ کے لیے جانا چاہیے اور ظہر کے وقت جب دشمن واپس جانے لگے تو یہ تازہ دم مجاہد اس پر ٹوٹ پڑیں۔ اس سے امید ہے کہ دشمن مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدان چھوڑ دے گا۔ عبداللہ ؓ نے جب اصحاب رائے سے اس کا مشورہ کیا تو سب نے اس کی تائید کی۔ اگلے دن ایسا ہی ہوا۔ جب رومیوں نے حسب عادت واپس اپنے خیموں کا رُخ کیا تو تازہ دم مجاہد سواروں نے انہیں جا لیا، یہ حملہ اتنا اچانک اور اتنا زوردار تھا کہ دشمن سنبھل نہ سکا۔ اِدھر مسلمان مجاہدین کے نعرۂ اللہ اکبر سے ان کے دل دہل گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ نے جرجیر کو قتل کر دیا۔ رومیوں کو شکست ہوئی اور ان کے بہت سے لوگ لڑائی میں مارے گئے جرجیر کی بیٹی کو قیدی بنا لیا گیا۔

عبداللہ ؓ نے ''سبیطلہ'' کا محاصرہ کر کے اسے بھی فتح کر لیا اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ پھر ''قفصہ'' اور ''الاجم'' کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ حضرت عبداللہ ؓ سوا سال کے بعد واپس مصر آ گئے اور عبداللہ بن زبیر ؓ افریقہ کی فتح کی خوشخبری لے کر حضرت عثمان ؓ کے پاس پہنچے۔

قبرص کی فتح میں بھی عبداللہ بن سعد ؓ نے حضرت امیر معاویہ ؓ کی بڑی مدد کی۔ 33 ہجری میں جب اہل افریقہ نے اپنا عہد و پیمان توڑ دیا تو عبداللہ بن سعد ؓ نے ان پر دوبارہ چڑھائی کر دی اور فتح پائی اور وہاں نظم قائم کیا۔

34 ہجری میں عبداللہ ؓ نے ذات الصواری میں سکندریہ کے کنارے حملہ کیا۔ ہرقل کے بیٹے قسطنطین نے بہت بڑی فوج اکٹھی کر رکھی تھی۔ پانچ یا سات سو کشتیوں اور جہازوں کا مقابلہ مسلمان مجاہدین نے دو کشتیوں سے کیا۔

اہل شام کی قیادت حضرت امیر معاویہ ؓ کر رہے تھے اور سمندر میں عبداللہ بن سعد ؓ جہاد میں مصروف تھے۔ بڑی سخت لڑائی کے بعد قسطنطین سخت زخمی ہوا اور اس کی فوج نے شکست کھائی۔ اس کی بہت سی فوج کام آئی۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ اس جنگ میں بال بال بچے انہوں نے نہایت دلیری اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کو اپنے حملوں سے خاصا پریشان کیا۔

35 ہجری میں عبداللہ رضی اللہ عنہ واپس مصر آئے اور پھر مدینہ منورہ کا رُخ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد 36 ہجری میں عبداللہ رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا گیا پھر رملہ یا عسقلان میں چلے گئے اور صبح کی نماز میں دوسری طرف جب سلام پھیرا تو اپنے رب سے جا ملے۔ یہ 36 ہجری کی بات ہے۔ عسقلان کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اسلام کے نامور سپاہی اور قائد تھے۔ ان میں تمام قائدانہ صفات موجود تھیں۔ وہ بڑے سخی، تلاوت کرنے والے اور صابر تھے۔ وہ بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ بنی عامر بن لوئی کے مشہور شہسوار تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے برابر مشورہ کیا کرتے۔ انہوں نے "والی" کے بجائے "غازی" رہنے کو اپنے لیے زیادہ پسند کیا۔ انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ جہاد میں گزارا۔ وہ بڑے اچھے اور ممتاز کمانڈر تھے۔ انہوں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کی ہے۔ تاریخ حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کو تونس، افریقہ، قبرص اور نوبہ کے فاتح کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اِسی طرح بحری جنگ "ذات الصواری" کو بھی بھلایا نہ جا سکے گا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے زندگی جہاد میں بسر کی۔

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔ آمین

27

حضرت عبداللہ بن حذافہ قرشی رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہؓ کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا، ان کی والدہ کا نام تمیمہ بنتِ حرثان تھا۔ عبداللہ حضرت خنیس کے بھائی تھے اور حضرت خنیس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے داماد تھے اور انہوں نے غزوۂ بدر میں شہادت پائی تھی، حضرت عبداللہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے۔ انہوں نے کافی پہلے اسلام قبول کیا تھا اور حبشہ کی طرف کی جانے والی دوسری ہجرت میں شامل تھے۔ انہیں رسول پاک ﷺ نے ایک دستہ کی کمان بھی سونپی تھی، نیز انہیں رسولِ پاک ﷺ کا گرامی نامہ کسریٰ کے نام لے کر جانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ کسریٰ نے گرامی نامہ چاک کر دیا، اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ مزق مُلْکَهٗ اے اللہ اس کی بادشاہی کو پاش پاش کر دے" اور ویسا ہی ہوا۔

حضرت عبداللہ غزوۂ خیبر کے تمام غزوات میں شریک رہے، آخری حج میں بھی شامل تھے۔ انہیں رسولِ پاک ﷺ نے منیٰ والوں میں اس حکم کی منادی کا کام سپرد کیا تھا کہ "ان دنوں میں کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔"

حضرت عبداللہ رسولِ پاک ﷺ کے معتمد تھے۔

حضرت عبداللہ نے سرزمین شام کے معرکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، معرکۂ قیساریہ میں رومیوں کی قید میں آ گئے۔ شاہِ روم نے ان سے کہا کہ "عیسائی ہو جاؤ تو تمہیں اپنی بادشاہت میں شریک کر لوں گا، انہوں نے صاف انکار کر دیا، اس پر انہیں سولی کا حکم دیا گیا اور تیر مارے گئے مگر انہوں نے صبر سے کام لیا، سولی سے اتار دیئے گئے۔ پھر شاہِ روم نے ایک دیگ میں پانی گرم کروایا اور انہیں اس میں پھینک دینے کا آرڈر دیا، جب شاہِ روم کے آدمی انہیں ساتھ لے کر اس طرف جا رہے تھے تو یہ رو پڑے، انہوں نے سمجھا کہ شاید اب رائے بدل گئی ہو۔ کہ اب یہ رو پڑا ہے۔ دوبارہ بادشاہ کے ہاں پیش کیے گئے، اس نے پوچھا کہ "اب عیسائی ہوتے ہو؟" انہوں نے

کہا کہ "مَیں ڈر کر نہیں رویا بلکہ مجھے تو اس وجہ سے رونا آیا کہ میری صرف ایک جان ہے جس کے ساتھ اللہ کی راہ میں یہ سلوک کیا جارہا ہے کاش کہ میری اتنی جانیں ہوتیں جتنے میرے جسم پر بال ہیں تو میں ان سب کو اللہ کی راہ میں پیش کر دیتا۔" اس جواب سے شاہِ روم بہت متاثر ہوا اور رہائی کا حکم دیا، اور کہا کہ "میرے سر کو چوم لو تو پھر چھوڑ دوں گا۔" انہوں نے جواب دیا کہ "یہ نہیں ہو سکتا" پھر کہا کہ "عیسائی ہو جاؤ مَیں اپنی بیٹی سے تمہارا نکاح کر دوں گا اور اپنی بادشاہی میں شریک کرلوں گا۔" انہوں نے اس پر بھی معذرت کر دی۔ شاہِ روم نے کہا کہ "میرے سر کو چوم لو تو تمہیں اور تمہارے ساتھ دوسرے اسّی مسلمانوں کو چھوڑ دوں گا۔" اس پر انہوں نے حامی بھر لی، اور شاہِ روم کے سر پر بوسہ دے دیا اور اپنے ساتھ اسّی مسلمانوں کو بھی رہا کروالیا۔ جب یہ حضرت عمر فاروق ؓ کے ہاں پہنچے تو حضرت عمر ؓ نے کھڑے ہو کر ان کے سر پر بوسہ دیا۔ مسلمان ان سے ازراہِ مذاق کہتے تھے کہ "آپ نے اس بادشاہ کے سر پہ بوسہ دیا" یہ ان کا جواب دیتے کہ "اس ایک بوسہ کے عوض اللہ نے اسّی مسلمانوں کو رہائی دلائی۔ عمرو بن العاص ؓ کی کمان میں فتح مصر میں بھی موجود تھے، جب عمرو نے فسطاط کو فتح کیا تو عبداللہ ابن حذافہ کو "عینِ شمس" پہ مامور کیا۔ انہوں نے جا کر عین شمس پر قبضہ کرلیا۔

اسکندریہ کی فتح کے بعد عمرو بن العاص نے وہاں عبداللہ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا، اور خود فسطاط کی راہ لی۔ اس دوران شاہِ روم نے اپنے ایک قائد کو فوج دے کر بھیجا تا کہ وہ اسکندریہ پر دوبارہ قبضہ کرلے مگر مسلمانوں کے جوابی حملے سے انہیں مُنہ کی کھانی پڑی۔

حضرت عبداللہ بڑے مضبوط ایمان وعقیدہ کے مالک تھے، وہ بڑے عقلمند اور سمجھدار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ پاک ﷺ نے انہیں کسریٰ کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ قید کے دوران اپنے عقیدے کی خاطر انہوں نے مثالی صبر وضبط سے کام لیا۔ شاہِ روم کے وعدہ وعید سے وہ ہرگز متاثر نہ ہوئے، اور استقامت کا ثبوت دیا، بالآخر انہیں تکلیفیں دینے والے ہار گئے اور انہیں اللہ تعالیٰ نے رہائی بخشی، اس سے ان کا ایمان وعقیدہ اور مضبوط ہو گیا۔ وہ بڑے خوش طبع، شریف النفس، مہمان نواز، بہادر، دلیر اور غیرت مند تھے۔ حضرت عثمان ؓ کے عہدِ خلافت میں ان کا مصر میں وصال ہوا۔

تاریخ انہیں عین شمس مصر کے فاتح کی حیثیت سے یاد رکھے گی، اور ان کے مثالی صبر سے مجاہدینِ اسلام کا حوصلہ بلند ہوتا رہے گا۔ (اللہ ان سے راضی ہو، آمین)

28

حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان انصاری رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بن عتبان انصاری آنحضرت ﷺ کے صحابی تھے۔ کم سنی کی وجہ سے آپ ﷺ کی کمان میں جہاد کا شرف حاصل نہ کر سکے البتہ عہدِ صدیقی میں مرتدین کے خلاف جہاد میں شریک رہے۔ اس کے بعد عراقی فتوحات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ "عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بن عتبان انصاری کی قیادت میں ایک لشکر عراق میں نصیبین، حران اور الرہا روانہ کریں۔" حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل میں عبداللہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ انہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا مشن پورا کیا۔ پھر وہ کوفہ واپس آ گئے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ طلب کیا تو انہوں نے اپنی جگہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کو قائم مقام مقرر کیا اور خود مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں اس منصب پر باقی رکھا اور انہیں لکھا کہ کوفہ سے مجاہدین اسلام کو نعمان بن مقرن کی امداد کے لیے بھیجیں۔ انہوں نے حضرت حذیفہ بن الیمان کی کمان میں ایک لشکر روانہ کیا اور اس لشکر کا معرکہ نہاوند اور اس کی فتح میں بڑا نمایاں حصہ تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اصفہان کی فتح پر مامور کیا اور ان کی امداد کے لیے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ بھیجا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نہاوند سے ہوتے ہوئے اصفہان پہنچے۔ وہاں دشمن نے باہر نکل کر مجاہدینِ اسلام کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر فدائیانِ اسلام بھی نہایت بے جگری سے لڑے اور دشمن کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ قلعہ بند ہو گئے اور محاصرہ نے طول کھینچا اور پھر دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ ایرانی لشکر کے قائد کا لقب "فاذوستان" تھا۔ اس نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ لشکروں کی تباہی سے کیا فائدہ، مناسب ہوگا کہ پہلے ہم دو دو ہاتھ کر

لیں اور جو قائد جیت جائے بس پھر فتح اس کی ہوگی۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا ٹھیک ہے۔ خود عبداللہؓ اس کے مقابلے کے لیے نکلے۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا کہ پہلے میں وار کروں یا تم کرتے ہو؟ ایرانی سپاہ سالار نے کہا پہلا وار میرا ہوگا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ اس نے حضرت عبداللہؓ پر بھر پور وار کیا جو گھوڑے سے نیچے آ گئے۔ بغیر زین دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایرانی کمانڈر سے کہا کہ اَب میرے وار کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مگر اب اُسے موت یقینی نظر آ رہی تھی اور اس کا اس پر اثر واضح نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت عبداللہؓ نے کہا کہ واقعی تم ایک بہادر اور تجربہ کار سپہ سالار ہو، اگر اب بھی جزیہ پر صلح کرتے ہو تو مَیں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تمہارا یہ ملک اور فوج پھر تمہارے حوالے کرتا ہوں اور تمہارے ساتھ تمہارے لشکر میں جا کر ان شرائط پر معاہدہ کرتا ہوں۔ اسے اس معاہدے میں بچت نظر آئی چنانچہ اس نے تمام شرائط مان لیں اور اس طرح پورا اصفہان حکومت اسلامیہ کے زیرِ نگیں آ گیا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہؓ کو کرمان کی فتح کے لیے حضرت سہیل بن عدیؓ کی امداد کے لیے بھیجا وہ تیزی سے اپنے لشکر کے ہمراہ حضرت سہیلؓ سے جا ملے اور زبردست جنگ کے بعد کرمان فتح کر لیا۔

حضرت عبداللہؓ جہاں ایک بہت اچھے قائد تھے وہاں وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ مگر ان کی شاعری خالصتہً جہاد اور اسلامی عدل وانصاف کے لیے وقف تھی۔

وہ بہت بڑے بہادر تھے اور انصار کے سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔ وہ بڑے شریف النفس، مہمان نواز اور نہایت سخی تھے۔ مالِ غنیمت میں بہت کچھ پایا مگر سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ وہ بات کے سچے اور قول کے پکے تھے، وہ بڑے نیک، متقی اور پارسا تھے۔ وہ ممتاز سپاہی اور ممتاز قائد تھے، ذاتی شجاعت میں بے مثال تھے۔ ان میں تمام قائدانہ صفات موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجے اور بڑھائیں۔ (آمین)

❀............❀............❀

29

حضرت عبداللہ بن المعتم العبسی رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ مالک رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور معتم کے پوتے تھے، قبیلہ عبس سے تعلق رکھتے تھے۔

صلح حدیبیہ سے پہلے قبیلہ عبس کے نو آدمیوں کا جو وفد اسلام لانے کے لیے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اس میں بھی شامل تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لیے دعائے خیر فرمائی۔

جہاد میں برابر حصہ لیتے رہے اور مختلف قائدین کی قیادت میں لڑنے کی سعادت حاصل رہی، ان کا نام سب سے پہلے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی کمان میں شراف سے قادسیہ مارچ کرنے والی فوج کے میمنہ کے کمانڈر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ قادسیہ کی جنگ میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کی حکیمانہ قیادت کا مسلمان مجاہدوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

قادسیہ کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم ملا کہ وہ مدائن کی طرف کوچ کریں۔ اس حکم کی تعمیل میں انہوں نے پہلے زہرہ بن الحویہ کو پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مالک کو بھیجا۔ برس جو بابل میں ایک مقام ہے، پر ایرانیوں سے مڈبھیڑ ہوئی مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔

مسلمان فتح پر فتح حاصل کیے جا رہے تھے یہاں تک کہ وہ کسریٰ کے پایۂ تخت مدائن میں داخل ہو گئے۔ قادسیہ سے مدائن کی فتح تک حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی فوجوں کے ہراول دستے میں تھے۔

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ رومی اور اہلِ موصل تکریت کے مقام پر جنگ کے

لیے جمع ہیں اور انہوں نے قبیلہ ایاد، تغلب اور نمر کے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو پانچ ہزار مجاہدوں کی کمان دے کر بھیجا۔ وہ چار دنوں میں تکریت پہنچے اور وہاں رومیوں اور ان کے حلیفوں کا محاصرہ کر لیا۔ جو قلعہ بند ہو گئے تھے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان عرب قبائل کو جو رومیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے پیغام بھیجا کہ انہیں تو رومیوں کی حمایت میں اپنے عرب مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہیے انہوں نے اس بات کو منظور کر لیا اور عربوں کے لیے ان سے امن وسلامتی چاہی، اس پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیا کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر اس بات کی گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور وہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں اس کے حق ہونے کا اقرار اور تصدیق کرو، پھر ہمیں اپنی رائے سے مطلع کرو اس پر وہ راضی ہو گئے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف ایک آدمی کو بھیجا، اس نے جنگ کے طریق کار کے بارے میں انہیں بتایا کہ جب ہم نعرۂ تکبیر بلند کریں اور تم اسے سنو تو تم سمجھ لینا کہ ہم دروازوں تک پہنچ آئے ہیں۔ اور داخل ہوا چاہتے ہیں تم بھی دروازوں پر آ کر نعرۂ تکبیر بلند کرنا۔ اندر سے نو مسلم عربوں نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ رومی سخت پریشان ہوئے اور دجلہ کی جانب کھلنے والے دروازوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا، ایسے میں ہر طرف سے ان پر تلواریں برسنے لگیں اور ان کا صفایا ہو گیا، اس طرح مسلمانوں نے تکریت کا شہر فتح کر لیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے حضرت ربعی رضی اللہ عنہ بن الافکل کی کمان میں مجاہدوں کو دو قلعوں نینوی اور موصل کی تسخیر کے لیے بھیجا اور کہا کہ تکریت کی فتح کی خبریں پہنچنے سے پہلے ان کی خبر لو، قبیلہ تغب، ایاد اور نمر کے مجاہد بھی ان کے ہمراہ تھے، انہوں نے اچانک انہیں جا لیا، دونوں قلعوں کے اندر فوج نے مقابلہ کی ٹھانی، اتنے میں انہیں تکریت کا حال معلوم ہوا کہ اس پر قبضہ ہو گیا ہے تو ان میں سے اکثر نے جزیہ پر صلح کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور کچھ نے مخالفت کی بہر کیف اتنے میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی پہنچ آئے اور انہوں نے یہاں کے لوگوں کو امان دے دی اور صلح کی تجویز قبول کر لی۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ موصل میں ہی رہے یہاں تک کہ انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کے ساتھ مدائن آ ملنے کو کہا جب وہ وہاں پہنچے تو حضرت سعد

﷜ انہیں لے کر محرم 17 ہجری میں کوفہ میں داخل ہو گئے۔

حضرت عبداللہ ﷜ اپنی قوم عبس کے سرکردہ لوگوں میں سے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد اس پر ڈٹے رہے، وہ اپنے عقیدے کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے بحیثیت سپاہی اور کمانڈر کے اللہ کی راہ میں مرتے دم تک جہاد کرتے رہے۔

وہ بڑے نڈر، دلیر اور بہادر تھے، ان کے ماتحت ان سے بہت پیار کرتے تھے اور یہ بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ انہیں رسول کریم ﷺ نے بھی ایک دستے کی قیادت سونپی تھی پھر سعد بن ابی وقاص ﷜ نے حضرت عمر ﷜ کی منظوری سے انہیں کمان دی تھی، ان کے اندر تقریباً تمام قائدانہ صفات موجود تھیں۔ وہ بڑے ذکی، متحمل مزاج، تکالیف برداشت کرنے والے اور بڑے مضبوط ارادے کے مالک تھے۔ ان کا ماضی بے داغ تھا، وہ دشمن سے بڑے باخبر رہا کرتے تھے۔ تکریت کی فتح کے لیے ان کا نقشہ فوجی لحاظ سے بڑا عمدہ تھا، جس سے ان کی قابلیت و مہارت معلوم ہوتی ہے۔ اسلام کی اشاعت میں بھی ان کی کوششیں اور کاوشیں قابل قدر تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں۔ آمین

❀..........❀..........❀

30

حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ

حضرت عُتبہ رضی اللہ عنہ غزوان جابر کے فرزند تھے۔ ایامِ جاہلیت میں ان کا خاندان نوفل بن عبدِ مناف کا حلیف تھا۔

حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ ان صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے ابتداء ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ کفارِ مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر ملک حبش کی دوسری ہجرت میں شریک ہوئے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد واپس چلے آئے۔ آنحضرت ﷺ اس وقت تک مکہ میں موجود تھے۔

جب رسولِ پاک ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور کفر و اسلام میں باہم فوجی چھیڑ چھاڑ کا آغاز ہوا تو یہ اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ ایک قریشی متجسس دستہ فوج کے ہمراہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے، عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل اس کے کمانڈر تھے۔ راستہ میں مجاہدینِ اسلام کی ایک جماعت سے مٹھ بھیڑ ہوئی، اس کے کمانڈر حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ دونوں موقع پا کر مسلمانوں سے مل گئے اور مدینہ پہنچ کر حضرت عبداللہ بن سلمہ عجلانی کے مہمان ہوئے۔ یہاں حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ میں بھائی چارہ قائم ہوا۔

تیر اندازی کے لحاظ سے حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کا شمار کاملینِ فن میں تھا۔ آنحضرت ﷺ کی قیادت میں بدر، اُحد اور دیگر تمام معرکوں میں شریک رہے اور جرأت و بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ 14 ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں بندرگاہ ابلہ میسان اور اس کے ملحقہ علاقوں کی فتح پر مامور فرمایا۔ فرمان کے الفاظ کا ترجمہ یوں ہے:

اللہ تعالیٰ کی نوازش و مہربانی و برکت پر اعتماد کر کے عرب کی انتہائی حدود اور مملکتِ عجم کے قریب ترین حصہ کی طرف اپنے ساتھیوں کو لے کر روانہ ہو جاؤ۔ جہاں تک ممکن ہو تقویٰ کو اپنا

شعار بناؤ، اور خیال رکھو کہ تم دشمن کی سرزمین میں جا رہے ہو۔ مجھے امید ہے کہ اللہ پاک تمہاری مدد فرمائے گا........... ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

حضرت عتبہ ؓ نے حسب فرمان اس مہم کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ دریائے دجلہ کا تمام ساحلی علاقہ جو ابلہ، ابراور میسان وغیرہ مقامات پر مشتمل تھا اسلام کے زیر نگیں کر دیا۔

اِسی سال انہیں بندرگاہ ابلہ کے قریب ایک شہر بسانے کا حکم دیا گیا۔ حضرت عتبہ ؓ آٹھ سو آدمیوں کے ساتھ یہاں تشریف لائے اور شہر کی داغ بیل ڈالی اور ہر قبیلہ کے لیے ایک محلہ مخصوص کر دیا۔

حضرت عتبہ ؓ اس نئے شہر کے سب سے پہلے والی مقرر ہوئے اور چھ مہینے تک نہایت خوش اسلوبی سے فرائض منصبی انجام دیتے رہے لیکن زہد و بے نیازی نے اس سے کنارہ کش ہونے پر آمادہ کر دیا۔ 15 ہجری میں حضرت مجاشع بن مسعود کو جانشین بنا کر فرات کی طرف فوج کشی کا حکم دے دیا اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کو امامت کی خدمت سپرد کر کے خود حج کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے اور یہاں حضرت عمر ؓ کی خدمت میں استعفا پیش کر دیا لیکن انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں واپس جانے کی ہدایت کر دی۔ حضرت عتبہ ؓ کا اگرچہ جی نہیں چاہتا تھا مگر حکم کے تحت بصرہ کی طرف روانہ ہوئے، اتفاقاً راستہ میں اونٹ سے گر کر واصل بحق ہوئے۔ اس وقت عمر 57 سال تھی۔

❁............❁............❁

حضرت عقبہ بن نافع قرشی رضی اللہ عنہ

عقبہ رضی اللہ عنہ بن نافع بن عبدالقیس بن لقیط بن عامر بن امیہ بن الضرب بن الحارث بن فہر قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی والدہ کا نام نابعہ تھا اور عقبہ رضی اللہ عنہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔

ہجرت سے ایک سال پہلے 621ء میں پیدا ہوئے۔اسلامی ماحول میں آنکھ کھولی اور خالص دینی ماحول میں نشوونما پائی۔اسلامی فتوحات کے زرّیں عہد میں مجاہدانہ کردار ادا کیا اور اپنی فتوحات سے ایک زمانہ کو قائل کر دیا۔

عہدِ نبوت میں وہ کم سن تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں قیادت سونپی اور وہ صحابہ ہی کو یہ منصب دیا کرتے تھے۔

عسکریت انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ان کے قریبی رشتہ دار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا شمار تو نامور سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کو بہت اچھا ماحول اور بہت مناسب حالات ملے جنہوں نے ان میں طبعی قائدانہ صفات پیدا کر دیں۔افریقہ کے نامور فاتح کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

مصر کی فتح میں انہوں نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی کمان میں نمایاں حصہ لیا، اور اس طرح عملی تجربہ حاصل کیا۔حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انہیں 21 ہجری میں زوبلہ کی مہم سونپی جسے انہوں نے سر کر لیا۔جس کی اطلاع عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھجوا دی۔اِسی سال انہیں ''توبہ'' کی مہم سونپی گئی، اس میں سخت لڑائی ہوئی اور ان کا پلّہ بھاری رہا۔

عقبہ رضی اللہ عنہ برقہ کے کمانڈر اور والی تھے۔25 ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت

عمرو بن العاص ؓ کو مصر کی ولایت سے معزول کر کے ان کی جگہ عبداللہ بن سعد ؓ بن ابی سرح کو مقرر کیا۔ عبداللہ ؓ نے بھی ان کو قیادت کے منصب پر بحال رکھا۔

26 ہجری میں جب عبداللہ بن سعد ؓ بیس ہزار کے لشکر کے ساتھ برقہ پہنچے تو وہاں عقبہ ؓ انہیں اپنی مسلم سپاہ کے ہمراہ ملے۔ پھر سب نے اکٹھے ہو کر طرابلس کا رُخ کیا۔ عقبہ ؓ نے افریقہ میں ابی سرح کی فتوحات مین شرکت کی اوران جنگوں میں کئی بار بال بال بچے۔ عقبہ ؓ نے برقہ میں رہ کر مصر کی مغربی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کی، یہی وجہ ہے کہ رومی لیبیا کے راستے مصر پر حملہ نہ کر سکے۔ برقہ کی حفاظت بھی رومیوں سے کرتے رہے۔ چنانچہ افریقہ کی فتح کے لیے جانے والے مجاہدینِ اسلام کے لیے برقہ ''ایڈوانس بیس'' کا کام دیتا رہا۔ اوراس طرح عقبہ ؓ عسکری لحاظ سے مسلمانوں کے بہت کام آئے۔

عقبہ ؓ عبداللہ ابن ابی سرع کے بعد اور معاویہ بن حدیج السکونی کے زمانہ میں برقہ میں رہے۔ 39 ہجری میں رومیوں سے بحری مقابلہ ہوا۔ اِسی طرح ایک دوسرا بحری مقابلہ رومیوں سے 49 ہجری میں ہوا۔

41 ہجری میں حضرت عمرو بن العاص ؓ نے عقبہ ؓ کو افریقہ کا والی مقرر کیا تو انہوں نے لواتہ (بربری قبائل کا مشہور شہر) کو فتح کیا۔ اہل لُواتہ نے پھر صلح کی درخواست کی (جب کہ پہلے بھی صلح توڑ چکے تھے) تو اس پر عقبہ نے فرمایا:

"انه ليس لمشركٍ عَهدٌ عندنا."

''ہمارے ہاں مشرک کے عہد کی کوئی حیثیت نہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے:

"كيف يكون للمشركين عهدٌ"

''مشرکین سے عہد کیسے ہوسکتا ہے۔''

عمرو بن العاص ؓ نے ھارہ کی مہم سونپی، انہیں بھی دوبارہ اطاعت پر مجبور کیا۔

42 ہجری میں عقبہ ؓ نے غدامس کو فتح کیا، 43 ہجری میں سوڈان کے علاقے اور 46 ہجری میں ودّان کو فتح کیا، پھر عقبہ ؓ نے اپنے لشکر کو سرت کی سرزمین میں مغداش کے مقام پر چھوڑا اور وہاں سے چار سو سواروں کے ساتھ شہر شہر فتح کرتے چلے گئے۔ پھر قزان جزمہ کو فتح کیا اوران

علاقوں میں اسلام کی نشرواشاعت ہوئی۔ قزان میں تو مسلمان پہلی بار فاتحانہ طور پر داخل ہوئے پھر صوبہ کاوار کو فتح کیا پھر ایک مقام جسے آج کل ماءفرس کہتے ہیں قیام کیا۔ یہاں عقبہ ؓ اوران کی ماتحت فوج کو سخت پیاس کا سامنا ہوا۔ یہاں دُور دُور تک پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ فوج کو پیاس سے مرجانے کا یقین ہوگیا۔ اتنے میں عقبہ ؓ کھڑے ہوئے اورانہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ عقبہ ؓ کے گھوڑے نے اپنی اگلی ٹانگوں سے سامنے کی جگہ کو کھودنا شروع کیا تو پانی پھوٹ نکلا۔ عقبہ ؓ نے لوگوں کو بلایا کہ کھدائی شروع کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسے ستر چھوٹے چھوٹے گڑھے کھودے اورخود بھی اپنی پیاس بجھائی اور اپنے گھوڑوں کو بھی سیراب کیا۔ اسے آج اِسی وجہ سے ماءِ فرس کہتے ہیں۔

دوبارہ خاور پر اچانک حملہ کیا، پھر وہاں سے زُدیلہ پہنچے اور پانچ ماہ کے بعد اپنے لشکر سے آملے۔ صحرائی علاقوں میں عقبہ ؓ نے اپنی منتخب اورتھوڑی فوج کے ساتھ کئی مہمیں سرکیں۔ وہ جانتے تھے کہ تھوڑی فوج کے ساتھ ایک تو حرکت آسان ہوتی ہے اور دوسرا مسائل کم پیش آتے ہیں۔

چنانچہ انہیں اپنی اس حکمت عملی کی وجہ سے مسلسل کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اس کے بعد عقبہ نفوسہ پہاڑ کے جنوبی ساحلی راستے سے چل کر ''اھواز'' پہنچے اور یہاں کے سارے قلعے فتح کر لیے، پھر اپنے سواروں کو غدامس بھیجا اور دوبارہ اسے فتح کرلیا۔ پھر ''قفصہ'' اور قسطیلیہ کو فتح کرنے کے بعد قیروان پہنچے۔ اپنی ان مہمات کی وجہ سے عقبہ ؓ نے برق سے قیروان تک کے تمام علاقے کو دشمنوں کی سرگرمیوں سے پاک کردیا، اور یہ تمام علاقے مسلمان مجاہدین کے لیے شمالی افریقہ سے بحراٹلانٹک تک محفوظ بیس کا کام دینے لگے۔ قیروان چھاونی کی تعمیر انہوں نے 50 ہجری میں کروائی اور یہاں جامع مسجد تعمیر کروائی۔ یہ مسلمان مجاہدین کی چھاؤنی ہی نہیں بلکہ شمالی افریقہ کی بھی چھاؤنی کا کام دینے لگی۔

55 ہجری میں حضرت معاویہ ؓ بن ابی سفیان نے مَسلمہ ابن مخلد انصاری کو مصرو افریقہ کا والی مقرر کیا تو انہوں نے عقبہ ؓ کو معزول کر کے اپنے ایک مخلص اور آزاد کردہ وفادار غلام ابوالمہاجر دینار کو افریقہ کا والی مقرر کردیا۔ ابوالمہاجر نے عقبہ ؓ سے اچھا سلوک کرنے کے بجائے انہیں قید کر کے تکلیف دینی شروع کر دی۔ عقبہ ؓ کئی ماہ تک قید میں رہے۔ حضرت

معاویہ ؓ کے حکم پر انہیں رہائی ملی۔ عقبہ شام پہنچے اور امیر معاویہ ؓ سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ابوالمہاجر نے ان سے روا رکھا تھا۔ حضرت معاویہ ؓ نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو دوبارہ وہاں کا والی مقرر کیے دیتے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب عقبہ ؓ حضرت معاویہ ؓ سے ملنے کے لیے شام پہنچے تو انہیں وہیں ان کی وفات کا علم ہوا۔ یزید نے دوبارہ انہیں 62 ہجری میں اِسی منصب پر بحال کر دیا۔

عقبہ اپنے دس ہزار سواروں کے ساتھ شام سے قیروان (افریقہ) پہنچے، اور قیروان کی تعمیر و ترقی میں بڑا حصہ لیا۔

عقبہ ؓ قیروان میں اپنے کچھ لوگوں کو زہیر بن قیس کی ماتحتی میں چھوڑ کر باقی سب کو لے کر مغرب کی طرف بڑھے اور اپنی اولاد کو جاتے وقت ان الفاظ میں وصیت کی: ''مَیں نے اپنی جان کا اللہ تعالیٰ سے سودا کر لیا ہے اور مَیں ہمیشہ کافروں سے جہاد جاری رکھوں گا، مَیں تمہیں تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں انہیں ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھنا۔ قرآن کو نہ چھوڑنا، شعر یاد کرنے کے بجائے قرآن یاد کرنا، اس لیے قرآن اللہ تعالیٰ کی دلیل ہے۔ عربوں کے کلام.......... جس سے اخلاقی قدریں بڑھتی ہوں استفادہ کرتے رہنا۔ کبھی کسی سے قرض نہ لینا کہ یہ دن کی ذلت اور رات کا غم ہے۔ متکبر لوگوں سے علم حاصل نہ کرنا بلکہ احتیاط تقویٰ والوں سے حاصل کرنا اور جس نے احتیاط سے کام لیا اس نے نجات پائی۔''

پھر کہا: ''تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہو، شاید مَیں پھر تم سے نہ مل سکوں اور نہ تم مجھ سے مل سکو.......... اے اللہ میری جان کو اپنی رضا کے لیے قبول فرما اور جہاد کو اپنے ہاں میرے لیے باعثِ رحمت و عزت بنا۔''

عظیم لشکر کے ساتھ عقبہ ؓ ''باغایہ'' پہنچے اور سخت لڑائی کے بعد ان کو شکست دی مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، ایک وقت تو مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید ہم میں سے کوئی بچ نہ سکے لیکن انہوں نے صبر و استقامت سے کام لیتے ہوئے ایک ایسا زوردار حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پھر وہاں سے زاب کے علاقہ اُرَبہ پہنچے۔ یہاں دشمن کا بادشاہ رہتا تھا اور اس کے آس پاس کوئی 360 کے قریب گاؤں آباد تھے۔ ان سے بھی جو راستے میں آتے گئے دو دو ہاتھ کیے یہاں تک کہ ''تاہرت'' جا پہنچے۔ یہاں رومیوں نے بربر قبائل سے مدد مانگی اور بربر قبیلہ نے پوری

طرح ان کی مدد کی اور مقابلہ کے لیے نکل آئے یہ موقع واقعی بڑا نازک تھا۔ عقبہ ﷜ نے اپنے لوگوں میں کھڑے ہو کر تقریر کی اور کہا کہ ''مَیں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور ثنا بیان کرتا ہوں۔ لوگو! تم میں سے اچھے اور چنے ہوئے لوگ وہ تھے جن سے اللہ راضی ہوا اور ان پر اپنی کتاب اتاری۔ رسول پاک ﷺ کے ہاتھ پر بیعت رضوان کی، جو اس بات کی بیعت تھی کہ ہم کافروں کے خلاف قیامت تک لڑتے رہیں گے۔ انہوں نے اپنی جانیں رب العٰلمین کے ہاتھ پر جنت کے بدلہ بیچ کر سودمند سودا کیا۔ یہاں بھی تم اس خدا کے سامنے ہو اور پردیس میں ہو، تم نے بھی تو جہانوں کے مالک سے بیعت کر رکھی ہے اور تم ان ملکوں میں اس کی رضا اور اس کے دین کا غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہی تو آئے ہو، تمہیں خوشخبری ہو، دشمن تعداد میں جتنا بھی زیادہ ہو تم ہرگز اس کی پرواہ نہ کرنا، اس کی کثرت ہی انشاء اللہ اس کی ذلت و رسوائی کا سبب بنے گی۔ تمہارا عزت والا رب تمہیں ان کے حوالے نہیں کرے گا۔ سچے دل کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرو۔ اللہ کے نام کی برکت اور مدد سے دشمن کو قتل کرتے جاؤ اور ان پر اللہ کا وہ عذاب بن کر ٹوٹ پڑو جو مجرموں سے ٹلا نہیں کرتا۔ اللہ کا نام لے کر ان پر ٹوٹ پڑو۔ واقعی مسلمان اِن پر ٹوٹ پڑے، دشمن کی تعداد اگرچہ ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی مگر مسلمان مجاہدین صبر و استقاعت کے ساتھ برابر لڑتے رہے اور بالآخر اللہ کی مدد آئی اور انہیں فتح حاصل ہوئی، دشمن کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔

عقبہ ﷜ طنجہ پہنچے، یہاں کے پادری نے تحفے پیش کیے اور عقبہ ﷜ اندلس کو فتح کرنا چاہتے تھے کہ ''یَیَاں'' پادری نے کہا کہ آپ اپنے پیچھے بربر کافروں کو چھوڑ کر اندلس کا ارادہ کر رہے ہیں۔ عقبہ ﷜ نے پوچھا کہ ''بربر کافر کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بلادِ سوس میں، وہ بڑے طاقتور اور لڑاکے ہیں۔ عقبہ ﷜ نے پوچھا ان کا دین کیا ہے؟ پادری نے کہا کہ ان کا کوئی دین نہیں اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں بلکہ وہ تو چوپایوں کی طرح ہیں۔'' اس سے پہلے وہ مجوسی تھے۔ عقبہ ﷜ نے ان کی طرف رُخ کیا اور ''وَلیلی'' شہر میں پڑاؤ ڈالا، یہ شہر زرہون پہاڑ کی طرف تھا اور دو دریاؤں سبو اور روغہ کے درمیان مغرب کا بہت بڑا شہر تھا۔ آج اسے قصرِ فرعون کہتے ہیں۔ اسے بھی عقبہ ﷜ نے فتح کر لیا۔ پھر وہاں سے سوس کے پہلے کنارے کا رُخ کیا۔ اسے فتح کر کے آخری کنارے کو بھی بڑی سخت لڑائی کے بعد فتح کر لیا، چلتے چلتے عقبہ ﷜ مالبان جا پہنچے اور بحر محیط کو دیکھ کر کہا:

"یا رب لولا هذا البحر لمضیت فی البلاد مجاهداً فِی سبیلک۔"

"اے رب! اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو میں کافروں سے جہاد کرتا ہوا بہت دُور نکل جاتا۔ جہاں کہ تیرے سوا کسی اور کی عبادت نہ ہوتی۔"

عقبہ ؓ قیروان آتے ہوئے جب افریقی سرحد طبنۂ پر پہنچے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو گروہ در گروہ اپنے اپنے طور پر قیروان پہنچنے کو کہا اور خود اپنے ہمراہ تین سو سواروں کے ساتھ تہوذہ کا قصد کیا۔ جب رومیوں نے انہیں اتنی تھوڑی تعداد میں دیکھا تو انہوں نے قلعہ کے دروازے بند کر لیے اور انہیں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ یہ برابر انہیں دینِ اسلام کی طرف بلاتے رہے مگر انہوں نے ایک نہ سُنی۔ رومیوں نے کسیلہ جو عقبہ کے لشکر میں تھا (اور نومسلم تھا) سے ساز باز کی۔ یہ ان کے ساتھ مل گیا اور سپاہ میں اس کے جو رشتہ دار تھے انہیں بھی ساتھ ملا لیا۔ عقبہ ؓ نے کسیلہ کو سبق سکھانا چاہا مگر وہ کسی اور راستے سے جان بچا کر نکل گیا۔ ابوالمہاجر بھی عقبہ ؓ کے ساتھ تھے۔ انہیں حکم دیا کہ مسلمانوں کا خیال رکھنا اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں شہادت کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ ابوالمہاجر نے کہا کہ میں بھی شہادت کا متمنی ہوں۔ عقبہ ؓ اور ان کے ساتھیوں نے میان سے تلواریں نکال کر بربر (دشمن) کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور زاب کے علاقہ میں تہوذہ کے مقام پر لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور ان کے تمام ساتھیوں نے بھی شہادت پائی۔

عقبہ ؓ نے 63 ہجری میں تہوذہ کے معرکہ میں شہادت پائی۔ ان کی قبر زاب میں ہے، وہاں عقبہ ؓ کے نام سے ایک مسجد بھی ہے اور ان کے ساتھیوں کے مزار ہیں۔

عقبہ ؓ ولادت کے لحاظ سے صحابی اور بڑے سمجھ دار منتظم تھے۔ وہ تقویٰ کے انتہائی بلند مقام پر تھے وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں ان کی زندگی جہاد کے لیے مخصوص تھی۔

وہ بڑے بہادر، صاحبِ بصیرت اور دیانت دار تھے۔ وہ خلق و کردار، شجاعت اور سمجھداری میں اپنے اسلاف کی زندہ مثال تھے۔ انہوں نے شمالی افریقہ کے وسیع علاقے میں بڑی جرأت و بہادری کے ساتھ اسلام پھیلایا، ان کی مخلصانہ کوششوں سے بربر قبائل نے اسلام قبول کیا۔ اس سے پہلے وہ عیسائی تھے۔ اس طرح اسلام سوڈان سے لے کر بحرِ محیط تک پھیل گیا۔ وہ اوّل سے آخر تک ایک سپاہی تھے اور بس! انہوں نے تھوڑے عرصہ میں جو فتوحات حاصل کیں انہوں

نے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ انہوں نے بہت تھوڑے وقت میں قیروان سے بحرِ اطلسی تک فتوحات حاصل کیں جو سمجھ میں آئے یا نہ مگر ایک تاریخی حقیقت ہے۔ وہ بلادِ اسفیٰ تک جا پہنچے اور آگے بحرِ محیط میں اپنے گھوڑے کے قدم ڈال کر اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کی ''اے اللہ مَیں تیری راہ میں اتراتے ہوئے نہیں نکلا اور نہ میرا مقصد کوئی اور تھا، تو خوب جانتا ہے کہ ہم کس مقصد کے لیے آئے تھے اور یہ وہی مقصد ہے جو بندے ذوالقرنین کے پیش نظر تھا کہ بغیر شرک کے تنہا، صرف تیری ہی عبادت ہو۔ اے اللہ! ہم کفر کے دشمن اور دینِ اسلام کا دفاع کرنے والے ہیں۔ اے اللہ! تو ہمارا ہو جا، اے ذوالجلال والاکرام ہمارے خلاف نہ ہونا۔ پھر یہ کہہ کر واپس لوٹ آئے انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کر رکھا تھا اور بالآخر اپنی جان بھی جان دینے والے کے حضور اپنے بہادر ساتھیوں کے ہمراہ ہوتے ہوئے پیش کر کے شہادت کے بلند مقام پر فائز ہوئے جس کی تمنا کر کے نکلے تھے۔ وہ ایک ممتاز قائد تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جہاد میں ان کا اصل سرمایہ تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ ذکر ہے۔ اِسی سے مدد مانگنا اور اِسی پر توکل کرنا، اِسی سے ڈرنا ہے اور اِسی سے غلبہ، سلامتی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ خوب جانتے تھے کہ فتح تو صرف اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ فتوحات محض اسلام کی وجہ سے اور ٹھیک اس کا دفاع کرنے کی وجہ سے ہیں اور یہ سچے مومنوں کا حصہ ہیں۔ وہ اپنے ماتحت عملہ سے محبت کرتے تھے اور وہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ ان میں تمام قائدانہ صفات موجود تھیں۔ وہ بڑے ہی سمجھ دار، تجربہ کار اور بلند آواز تھے۔ وہ بلند کردار کے مالک اور انتہائی پارسا اور پاکباز تھے۔ تاریخ انہیں فتوحاتِ اسلامی کے ایک نامور فاتح اور دینِ اسلام کے ایک مخلص داعی کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔

کیا آج فرزندانِ اسلام کو یہ معلوم ہے کہ عقبہ رضی اللہ عنہ کون تھے؟ مصر، سوڈان، لیبیا، جزائر، تونس، مراکش اور موریتانیا کے فاتح کون تھے؟ وہ یہی عقبہ رضی اللہ عنہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ان کے درجات مزید بلند فرمائے۔ (آمین)

❀..........❀..........❀

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ

آپ کا نام عقبہ رضی اللہ عنہ والد کا نام عامر اور دادا کا عبس تھا، قضاعہ بن مالک بن حمیر سے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی ہجرت مدینہ کے بعد اسلام قبول کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب رسول پاک ﷺ مدینہ تشریف لائے تو میں بکریاں چرا رہا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ مجھے بیعت کریں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''آپ کون ہیں؟ میں نے بتایا تو فرمایا کون سی بیعت کرو گے؟ دیہاتیوں کی بیعت یا ہجرت کی بیعت؟ میں نے عرض کی ہجرت کی تو مجھے بیعت کر لیا۔''

آپ رضی اللہ عنہ کو رسول پاک ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا، اور مشہور صحابہ میں شمار ہوئے۔ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے۔ غزوۂ اُحد میں البتہ شریک ہوئے اور اس کے بعد تمام معرکوں میں شریک رہے، اس طرح رسول پاک ﷺ کی صحبت اور آپ ﷺ کی قیادت میں لڑنے کا شرف حاصل ہوا۔

رسول پاک ﷺ کے وصال کے بعد شام کی فتوحات میں حصہ لیا، اِسی طرح مصر کی فتح میں بھی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لڑے۔

جب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فسطاط فتح کر لیا تو انہیں زیریں علاقوں کی طرف بھیجا۔ اس مہم میں کامیابی حاصل ہوئی اور اہلِ فسطاط کی شرائط پر ان سے بھی صلح ہو گئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں سمندری لڑائی میں اہلِ مصر کی کمان کر رہے تھے۔

رسول پاک ﷺ نے انہیں زکوٰۃ وصدقات کی وصولی کی خدمت سپرد کی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں نماز اور خراج پر مامور تھے۔ پھر انہیں اس منصب سے الگ کر دیا گیا اور

بحریہ کی قیادت کے لیے ایک مصری ہی کا انتخاب ہوا۔

حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کا قیام مصر ہی میں رہا، وہاں اپنا مکان بنالیا تھا۔ وہیں 58 ہجری میں ان کا وصال ہوا اور مصریوں کے قبرستان واقع مقطم میں دفن کیے گئے۔

انہوں نے رسول پاک ﷺ سے پچپن حدیثیں روایت کی ہیں۔ وہ بڑے عمدہ قاری تھے، آواز بھی بڑی دلکش تھی۔ فرائض اور فقہ کے عالم، فصیح اللسان، شاعر اور کاتب تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے قرآن جمع کیا تھا۔ وہ عمدہ اخلاق کے مالک تھے۔ وہ رسول پاک ﷺ سے سُنی ہوئی احادیث کا بار بار تذکرہ کرتے، اور ان پر عمل کیا کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا تھا۔ ''اے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ! اپنی زبان کو قابو میں رکھیں، اور اپنی خطاؤں پہ رویا کریں اور اپنے گھر کو وسیع بنائیں'' اور یہ بھی فرمایا تھا ''جو تم سے قطع تعلق کرے تم اس سے ملو اور جو تمہیں نہ دے تم اسے دو اور جو تم پر ظلم کرے تم اسے معاف کردو۔''

انہوں نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کردیا، جب ان کے وصال کا وقت قریب آیا، اس وقت ان کے پاس ستر سے کچھ اوپر کمانیں تھیں، اور نیزے بھالے بھی تھے، سب اللہ کی راہ میں صدقہ کردیئے۔

جہاد حضرت عقبہ کا محبوب مشغلہ تھا، اور ان سے جو حدیثیں مروی ہیں وہ بھی زیادہ تر جہاد سے متعلق ہیں، انہیں نیزہ بازی کا شوق تھا، وہ بڑے عقلمند تھے اور صحیح فیصلے کیا کرتے تھے، انہیں اپنے زیرِ کمان لوگوں پر بڑا اعتماد تھا اور وہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔

مصر کے زیریں علاقوں کے فاتح کی حیثیت سے ان کا نام تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس جلیل القدر صحابی، قائد اور فاتح کے مزید درجے بلند فرمائیں۔ آمین۔

❀..........❀..........❀

حضرت عکرمہ بن ابی جہل المخزومی رضی اللہ عنہ

حضرت عکرمہ ابوجہل کے بیٹے اور ہشام مخزومی قرشی کے پوتے تھے۔ان کی والدہ کا نام اُم امجالد تھا اور وہ بنی ہلال بن عامر سے تھیں۔اسلام سے پہلے وہ اپنے والد کی طرح اسلام، مسلمانوں اور رسولِ پاک ﷺ کی دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ کی طرف سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اِسی دوران ان کے والد دو مسلمان بچوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔

غزوہ اُحد میں مشرکین کی طرف سے گھڑ سوار دستے کے میسرہ پر تھے۔اِسی طرح غزوۂ خندق میں بھی مشرکین کی نمائندگی کی تھی اور یہ ان سواروں میں سے تھے جو اپنے گھوڑوں کے ذریعہ خندق پار کر جانے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر اس معرکہ میں مشرکین کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

فتحِ مکہ کے دوران خندمہ پہاڑ پر اپنے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلے مگر حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے بڑی تیزی اور پھرتی سے انہیں مار بھگایا۔

عکرمہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا خون رسولِ پاک ﷺ نے مباح قرار دے دیا تھا اس لیے انہوں نے یمن کی راہ لی۔ان کی چچازاد اور بیوی اُم حکیم بنت الحارث بن ہشام چونکہ اسلام لے آئی تھیں اس لیے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اپنے خاوند کے حق میں امان طلب کی۔ آپ ﷺ نے امان دے دی۔وہ ان کی تلاش میں یمن گئیں اور انہیں ساتھ لے کر مدینہ پہنچیں، جب رسولِ پاک ﷺ نے عکرمہ کو دیکھا تو فرمایا:

"مرحبا بالراکب المهاجر" مہاجر سوار خوش آمدید!

حضرت عکرمہ نے 8 ہجری میں اسلام قبول کیا، کلمۂ شہادت پڑھ کر رسولِ پاک ﷺ

سے بخشش کی دعا کی درخواست کی اور پھر اس کے بعد سچے اور نیک مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ ان کے اسلام لے آنے کے بعد مسلمان کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ اللہ کے دشمن کا بیٹا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے انہیں روکا اور فرمایا "مُردوں کو بُرا بھلا کہہ کر زندوں کو تکلیف نہ دو۔"

11 ہجری میں رسولِ پاک ﷺ نے انہیں ہوازن کے صدقات کی وصولی پر مامور فرمایا۔ یہ ان کے حُسنِ اسلام اور امانت کی بہت بڑی اور مضبوط دلیل ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے انہیں مسیلمہ کذاب کے مقابلہ کے لیے بھیجا اور ان کی مدد کے لیے شرجیل ؓ بن حسنہ کو بھی روانہ کیا۔ مگر انہوں نے یمامہ پہنچتے ہی مسیلمہ کی قوم بنو حنیفہ پر حملہ کر دیا جس میں انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس پر انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو لکھا تو انہوں نے اسی طرف رہنے کی ہدایت کی اور کچھ مزید ذمہ داریاں سونپ دیں۔ چنانچہ ان کے حکم پر حضرت عکرمہ ؓ نے عمان، مہرہ، یمن، حضرموت اور کندہ کی فتوحات میں بڑا نمایاں حصہ لیا اور یہ علاقے دوبارہ اسلام کے جھنڈے تلے آ گئے۔

مرتدین سے فارغ ہو کر حضرت عکرمہ نے ارضِ شام کی راہ لی اور وہاں کی چھوٹی بڑی تمام مہموں میں خوب خوب دادِ شجاعت دی۔

جنگِ یرموک میں، حضرت خالد بن الولید ؓ کی کمان میں وہ اپنے چھ ہزار مجاہدوں کے کمانڈر کی حیثیت سے شریک تھے۔ حضرت خالد ؓ کے حکم پر عکرمہ ؓ اور قعقاع ؓ نے بڑی بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا۔ رومیوں نے مسلمانوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے بڑا زوردار حملہ کیا تو اس پر حضرت عکرمہ ؓ نے کہا "مَیں نے حالتِ کفر میں، ہر مقام پر رسولِ پاک ﷺ سے مقابلہ کیا اور اپنی جگہ سے نہیں ہٹا اور کیا آج مسلمان ہوتے ہوئے میں تم لوگوں سے بھاگ جاؤں گا؟" پھر انہوں نے اپنے مجاہدوں کو ان الفاظ میں للکارا "من یا یعنی علی الموت" موت پر میری بیعت کون کرتا ہے؟ اس آواز پر 400 مجاہد سامنے آ گئے جن میں ان کے چچا حارث بن ہشام اور ضرار بن الازور بھی شامل تھے۔ یہ سب خالد بن الولید ؓ کے سامنے دشمن کے آگے ڈٹ کر لڑتے رہے۔

حضرت عکرمہ ؓ دشمن پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے۔ انہیں کہا بھی گیا کہ کچھ اپنا بھی تو خیال رکھیں تو انہوں نے کہا "مَیں تو لات و عزیٰ کی خاطر بڑے بڑے خطرے مول لیتا رہا ہوں

اور کیا آج اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر اپنی اس جان کو بچا کر رکھوں گا؟ بخدا کبھی نہیں۔"
برابر آگے بڑھتے رہے اور سخت زخمی ہوئے۔ ان کے چچا حارث بن ہشام اور سہیل بن عمرو کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے پانی مانگا، جب پانی ان کے پاس لایا گیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ سہیل کی نظر بھی پانی پر ہے۔ کہا کہ پہلے سہیل کو پلا دو۔ جب پانی ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے حارث بن ہشام کو پانی کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا، سہیل نے کہا کہ پہلے حارث کو پلا دو۔ جب پانی پلانے والا حارث کے پاس پہنچا تو وہ شہادت کے مقام پر فائز ہو چکے تھے، واپس سہیل کی طرف آیا تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور جب عکرمہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو وہ بھی اپنے رب سے مل چکے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پانی نہ پی سکا مگر اپنے ایثار کی مثال بعد میں آنے والوں کے حق میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا اور اس میں پہل حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوئی تھی۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے جسم پر تیروں، نیزوں اور تلوار کے ستر سے اوپر زخم تھے۔
حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اسلام سے پہلے قریش کے سردار اور قائد تھے اسلام کے بعد پھر وہ مسلمانوں کے قائد اور سردار رہے۔ انہوں نے اسلام سے پہلے کی اسلام دشمنی کا کفارہ نماز، روزہ، صدقات اور جہاد سے کیا۔ جنگِ یرموک میں، اللہ کی راہ میں اپنی اور اپنے اکلوتے بیٹے کی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی اور ہمیشہ کے لیے صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ آرام کر رہے ہیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بڑے سخی، مہمان نواز، غیور، سچے، وفادار، تجربہ کار، شاعر، خطیب، مشہور شہسوار، بہادر، انتہائی دلیر، قائد اور شجاع تھے۔ انہوں نے ہر معرکہ میں اپنی شجاعت کا لوہا منوایا۔ ان میں تقریباً تمام قائدانہ صفات موجود تھیں۔ ان کے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ مسلمان مجاہدوں کا حوصلہ بلند ہوا۔ 13 ہجری کو جنگِ یرموک میں 62 سال کی عمر میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔

❁..........❁..........❁

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ قبیلہ بنی سہم میں سے تھے۔ ان کی ولادت واقعۂ فیل کے چھ سال بعد مکہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام عاص تھا، اور وہ اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ ان کا کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا۔ یمن اور حبشہ کا مال شام میں لے جاتے تھے اور وہاں کا سامان عرب اور یمن میں لاتے تھے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی تربیت مکہ میں ہی ہوئی۔ اگر چہ اس وقت تک عرب میں بچوں کو لکھانے پڑھانے کا بالکل دستور نہ تھا۔ مگر انہوں نے جوانی میں اپنے کاروبار کی غرض سے لکھنا سیکھ لیا تھا۔ بڑے ہو کر اپنے والد کا پیشہ اختیار کیا، اور تجارت کے سلسلہ میں مختلف قوموں اور ملکوں کے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا۔ اِس وجہ سے تجربہ، دانائی اور سمجھ بوجھ میں بہت ممتاز تھے۔ تجارت پیشہ ہونے کے باوجود سپہ گری اور شہ سواری کو جو باپ دادا کا فن تھا بچپن سے سیکھا اور اس کو انسان کا سب سے بڑا جوہر سمجھتے تھے۔

جب رسول اکرم ﷺ نے اہلِ عرب کو اِسلام کا پیغام سُنایا تو عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص ایک عرصہ تک آپ ﷺ کے مخالف رہے۔ مگر فتح مکہ سے پہلے ہی مدینہ میں جا کر اسلام قبول کر لیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ عمرو رضی اللہ عنہ ابن عاص اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید ایک ہی دن مسلمان ہوئے۔ نبی کریم ﷺ اِن دونوں کے اسلام لانے سے بہت خوش ہوئے، اور اُن کی دلیری اور بہادری کی وجہ سے اکثر جنگوں میں دیگر اصحاب سے زیادہ انہی سے کام لیا۔ حضور ﷺ کے عہد اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کئی جنگوں میں شریک ہوئے اور بڑا نام پایا۔ فلسطین کی فتح میں ان کا بہت حصہ تھا۔ مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ مصر کی فتح ہے۔

639ء میں خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ان سے

تنہائی میں ملے اور کہا۔ ''مجھے مصر پر چڑھائی کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ ایک زرخیز ملک ہے۔اس کے فتح کرنے سے رومیوں کی قوت ٹوٹ جائے گی اور اسلام کی شوکت بڑھے گی۔

حضرت عمرؓ نے خیال کیا کہ مصر دُور دراز واقع ہے۔ وہاں چڑھائی کرنے سے مسلمانوں کو بڑی تکلیفیں ہوں گی۔ اِس لیے انہوں نے کچھ پس و پیش کیا۔ مگر عمرو بن عاصؓ نے کامیابی کی ایسی زبردست اُمید دلائی کہ وہ راضی ہو گئے۔ چار ہزار سپاہی جو سب کے سب یمن کے ایک ہی قبیلہ کے افراد تھے، اُن کے ساتھ کر دیئے۔ عمرو بن عاصؓ اسی وقت فوج لے کر روانہ ہو گئے۔ اُن کے چلے جانے کے بعد بعض مسلمان بہت حیران ہوئے کہ ایسے ملک میں جہاں کم سے کم ایک لاکھ فوج حفاظت کے لیے موجود ہے وہاں عمرو بن عاصؓ ان مُٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ کیا کریں گے۔ ایسا نہ ہو کہ بہادری کے جوش میں ساری فوج ہلاک ہو جائے۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ بھی گھبرائے، اور عمرو بن عاصؓ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ اگر یہ خط مصر کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے مل جائے تو واپس چلے آؤ، ورنہ اللہ کے بھروسے پر آگے بڑھو۔ جب قاصد یہ خط لے کر پہنچا، تو اس وقت مصر کی سرحد قریب ہی تھی۔ عمرو بن عاصؓ نے اپنی سمجھ سے اندازہ کر لیا۔ کہ اس میں کیا کیا لکھا ہوگا۔ چنانچہ اس دن خط نہیں لیا۔ جب اِسلامی فوجیں مصر کی سرحد میں داخل ہو گئیں تو قاصد کو بلا کر خط کھولا۔ سب کے سامنے پڑھا اور کہا۔ ''اب ہم مصری سرحد میں داخل ہو چکے ہیں، اِس لیے اس حکم کے مطابق آگے بڑھنا چاہیے۔''

سب سے پہلے جو مقام فتح ہوا۔ وہ عریش تھا۔ عمرو بن عاصؓ نے وہاں سب کی طرف سے ایک مینڈھے کی قربانی دی۔ عریش سے نکل کر وہ راستہ اختیار کیا جو ایشیا سے مصر جانے والے قافلوں اور سیاحوں کا تھا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اسلامی لشکر فرسا کے سامنے جا پہنچا۔ فرسا دریائے نیل پر ایک پرانا اور بڑا شہر تھا۔ اس میں ایک سنگین قلعہ تھا، جس کے اردگرد چوڑی فصیل تھی۔ یہ شہر مصر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ حفاظت کے لیے قلعہ میں رومی فوجیں تھیں۔ عمرو بن عاصؓ نے محاصرہ کا حکم دیا۔ تقریباً ایک مہینہ تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر میں رومیوں نے شکست کھائی، اور مسلمان شہر میں داخل ہو گئے۔

یہاں سے پُرانا راستہ چھوڑ دیا۔ کیونکہ اِس میں جا بجا نہریں پڑتی تھیں۔ ایک نئے

راستہ سے سفر کرتے ہوئے بلبلیس پہنچ گئے۔ یہاں بھی رومی لشکر تھا اور اس کا سپہ سالار ارطبون تھا جو پہلے بھی شام میں مسلمانوں کا مقابلہ کر چکا تھا ایک مہینہ تک جنگ جاری رہی۔ ایک دن ارطبون نے چاہا کہ مسلمانوں کو دھوکہ سے شکست دے۔ اس نے رات کو حملہ کر دیا۔ سمجھا کہ مسلمان بے خبر ہوں گے۔ مگر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اپنے دشمن سے غافل نہیں تھے۔ وہ جس وقت آیا اسلامی سپاہی تیار ملے۔ زبردست جنگ ہوئی رومیوں کو شکست ہوئی۔ ایک ہزار قتل اور تین ہزار قید ہوئے۔ شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

بلبلیس کے بعد ام دنین شہر تھا۔ کئی ہفتہ تک لڑائی جاری رہی۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک طرف تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو امداد کے لیے لکھا اور دوسری طرف اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھا کر ایسا سخت حملہ کیا کہ شہر میں گھس گئے اور اُس پر قبضہ کر لیا۔

مصر کے رومی سپہ سالار تھیوڈور نے جب دیکھا کہ عرب مصر میں آگے ہی بڑھتے چلے آتے ہیں، تو اس نے قلعہ بابلیون کے چاروں طرف زبردست فوجیں جمع کر لیں اور مقابلے کا پورا سامان کر لیا۔ عمر بن عاص رضی اللہ عنہ کا ارادہ خود اُدھر بڑھنے کا تھا۔ مگر ابھی مدینہ سے امدادی فوج نہیں پہنچی تھی۔ اس کا انتظار تھا۔ فوج کو مشغول رکھنے کے لیے انہوں نے کئی چھوٹے چھوٹے شہروں کو فتح کر کے ایک مشہور شہر فیوم کا محاصرہ کر لیا۔ اتنے میں امدادی فوجیں بھی پہنچ گئیں۔ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے محاصرہ اٹھا کر قلعہ بابلیون کا رُخ کیا۔ اُدھر تھیوڈور نے سوچا کہ مسلمانوں کے اس طرف آنے سے پہلے ان پر حملہ کر کے مصر سے کیوں نہ نکال دوں۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جب یہ سُنا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کی تو یہ خواہش تھی کہ رومی قلعہ سے نکل کر کھلے میدان میں آئیں، تا کہ اُن کی قوت توڑ کر رکھ دی جائے۔ تھیوڈور ہیلوپولس کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ اِس کی فوج کی تعداد بیس ہزار تھی۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کا ایک دستہ ایک گھاٹی میں اور دوسرا ایک اور جگہ چھپا دیا۔ باقی فوج لے کر مقابلہ میں گئے۔ دونوں فریق جانتے تھے کہ یہ لڑائی بڑی اہم ہے، اور اسی پر مصر کا فیصلہ ہو گا۔ دونوں فوجوں کے سپاہی آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور زوروں کی جنگ ہونے لگی۔ جب لڑائی انتہائی عروج پر تھی تو مسلمانوں کے دونوں دستوں نے جو چھپے ہوئے تھے باہر نکل کر رومیوں پر حملہ کر دیا۔ رومی تین طرف سے گھر گئے۔ تقریباً سب کے سب مارے گئے۔ صرف تین سو سپاہی بچ کر نکل سکے۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر قلعہ بابلیون کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے ایک طرف دریائے نیل تھا، اور تین طرف خندق۔ مسلمانوں کے پاس قلعہ توڑنے والی توپیں نہ تھیں، اِس لیے محاصرہ لمبا ہو گیا۔ رومی کبھی کبھی قلعہ سے باہر نکل کر لڑتے تھے۔ مگر ہمیشہ نقصان اُٹھا کر بھاگ جاتے تھے۔ اِس قلعہ میں مصر کا والی مقوقس موجود تھا۔ یہ اصلی مصری یعنی قبطی تھا، اور اس قوم کا رئیس اعظم تھا۔ قیصرِ روم نے اس کی تربیت خود کی تھی۔ اُس نے اس کو مصر کا والی بنا دیا تھا، تا کہ اُس کے ہاتھ سے اس کے ہم قوموں کو سزائیں ملیں، اور قیصر خود بدنامی سے محفوظ رہے۔ مقوقس نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنا مشکل ہے، تو اُس نے اُن سے صلح کی بات چیت شروع کر دی مسلمانوں کی دو ہی شرطیں تھیں۔ اسلام قبول کر لو یا جزیہ دو۔ آخر مقوقس نے جزیہ دینا قبول کر لیا، اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے وعدہ کیا کہ مصری باشندوں کی زمین اور مال انہی کے ہاتھوں میں رہے گا اور ان کے دین میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

مقوقس نے یہ صلح اپنی قوم یعنی قبطیوں کی طرف سے کی تھی۔ اس نے رومیوں سے کہا کہ اگر تم چاہو، تو ان شرطوں کو مان کر مصر میں رہو یا اپنے ملک واپس چلے جاؤ۔ اس کی ایک نقل منظوری کے لیے ہرقل کے پاس بھیج دی گئی۔ اُس نے جب اسے پڑھا تو لال پیلا ہو گیا اور مقوقس کو بہت بُرا بھلا کہا۔ رومیوں کو حکم دیا کہ وہ جنگ جاری رکھیں۔

رُومی لڑائی کے لیے تیار ہو گئے، اور مقوقس اپنے ہم قوموں کے ساتھ قلعہ سے نکل کر جزیرہ میں چلا گیا۔ وہاں سے اس نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ اور اس کی قوم اپنے عہد پر قائم ہے۔ اس لیے اُن کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ انہیں چاہیے کہ وہ ہمارے راستہ میں اپنے خرچ سے پُل بنوائیں۔ جہاں اسلامی فوج اُترے، وہاں بازار لگائیں اور خوراک کا سامان فراہم کریں۔ قبطی اس پر راضی ہو گئے۔

مسلمانوں نے بہت کوشش کی کہ قلعہ جلد سے جلد فتح ہو جائے۔ مگر اندر جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں ملتا تھا۔ ایک روز حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قلعہ کو فتح کرنے کے لیے مَیں اپنی جان وقف کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ رات کو سیڑھی لگا کر ایک بُرج پر چڑھ گئے۔ چند اور لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ وہاں سے نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے وہ نیچے اُترے۔ اور ننگی تلواریں لیے ہوئے دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ رومیوں نے بہت روکا، مگر انہوں نے دروازہ کھول دیا، اور مسلمان

قلعہ میں داخل ہو گئے۔ بہت سے رومی مارے گئے۔ اُن کے سپہ سالار نے امان مانگی جسے منظور کر لیا گیا۔

اب مصر میں ایک بڑا شہر اسکندریہ رہ گیا تھا۔ یہ بہت بڑا فوجی مرکز اور تجارتی شہر تھا۔ اس کی بنیاد بحیرۂ روم کے کنارے دریائے نیل کے دہانے پر رکھی گئی تھی۔ اس کی صورت مستطیل تھی۔ موقع نہایت عمدہ تھا۔ اس کے جنوب میں ایک جھیل تھی اور شمال میں بحیرۂ روم تھا۔ یہ شہر تین حصوں پر منقسم تھا۔ شمال مشرقی حصے میں یہودی رہتے تھے۔ مغرب میں مصری اور درمیان میں یونانی آباد تھے۔ قیصر نے وہاں بہت بڑی فوج جمع کر دی تھی اور حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ عمرو بن عاص ؓ اسکندریہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں قبطیوں نے ہر طرح کی مدد کی، اور جگہ جگہ فوج کے گزرنے کے لیے پُل بنا دیئے۔ جب وہ اسکندریہ کے سامنے پہنچے، تو اُس وقت پچاس ہزار رومی فوج تھی اور سمندر کے راستہ سے قسطنطنیہ سے مدد اور رسد کا سلسلہ جاری تھا۔ مسلمانوں کی کل تعداد بارہ ہزار تین سو تھی۔ اُن کے پاس نہ قلعے توڑنے کی توپیں تھیں نہ جہاز۔ رومیوں کو اپنی تعداد اور قوت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ اکثر شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ کرتے تھے۔ مگر ہر بار نقصان اُٹھا کر انہیں واپس جانا پڑتا تھا۔ اس سے ان پر مسلمانوں کی ایسی ہیبت چھا گئی، کہ انہوں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ اب مسلمان خود شہر کے دروازوں اور بُرجوں پر حملہ کرنے لگے۔ سب سے آگے عمرو بن عاص ؓ کا خاص جھنڈا ہوتا تھا، اور وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے بڑھتے تھے۔

محاصرہ کو تقریباً چار مہینے ہو گئے۔ حضرت عمر ؓ پریشان تھے، کہ آخر شہر فتح کیوں نہیں ہوتا۔ انہوں نے عمرو ؓ بن عاص کو لکھا، کہ شاید وہ رومیوں کی طرح آرام پسند ہو گئے ہیں، اِسی لیے اتنا عرصہ لگ گیا ہے۔ اس خط کے آتے ہی عمرو بن عاص نے زور شور سے جنگ شروع کی، اور ایسا سخت حملہ کیا، کہ رومیوں نے امان طلب کی اور صلح کے خواستگار ہوئے چنانچہ آپس کی بات چیت کے بعد صلح ہو گئی۔ اِس کی بڑی بڑی شرطیں یہ تھیں کہ جن پر جزیہ واجب ہے، وہ سالانہ دو دینار ادا کرتے رہیں گے۔ کسی رومی فوج کو مصر میں داخل ہونے کا حق نہیں ہوگا۔ اسکندریہ کی رومی فوج اپنا سامان لے کر سمندر کے راستے سے جا سکتی ہے اور جو لوگ خشکی کے راستہ سے جانا چاہیں، ان کو روانگی کے وقت جزیہ دینا ہوگا۔ مسلمان مصریوں کے دین میں کسی قسم کا دخل نہیں دیں گے۔

جب یہ شرطیں مان لی گئیں، تو اسلامی فوج اسکندریہ میں داخل ہوگئی۔

اگرچہ اسکندریہ کی فتح سے تقریباً سارے مصر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ مگر کچھ مقامات ایسے تھے جہاں دشمن کی فوجیں موجود تھیں۔ عمرو بن عاص ؓ نے ان کی طرف فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے بھیج دیئے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں سارا ملک دشمنوں سے پاک ہوگیا۔ یہ تعجب کی بات نہیں تو اور کیا ہے، کہ اتنا بڑا ملک مصر صرف دو سال کے عرصہ میں فتح ہوگیا۔ اس سے حضرت عمرو بن عاص ؓ کی دلیری، بہادری اور جنگی قیادت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مصر سے نکل کر رومیوں نے اپنی قوت مغربی افریقہ میں جمع کر لی تھی۔ عمرو بن عاص ؓ نے چاہا، کہ آگے بڑھ کر وہاں بھی اُن کی قوت کو توڑ دیں تا کہ انہیں پھر کبھی مصر واپس لینے کا حوصلہ نہ ہوسکے۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ برقہ پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے تیرہ ہزار دینار سالانہ جزیہ پر صلح کر لی۔ پھر انہوں نے طرابلس غرب کا رُخ کیا۔ یہاں نہایت سخت مقابلے پیش آئے۔ پورے تین مہینے کے بعد اس پر قبضہ ہوا۔ وہاں سے انہوں نے حضرت عمر ؓ کو لکھا کہ طیونس اب صرف نو منزل پر ہے۔ اگر وہ حکم دیں، تو اس کو بھی فتح کر لیا جائے۔ مگر حضرت عمر ؓ نے آگے جانے سے روک دیا۔

عمرو بن عاص ؓ چاہتے تھے کہ اسکندریہ کو ہی مصر کا پایۂ تخت رہنے دیں۔ مگر حضرت عمر ؓ نے اس کو پسند نہیں کیا۔ انہوں نے لکھا کہ اسکندریہ کے راستے میں دریائے نیل پڑتا ہے۔ اس لیے اسے چھوڑ کر کسی ایسے مقام کو پایۂ تخت بناؤ جہاں مَیں جس موسم میں چاہوں چلا آؤں، اور کوئی دریا بیچ میں نہ پڑے۔ چنانچہ عمرو ؓ بن عاص نے اس کے لیے فسطاط کو منتخب کیا۔ یہاں سے شمالی اور جنوبی سرحدوں کی نگہداشت ہوسکتی تھی، اور آب و ہوا بھی یہاں کی بہت اچھی تھی۔ کہتے ہیں کہ پہلے اسی مقام پر اسلامی فوج نے آ کر ڈیرے ڈالے تھے۔ یہاں سے جس وقت اسکندریہ کو روانہ ہونے لگے، تو عمرو بن عاص ؓ کے خیمہ میں ایک کبوتر نے گھونسلا بنا کر انڈے دے رکھے تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ خیمہ کو مت اکھاڑو، ورنہ ہمارے مہمان کو تکلیف ہو گی۔ جب اسکندریہ سے واپس آئے تو اُسی خیمہ میں اُترے عربی زبان میں فسطاط ڈیرے کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس شہر کا نام بھی یہی رکھا گیا۔

فسطاط شروع میں ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے یہ بہت بڑا ہوگیا۔ مدت

تک یہ مصر کا صدر مقام اور تجارت و تمدن کا مرکز رہا۔ جب نیا پایہ تخت تعمیر ہوا، تو اس کی رونق گھٹنے لگی، اور اب اس کے کچھ کھنڈر باقی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو تاکیدی حکم بھیجے تھے، کہ اہلِ مصر کی اچھی طرح نگرانی کرو۔ عدل و انصاف قائم کرو۔ اِن کے چھوٹے چھوٹے قصور معاف کر دیا کرو۔ کسی پر زیادتی نہ کرو۔ محصول ان کی استطاعت کے مطابق لگاؤ۔ وہ اسے بوجھ نہ سمجھیں۔ ان کی مذہبی اور معاشرتی آزادی میں مطلق دخل نہ دو۔ رعایا کی خوشحالی اور اراضی کی ترقی کو مدنظر رکھو۔

حضرت عمرو بن عاصؓ نے امیر المومنین کے احکام کی پوری تعمیل کی۔ اور مصر کا انتظام اتنا اچھا کیا، کہ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ سب سے پہلے اُنہوں نے وہاں کے باشندوں کی طرف توجہ کی۔ مذہبی باتوں میں ان کو پوری آزادی بخشی۔ جان و مال، جائیداد و اولاد، عزت، دولت، تجارت غرض ہر چیز کی حفاظت کا اُن کو پورا اطمینان دلایا۔ تمام پُرانے سخت اور ظالمانہ قانون منسوخ کر کے عدل و انصاف کا قانون جاری کیا۔ مقدموں کا فیصلہ کرنے کے لیے قاضی مقرر کیے۔ خراج جمع کرنے کا فرض قبطیوں کے سُپرد کیا۔ ان کی نگاہ میں ہر ایک برابر تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ مصر کے باشندے ان کے انتظام سے اتنے خوش ہوئے کہ بے ساختہ پُکار اُٹھے۔ "ہماری بیڑیاں کٹ گئیں اور ہم آزاد ہو گئے۔"

❀............❀............❀

35

حضرت عمیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ سعد کے بیٹے اور قبیلہ انصار کی مشہور شاخ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ کم سنی کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی کمان میں انہیں جہاد کی سعادت نہ مل سکی، شام کی فتوحات میں البتہ انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عیاض بن غنم کو لکھا کہ وہ عمیر رضی اللہ عنہ کو جزیرہ کے مشہور شہر راس عین کی تسخیر پر مامور کریں۔ چنانچہ انہوں نے انہیں راس عین کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ نے بڑی حکمتِ عملی سے اپنی فوجوں کی کمان کی۔ مجاہدین اسلام بڑی بے جگری سے لڑے اور دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔

راس عین کی فتح کے بعد عمیر رضی اللہ عنہ نے خابور اور قرقیسیاء کا رُخ کیا اور انہیں بھی فتح کر لیا۔ اِسی طرح فرات کے آس پاس کے قلعے ناؤدسیہ اور ''آبوسہ'' بھی فتح کر لیے۔ فرات کے مغربی کنارے پر واقع شہر ہیت میں ان کی ملاقات حضرت عمار بن یاسر سے ہوئی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ پھر وہاں سے حضرت عمیر رضی اللہ عنہ رقہ چلے آئے اور وہاں سے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی ان فتوحات اور مشورہ طلب امور کے بارے میں لکھا۔

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ بڑے زاہد، متقی اور پارسا تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑے اچھے منتظم اور بہترین قائد تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ''مجھے عمیر رضی اللہ عنہ جیسے آدمیوں کی ضرورت ہے۔''

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے بیٹے عبدالرحمٰن سے کہا کہ شام میں تمہارے باپ سے افضل و بہتر کوئی نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمیر رضی اللہ عنہ کو جزیرہ کا گورنر مقرر کیا، انہوں نے مضر اور

ربیعہ کے علاقوں میں مسجدوں کا جال پھیلا دیا۔ پھر انہیں سعید بن عامر کے بعد حمص کا گورنر مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ کو اپنے وہی گورنر اچھے لگتے تھے جو رعایا کو بہت خوش رکھتے تھے۔ حضرت عمیرؓ نے ایک دن حمص کی جامع مسجد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا جتنا ملک کا والی (اور حکمران) مضبوط ہوگا اتنا ہی اسلام مضبوط ہوگا۔ والی ملک کی مضبوطی قتل و غارت اور جاہ و جلال سے نہیں، بلکہ عدل وانصاف کی راہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے سے ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے طور پر فلسطین کے غریب آدمیوں کی فہرست حاصل کی تو ان میں حضرت عمیرؓ کا نام بھی شامل تھا۔ وہ حیران ہوئے اور پوچھا "یہ عمیر کون ہے۔" بتایا گیا ہے کہ عمیرؓ بن سعد جو گورنر ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ گورنر ہو کر کیسے غریب ہو سکتے ہیں؟ بتایا گیا کہ وہ حکومت کے خزانے سے تو ایک پیسہ بھی نہیں لیتے، پھر وہ پیسوں کو کیا کرتے ہیں؟ بتایا گیا کہ مستحق لوگوں پر تقسیم کردیتے ہیں اور خود بان بٹ کر مزدوری کر کے کھاتے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ پر رقت طاری ہوگئی اور ان کے لیے ایک سو دینار تحفہ میں بھجوائے۔ جونہی یہ رقم انہیں ملی فوراً فقراء میں تقسیم کردی، اِن کی بیوی نے کہا کہ ایک دینار اپنے لیے بھی رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا کہ اگر پہلے بتا دیتیں تو رکھ لیتا۔

حضرت عمیرؓ بڑے بہادر تھے، دشمن پر ان کا حملہ بڑا خطرناک ہوتا تھا۔ ان میں تمام قائدانہ صفات پائی جاتی تھیں۔ اپنے ماتحت مجاہدوں سے وہ گھل مل کر رہتے اور ان کا بڑا خیال رکھتے تھے وہ بھی اِن پر مرتے تھے۔

حضرت عمیرؓ کا وصال 31 ہجری میں حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں شام میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجے مزید بلند فرمائیں اور ہمیں ان کی صحیح پیروی کی توفیق بخشیں۔
(آمین)

❀..........❀..........❀

36

حضرت عمیر بن وہب الجمعی رضی اللہ عنہ

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ بن وہب بن حذافہ بن جمع (جمح) قرشی کے بیٹے تھے، ابواُمیہ کنیت تھی۔ والدہ کا نام نخیلہ بنت ہاشم بن سعید بن سہم تھا۔ اسلام سے پہلے وہ اپنے قبیلہ بنی جمح کے سردار تھے، اور قریش میں بھی قابلِ قدر تھے۔

غزوۂ بدر میں کفارِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑے۔ کفار نے انہیں اسلامی لشکر کے حال احوال معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ انہوں نے اپنے گھوڑے پر اسلامی لشکر کے اردگرد چکر لگایا اور آکر بتایا کہ اسلامی لشکر کی تعداد کم وبیش 300 کے قریب ہے۔

ابن سعد کا کہنا ہے کہ "ان کی خواہش یہ تھی کہ قریش واپس مکہ چلے جائیں اور مسلمانوں سے جنگ نہ کریں ورنہ زیادہ نقصان قریش ہی کا ہوگا، مگر قریش نہ مانے۔"

بدر میں زخمی ہوئے اور مقتولین میں ڈال دیئے گئے، رات کی ٹھنڈک میں انہیں کچھ افاقہ محسوس ہوا تو گھسٹ گھسٹ کر مقتولین میں سے نکلے اور پھر مکہ کی راہ لی، اور پھر ان کا زخم بھی ٹھیک ہوگیا۔

قریش کے بہادروں میں سے تھے۔ اسلام سے پہلے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کو اذیت پہنچاتے رہتے تھے۔

عمیر مکہ میں صفوان بن اُمیہ کے ہاں بیٹھے تھے، اس دوران بدر میں مرنے والوں کا تذکرہ ہوا تو صفوان نے کہا کہ "بدر میں مرنے والوں کے بعد بخدا زندگی کا لطف جاتا رہا۔" عمیر نے کہا واقعی! اگر مجھ پر قرض اور اہل وعیال کا بار نہ ہوتا تو مَیں محمد ﷺ کو بہانے سے جا کر قتل کر آتا اور میرے پاس اس کا معقول بہانہ بھی ہے کہ مَیں اپنے قیدی بیٹے کو ملنے آیا ہوں۔ اس پر صفوان

نے مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ تمہارے قرض اور اہل وعیال کے خرچ کا میں ذمہ لیتا ہوں۔ تمہیں کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ صفوان نے انہیں تیار کیا اور تلوار زہر میں بجھا کر اور تیز کر کے ان کے حوالہ کی۔ عمیر اس مشن پر روانہ ہوئے اور مسجد نبوی کے دروازہ پر اُترے۔

حضرت عمر ؓ چند انصار سے غزوۂ بدر کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ اتنے میں ان کی نظر عمیر پر پڑی کہ وہ تلوار لیے ہوئے تھے۔ تو فرمایا کہ "یہ اللہ کا وہ دشمن ہے جس نے غزوۂ بدر کے موقع پر قریش کو ہمارے بارے میں احوال کی خبر دی تھی۔ پھر حضرت عمر فاروق ؓ وہاں سے اُٹھ کر رسولِ پاک ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی "یا رسول اللہ ﷺ! عمیر تلوار سونت کر مسجد میں داخل ہو گیا ہے اور یہ بڑا دغاباز اور مکار ہے۔ اس پر ہرگز اعتبار نہ کیجیے گا۔" رسولِ پاک ﷺ نے فرمایا کہ "اسے میرے پاس لے آئیں۔" حضرت عمر ؓ ان کی تلوار کی میان پر ہاتھ رکھ کر انہیں آپ ﷺ کی خدمت میں لے آئے، اور اپنے انصار ساتھیوں سے کہا کہ آپ لوگ بھی رسولِ پاک ﷺ کے پاس آ کر بیٹھ جائیں اور اس خبیث پر کڑی نظر رکھیں۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

حضرت عمر ؓ عمیر کو لیے رسولِ پاک ﷺ کے ہاں پہنچے اور ان کا ہاتھ برابر عمیر کے گلے میں لٹکی ہوئی تلوار کے میان پر رہا، رسولِ پاک ﷺ نے فرمایا "عمر اسے چھوڑ دو۔" عمیر میرے پاس آ جاؤ۔ عمیر پاس آ گئے اور جاہلی سلام "انعموا صباحاً" کہا۔ رسولِ پاک ﷺ نے فرمایا کہ "عمیر تمہارے سلام سے کہیں بہتر اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کا سلام ہمیں عطا کیا ہے۔"

آپ ﷺ نے پوچھا عمیر یہ بتاؤ کہ کیسے آنا ہوا؟ عمیر نے کہا کہ "اس قیدی کی وجہ سے آیا ہوں کہ اس سے اچھا سلوک کریں۔"

رسولِ پاک ﷺ نے فرمایا کہ "آپ کے گلے میں جو تلوار ہے اس کا کیا قصہ ہے؟ عمیر کہنے لگے! تلواروں کا بُرا ہو، یہ ہمیں کب کام آئیں۔ دراصل جب میں سواری سے اترا تو اسے وہاں چھوڑنا بھول گیا۔ رسولِ پاک ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اپنے آنے کے بارے میں سچی بات بتا دو۔ عمیر نے کہا میں اسی قیدی کی وجہ سے آیا ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا کہ حِجر (مکہ) میں صفوان سے کیا طے ہوا تھا؟ اس پر عمیر ڈر گئے اور کہا کہ کچھ طے نہیں ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا آپ کے درمیان یہ طے نہیں ہوا کہ وہ آپ کا قرض چکا دے اور آپ کے بچوں کو خرچ دیتا رہے اور اس کے عوض آپ مجھے قتل کریں؟" تمہارے اور تمہارے اس فیصلہ کے درمیان اللہ تعالیٰ حائل ہیں۔

اس پر عمیر نے کہا: "مَیں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ گواہی بھی دیتا ہوں کہ اللہ کے بغیر اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اس پر مسلمان بہت خوش ہوئے، اور رسولِ پاک ﷺ نے ان سے فرمایا اپنے اس بھائی کو دین سکھاؤ۔ قرآن پڑھاؤ اور اس کے قیدی کو آزاد کر دو۔" انہوں نے فوراً اس کی تعمیل کی۔

عمیر نے بارگاہِ نبوی میں درخواست کی "یا رسول اللہ ﷺ! مَیں اللہ کے نور کو بجھانے کی بھرپور کوشش کرتا رہا، اور مسلمانوں کی تکلیف کا باعث بنارہا۔"

اب مَیں چاہتا ہوں کہ اگر آپ ﷺ اجازت دیں تو مَیں واپس جا کر اہلِ مکہ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور اسلام کی طرف بلاؤں شاید اللہ انہیں ہدایت دے دیں ورنہ انہیں ایسی ایسی تکلیفیں پہنچاؤں جیسے آپ ﷺ کے صحابہ ؓ کو پہنچایا کرتا تھا۔ آپ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔

عمیر جب اس ناپاک ارادے سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تھے تو صفوان بن امیہ لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ تمہیں چند دنوں میں ایک اہم واقعہ کی خوشخبری دیتا ہوں کہ جس سے تم بدر کو بھول جاؤ گے۔ صفوان آنے جانے والوں سے عمیر کے بارے میں پوچھا کرتے اتنے میں ایک سوار نے آکر عمیر کے اسلام لانے کی اطلاع کر دی۔ اس پر صفوان نے قسم اٹھالی کہ وہ کبھی عمیر سے کلام نہیں کریں گے اور نہ کسی قسم کا کوئی فائدہ پہنچائیں گے۔

عمیر ؓ مکہ واپس پہنچے تو یہیں رہ کر اسلام کی دعوت دینے لگے، اور جو ان کی مخالفت کرتے انہیں سخت تکلیف پہنچاتے۔ ان کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ (ابن ہشام)

اس کے بعد عمیر ؓ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوۂ احد اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شرکت کی۔

فتح مکہ کے بعد صفوان بن امیہ نے یمن کی راہ لی۔ عمیر ؓ نے ان کے لیے رسولِ پاک ﷺ سے امان طلب کی اور امان کی نشانی کے طور پر اپنا عمامہ انہیں عطا کیا۔ عمیر ؓ نے انہیں جالیا اور کہا کہ صفوان آپ کیوں اپنی جان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ رسولِ پاک ﷺ کی طرف سے تمہارے لیے امان ہے جو مَیں لے کر آیا ہوں۔ صفوان نے کہا دور رہو۔ مَیں تم سے

بات کرنا نہیں چاہتا۔اس پر عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا ''رسول پاک ﷺ سب سے افضل، بہتر، سب سے زیادہ نیک اور حلیم و بردبار ہیں۔آپ کے چچازاد ہیں۔ان کی عزت تمہاری عزت، ان کا شرف تمہارا شرف، ان کی بادشاہی تمہاری بادشاہی ہے۔'' صفوان نے کہا کہ مجھے ان سے جان کا خطرہ ہے۔عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول پاک ﷺ اس سے کہیں بلند و بالا ہیں۔صفوان عمیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس آئے اور رسول پاک ﷺ کے پاس آ کر کہا کہ عمیر رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے امان دی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عمیر رضی اللہ عنہ نے سچ کہا۔صفوان نے کہا کہ آپ مجھے دو ماہ تک سوچنے کا موقع دیں۔آپ ﷺ نے فرمایا ''چار ماہ تک سوچے۔'' غزوۂ حنین اور طائف میں عمیر رضی اللہ عنہ کو بہت سامالِ غنیمت بھی ملا۔

رسول پاک ﷺ کی قیادت میں غزوۂ تبوک میں بھی شریک رہے۔

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ ایک سچے مسلمان تھے، اسلام لانے کے بعد انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں اسلام کی دعوت اور نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیں اور رسول پاک ﷺ کے جھنڈے تلے جہاد کا حق ادا کر دیا۔

❁............❁............❁

37

حضرت القعقاع بن عمرو التمیمی رضی اللہ عنہ

ایک عرب سپہ سالار جو متعدد جنگوں میں شریک ہوئے اور بہادری سے لڑے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "قعقاع کی آواز لشکر میں ہزار آدمیوں سے افضل ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ:

"جنگِ قادسیہ میں ایک ہی دن انہوں نے تیس حملے کیے اور ہر حملے میں کسی نہ کسی بہادر کو نشانہ بنایا۔" (ابن حجر: الاصابہ: 2:230)

انہوں نے نامور سپہ سالار خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں ابتدائی اسلامی جنگوں میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ 11ھ/632ء میں وہ بڑی وفاداری سے خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی طرف سے جنگ بزاخہ میں لڑے تھے۔ الحیرہ کی فتح کے بعد ربیع الاوّل 12ھ/مئی، جون 633ء میں الانبار کے قرب و جوار میں الحصید کے مقام پر القعقاع رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے مابین جھڑپ ہوئی تھی۔ جس میں ایرانیوں نے شکست کھائی۔ ایک روایت کی رو سے یہ لڑائی 12ھ میں ہوئی تھی۔

رجب 14ھ/اگست، ستمبر 635ء میں القعقاع رضی اللہ عنہ نے فتح دمشق میں نمایاں حصہ لیا اور اس سے اگلے سال یرموک میں سواروں کے ایک دستے کے سپہ سالار تھے اس جنگ کا انجام بھی مسلمانوں کی فتح پر ہوا۔

16ھ/637ء میں القادسیہ کی خونریز جنگ میں القعقاع رضی اللہ عنہ نے جو امتیاز حاصل کیا اس کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سپہ سالار تھے۔ لیکن فتح کو القعقاع رضی اللہ عنہ کی بروقت امداد سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کا ذکر ان جان باز

بہادروں کے ساتھ آتا ہے جنہوں نے اِسی سال مدائن کی فتح میں حصہ لیا، جہاں سے بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ بعض روایات کے مطابق اسی سال کے آخر میں القعقاع جنگ جلولاء میں ہراول دستے کے سردار تھے اور انہوں نے حلوان میں ایک محافظ فوج مرتب کی تھی۔ انہوں نے 21ھ/41-642ء میں نہاوند کی تسخیر میں بھی شرکت کی۔ جنگِ جمل (36ھ/656ء) سے قبل حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے گفتگو کرنے کے لیے بصرے بھیجا۔ بعدازاں انہوں نے کوفے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ القعقاع رضی اللہ عنہ عرب داستانوں کی ایک ہر دلعزیز اور بہادر شخصیت ہونے کے علاوہ شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں اور انہوں نے کئی نظموں میں اپنے جنگی کارناموں کا ذکر کیا ہے:

''جس لشکر میں قعقاع جیسا انسان ہو وہ ہار نہیں سکتا۔'' (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ)

9ہجری میں جب غزوۂ تبوک سے آنحضرت ﷺ کی واپسی ہوئی تو بنو تمیم کا قبیلہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اسلام قبول کیا، ان میں قعقاع بن عمرو التمیمی بھی تھے، ان کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ ''تم نے جہاد کے لیے کیا تیاری کی ہے؟'' مَیں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور گھوڑے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہی مقصود ہے۔''

انہی کا کہنا ہے کہ مَیں آپ ﷺ کے وصال کے وقت بھی موجود تھا۔ چونکہ قعقاع آپ ﷺ کے بالکل آخری زمانہ میں مسلمان ہوئے تھے اس لیے آپ ﷺ کی قیادت میں انہوں نے جہاد میں کوئی حصہ لیا ہو یہ ہمیں معلوم نہیں، صحابی ہونے کا البتہ شرف انہیں حاصل ہوا اور یہ شرف بھی کیا کم ہے!

ارتداد کے خلاف ان کا جہاد

بنو کلب کے قبیلہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص علقمہ بن علاثہ آپ ﷺ کے زمانہ ہی میں مرتد ہو گئے اور شام کا رُخ کیا آپ ﷺ کے وصال کے بعد جلد ہی اپنے قبیلہ میں آ کر کیمپ کیا، جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان کی سرکوبی کے لیے قعقاع بن عمرو کو ان کی طرف بھیجا کہ انہیں گرفتار کر لیں، یا پھر قتل کر دیں۔ قعقاع نے اپنے آدمیوں کے ساتھ انہیں آ

لیا، علقمہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر اپنے گھوڑے پر بھاگ نکلے، ان کے اہل وعیال البتہ مسلمان ہو گئے علقمہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آ کر توبہ کی اور مسلمان ہو گئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں معاف کر دیا کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں کی تھی اور نہ ہی مسلمانوں میں سے کسی کو جان سے مارا تھا۔

خالد بن الولید کی معیت میں

عراق میں

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو عراق بھیجا اور ان کی اور عیاض بن غنم کی طرف لکھ بھیجا کہ ''اپنے لشکر میں صرف انہی لوگوں کو رکھیں جنہوں نے مرتدین کے خلاف جہاد کیا ہو اور وہ اپنے اسلام پر ثابت قدم رہے ہوں۔'' یہی وجہ ہے کہ کوئی مرتد ان جنگوں میں شریک نہ ہو سکا۔

خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امداد کے لیے لکھا تو انہوں نے قعقاع کو ان کی طرف بھیجا۔ ان سے کہا گیا کہ ''اس میں ایک آدمی سے کیا ہو گا؟''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ، ''جس لشکر میں یہ ہوں گے وہی غالب رہے گا۔'' قعقاع رضی اللہ عنہ خالد رضی اللہ عنہ کے پاس جا پہنچے اور ان کی قیادت میں ''کاظمہ'' کی جنگ لڑی۔ یہ ایک بڑی جنگ تھی جس کی قیادت دوسری طرف سے ''ہرمز'' کر رہا تھا اور یہ وہ پہلی جنگ ہے جس میں خالد رضی اللہ عنہ ایرانیوں سے لڑے، اِسی جنگ کے دوران خالد رضی اللہ عنہ کو موت کے منہ سے نکال کر لانے والے یہی قعقاع رضی اللہ عنہ تھے۔ ہوا یوں کہ ''ہرمز'' نے خالد رضی اللہ عنہ کو دعوت مبارزت دی اور اس نے اپنے ساتھیوں کو کہہ دیا تھا کہ جب میں ان سے سامنا کروں تو تم سب ان پر ٹوٹ پڑنا اور ان کا کام تمام کر دینا۔ جب اس کے خالد رضی اللہ عنہ سے دو دو ہاتھ ہوئے اور خالد رضی اللہ عنہ نے اسے قابو کر لیا تو ایرانیوں نے ان کے ہاتھ سے ہرمز کو بچانے اور خالد رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی خاطر جونہی اقدام کرنا چاہا تو قعقاع رضی اللہ عنہ نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی اور ان پر ٹوٹ پڑے اور باقی لوگوں کو ان سے روکے رکھا۔ ایرانی ان کے سامنے ٹھہر نہ سکے رات تک جنگ جاری رہی اور سخت جنگ کے بعد شکست کھائی۔

قعقاع ؓ خالد ؓ کی قیادت میں فتح حیرہ تک برابر لڑتے رہے، اور ہر جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نمایاں خدمات انجام دیں، حیرہ پر قبضہ کے بعد خالد ؓ نے اپنے کمانڈروں کو سواد کے علاقہ میں دجلہ تک ریڈ کا مشن سونپا، ان میں قعقاع ؓ بھی تھے، اور انہوں نے اس مشن میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔

حیرہ

حیرہ آگے بڑھنے والی مسلمان سپاہ کی چھاؤنی قرار پائی، جب خالد ؓ نے اس کے شمال میں انبار، عین التمر اور دومتہ الجندل کی فتح کا ارادہ کیا تو حیرہ کی قیادت انہیں سونپی اور انہیں اپنا قائم مقام بنایا، یہاں قعقاع ؓ نے خالد ؓ کی قائم مقامی اور پشت پناہی کا مشن انجام دیا اور حیرہ کی حفاظت کی اور دشمن اور ان کے حلیفوں کے حملوں سے اسے بچا کر رکھا اور انبار میں ان کو شریک ہونے سے رکاوٹ پیدا کرتے رہے، جب خالد ؓ دومتہ الجندل کی فتوحات سے واپس حیرہ پہنچے تو انہوں نے کیا دیکھا کہ قعقاع ؓ اپنے لوگوں کے ساتھ حصید کے مقام پر ایرانیوں سے نبرد آزما ہیں، جس میں انہیں بہت نقصان پہنچایا اور ایرانی قائد کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا، وہ تمام معرکوں میں خالد ؓ کی قیادت میں شریک رہے یہاں تک کہ جب خالد ؓ اپنی نصف فوج کے ساتھ عراق سے شام کے لیے روانہ ہوئے۔ تو قعقاع ؓ ان نامور مجاہدین میں سے ایک تھے جنہیں خالد ؓ نے شامی مہم کے سلسلہ میں معاونت کے لیے چُنا تھا۔ شام کے راستہ میں، شام پہنچنے تک خالد ؓ کی قیادت میں لڑی جانے والی تمام جنگوں میں شریک رہے۔

شام میں

مسلمان سپاہ یرموک میں جمع ہوئی، ان کے کمانڈران چیف خالد بن الولید ؓ تھے، مہاجرین وانصار کے جن 100 نامور مجاہد وفدائی جنہیں خالد ؓ نے رومیوں کے مورال کو تباہ کرنے کے لیے معرکہ یرموک سے کچھ پہلے چُنا ان میں ایک قعقاع ؓ بھی تھے۔ انہوں نے یرموک میں عراقی فوج کے ایک حصہ کی کمانڈ بھی کی تھی۔ وہ رجز پڑھتے ہوئے اپنے اس دستے کے ساتھ رومیوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے۔ اس سے ان کے اپنے آدمیوں میں بھی آگے بڑھنے اور دادِ شجاعت دینے کا مزید جذبہ پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا، آگے بڑھنے اور دادِ شجاعت دینے

میں وہ ایک عمدہ مثال تھے۔

جب یرموک میں رومیوں نے شکست کھائی تو مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ رومیوں کی نئی فوج دمشق کی حمایت وحفاظت کے لیے آ گئی ہے اور وہ قلعہ بند ہو گئی ہے۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ اور خالد ؓ نے دمشق کی راہ لی اور 70 دن تک اس کا محاصرہ کیے رکھا۔ خالد ؓ نے دمشق کے قلعہ پر قبضہ کرنے کا ایک جرأت مندانہ پلان بنایا اور وہ یہ کہ انہوں نے قلعہ کی دیواروں پر رسیوں کی سیڑھیاں بنا کر رات کی تاریکی میں قلعہ کی دیواروں پر چڑھنا تھا اس میں خالد ؓ کے ہمراہ قعقاع ؓ بھی تھے۔ انہوں نے فصیل پر چڑھ کر حسب پروگرام نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دیگر فوج نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر وہ شہر کی فصیل کی طرف چل پڑے اور رسیوں کی سیڑھیاں پھینک دیں، قعقاع ؓ اور مذعور بن عدی ان پر چڑھ کر اوپر چلے گئے اور باقی رسیوں کو فصیل کے ساتھ مضبوط کر دیا، اور یہ جگہ نہایت محفوظ اور اہم تھی، جب مسلمان فصیل پر چڑھ گئے خالد ؓ نے اپنے آدمیوں کے ساتھ جن میں قعقاع ؓ پیش پیش تھے شہر کے دروازوں پر پہرہ داروں پر حملہ بول دیا، انہیں قتل کر کے شہر کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دیئے اس دوران خالد ؓ اور قعقاع ؓ بار بار نعرۂ تکبیر بلند کرتے رہے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمان طویل محاصرے کے بعد دمشق شہر میں داخل ہو گئے ہیں۔

اِسی طرح قعقاع ؓ نے "فحل" کی جنگ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اس میں تو بہت ہی تکلیف اٹھائی۔

دوسری بار عراق میں

قادسیہ میں

فتح دمشق کے بعد حضرت عمر ؓ کا خط ابوعبیدہ ؓ کے نام آیا کہ عراق سے آنے والی امدادی فوج کو واپس عراق بھیج دیں اور انہیں سعد ؓ بن ابی وقاص کی قیادت میں لڑنے کو کہیں۔"

ابوعبیدہ ؓ نے ہاشم بن عتبہ کی امارت میں اس فوج کو عراق روانہ کیا۔ قعقاع ؓ اس کے ہراول دستے میں تھے، اور قعقاع ؓ تیزی سے فوج کو چلا کر قادسیہ کی جنگ کے

دوسرے روز (یوم اغواث) اسلامی فوج سے جا ملے۔ اپنے ساتھیوں کو جو تعداد میں ایک ہزار تھے حکم دیا کہ وہ دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت میں چلیں گے۔ جب ایک جماعت نگاہ سے اوجھل ہو جائے گی تو پھر دوسری انہی کے پیچھے مارچ کرے گی، پھر قعقاع ؓ پہلی جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے، جب اپنے لوگوں کے پاس پہنچے تو انہیں سلام کیا، اور امدادی فوج کے آنے کی خوشخبری سنائی اور بتایا کہ میں عجیب فوج لے کر حاضر ہوا ہوں۔ تم بھی وہی کرو جو میں کروں۔ پھر آگے بڑھے حتیٰ کہ وہ دو صفوں کے درمیان تھے، قعقاع ؓ نے پکار کر کہا ہے کوئی میرے ساتھ مقابلہ کرنے والا؟ اس پر ذوالحاجب نکلا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں بہمن جاذویہ ہوں اس پر قعقاع ؓ نے زوردار آواز میں کہا کہ ابوعبیدہ ؓ بن مسعود سلیط اور جنگ جسر کے ساتھیوں کا بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔ اس پر زوردار حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔

قعقاع کے گھڑسواروں کے دستے جماعتوں کی شکل میں اسی ترتیب کے ساتھ رات تک آتے رہے۔ وہ جب لشکر میں پہنچتے تو نعرۂ تکبیر بلند کرتے تھے جس سے مسلمانوں کا مورال بلند ہوتا رہا اور دشمن کا مورال تباہ۔ قعقاع نے پھر دوسری بار دعوت مبارزت دی۔ اس پر ایرانی فوج کے ایک کمانڈر سامنے آئے۔ اسے نہایت پھرتی سے ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

قعقاع کے چچازاد بھائیوں نے بھی دس دس آدمیوں کی جماعتیں بنائیں، انہوں نے اپنے اونٹوں کو برقعے پہنا دیئے۔ قعقاع نے انہیں حکم دیا کہ اب ایرانیوں کے گھڑسواروں پر ٹوٹ پڑو۔ اب ان کے گھوڑے ان سے ویسے ہی ڈر گئے جیسے مسلمانوں کے گھوڑے ان کے ہاتھیوں سے ڈر گئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر مسلمان بہت خوش ہوئے۔ جنگِ قادسیہ کے پہلے روز مسلمانوں کے گھوڑے ایرانیوں کے ہاتھیوں سے اتنے نہیں ڈرے تھے جتنے کہ آج ان کے گھوڑے ان برقع پوش اونٹوں سے ڈرے اور اپنے سواروں کو لے کر بھاگ نکلے، اس روز قعقاع نے ہر آنے والے دستے کے ساتھ تیس زوردار حملے کیے اور ہر حملہ میں خود اپنے ہاتھ سے ان کے تیس نامی گرامی لڑاکوں کو جہنم رسید کیا۔

قعقاع ؓ اس تمام رات میں جاگتے رہے اور اپنے آدمیوں کو لے کر گزشتہ کل والی جگہ پر پہنچ گئے، اور ان سے کہا کہ اب تم سورج نکلنے کے بعد سو سو کی تعداد میں آتے رہو گے اور آخری دستے میں جب ہاشم آ جائیں تو بس! اور جب ایک دستہ نظروں سے اوجھل ہو گا تو پھر دوسرا

چل پڑے گا، اور یہ دستے بھی آتے رہے اور قادسیہ میں لڑنے والی فوج کو بھی یہ علم نہ ہو سکا کہ یہ وہی لوگ ہیں بلکہ وہ بھی یہی سمجھتے رہے کہ مسلسل امدادی فوج پہنچ رہی ہے۔

مگر ہاتھیوں سے آج بھی مسلمانوں کو تکلیف پہنچ رہی تھی، اوران کا نقصان ہورہا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قعقاع رضی اللہ عنہ اوران کے بھائی عاصم کو کہلا بھیجا کہ "سفید ہاتھی کا بندوبست کرو، کہ باقی ہاتھی اس کے اردگرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔قعقاع رضی اللہ عنہ اور عاصم نے دو مناسب نیزے لیے اور ایک گھوڑا سوار اور ایک پیادہ کو دے دیئے کہ اس سفید ہاتھی کی آنکھوں میں ایک ہی وقت میں ماردو، انہوں نے ایسا ہی کیا ہاتھی درد سے پیچھے ہٹا اور اپنے سوار کو بھی گرادیا، قعقاع نے اپنی تلوار کی ضرب سے اس کا کام تمام کردیا۔

ساری رات جنگ جاری رہی، ایرانی فوج نے مل کر زوردار حملہ کیا اور اپنی صفوں کو مزید مضبوط کیا۔قعقاع رضی اللہ عنہ نے بھی جوابی حملہ کیا، بڑی زوردار لڑائی ہوئی اور جوں جوں رات آگے بڑھتی رہی جنگ انتہائی شدت اختیار کرتی گئی۔

نصف رات کے وقت سعد نے قعقاع رضی اللہ عنہ کے رجز پڑھنے کی زوردار آواز سُنی جس سے انہیں فتح کا اندازہ ہوا۔اس خونی رات کی جب صبح ہوئی تو قعقاع رضی اللہ عنہ لوگوں میں کہتے پھرتے تھے کہ اب فیصلہ ہوا ہی چاہتا ہے اور یہ اس کے حق میں ہوگا جو زوردار حملہ کرے۔ذرا سا صبر کرو پھر زبردست حملہ کرو۔صبر کرو اس لیے کہ فتح ونصرت کا تعلق صبر ہی سے ہے۔

کچھ کمانڈر اپنے آدمیوں کے ساتھ رستم پر چڑھ دوڑے اور اس کے اردگرد کا حلقہ توڑ دیا اور ان میں خلط ملط ہوگئے۔اب ایرانیوں کی صفوں کی ترتیب برقرار نہ رہ سکی۔قعقاع رضی اللہ عنہ اور ان کے آدمی "ہرمز" کے تخت پر حملہ آور ہوئے، جب اس تک پہنچے تو دیکھا کہ وہ اس سے اٹھ کر نکلنے لگا۔ قعقاع رضی اللہ عنہ نے اپنے آدمیوں کے ساتھ دریا کے کنارے تک اس کا پیچھا کیا، ہرمز نے جان بچانے کی خاطر دریا میں چھلانگ لگادی۔ہلال بن علقمہ نے اسے دیکھ لیا اور وہ بھی اس کے پیچھے دریا میں کود گئے اور اسے قتل کردیا۔

ایرانیون کو شکست ہوئی اور قعقاع رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ کے حکم سے انہیں دور بھگا دیا اور ان (ایرانیوں) کا بہت جانی نقصان ہوا۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ "میں نے قعقاع رضی اللہ عنہ جیسا کوئی اور لڑاکا نہیں دیکھا۔اس نے ایک ہی دن میں تیس حملے کیے اور ہر حملہ

میں دشمن کے نامی گرامی آدمی کو تہ تیغ کیا۔"

مدائن میں

حضرت سعدؓ نے فتح مدائن کے موقع پر دریا کو گھوڑوں کی پشت پر عبور کرنے کا فیصلہ کیا اور فرمایا کہ پہل کون کرے گا تاکہ آگے پہنچ کر وہ عبور کرنے والوں کی حفاظت کر سکیں اور تمام لوگ دریا عبور کر جائیں، اور دشمن کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ امدادی فوج کے چھ سو گھڑ سواروں کے ساتھ دریا کو عبور کرنے کے لیے قعقاعؓ کے بھائی عاصم نے حامی بھر لی اور اپنے آدمیوں کے ساتھ دریا عبور کر کے مدائن میں داخل ہو گئے، ان کے بعد قعقاعؓ نے اپنے آدمیوں کے ہمراہ دریا عبور کیا دریا کو عبور کرتے ہوئے ان کے آدمیوں میں سے ایک آدمی اپنے گھوڑے سے پھسل گیا، قعقاعؓ نے فوراً اپنے گھوڑے کی لگام اس کی طرف پھینکی، اس آدمی نے یہ لگام پکڑ لی اور قعقاعؓ نے اسے کھینچ کھینچ کر دریا عبور کرا دیا، اس آدمی نے قعقاعؓ سے کہا کہ "اے قعقاعؓ! عورتیں تمہارے جیسے سپوت کو جنم نہیں دے سکیں گی۔" (الطبری:2-122)

مسلمانوں کی فتح کے بعد قعقاعؓ اپنے لوگوں کی قیادت کرتے ہوئے پیش پیش تھے، انہوں نے ایک ایرانی کو دیکھا کہ وہ اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹنے سے روک رہا تھا، اسے قتل کر دیا، اس مقتول کے پاس گیارہ تلواریں اور زرہیں تھیں، اور ان میں کسریٰ، ہرمز، ہرقل، خاقان اور نعمان وغیرہ بادشاہوں کی تلواریں اور زرہیں بھی شامل تھیں۔ یہ قعقاعؓ کو غنیمت میں ملیں۔

جنگِ جلولاء میں

ایرانی فوجیں مدائن سے پیچھے ہٹ کر جلولاء میں آ گئیں۔ حضرت سعدؓ نے اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی، انہوں نے جواب میں لکھا کہ "ہاشم بن عتبہ کی سرکردگی میں 12 ہزار فوج جلولاء بھجوا دیں اور قعقاعؓ بن عمرو اس کے ہراول دستے میں ہونے چاہئیں۔"

ہاشم نے جلولاء پہنچ کر ان کا محاصرہ کر لیا اور محاصرہ نے 80 دن تک طول کھینچا، قعقاعؓ اپنے آدمیوں کو لے کر ایرانیوں کی خندق کے ایک حصہ میں داخل ہو گئے، اور ایک آدمی سے منادی کرائی کہ مسلمانو! یہ تمہارے امیر اور کمانڈر ہیں جو خندق میں داخل ہو گئے ہیں اور تم بھی ان کا ساتھ دو، قعقاعؓ نے مسلمانوں کا مورال بلند کرنے کے لیے منادی کا حکم دیا تھا۔ مسلمان

سپاہ بھی خندق میں پہنچ گئی انہوں نے ہلہ بول دیا، ان کا خیال تھا کہ ہاشم خندق میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں ہاشم کی جگہ قعقاع ؓ نے خندق کے ایک حصہ پر قبضہ کر رکھا ہے، اِسی بات پر ایرانی ہار گئے، قعقاع ؓ نے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ وہ خانقین، پھر حلوان اور قصر شیریں میں جا پہنچے، حضرت سعد ؓ کے کوفہ پہنچنے تک قعقاع ؓ حلوان[1] ہی میں رہے۔ پھر اپنی جگہ اپنے آدمیوں میں سے ایک کو نائب بنا کر حضرت سعد ؓ کے ہاں پہنچ گئے۔ (ابن اثیر، طبری)

دوبارہ شام میں

ہرقل شاہ روم نے بڑی تعداد میں فوج جمع کر لی۔ اس کے پاس الجزیرہ اور دیگر علاقوں اسکندریہ سے برّی اور بحری فوجیں جمع ہو گئیں۔ جب ابو عبیدہ ؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنی فوجیں حمص میں جمع کر کے حضرت عمر فاروق ؓ کو اس معاملہ کی اطلاع دی۔ حضرت عمر ؓ نے حضرت سعد ؓ کو لکھا کہ ''میرا یہ خط ملتے ہی قعقاع ؓ کی سرکردگی میں فوج حمص روانہ کر دیں۔'' اس پر انہوں نے چار ہزار آدمیوں کے ساتھ انہیں روانہ کر دیا۔ جب اہل جزیرہ جنہوں نے اہل حمص کے خلاف رومیوں کی مدد کی تھی، کو پتہ چلا کہ کوفہ سے مسلمان افواج چل پڑی ہیں اب یہ معلوم نہیں کہ ان کا رُخ جزیرہ کی طرف ہے یا حمص کی طرف تو وہ فوری خطرہ کے پیشِ نظر روم کو چھوڑ کر اپنے علاقوں کی حفاظت کے لیے چلے گئے۔ ان رومیوں سے مسلمانوں نے دو دو ہاتھ کیے اور قعقاع ؓ کے حمص پہنچنے سے تین دن پہلے با آسانی ان پر فتح حاصل کی۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے ابو عبیدہ ؓ کو لکھا کہ کوفہ سے آنے والی اس فوج کو بھی مالِ غنیمت میں سے حصہ دیں اور یہ بھی لکھا کہ اللہ انہیں جزائے خیر دیں کہ یہ اپنے علاقوں کے دفاع کے ساتھ ساتھ دوسرے شہروں کی بھی امداد کرتے ہیں۔ (الطبری 15:3)

قعقاع ؓ کی وجہ سے کوفہ سے آنے والی اس فوج کو یوں سراہا گیا۔ قعقاع ؓ اپنی فوج کو لے کر واپس عراق پہنچ گئے۔

ایران میں

قعقاع ؓ نے نعمان بن مقرن المزنی کی قیادت میں جنگِ نہاوند میں بھی خوب

[1] لیکن بلاذری کے قول کے مطابق حلوان کو جریر ابن عبداللہ البجلی نے فتح کیا تھا۔

خوب دادِ شجاعت دی، یہاں بھی وہ گھڑ سواروں کے ہراول دستے کے قائد تھے۔ مسلمانوں کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شہر کا محاصرہ غیر ضروری طول کھینچے جب کہ ایرانی قلعہ کے اندر چلے گئے تھے اور جب تک وہ خود نہ نکلیں انہیں نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ اس پر مشورہ کے لیے نعمان بن مقرن نے کانفرنس بلائی تا کہ شہر کو فتح کرنے کا مناسب حل مل سکے۔ طے پایا کہ نعمان گھڑ سواروں کا ایک دستہ جنگ کے لیے بھیجیں۔ پھر یہ لوگ ہٹتے ہٹتے پیچھے آتے جائیں۔ اس سے ایرانی یہ سمجھ کر کہ یہ بھاگ رہے ہیں ان کا تعاقب کریں گے اور جب یہ تدبیر کام کر جائے تو اس وقت مسلمان فوج ان پر حملہ بول دے اور پھر یہ جنگ قلعہ سے باہر ہوگی۔ اس منصوبہ پر بیدار مغزی اور پوری مہارت کے ساتھ کون عمل درآمد کرے؟ نعمان نے قعقاع ﷛ کو حکم دیا کہ وہ گھڑ سواروں کی قیادت کریں گے۔ انہوں نے جا کر ان سے لڑنا شروع کر دیا۔ جب ایرانیوں نے باہر نکل کر مقابلہ شروع کر دیا تو یہ برابر پیچھے ہی ہٹتے رہے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ رہے ہیں انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان کی سب فوج باہر نکل آئی سوائے ان چند آدمیوں کے جو دروازوں پر متعین تھے۔ قعقاع ﷛ بڑی مہارت کے ساتھ اپنے لوگوں کو اپنی فوج میں لے آئے۔ اب ایرانی قلعہ سے باہر تھے، مسلمانوں نے ان پر حملہ بول دیا، جس میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مورخین نہاوند کی فتح کو فتح الفتوح کا نام دیتے ہیں۔ اس فتح میں قعقاع ﷛ کا واقعی بڑا حصہ ہے۔

فیرزان، ایرانی فوج کا کمانڈر جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ نعیم بن مقرن نے اس کا تعاقب کیا۔ قعقاع ﷛ بھی اس کے پیچھے تھے۔ قعقاع ﷛ نے اسے ہمدان کے اطراف میں جا لیا۔ وہاں وہ گھوڑے سے اتر کر قریبی پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ قعقاع ﷛ نے وہاں بھی پیچھا کر کے اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا۔ اس طرح قعقاع ﷛ بھی نعمان کے ساتھ ہی ہمدان میں فاتح کے طور پر داخل ہوئے۔

❀............❀............❀

38

حضرت المثنیٰ بن حارثہ الشیبانی رضی اللہ عنہ

آپ عرب کے مشہور قبیلے شیبان سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا نام حارثہ تھا۔ نامور سپہ سالار اور قائد تھے۔ انہی کی توجہ دلانے سے اسلامی لشکر نے عراق پر فوج کشی کی اور پھر اسلامی فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔

اپنی قوم کے وفد کے ساتھ 9 ہجری میں بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ وہ اگرچہ صحابیٔ رسول تھے مگر انہیں حضرت محمد ﷺ کی قیادت میں جہاد کی سعادت نہ مل سکی۔ وہ مرتے دم تک اسلام پر ڈٹے رہے۔

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد جب بعض عرب قبائل ربعیہ وغیرہ مرتد ہو گئے تو بحرین میں علاء بن الحضرمی کے لکھنے پر ان کی سرکوبی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قطیف اور ہجر کے جن لوگوں نے مرتدوں کا ساتھ دیا تھا انہیں بھی سبق سکھایا۔

مثنیٰ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ مجھے اپنے قبیلے کا امیر مقرر فرما دیجیے تاکہ میں ایرانیوں کے خلاف جہاد کر سکوں۔ مثنیٰ سواد کے علاقے پر برابر حملے کرتے رہے پھر انہوں نے اپنے بھائی مسعود کو امداد کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی امداد کے لیے حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو کمانڈر اِن چیف بنا کر بھیجا اور مثنیٰ کو ان کی کمان میں لڑنے کو کہا جسے انہوں نے بخوشی تسلیم کر لیا۔ حضرت خالد یمامہ سے دس ہزار مجاہدینِ اسلام کے ساتھ عراق کے لیے روانہ ہوئے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ مدینہ منورہ سے عراق روانہ ہوئے۔

عراق میں وہ دشمن کے خلاف لڑی جانے والی تمام جنگوں میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی

کمان میں بڑی دلیری اور بہادری سے لڑے اور کبھی ان کے حکم پر خود بھی کمان کی۔

حضرت خالد ؓ ان کی بے حد قدر کرتے تھے اور ان پر پورا اعتماد کیا کرتے تھے۔ حضرت خالد ؓ نے انہیں سوقِ بغداد پر حملے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے مقابلے میں آنے والوں کو شکستِ فاش دی۔

اِسی اثناء میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے حکم پر، حضرت خالد ؓ کو شام میں روم کے خلاف لڑنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہوں نے نصف فوج کے ہمراہ شام کی راہ لی اور بقیہ فوج کی قیادت حضرت مثنیٰ کے سپرد کرتے ہوئے انہیں خدا حافظ کہا، اب مثنیٰ کے پاس فوج کم تھی۔ ایرانی سپہ سالار ہُرمزجاذویہ، بڑی تعداد کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلا۔ بابل کے آس پاس بڑی سخت جنگ ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔ مزید کمک کی خاطر وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ہاں مدینہ منورہ پہنچے انہیں بسترِ مرگ پر ہی حال احوال کہہ سنایا۔ اس کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے انہیں خوش آمدید کہا اور بڑی توجہ سے ان کی بات سُنی اور کہا کہ حضرت عمر ؓ کو بلالاؤ۔ حضرت عمر ؓ کے آنے پر انہیں وصیت کی کہ ان کی امداد میں ہرگز تاخیر نہ کی جائے اور اگر شام میں فتح ہوئی تو ان لشکروں کو ان کی امداد کے لیے بھیجا جائے۔ حضرت عمر ؓ نے ان کی وصیت پر پورا عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا وصال ہوگیا اور حضرت عمر ؓ نے بارِ خلافت اٹھایا۔ انہوں نے لوگوں کو ایران پر حملے کے لیے توجہ دلائی مگر مسلمانوں کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ چوتھے روز حضرت عمر ؓ کی دعوت پر جس مجاہد نے لبیک کہی وہ حضرت ابوعبیدہ ثقفی ؓ تھے۔ حضرت عمر ؓ نے عراقی مہم کے لیے انہی کو کمانڈر ان چیف مقرر کردیا۔ حضرت مثنیٰ کے حیرہ پہنچنے کے بعد ابوعبیدہ ؓ بھی ایک ماہ بعد جا پہنچے۔ ایرانی فوج نمارق میں اکٹھی ہوئی۔ یہاں رسالے کی کمانڈ حضرت مثنیٰ کررہے تھے۔ مسلمانوں نے دادِ شجاعت دی اور ایرانی فوج کو شکست ہوئی اور ایرانی فوج کا سپہ سالار جابان گرفتار کرلیا گیا۔ واسط کے قریب سقاطیہ کے مقام پر دوسری جنگ ہوئی اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب فرمایا۔ اب ابوعبیدہ نے کسکر میں کیمپ کیا، اور مثنیٰ کو باروسما بھیجا۔ یہ وہاں بھی غالب رہے۔ اس کے بعد ابوعبیدہ حیرہ پہنچے اور یہاں معرکہ معبر میں ہاتھیوں نے عرب گھوڑوں کے لیے ایک مسئلہ بنادیا اور پُل کو عبور کرنے بھی نہ پائے تھے کہ ایرانیوں کے زوردار حملے کی تاب نہ لاسکے اور پیچھے دریا تھا، مسلمانوں کا

بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ابو عبیدہ اور کئی نامور بہادروں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ان کے بعد قیادت حضرت مثنیٰ کے حصے میں آئی انہوں نے زوردار آواز لگائی کہ مسلمانو! ہمت سے کام لو اور سکون کے ساتھ پل سے گزر جاؤ۔ میں دشمن کے سامنے رہوں گا، مثنیٰ آخر تک دشمن سے لڑتے رہے اور وہ آخری آدمی تھے جنھوں نے پُل عبور کیا۔ایرانیوں کا سارا زور ان پر تھا اور یہ سخت زخمی بھی ہوئے بقیہ فوج کو بچا لانے میں کامیاب ہو گئے۔ مدینہ منورہ سے بھی کمک مانگی اور قریبی عرب قبائل کو بھی جہاد پر ابھارا۔ اب بُویب کے مقام پر اسلامی لشکر جمع ہو گیا۔مہران کی قیادت میں بویب کے مقام پر بڑی سخت لڑائی ہوئی۔اِدھر اسلامی لشکر کی کمان حضرت مثنیٰ کر رہے تھے۔انہوں نے ایرانی فوج کو تقریباً تباہ کر کے اس طرح جنگِ جسر کا بدلہ لے لیا۔ پھر وہ ذی قار میں چلے آئے۔ یہیں وہ 14 ہجری میں معرکہ جسر کے زخم سے شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے۔ حضرت سعد ﷺ اور ان کا لشکر تو ان سے نہ مل سکا البتہ انہوں نے ان کے لیے فوجی لحاظ سے اہم وصیتیں چھوڑیں جنہیں عمل میں لانے سے حضرت سعد ﷺ کو ہر جگہ کامیابی ہوئی۔ یہ بھی انہی کی وصیت تھی کہ ایرانیوں سے زوردار مقابلہ میدانِ قادسیہ میں ہو۔

مثنیٰ جہاں ممتاز صاحبِ سیف اور سپہ سالار تھے وہاں صاحبِ قلم اور بڑے درجے کے شاعر بھی تھے مگر ان کی شاعری کا موضوع خالص جہاد تھا۔ بحیثیت انسان وہ بہت بہادر، نڈر اور دلیر تھے۔ وہ مضبوط ایمان وعقیدہ کے مالک تھے۔ان میں تقریباً وہ تمام قائدانہ صفات موجود تھیں جو حضرت خالد بن الولید ﷺ میں تھیں۔ شجاعت و بہادری میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔حملہ کرنے میں پیش پیش اور جنگی چال کے تحت اگر پیچھے ہٹنے کی نوبت آتی تو سب سے اخیر میں۔ وہ عراق کی سرزمین کے چپّہ چپّہ سے واقف تھے۔ ایرانیوں پر حملے میں بڑی جری تھے۔ انہوں نے ہی تو مسلمانوں کو عراق پر حملے کی طرف مائل کیا تھا۔ان میں ضبط واطاعت کا مادہ بھی بے مثال تھا۔ وہ اپنے سینئرز کے احکام کو پوری طرح نافذ کیا کرتے تھے۔انہوں نے عہدِ صدیقی میں حضرت خالد ﷺ کی کمان میں اور عہدِ فاروقی میں ابو عبیدہ ﷺ کی کمان میں نہایت اخلاص کے ساتھ کام کیا۔ دراصل وہ اپنے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے کام کرتے تھے۔

ان کی قائدانہ صفات حضرت خالد ﷺ بن الولید کی صفات سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہیں کسی بھی معرکہ میں ناکامی نہیں ہوئی۔

تاریخی لحاظ سے وہ کبھی تو بحرین کے مرتد قبائل کے خلاف علاء الحضرمی کی معیت میں جہاد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ایرانیوں سے نبرد آزما۔ انہوں نے عربوں کا مورال بلند کرنے اور ایرانیوں کا مورال تباہ کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ عراق میں ان کے کارنامے دراصل بعد کی فتوحات کا پیش خیمہ تھے اور معرکۂ بویب دراصل معرکہ قادسیہ کی تمہید تھا جو حقیقتاً ایرانی شہنشاہیت کی تباہی اور اسلام کی نشر واشاعت کا اعلان تھا۔

آخری بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عقیدے کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کر کے شہادت پائی، اور یہ جنگِ جسر کے اس زخم سے ہوئی جو انہیں مسلمان سپاہ کو بچالاتے ہوئے لگا تھا اور بڑا کاری تھا۔ وہ ہر ملک اور مقام کے سپہ سالاروں کے لیے ایک عمدہ مثال اور باعثِ فخر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجے اور بڑھائیں۔ آمین۔

❁............❁............❁

39

حضرت مجاشع بن مسعود السلمی رضی اللہ عنہ

حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ بن مسعود قبیلہ بنوسلیم سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ فتح مکہ کے بعد بیعت کی غرض سے اپنے بھائی مجالد کو لے کر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضرت ہجرت پر ان کی بیعت قبول فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اب ہجرت تو رہی نہیں۔" مجاشع رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ اب آپ ﷺ کس بات پر بیعت لے رہے ہیں؟ فرمایا "اسلام اور جہاد پر"۔ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ اپنے بھائی مجالد سے پہلے اسلام لائے، انہیں آنحضرت ﷺ کی صحبت اور ان کی کمان میں لڑنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ انہوں نے آپ ﷺ سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں جو بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔

عراق کی مہموں میں ابلہ کی مہم میں ان کا نام نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ وہاں وہ عتبہ بن غزوان کی کمان میں لڑے اور انہوں نے انہیں بصرہ کا اور فوج کا امیر بھی مقرر کیا تھا۔ جب اس بات کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انہوں نے عتبہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا آپ نے شہریوں پر دیہات کے ایک آدمی کو امیر مقرر کر دیا ہے؟

ایران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے انہیں سابور اور اردشہر کی مہم سونپی گئی جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ انہیں کام یہ دیا گیا تھا کہ وہ ایرانی سپاہ کو اہواز میں مشغول رکھیں تاکہ وہ نہاوند کی جنگ میں ان کی مدد نہ کر سکیں۔ پھر حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن نے پیادہ دستے کی کمان انہیں سونپی اور انہیں اپنے ساتھ ساتھ رکھا۔ جنگ نہاوند میں حضرت مجاشع نے نمایاں حصہ لیا اور بڑی آزمائشوں سے گزرے۔

جنگ نہاوند کے بعد حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ نے اپنے لوگوں کو ساتھ لیا اور سابور اور اردشیر

خرہ کا قصد کیا، توج کے مقام پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ اہلِ فارس نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی، حضرت مجاشع نے توج فتح کرنے کے بعد اردشیر خرہ اور سابور بھی فتح کر لیے۔

حضرت عثمان ؓ بن عفان کے عہد میں عبداللہ بن عامر بن کریز بصرہ کے والی بنے تو حضرت مجاشع ؓ ان کے دست راست تھے۔ ان کے ہمراہ ایران گئے اور بعض وہ علاقے جو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے انہیں دوبارہ فتح کر لیا، کابلی میں بھی جنگ لڑی، مگر اس کے والی نے صلح کر لی۔ واپسی پر عبداللہ بن عامر نے انہیں یزدگرد کے تعاقب میں روانہ کیا مگر وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران حضرت مجاشع ؓ اور ان کا لشکر سخت سردی اور برف کا شکار ہو گیا اور کافی نقصان ہوا۔ حضرت عبداللہ ؓ بن عامر نے انہیں کرمان کا والی مقرر کیا، اور کرمان کے جن علاقوں نے بغاوت کر دی تھی انہیں زیر کرنے کی مہم سونپی۔ حضرت مجاشع ؓ اپنے مشن پر روانہ ہو گئے اور بیمند کو بزورِ بازو فتح کر کے وہاں ایک محل تعمیر کیا جس کا نام "محل مجاشع" تھا۔ وہاں سے شیرجان اور پھر بیرفت اور قفص کے شہر اور علاقے بھی فتح کر لیے۔ آخر میں بصرہ آ گئے تھے۔

36 ہجری میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے اور وہاں بنی سدوس میں دفن کیے گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے پانچ حدیثیں روایت کی ہیں۔

حضرت مجاشع ؓ ایک عمدہ شاعر بھی تھے مگر ان کے شعر زیادہ تر جہاد اور میدانِ جہاد سے متعلق ہیں۔ ان کا شمار عرب کے مشہور سخاوت کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ وہ بڑے سمجھ دار، متقی اور پاکباز تھے۔ مشہور جرنیل اور صحابی عتبہ ؓ بن غزوان نے اپنی بیٹی کا عقد ان سے کر دیا۔ وہ نہایت ہی عمدہ صفات کے مالک تھے۔

تاریخ انہیں اردشیر خرہ اور سابور کے فاتح کی حیثیت سے اور کرمان کی از سر نو قائدانہ اور انتظامی صفات کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

اللہ تعالیٰ اس جلیل القدر صحابی، قائد، فاتح اور منتظم حضرت مجاشع بن مسعود السلمی ؓ سے راضی ہو۔ (آمین)

❁..........❁..........❁

40

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بہت بڑے رتبہ کے صحابی گزرے ہیں آپ کو قرآن شریف کے معنی و مطالب پر بہت عبور حاصل تھا۔ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں جن پانچ صحابہ نے قرآن مجید حفظ کیا اُن میں سے ایک خوش نصیب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ صرف قرآن شریف کے عالم ہی نہ تھے۔ بلکہ آپ ایک زبردست مجاہد بھی تھے۔ اِس لیے آپ کو اکثر اصحاب کبارؓ میں امتیازی شان حاصل تھی۔

آپ جنگ بدر اور عہد نبوی ﷺ کی تمام جنگوں میں شریک ہوئے۔ اور ہر معرکے میں دادِ شجاعت دی۔ شام کی فتوحات میں آپ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ شریک تھے۔

جنگ فحل کے موقع پر جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں 14ھ میں ہوئی۔ رومیوں نے صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے سفیر طلب کیا تو آپ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو رومی سپہ سالار کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رومیوں کے لشکر میں پہنچے۔ تو دیکھا کہ رومی سپہ سالار کے خیمے میں دیبائے عین کا فرش بچھا ہے۔ آپ وہیں ٹھہر گئے۔ ایک عیسائی نے آ کر کہا گھوڑا میں تھام لیتا ہوں۔ آپ دربار میں جا کر بیٹھیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی بزرگی اور فضیلت کا عام شہرہ تھا۔ عیسائی بھی اُن سے واقف تھے۔ اِسی لیے وہ آپ کی عزت کرنی چاہتے تھے۔ لیکن وہ فقر و درویشی اور اسلام کی سچی و سادہ تعلیم کے نمونہ تھے۔ اس لیے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ”میں اِس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر تیار کیا گیا ہے نہیں بیٹھ سکتا۔“ یہ کہہ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ عیسائیوں نے افسوس کیا اور کہا کہ ہم تو دیبا و حریر کے فرش پر

بٹھا کر آپ کا احترام کرنا چاہتے تھے۔آپ نے فرمایا کہ ''مجھے ایسے احترام وعزت کی ضرورت نہیں ہے۔'' اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے۔تو ''خدا کی قسم مجھ سے بڑھ کر اللہ کا غلام اور کون ہو سکتا ہے۔'' رومی اُن کی بے باکی، آزادیٔ گفتار اور صاف گوئی پر حیران تھے۔ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ مسلمانوں میں کوئی اور آپ سے بڑھ کر ہے۔'' انہوں نے کہا ''معاذ اللہ یہی بہت ہے کہ مَیں سب سے بدتر ہوں۔'' رومی چپ ہو رہے آپ نے مترجم سے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر تم کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تو مَیں واپس جاتا ہوں۔رومیوں نے کہا ہم تو صرف یہ پوچھتے ہیں کہ تم اس طرف کیوں آئے ہو۔ایران کا بادشاہ مر چکا ہے۔اُدھر جاؤ۔جس کا ملک تم سے زیادہ قریب ہے۔اُس پر یورش کرو۔'' ہمارا بادشاہ سب سے بڑا ہے اور ہم تعداد میں ستاروں اور ریت کے ذرّوں سے بھی زیادہ ہیں۔'' حضرت معاذؓ نے جواب میں فرمایا کہ ''ہماری سب سے پہلی التجا یہ ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔اگر تم نے ایسا کیا تو تم ہمارے بھائی ہو۔اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ دو۔اگر تم آسمان کے ستاروں اور ریت کے ذرّوں سے بھی زیادہ ہو۔تو ہمیں قلت و کثرت کی کوئی پروا نہیں۔تمہیں اِس پر ناز ہے کہ تم نے اس کو شہنشاہ بنایا ہے جس کو تمہاری جان و مال پر پورا اختیار ہے۔لیکن ہم نے جسے بادشاہ بنایا ہے وہ خود کو کسی بات میں ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا۔اگر تمہیں اسلام یا جزیہ دونوں منظور نہیں تو پھر تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔'' رومیوں سے کہا کہ ''ہم تمہیں بلقاء کا ضلع اور اردن کا وہ حصہ جو تمہارے ملک کے متصل ہے دے دیتے ہیں۔تم یہاں سے چلے جاؤ۔حضرت معاذؓ نے انکار کیا اور اُٹھ کر چلے آئے۔آخر جنگ ہوئی۔مجاہدین نے بہادری کے جوہر دکھائے اور رومی دُم دبا کر بھاگ نکلے۔

جنگ یرموک میں جو 15ھ میں ہوئی جب ایک لاکھ رومیوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا تو حضرت معاذؓ بن جبل گھوڑے سے اُتر کر پیدل ہو گئے اور شوق شہادت میں اِس زور سے تلوار چلائی کہ رومیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور مسلمان جن کو رومیوں نے کسی قدر دبا لیا تھا بپھرے شیر کی طرح رومیوں پر جھپٹے۔آخر رومی زیادہ دیر تابِ مقابلہ نہ لا سکے اور میدان خالی چھوڑ کر پُشت دکھا گئے۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد جب شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔تو 17ھ کے آخر میں اِن علاقوں میں طاعون پھیل گیا۔حضرت ابو عبیدہؓ نے 18ھ میں حضرت عمر فاروقؓ کے

احکام کے مطابق جابیہ میں قیام کیا۔لیکن آپ چند روز کے بعد طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پا گئے۔ لیکن وفات سے قبل حضرت معاذؓ بن جبل کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

بیماری زوروں پر تھی۔فوج میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔عمروؓ بن عاص نے لوگوں سے کہا کہ یہ وبا اُنہیں بلاؤں میں سے ہے۔جو بنی اسرائیل کے زمانے میں مصر پر نازل ہوئی تھیں۔ اس لیے یہاں سے کوچ کر جانا چاہیے۔معاذؓ بن جبل نے یہ سُنا تو ممبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔''فرمایا یہ وبا نہیں ہے خدا کی رحمت ہے۔خطبہ کے بعد خیمے میں آئے تو بیٹے کو بیمار پایا۔نہایت اطمینان کے ساتھ بیٹے سے کہا''اے فرزند دیکھ یہ خدا کی طرف سے ہے۔دیکھ شُبہ میں نہ پڑنا'' بیٹے نے جواب دیا۔''آپ مجھے صابر پائیں گے۔''یہ کہہ کر انتقال کر گئے۔بیٹے کو دفنا کر آئے تو خود بیمار پڑ گئے۔عمروؓ بن عاص کو اپنا جانشین مقرر کیا۔اور اس خیال سے کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار ہے نہایت اطمینان اور شوق سے جان دی۔

حضرت معاذؓ بن جبل نہایت دلیر آزادی پسند اور عالمِ بزرگ تھے۔حضرت عمرؓ آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ایک بار حضرت عمرؓ نے فلسطین میں آپ کو درسِ قرآن دینے پر مامور فرمایا تھا۔آپ کو اِس عہد کے دیگر مسلمانوں کی طرح موت کی مطلق پروانہ تھی۔بلکہ موت کو وصالِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔جنگِ بدر سے لے موت کے وقت تک میدان جہاد میں رہے۔تلوار سے جہاد کیا اور زبان سے لوگوں کو قرآن پڑھایا۔ایسے ہی مومن مرد تھے جن کے متعلق علامہ اقبال کہتے ہیں:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

حضرت معاویہ بن حدیج السکونی رضی اللہ عنہ

حضرت معاویہ بن حدیج بن جفنہ بن قنبرہ بن حارثہ.......... بن الشکون السکونی کا تعلق قبیلہ کندہ سے تھا۔ ان کی والدہ کا نام کبشہ بن معدی کرب تھا۔

انہیں صحابی رسول ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ رسولِ پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اِسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ملتے تھے۔ عہدِ نبوت میں ان کی عمر چھوٹی تھی اس لیے آپ ﷺ کے جھنڈے تلے لڑنے کی سعادت نہ مل سکی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن حدیج فتح مصر میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ رہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انہی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس، مصر اور سکندریہ کی فتح کی خوشخبری دے کر بھیجا تھا۔ جب یہ مدینہ منورہ پہنچے تو ابھی ظہر کی نماز نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے پوچھا کہ امیر المومنین قیلولہ تو نہیں کر رہے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ بات تم نے اچھی نہیں کی یا میرے بارے میں یہ گمان اچھا نہیں، اگر دن کو سو جاؤں تو رعیت کو ضائع کر دوں گا اور اگر رات کو سو جاؤں تو اپنے آپ کو ضائع کر دوں گا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے معتمد تھے یہی وجہ ہے کہ انہیں فتح کی خوشخبری دے کر بھیجا تھا۔ 31 ہجری میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کی کمان میں توبہ کی فتح میں شرکت کی۔ اس جنگ میں ان کی ایک آنکھ چلی گئی تھی۔

افریقہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے تین بار جہاد میں شرکت کی۔ 34 ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں، جب عبداللہ رضی اللہ عنہ بن سعد بن ابی سرح مصر کے والی تھے۔ ان کے ہمراہ مہاجرین وانصار کی ایک جماعت بھی تھی، انہوں نے دُور دُور تک فتوحات حاصل کیں اور بہت سا

مالِ غنیمت بھی ہاتھ لگا۔ انہوں نے قیروان پر ڈیرہ ڈالا اور واپس مصر آتے تک یہیں قیام رہا۔ پھر 45 ہجری میں تنسرت کا شہر فتح کیا، ان کے ساتھ عبدالملک بن مروان بھی تھے۔ پھر 45 ہجری میں حضرت معاویہ ؓ بن ابی سفیان نے دس ہزار کے لشکر کے ہمراہ انہیں بھیجا۔ اس لشکر میں حضرت عبداللہ بن عمر ؓ اور صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت تھی۔ قمونیہ میں ڈیرہ ڈالا۔ سبیطلہ کا والی جو جوجر جیر کی طرف سے مقرر تھا وہ تیس ہزار کی فوج کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلا۔ رومیوں کی فوج انہیں کچھ کام نہ آئی۔ اللہ تعالیٰ نے معاویہ ؓ بن حدیج کو فتح سے نوازا اور اجم کے قلعہ کے پاس دشمن کو شکست دی۔ اپنے لوگوں کو اِدھر اُدھر پھیلا دیا، پھر عبداللہ بن زبیر ؓ کو سوسہ کی طرف بھیجا۔ انہوں نے اسے فتح کر لیا۔ رُدَیفع بن ثابت انصاری کو سمندر خبریہ (تونس کا ایک جزیزہ ہے) روانہ کیا۔ انہوں نے اسے فتح کر لیا۔ عبدالملک بن مروان کو جلولاء بھیجا۔ انہوں نے بھی اسے فتح کر لیا۔ معاویہ ؓ نے قرن کے پہاڑ پر ڈیرہ ڈالا اور وہاں تین سال رہے۔ اس کے قریب بیرکس بنالی تھیں اور اسے قروان کا نام دیا تھا افریقہ میں اپنی اچھی یادیں اور آثار چھوڑ کر واپس مصر آ گئے۔ انہوں نے ہی 50 ہجری میں آپ کو افریقہ کے جہاد کے لیے بھیجا تھا۔

حضرت معاویہ ؓ بن حدیج صحابی رسول تھے۔ رسول پاک ﷺ سے چار حدیثیں روایت کی ہیں۔ 52 ہجری میں ان کا مصر ہی میں وصال ہوا۔

حضرت معاویہ ؓ اہل مصر میں بڑے مقبول تھے۔ وہ بڑے عقلمند، عالم اور ذکی تھے۔ وہ بڑے اچھے انسان اور منتظم تھے۔

ان کا شمار دلیر اور بہادر فاتح کمانڈروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت عمرو بن العاص ؓ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ؓ کی کمان میں جہاد میں شرکت کی اور اس طرح کافی تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ وہ ان علاقوں کے واقف تھے۔ انہیں جہاد سے بڑا لگاؤ اور پیار تھا۔

وہ والی کی حیثیت سے محل میں رہنے کے بجائے میدانِ جہاد کی شرکت کو ترجیح دیتے تھے۔ طبعی طور پر وہ ایک سپاہی اور عرب کے بہادروں میں سے تھے۔ وہ بڑے دلیر اور آگے بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والے تھے۔ ان کی شخصیت بڑی جاذب تھی، بڑی عمدہ صلاحیت و قابلیت کے مالک تھے۔ صحیح اور جلد فیصلے دیتے اور اپنی ذمہ داری کو قبول کیا کرتے تھے۔ ان کا ارادہ بڑا قوی تھا۔

جنگ اور اس کی نفسیات اور اپنے ماتحتوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنے لوگوں پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ماتحت عملہ بھی ان سے پیار کرتا تھا۔ جنگ کا انہیں طویل تجربہ حاصل تھا۔ ان کا ماضی بے داغ تھا۔ معاویہ ﷜ ایک ممتاز کمانڈر تھے۔

حضرت معاویہ ﷜ بن حدیج کی زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں گزری۔ انہوں نے برّی اور بحری جنگوں میں حصہ لیا، اور اسلام کی نشر و اشاعت میں بھی پیش پیش رہے۔

تاریخ انہیں افریقہ کے فاتح کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔

❁............❁............❁

42

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی والدہ کا نام اسماء بنت الافقم تھا اور وہ بنی نصر بن معاویہ کے قبیلہ سے تھیں۔حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ قبیلۂ ثقیف کے مشہور سردار عرو، بن مسعود کے بھتیجے تھے۔طائف میں ہجرت سے کوئی بیس سال پہلے پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما ہوئی۔مغیرہ مشہور بت لات کے مجاوروں میں سے تھے۔انہوں نے قبولِ اسلام سے پہلے ثقیف کی ایک جماعت کے ساتھ مصر کا سفر بھی کیا تھا۔غزوۂ خندق کے سال میں اسلام قبول کیا۔ بیعت رضوان میں شریک تھے اور وہاں تلوار لیے رسول پاک ﷺ کے حفاظت کرنے کی سعادت بھی ملی۔اِسی دوران جب ان کے چچا عروہ بن مسعود قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ مذاکرات کرنے آئے تو بات بات میں وہ اپنا ہاتھ رسول پاک ﷺ کی داڑھی مبارک تک لے جاتے تھے۔حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں ہر بار روکا اور کہا کہ اپنے ہاتھ کو روکو ورنہ اس ہاتھ سے ہاتھ دھونا پڑیں گے،اس پر عروہ نے رسول پاک ﷺ سے پوچھا کہ یہ بدتمیز کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ تمہارا بھتیجا مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ ہے۔'' پھر جب عروہ واپس قریش کے پاس پہنچا تو ان سے کہا ''اے قریشیو! مَیں بڑے بڑے بادشاہوں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں گیا ہوں مگر بخدا کہیں کسی کو ایسی محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسے محمد ﷺ کے ساتھی ان سے کرتے ہیں۔بلکہ یہ تو ان کے اشاروں پر مرتے ہیں،وہ کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے پس تم اپنی رائے اور فیصلہ پر نظر ثانی کرلو۔''

عروہ بن مسعود کی رائے میں اور باتوں کے علاوہ مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کی اس بات کا بھی خاصا اثر تھا۔اس کے بعد تمام غزوات میں رسول پاک ﷺ کی کمان میں جہاد کرنے کا موقع ملا۔ غزوۂ حنین اور طائف میں بھر پور حصہ لیا۔رسول پاک ﷺ نے انہیں اور حضرت ابوسفیان کو طائف

میں ثقیف کے مشہور بت لات کے ڈھا دینے پر مامور فرمایا تو انہوں نے اپنے نئے عقیدہ کی بنیاد پر سابقہ عقیدہ کے بت کو پاش پاش کر کے جلا دیا۔

حضرت خالد بن الولید ﷺ کی کمان میں فتنہ ارتداد کی سرکوبی کے لیے جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف نمایاں حصہ لیا، اِسی طرح ان کی ماتحتی میں عراق میں لڑی جانے والی تمام جنگوں میں شریک رہے، پھر جب حضرت خالد ﷺ نے عراق سے شام کا رُخ کیا تو یہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس طرح جنگ یرموک میں بڑی بہادری کے ساتھ دادِ شجاعت دیتے ہوئے ان کی ایک آنکھ اللہ کی راہ میں کام آئی۔ پھر ملک شام کے دوسرے معرکوں میں بھی برابر شریک رہے۔

جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص ﷺ کی کمان میں لڑے، جنگ سے پہلے کسریٰ اور اس کے کمانڈروں کے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے مذاکرات کرنے بھی گئے تھے۔ اسی طرح رستم سے بھی اُن کے مذاکرات ہوئے، ان کی مدبرانہ گفتگو کا مسلمانوں کے مورال پر بڑا خوشگوار اثر ہوا جبکہ دشمنوں کے حوصلے پست ہوئے۔ اس جنگ میں مجاہدین اسلام کو جہاد پر ابھارتے رہے اور انہیں اللہ کی راہ میں ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار کیا۔

پھر عتبہ بن غزوان کی قیادت میں بصریٰ اور جنوبی عراق کی مہم میں شریک رہے، اور جب عتبہ بن غزوان وہاں سے فریضہ حج کے لیے جانے لگے تو انہیں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور جنوبی فرات کی مہم پر مجاشع بن مسعود کو آگے بھیجا۔ مجاشع کو پہلے تو ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہوا مگر ایک ایرانی قائد جب ایک بہت بڑی تعداد میں فوج لے آیا تو اس کے مقابلہ کے لیے بُصریٰ سے مغیرہ اپنی فوج لے کر نکلے۔ سخت جنگ کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

حجاز سے واپسی پر عتبہ کا راستہ میں انتقال ہو گیا اور ان کے بعد حضرت عمر ﷺ نے ان کی جگہ حضرت مغیرہ کو بصریٰ کا والی مقرر کیا۔ حضرت مغیرہ نے نعمان بن مقرن کی قیادت میں سوق اھوار اور نہاوند کی جنگ میں میسرہ کی قیادت کرتے ہوئے نمایاں حصہ لیا۔ 21ھ میں حضرت عمر فاروق ﷺ نے انہیں کوفہ کا والی مقرر کیا۔ اس دوران انہوں نے براء بن عازب کو قزین کی فتح پر مقرر کیا جو انہوں نے فتح کر لیا۔ 22ھ میں ارجان بھی فتح کر لیا گیا، ان فتوحات کا سہرا بھی حضرت مغیرہ ﷺ کے سر ہے۔

50ھ میں کوفہ میں اَلثویہ کے مقام پر طاعون سے ستر سال کی عمر میں وصال ہوا۔ بالکل آخری وقت میں کہنے لگے:

"اللھم ھذہ یمینی بایعت بھا نبیک وجاھدت بھا فی سبیلک."
"اے اللہ یہ میرا وہ دایاں ہاتھ ہے جس سے مَیں نے تیرے نبی کے ہاتھ پر بیعت کی اور تیری راہ میں اس سے لڑتا رہا۔"

حضرت مغیرہ ؓ بہترین قاری اور تجربہ کار کاتب تھے اس لیے رسول پاک ﷺ نے انہیں وحی کی کتابت پر مامور فرمایا تھا۔ وہ فارسی زبان بھی جانتے تھے۔ حضرت عمر ؓ اور ہرمزان کے درمیان ترجمانی کا کام انہوں نے ہی سرانجام دیا تھا۔ انہوں نے رسولِ پاک ﷺ سے 36 حدیثیں بھی روایت کی ہیں۔ وہ بہت بڑے مدبر اور سیاستدان تھے اس لیے انہیں مغیرۃ الرائے کہا جاتا ہے۔

شعبیؒ کا کہنا ہے کہ "عربوں میں چار مانے ہوئے مدبر اور سیاست دان ہوئے ہیں۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان ؓ، عمرو بن العاص ؓ، مغیرہ بن شعبہ ؓ اور زیاد ؓ۔ معاویہ ؓ احتیاط اور صبر وتحمل میں، عمرو بن العاص ؓ مشکل کاموں کے حل کرنے میں، مغیرہ ؓ ناگہانی مشکل کاموں میں اور زیادہ چھوٹے بڑے معاملات سلجھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

مصقلہ بن ھبیرہ شیبانی کا کہنا ہے کہ "مغیرہ دوست کے لیے بہترین دوست اور دشمن کے حق میں بدترین دشمن تھے۔"

قبیصہ بن حابر کا کہنا ہے کہ "مجھے مغیرہ ؓ کی رفاقت حاصل رہی ہے اگر کسی شہر کے آٹھ دروازے ہوں اور ان میں سے بمشکل ایک دروازے سے ہی باہر نکلا جا سکتا ہو، تو مغیرہ ؓ کے لیے ان آٹھوں دروازوں سے باہر نکل آنا کوئی مشکل اَمر نہ تھا۔"

طبریؒ کا کہنا ہے کہ "وہ ہر مشکل کا حل تلاش کر لیتے تھے اور کتنا بھی بڑا اور مشکل کام ہوتا تو وہ اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔"

حضرت مغیرہ ؓ نے زیادہ تر ماتحتی میں جنگیں لڑیں اور ان میں کامیاب ہوئے۔ اسی طرح جب انہوں نے خود کمان سنبھالی تو اپنے لوگوں کو بڑی عمدگی سے لڑایا، اور کامیابی نے ہمیشہ ان کے قدم چومے۔ ان کی عسکری زندگی پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے قائد اور ان کے ماتحت ہمیشہ ان سے خوش رہے۔

تاریخ مغیرہ ؓ کو ایک جامع شخصیت، منظم اور کامیاب سپہ سالار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔

حضرت النعمان بن مقرن المزنی رضی اللہ عنہ

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ مقرن کے نامور فرزند تھے ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ مضر سے تھا۔ ان کے دس بھائی اور بھی تھے اور ان سب کا شمار بھی جلیل القدر مجاہدین اور صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں قرآن پاک کی آیت:

"وَمن الاعران من یؤمن باللّٰہِ وَالیوم الاٰخر" (التوبہ:۹۹)

نازل ہوئی جس میں ان کے ایمان وعمل کی تعریف کی گئی ہے۔

رجب 5 ہجری میں حضرت نعمان رضی اللہ عنہ اپنے قبیلہ کے چار سو سواروں کے ساتھ بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ ان سواروں میں ان کے اپنے بھائی بھی شامل تھے۔ آنحضرت ﷺ کی کمان میں غزوۂ خندق اور اس کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ فتح مکہ کے وقت اپنے قبیلہ مزینہ کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا اور مزینہ کے ایک ہزار تین افراد اس میں شامل تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بڑی بہادری کے ساتھ مرتدین کے خلاف لڑے، عبس وذبیان اور دیگر قبائلِ عرب کی سرکوبی میں پیش پیش رہے۔ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائیوں کا مرتدوں کے خلاف لڑی جانے والی لڑائیوں اور استحکام خلافت میں بڑا اہم حصہ ہے۔

جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لڑے، یزدگرد کے پاس جو اسلامی سفارت بھیجی گئی تھی اس کے بھی سربراہ یہی تھے۔

جب یہ سفارت کسریٰ کے پاس مدائن پہنچی تو یزدگرد کے زیادہ تر سوالوں کا جواب اور

نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں دین کی دعوت دینے والے بزرگ یہی تھے۔ اگرچہ یزدگرد کو ان کی کھری کھری باتیں اچھی نہیں لگیں مگر کسریٰ اور اس کے آدمی ان کی جرأت و بے باکی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہاں تک کہ کسریٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ عرب میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ تم سوال و جواب میں بھی ان کے مقابلے کے نہیں ہو۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یا تو یہ لوگ اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں گے یا پھر اس کے لیے جان دے دیں گے۔

جنگ قادسیہ میں بڑی آزمائشوں سے گزرے اور جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی تو حضرت عمرؓ کو یہ خوشخبری دینے حضرت نعمانؓ ہی گئے تھے۔ شکست کے بعد یزدگرد نے باقی ملک چھان مارا، اپنے ملک کے دفاع اور نقصان کی تلافی کے لیے لوگوں کو خوب ابھارا اور اہواز میں مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑی فوج تیار کر لی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کو لکھا گیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا کہ ''النعمان کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا لشکر فوراً روانہ کریں۔ جو ہرمزان کے قریب ٹھہرے اور اپنا مشن پورا کرے۔'' (ابن اثیر)

حضرت نعمانؓ اپنے لوگوں کو لے کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے اور ہرمزان کے لشکر کا رام ہرمز میں مقابلہ کر کے انہیں شکست دی اور شہر فتح کر لیا، ہرمزان نے شکست کے بعد تستر میں پناہ لی۔ حضرت نعمانؓ نے کوفی فوج کے ہمراہ تستر کی راہ لی۔

حضرت عمرؓ کے ارشاد پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور سترہ بن ابی رھم فوج کے ساتھ ان کی امداد کے لیے آ پہنچے۔ یہ آگے بڑھتے ہوئے نہاوند جا پہنچے۔

ہرمزان نے یزدگرد کو لکھا کہ جب تک آپ کی سربراہی میں ہم سب مل کر مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کریں گے کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ اس پر یزدگرد نے حامی بھر لی اور ڈیڑھ لاکھ فوج مقابلہ کے لیے اکٹھی کر لی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عمرؓ کو اس عظیم لشکر کے بارے میں اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ اس لشکر کی کمان کے لیے بذات خود آنا چاہتے تھے۔ مگر حضرت علیؓ اور دیگر اصحاب شوریٰ کے مشورہ سے خود مدینہ ہی میں رہے اور حضرت نعمانؓ بن مقرن کو اس مہم کی قیادت سونپی۔ حضرت نعمانؓ کو حضرت سعدؓ نے کسکر کا والی مقرر کر دیا تھا جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے اور انہوں نے حضرت عمرؓ کو لکھا بھی تھا کہ وہ ''والی''

کے بجائے ''غازی'' کو بہرحال ترجیح دیتے ہیں۔اس پر حضرت عمرؓ نے انہیں لکھا کہ ''مجھے معلوم ہوا کہ عجمیوں نے نہاوند میں ایک بری فوج جمع کر رکھی ہے۔ جب آپ کو میرا یہ خط ملے تو آپ مع اپنی فوج کے اللہ کا نام لے کر اور اسی کے بھروسہ پر چل پڑیں۔فوج کے آرام اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا پورا خیال رکھیں۔ایک مسلمان مجاہد میرے ہاں بہت ہی قیمتی ہے۔''

اس خط کے ساتھ ہی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور دیگر سب قائدین کو حضرت نعمانؓ کی امداد کے لیے لکھا چنانچہ اسلامی فوجیں نہاوند کے ایک شہر ماہ د دینار میں جمع ہوگئیں اور دیگر قائدین کو یہ بھی لکھا کہ جب تم سب اکٹھے ہو جاؤ تو تمہارے امیر حضرت نعمانؓ ہوں گے۔ نیز اہواز کے سپہ سالاروں کو ہدایت کی کہ نہاوند کے اصل مقابلہ سے پہلے سپاہ پر ضربیں لگائی جائیں۔ تا کہ اس وقت تک کمزور ہو جائے۔

حضرت نعمانؓ اپنی فوج لے کر نہاوند کی طرف چل پڑے اس کے دائیں بازو پر لاشعث بن قیس کندی اور بائیں پر حضرت مغیرہؓ بن شعبہ تھے۔شہر کے قریب دونوں فوجوں کا سامنا ہوا اور دو دن کی سخت لڑائی کے بعد، حضرت نعمانؓ نے اپنے خاص لوگوں کے مشورہ سے ایک جنگی چال چلی کہ پہلے قعقاع بن عمرو اپنے رسالہ کے ساتھ دشمن پر سخت حملہ کریں اور پھر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتے آئیں۔اس طرح تمام ایرانی سپاہ ان کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے قلعوں سے اس طرف نکل آئے گی اور پھر مسلمان مجاہدوں کو دادِ شجاعت دینے اور دشمن کو زیر کرنے کا پورا موقع مل جائے گا۔

حضرت نعمانؓ موقع کی تلاش میں تھے۔ جب ان کا سارا لشکر سامنے آ گیا تو نعرۂ تکبیر کی گونج میں اپنے لشکر سے یوں مخاطب ہوئے میرے ساتھ رہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔

"اللھم اعز دینک وَانصر عبادک وَاجعل النعمان اول شھید الیوم علی اعزاز دینک ونصر عبادک."

''اے اللہ! اپنے دین کو غلبہ عطا کر، اپنے بندوں کو نصرت فرما۔اپنے دین کے غلبہ اور سربلندی اور اپنے بندوں کی نصرت کے لیے نعمانؓ کو آج پہلا شہید ہونے کی سعادت عطا فرما۔''

بڑی سخت لڑائی ہوئی اور کشتوں کے پشتے لگ گئے۔حضرت نعمانؓ کا گھوڑا خون

میں پھسل گیا جس سے وہ گر گئے اور انہیں کافی زخم بھی لگ چکے تھے۔ان کے بھائی نعیم نے حسب وصیت ان کے ہاتھ سے جھنڈا لے کر چپکے سے حضرت حذیفہ ؓ بن الیمان کو دے دیا اور لشکر کو مطلق خبر نہ ہونے دی تا کہ ان کے مورال میں کسی طرح کی کمی نہ آ جائے۔رات گئے ایرانی سپاہ پسپا ہوئی۔مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور کم لوگ ان میں سے بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو سکے۔فتح کے بعد مجاہدین اسلام اپنے قائد کو دیکھنے لگے تو ان کے دوسرے بھائی معقل نے انہیں بتایا کہ تمہارے قائد نعمان ؓ یہ ہیں۔جن کی اللہ تعالیٰ نے فتح دے کر اور شہادت سے سرفراز کر کے آنکھیں ٹھنڈی کی ہیں۔

ایرانی سپاہ کو شکست دے کر مسلمان مجاہد نہاوند میں داخل ہو گئے اسے فتح الفتوح *(Victory of Victories)* بھی کہا گیا ہے۔

اِدھر حضرت عمر ؓ کو اس جنگ کی بڑی فکر تھی اور وہ نتیجہ کے سخت انتظار میں تھے کہ نہاوند سے قاصد نے آ کر فتح کی بشارت سنائی جس پر حضرت عمر ؓ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ نعمان ؓ کے بارے میں پوچھا تو قاصد نے بتایا کہ کس طرح خون میں ان کا گھوڑا پھسل کر گر پڑا جس سے انہوں نے شہادت پائی۔اس دوسری خبر نے حضرت عمر ؓ کو ہلا کر رکھ دیا۔انہوں نے اناللہ پڑھا اور رو پڑے ان کا تاثر یہ تھا کہ جیسے نعمان ؓ سے بڑھ کر انہیں اور کوئی محبوب نہیں۔

حضرت نعمان ؓ اپنے قبیلے کے سردار تھے۔چار سو سواروں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔فتح مکہ میں مزینہ کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں ان کے معتمد اور وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق ؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ کے معتمد رہے یہاں تک کہ 21 ہجری میں نہاوند میں شہادت پائی۔ان کی قبر وہاں اسفقد بان میں ہے۔وہ ایک سچے مومن تھے۔انہوں نے آنحضرت ﷺ سے چھ حدیثیں روایت کی ہیں۔وہ بڑے پیارے آدمی تھے اِسی لیے سب ان سے پیار کرتے تھے۔

❀..........❀..........❀

حضرت الولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ

الولید عقبہ کے بیٹے اور عرب کے مشہور خاندان قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ماں کی طرف سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام اَرْوی بنت کریز بن ربیعہ تھا۔ ان کے والد عقبہ بن ابی معیط نے آنحضرت ﷺ کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ الولید کی کنیت ابو وھب تھی۔ وہ قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔ ان کے دوسرے بھائیوں عمارہ بن عقبہ اور خالد بن عقبہ نے بھی فتح مکہ کے موقع پر ان کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا تھا۔ اس وقت وہ جوان تھے اس کے بعد غزوات میں آنحضرت ﷺ کی کمان میں شرکت کی۔ 9 ہجری کے شروع میں انہیں رسول پاک ﷺ نے بنی المصطلق کی طرف زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا تھا۔

عراق کی مہمات میں انہوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کمان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دومتہ الجندل کی فتح میں شریک رہے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں قبیلۂ قضاعہ سے زکوٰۃ وصدقات کی وصولی پر مامور کیا، پھر یہ بات ان پر چھوڑ دی کہ آیا وہ اس خدمت پر رہتے ہیں یا غازی کی حیثیت سے جہاد میں حصہ لیتے ہیں، مگر انہوں نے غازی اور مجاہد کو ترجیح دی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ سہیل بن عدی، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان اور خصوصاً الولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ کو جزیرہ میں قبائل ربیعہ اور تنوخ پر مقرر کریں اور جنگ کی صورت میں عیاض ان سب کے کمانڈر رہوں گے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں تمام کمانڈر اپنے اپنے مشن پر روانہ ہو گئے اور ہر ایک نے اپنے اپنے مشن میں کامیابیاں حاصل کیں۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے

بعد انہیں کوفہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اِسی دوران آذربیجان اور ارمینہ والوں نے صلح کے عہد و پیمان توڑ دیئے، تو اس پر الولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کے ہمراہ ان پر حملہ کر کے انہیں بدعہدی کا سبق سکھا دیا۔

آذربیجان کی فتح کے بعد الولید نے سلمان بن ربیعہ الباھلی کو 12 ہزار فوج دے کر اِرمینہ روانہ کیا۔ انہوں نے اَرمینہ والوں کو سیدھا کر دیا۔ دونوں مقامات پر امن و امان قائم کر کے الولید نے واپس کوفہ کا رُخ کیا۔ جب الموصل پہنچے تو وہاں انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک خط ملا جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی درخواست پر، رومیوں کے خلاف شام میں، مجاہدین اسلام کی امداد کا حکم تھا۔ انہوں نے وہ خط پڑھ کر سنایا تو آٹھ ہزار مجاہد رضا کارانہ طور پر تیار ہو گئے اور انہیں اس خط کے موصول ہونے کے بعد تیسرے دن سلمان بن ربیعہ باھلی کی کمان میں روانہ کر دیا گیا۔ یہ لشکر دوسرے مجاہدوں کے ساتھ شام جا ملا اور الولید باقی ماندہ فوج کے ساتھ کوفہ واپس آ گئے۔

الولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے لوگوں پر پوری کمانڈ حاصل تھی۔ وہ گوناگوں صفات کے مالک تھے۔ لوگ انہیں بہت چاہتے تھے اور وہ بھی ان سے ہمیشہ حسنِ سلوک کیا کرتے تھے۔ وہ نہایت ہی اچھے منتظم تھے۔ ان میں تمام قائدانہ صفات موجود تھیں اور حقیقتاً وہ ایک ممتاز قائد تھے۔

الولید رضی اللہ عنہ بن عقبہ نے آنحضرت ﷺ سے دو حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان کا وصال 61 ہجری میں ہوا۔

❁........❁........❁

حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ

آپ رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کی ایک شاخ بنوزہرہ سے تھا آپ رضی اللہ عنہ کے والد گرامی کا نام عتبہ اور آپ رضی اللہ عنہ مشہور جرنیل حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے تھے۔

غزوہ حنین آپ رضی اللہ عنہ کی پہلی جنگ تھی کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی قیادت میں آپ رضی اللہ عنہ نے شجاعت کے جوہر دکھائے۔ ان کا یہ بھی ایک امتیاز تھا کہ ان کے قبولِ اسلام سے قبل مسلمانوں اور کافروں کے درمیان کئی ایک جنگی معرکے ہو چکے تھے۔ لیکن انہوں نے حضور اکرم ﷺ کے خلاف کسی بھی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ کیونکہ بنوزہرہ آنحضرت ﷺ کے ننہیال تھے۔

جنگ یرموک میں ان کی ایک آنکھ شہید ہوگئی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مہاجرین وانصار میں سے ایک سو بہادر چنے تھے۔ جو قبل از جنگ رومیوں کو تھکا دیں۔ ان میں حضرت ہاشم بھی نمایاں طور پر شامل تھے۔ آپ نے ایک دستہ کی باقاعدہ کمان کی تھی اور اس بے جگری سے لڑے تھے کہ آپ کی شجاعت و بہادری عام لوگوں میں مشہور ہوگئی تھی اسی طرح قادسیہ کے فاتحین میں ان کا نام بڑا نمایاں ہے۔ کیونکہ انہوں نے جنگ قادسیہ میں شام سے چلنے والی چھ ہزار فوج کی کمان کی تھی اور اس مہارت اور بہادری سے لڑے تھے کہ مجاہدین قادسیہ میں کوئی مجاہدانہ کارناموں کو نہیں پہنچ سکا تھا۔

مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنا نائب بنا لیا تھا۔ اُن کے بعد فوج کی کمان یہی کیا کرتے تھے اور انہوں نے بُرس، بابل اور ساباط میں فتح پر فتح حاصل کی۔ جو ان کی بہادری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جلولاء میں یزدگرد نے مسلمانوں کے خلاف جنگی

تیاریاں شروع کیں تو حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت سعد نے ان کو روانہ کیا اور یہ بارہ ہزار کی فوج لے کر نکلے۔ ہاشمؓ مدائن سے نکلے اور دشمن کو جالیا۔ اس نے جب دیکھا کہ ہاشمؓ اپنے بارہ ہزار فوجیوں کے ساتھ میرا تعاقب کر رہے ہیں تو وہ قلعہ بند ہو گیا۔ حضرت ہاشمؓ نے 80 روز تک اس کا محاصرہ کیا اور مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اللہ تعالیٰ کی خوشی اور رضا کے لیے دشمن سے مقابلہ کرو اور صبر و استقامت کے دامن کو تھامے رکھو۔ انشاء اللہ جیت تمہاری ہو گی۔''

زبردست لڑائی کے بعد مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی۔ فتوحات کے بعد ہاشمؓ اپنے چچا حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس کوفہ ہی میں رہنے لگے اور فوجی اور انتظامی امور میں ان کا تعاون کرنے لگے وہ بنیادی طور پر بہت ہی معاملہ فہم اور قوت فیصلہ کے مالک تھے۔ جب بھی کوئی گھمبیر معاملہ درپیش ہوتا تو فوراً اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتے آپ نہایت مضبوط عزم کے مالک اور پرکشش شخصیت کے حامل تھے۔ علامہ ابن کثیر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بڑے بہادر اور فاضل شخص تھے۔ آپؓ جنگ صفین (37ھ) میں حضرت علیؓ کی فوج میں پیادہ فوج کے قائد اور علم بردار تھے اور اسی جنگ میں آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

❁..........❁..........❁

(حصہ سوم)

دیگر مسلم جرنیل

ابن ابی عامر

ابن ابی عامر کے عروج کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ شخص جو اصل و نسل کے لحاظ سے عرب تھا ابتدا میں ایک معمولی شخص تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ہی وہ حکومت حاصل کرنے کے منصوبے باندھتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ اور اس کے چار ساتھی جو اس کی طرح طالب علم تھے ایک شام کو قرطبہ کے ایک باغ میں بیٹھے تھے۔ ابن ابی عامر کے ساتھی تو اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ چپ چاپ بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اُسے خاموش دیکھ کر ایک طالب علم نے کہا "تم کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "مجھے مدت سے خیال ہے کہ ایک دن میں اس ملک کا حکمران ہوں گا۔ تمہیں جو جو عہدے پسند ہیں۔ ابھی مجھے بتا دو۔ مَیں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ کہ حکومت حاصل کرنے کے بعد میں تمہاری آرزوئیں پوری کر دوں گا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ مجھے ملاغہ کا حاکم بنا دینا کیونکہ ملاغہ کے انجیر بہت اچھے ہوتے ہیں اور مجھے انجیر بہت پسند ہیں۔ دوسرا بولا۔ مجھے قرطبہ کے بازار کا داروغہ بنا دینا۔ تیسرے نے کہا، میں قرطبہ کا محتسب بننا چاہتا ہوں۔ جب چوتھے کی باری آئی تو اُس نے ابی ابن عامر کی داڑھی پکڑ لی اور کہنے لگا۔ کمبخت کہاں تو اور کہاں اندلس کی حکومت۔ تو بادشاہ ہو جائے تو مجھے ننگا کر کے پہلے میرے جسم پر شہد ملوانا۔ تاکہ شہد کی مکھیاں مجھے کاٹیں۔ پھر گدھے پر سوار کر کے سارے شہر میں پھرانا۔ ابن ابی عامر نے اس کی باتوں کی پرواہ نہ کی اور بڑی متانت سے کہا کہ اچھا تمہاری یہ آرزو پوری کر دی جائے گی۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پہلے تو کچھ دیر تک لوگوں کی عرضیاں لکھتا رہا۔ پھر ایک قاضی کا نائب مقرر ہو گیا۔ یہاں اس کا نصیب چمکا۔ یعنی وزیر مصحفی نے اُسے شہزادہ ہشام کی

جاگیر کا نگران مقرر کر دیا۔

اِس طرح اُسے ملکہ صبح کے محل میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور اس نے اپنی قابلیت اور دانائی کی بدولت ملکہ کی طبیعت میں ایسا دخل حاصل کر لیا کہ محل کا سارا انتظام اُس کے سپرد ہو گیا۔ ابن ابی عامر نے اس موقع سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ ملکہ کی سفارش اور کوشش سے اُسے یکے بعد دیگرے کئی بڑے بڑے عہدے ملے اور آہستہ آہستہ اُس نے ایسا اقتدار حاصل کیا کہ حکم کی وفات کے بعد وہ اور مصحفی نابالغ شہزادہ کے نگران مقرر ہوئے۔

اب ابن ابی عامر کے راستہ میں صرف مصحفی اور غالب رہ گئے تھے۔ اُس نے پہلے غالب سے تعلقات پیدا کر کے مصحفی کو عزت و اقتدار کے مرتبہ سے گرانے کی کوشش کی۔ اُن دنوں شمالی ریاستوں کے عیسائی سرداروں نے اندلس پھر پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے تھے۔ اگرچہ مصحفی اور ابن ابی عامر دونوں جنگی تدبیروں سے ناواقف تھے لیکن ابن ابی عامر نے ایسا پیچ کھیلا کہ عیسائیوں کے مقابلہ پر جو فوج بھیجی گئی اُسے اس کا سردار مقرر کر دیا گیا۔ ناتجربہ کاری کے باوجود اس مہم میں اُسے بڑی کامیابی ہوئی۔ ریاست لیون کی فوجیں جنہوں نے اندلس میں بڑی آفت مچا رکھی تھی دو تین معرکوں کے بعد اس طرح بھاگ کھڑی ہوئیں کہ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ پھر کیا تھا سارے ملک میں ابن ابی عامر کی فوجی قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی اور اُسے اس مہم سے واپس آتے ہی قرطبہ کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

اب مصحفی کو نیچا دکھانے کے لیے ابن ابی عامر نے ایک اور تدبیر کی۔ یعنی غالب سے ایسے تعلقات بڑھائے کہ اُس نے اپنی بیٹی ابن ابی عامر کو بیاہ دی اس طرح مصحفی کو راستہ سے ہٹانا بہت آسان ہو گیا۔ ساری فوج ابن ابی عامر کی پشت پر تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس کی مخالفت کر سکے۔ مصحفی پر خیانت کا مقدمہ چلا اور وہ کچھ دن قید رہ کر قتل کر ڈالا گیا۔

مصحفی کے ہٹتے ہی ابن ابی عامر نے اُس کی جگہ سنبھالی اور سلطنت کے سارے کاروبار پر قبضہ کر لیا۔ ہشام پہلے ہی حکومت سے بے تعلق تھا۔ ابن ابی عامر نے اُسے بالکل بے دخل کر دیا۔ وہ بیچارا محل سرا کے اندر لونڈی غلاموں میں گھرا رہتا تھا اور ناچ رنگ کی محفلیں اور جلسے اتنی مہلت ہی نہ دیتے تھے کہ آنکھ کھول کر اپنے گرد و پیش نظر ڈالتا۔ ابن ابی عامر نے کچھ لوگ مقرر کر رکھے تھے جو سایہ کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے۔ اُنہوں نے نوعمر بادشاہ کے ذہن میں یہ

بات اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ حضور! حکومت کا انتظام کرنا نوکروں کا کام ہے۔ بادشاہوں کو ان بکھیڑوں سے کیا واسطہ۔

لیکن ابن عامر ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اُسے یہ خیال رات دن ستاتا رہتا تھا کہ فوج غالب کے قبضہ میں ہے۔ اگر اس نے ساتھ چھوڑ دیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد اُس نے بربری سپاہیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا اور تھوڑے دنوں میں اُن کا بہت بڑا لشکر فراہم کرلیا، اب غالب چونکا۔ لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ایک موقع پر داماد اور خسر میں تکرار ہوگئی۔ غالب اکھڑ سپاہی تھا اس نے فوراً تلوار سونت لی اور چاہا کہ ابن ابی عامر کا کام تمام کردے۔ لیکن وہ جان بچا کر بھاگ نکلا۔ اب فوج کے دونوں حصوں میں لڑائی شروع ہوئی انہیں معرکوں میں غالب مارا گیا اور ابن ابی عامر اطمینان سے حکومت کرنے لگا۔

جب سلطنت کے سارے کارخانے قبضہ میں آچکے اور حکومت کے فرمان اُس کے دستخطوں سے رونق پانے لگے تو اُن تین طالب علموں کو جو مفلسی کے زمانے کے ساتھی تھے بلوایا اور ان کی دلی مرادیں پوری کردیں۔ چوتھے ساتھی کو جو بڑی گستاخی سے پیش آیا تھا بلوا کر بہت ڈانٹا۔ پھر اُس کی جائیداد ضبط کرلی۔ اُس کے بدن پر شہد ملوا کر گدھے پر سوار کرایا اور شہر بھر میں پھرایا۔

❁............❁............❁

اُرخان

رومیوں کے قبضہ میں ایشیا کے جو دو تین شہر رہ گئے تھے عثمان کے جانشین ارخان نے ان سے وہ بھی چھین لیے۔ اس طرح ایشیائے کوچک کے سارے شمال مغربی علاقے پر عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ارخان یورپ کی سرحد پر پہنچ کر رُک گیا اور آگے بڑھنے کا خیال چھوڑ کر ملک کے اندرونی انتظام کی طرف توجہ کی۔

اب تک عثمانیوں کے پاس باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ کچھ اپنے قبیلے کے لوگ تھے کچھ سلجوق اور دوسرے ترک قبیلے جو آس پاس کے علاقوں سے اس سرزمین میں اُٹھ آئے تھے۔ جنگ کے موقع پر یہی لوگ اِدھر اُدھر سے سمٹ کے عثمانی سردار کے جھنڈے تلے آ کھڑے ہوتے۔ جنگ ختم ہو جاتی تو پھر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ ارخان نے باقاعدہ فوج بھرتی کی اور سپاہیوں کو نقد تنخواہ دی جانے لگی۔ اس فوج میں ایشیائے کوچک کے بہت سے قبیلوں کے لوگ شامل تھے لیکن فوج کے بڑے بڑے عہدے انہیں خاندانوں کے قبضہ میں رہے جو ارطغرل کے ساتھ آئے تھے ان کے علاوہ عیسائی خاندانوں کے نومسلم نوجوانوں کی ایک فوج بھی بھرتی کی گئی۔ اس میں پہلے صرف ایک ہزار نوجوان تھے لیکن بعد میں تین سو سال تک برابر یہ قاعدہ رہا کہ ہر سال نومسلم یونانیوں اور رومیوں میں سے ایک ہزار نوجوان اس فوج میں بھرتی کر لیے جاتے تھے۔ اس دستہ کا نام ینی چری یعنی نئی فوج رکھا گیا۔ اس فوج کے سپاہی بہت جیالے اور سورما تھے اور بڑی بہادری سے لڑتے تھے۔ ان کی تربیت بھی بڑی جانفشانی سے کی جاتی تھی۔

اب ترکوں کی فوج پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی ایک تو یہی ینی چری تھے دوسرے پیادے جن میں ایشیائے کوچک کے بہت سے قبیلے شامل تھے۔ ان کے علاوہ پیدل اور سوار فوج

کے دو دستے اور بھی تھے۔ پانچواں لشکر بے قاعدہ سپاہیوں کا تھا۔ جنہیں تنخواہ کے عوض میں مالِ غنیمت میں حصہ ملتا تھا۔

بیس سال تک ارخان نے شمالی مغربی ایشیائے کوچک سے قدم باہر نہیں نکالا۔ جب سلطنت کے انتظام درست ہو گئے۔ تو اردگرد کے ملکوں پر نظر دوڑائی۔ مشرق کی طرف چھوٹی چھوٹی ترک ریاستیں تھیں۔ ارخان چاہتا تو انہیں چند دنوں، میں مٹا کے رکھ دیتا لیکن کمزوروں پر ہاتھ اٹھانے کو جی نہ چاہا۔ سامنے آبنائے باسفورس تھی اور اس کے کنارے قسطنطنیہ کے مینار اور برج اس طرح سر اٹھائے کھڑے تھے گویا فتح مند عثمانیوں کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ اس لیے اس نے اسی طرف گھوڑے کی باگ موڑی۔ اس وقت روم کی عیسائی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ بلقان کی اکثر ریاستیں خود مختاری کا علم لہرا رہی تھیں۔ ادھر وہ ملک جسے آج اطالیہ کہتے ہیں کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن میں جنیوا اور وینس کی ریاستیں جو ہمیشہ آپس میں لڑتی بھڑتی رہتی تھیں بہت طاقتور تھیں۔ غرض روم کے بادشاہوں میں عثمانیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت بالکل باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ایک بادشاہ نے باہمی لڑائی جھگڑوں میں ارخان کی مدد حاصل کرنے کے لیے اسے اپنی بیٹی تھیوڈورا بیاہ دی۔

اَب تک عثمانیوں کی سلطنت کا دائرہ ایشیا سے آگے بڑھنے نہیں پایا تھا۔ سب سے پہلے ارخان نے یورپ کی طرف قدم بڑھایا اور اس کا بڑا بیٹا سلیمان پاشا صرف اسّی بہادروں کے ساتھ سمندر کو عبور کر کے ایک قلعہ پر جا چڑھا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کو تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ تھریس کے علاقہ میں سخت بھونچال آیا جس کی وجہ سے گیلی پولی کی فصیل گر پڑی۔ عثمانیوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ روم کے بادشاہ نے شکایت کی تو ارخان نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے! قدرت کو یہی منظور ہے۔ ورنہ یوں بھونچال نہ آتا اور شہر پناہ گر نہ پڑتی۔ ارخان نے 1359ء میں وفات پائی۔

❀............❀............❀

48

قاضی اسد بن فرات

صقلیہ بحیرۂ روم کا ایک جزیرہ ہے جو براعظم یورپ کے وسطی جزیرہ نما اٹلی کے جنوبی گوشہ سے ایک چھوٹی سی تین میل چوڑی آبنائے مستفیا کے ذریعہ جدا ہوتا ہے۔ صقلیہ میں (211ھ بمطابق 846ء) میں قیصر روم کی حکومت تھی اور وہاں قیصر روم کی طرف سے ایک گورنر حکومت کرتا تھا۔ جس کا نام قسطین تھا۔ اس گورنر نے فیمی نامی ایک شخص کو اپنا امیر البحر بنایا تو اُس نے ساحلی افریقہ میں خوب لوٹ مار مچا کر سمندر میں اپنی دھاک بٹھا دی۔ جب قیصرِ روم کو اس کا پتہ چلا تو اُس نے اپنے گورنر سے کہا کہ امیر البحر کو گرفتار کر کے پایہ تخت قسطنطنیہ بھیج دیا جائے۔ امیر البحر کو اطلاع ملی تو بہت غضب ناک ہوا اور صقلیہ میں داخل ہو کر شہر سرقوسہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کا لازمی نتیجہ جنگ تھا۔ امیر البحر فیمی اور گورنر میں لڑائی ہوئی۔ جس میں گورنر ہلاک ہو گیا اور فیمی نے تمام جزیرے پر قابض ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بادشاہ کہلانے لگا۔ اس نے جزیرہ کے ایک حصے کی حکومت بلاطہ نامی ایک شخص کے سپرد کر دی۔ بلاطہ کا ایک چچازاد بھائی میخائل پہلے ہی اس جزیرے کے ایک حصے پر حکومت کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ان دونوں بھائیوں نے مل کر فیمی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور معرکہ آرائی کے بعد سرقوسہ پر قبضہ کر لیا۔ فیمی شکست کھا کر سمندر میں ایک جہاز میں پناہ گزین ہوا اور امداد حاصل کرنے کے لیے زیادۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا جو دولت اغالبہ کا مشہور بادشاہ تھا۔ دوسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) میں شمالی افریقہ پر عباسیوں کا قبضہ تھا۔ (184ھ بمطابق 800ء) میں خلیفہ ہارون الرشید نے ابراہیم بن اغلب کو اس علاقے کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس نے اپنی خوش تدبیری سے اپنی مستقل حکومت قائم کر لی۔ یہ حکومت اغالبہ افریقہ کا آغاز تھا۔ ابراہیم نے 811ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا ابوالعباس

عبداللہ اس کا جانشین ہوا۔ابوالعباس عبداللہ نے (201ھ بمطابق 816ء) میں وفات پائی تو اس کا چھوٹا بھائی زیارۃ اللہ تخت نشین ہوا۔ابومحمد زیارۃ اللہ بن ابراہیم بن اغلب نہایت بہادر حکمران تھا۔اس نے 201ھ تا 223ھ (816ء تا 837ء) حکومت کی۔

جب فیمی کی درخواست زیارۃ اللہ کی خدمت میں پیش کی گئی تو یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ صقلیہ پر حملہ کیا جائے یا نہ کیا جائے ایک مجلسِ مشاورت منعقد ہوئی۔جس میں اتفاق رائے کے ساتھ حملہ کرنے کا فیصلہ ہوااور یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا کہ صقلیہ کو فتح کر کے صرف باجگوار بنایا جائے یا مستقل طور پر قابض ہو کر وہاں دارالسلام کا قیام کیا جائے۔خوب گرما گرم بحث ہوئی جس میں ارکان مجلس کی متفقہ رائے سے یہ طے پایا کہ صقلیہ کو دارالسلام بنایا جائے۔اس کے بعد زیارۃ اللہ نے اس فیصلہ کی اطلاع فیمی کو دی اور کہلا بھیجا کہ سوسہ میں اسلامی بیڑہ کا انتظار کرے۔

جب فوجی تیاریاں مکمل ہوگئیں تو اس کی سپہ سالاری کا مسئلہ پیش آیااور اس اہم خدمت کے لیے زیارۃ اللہ کی نگاہِ انتخاب قاضی القضاۃ ابوعبداللہ اسد بن فرات پر پڑی۔جو ایک نہایت ممتاز صاحب قلم اور فقہ کے بہت بڑے عالم تھے۔وہ افریقہ کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے۔ان کے فوج کے کمانڈر مقرر ہونے پر بہت سے علماء اور صوفیا شوق سے فوج میں بھرتی ہو گئے۔اور امام مالکؒ، قاضی ابو یوسف اور امام محمد (شاگردان امام ابوحنیفہ) کے شاگرد تھے۔اس فوج کی تیاریاں مکمل ہوگئیں تو زیارۃ اللہ نے افریقہ کے ساحلی شہر سوسہ کی طرف لشکر کی روانگی کا حکم دیا۔جب 18 ربیع الاوّل 213ھ کو جہازوں کے لنگر اٹھانے کا وقت آیا تو سپاہیوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔جہازوں کے پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔سپاہی عرشے پر کھڑے اپنی تلواریں ہلا رہے تھے اور فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔اتنے میں امیر لشکر قاضی اسد بن فرات عرشہ جہاز پر آیا اور یہ تقریر کی:

''لوگو! میرے آباؤ اجداد آج تک کبھی والی مقرر نہیں ہوئے۔انہیں کبھی بھی یہ سرفرازی نصیب نہ ہوئی اور مَیں بھی اس منصب جلیلہ پر فائز نہ کیا جاتا اگر علم کو اپنا زیور نہ بناتا۔اس لیے علم کی تحصیل وتدریس میں سعی و کوشش کرو۔اس راہ میں مصائب و مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ان کا مردانہ وار مقابلہ کرو۔اس سے تم دین و دنیا میں سربلند ہو سکتے ہو۔''

قاضی اسد بن فرات کی اس تقریر کے بعد اسلامی فوج صقلیہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس فوج میں سات سو سوار اور دس ہزار پیادہ سپاہی تھے۔ بیڑہ سو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا۔ اس کے پیچھے فیمی کے چند جہاز تھے۔

اب تک افریقہ سے جس قدر اسلامی بیڑے جاتے تھے وہ زیادہ تر دارالحکومت سرقوسا پر حملہ آور ہوتے تھے۔ مگر اسد بن فرات نے یہ راستہ بدل دیا اور ایک ایسے شہر کا رُخ کیا جو مزاحمت کے بغیر قبضہ میں آ گیا۔ اس شہر کا نام مازر تھا۔ یہاں اسد بن فرات نے مورچہ بندی کی اور دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ مگر دشمن یہاں سامنے نہ آیا تو اسلامی فوج نے پیش قدمی کی اور جب مرج پہنچی تو دشمن سامنے تھا۔ جس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار تھی اور اس کے مقابلے میں اسلامی فوج صرف دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی خیال تھا کہ فیمی کے ساتھی اس مہم میں اچھے مددگار ثابت ہوں گے، مگر یہاں پہنچ کر فیمی نے بالکل علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے یقین تھا کہ اُس کو صقلیہ کا فرمانروا بنا دیا جائے گا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ مسلمان اس پر قبضہ کر کے حکومت چاہتے ہیں تو اُسے مایوسی ہوئی۔

معرکۂ کارزار گرم ہوا تو ایک طرف رُومیوں کا ٹڈی دل تھا اور دوسری طرف دس ہزار بے وطن مسلمان مجاہد۔ قاضی اسد بن فرات بڑا دور اندیش تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ مسلمان رومیوں کی کثرت تعداد سے کچھ ہراساں ہیں۔ چنانچہ اُس نے فوج کے سامنے ایک تقریر کی۔ جس سے مسلمان سپاہیوں کی شجاعت و ہمت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ قاضی اسد بن فرات کی تقریر کے آخری جملے یہ تھے۔

''مجاہدو! فتح و نصرت اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت۔ دشمن کی کثرت سے کہیں خائف نہ ہو جانا۔''

جنگ شروع ہوئی اور گھمسان کا رَن پڑا۔ رومیوں نے سارا زور اسد بن فرات پر صرف کیا اور اس پر مسلسل حملے کرنے لگے۔ اسد بن فرات نے ان حملوں کا جواب بڑی پامردی سے دیا۔ گو وہ زخموں سے چُور چُور ہو گیا مگر تلوار کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ جس ہاتھ میں جھنڈا تھا وہ بھی خون سے شرابور ہو گیا۔ مگر قاضی اسد بن فرات نے اسے سرنگوں نہ ہونے دیا۔ اچانک رومیوں کے پاؤں میدانِ جنگ سے اکھڑنے لگے اور وہ بھاگ نکلے۔ صقلیہ میں یہ مسلمانوں کی پہلی بڑی فتح تھی۔

یہاں سے اسلامی فوج شہروں اور قلعوں کو فتح کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی اور چند روز بعد سرقوسا کے سامنے پہنچ گئی۔ جو جغرافیائی حیثیت سے ایک مستحکم قلعہ تھا۔ اس کے تین طرف سمندر تھا اور شمالی حصہ خشکی سے ملا ہوا تھا۔ قاضی اسد بن فرات نے اسے دونوں طرف سے گھیر لیا۔ اِسی اثنا میں افریقہ سے کمک آ گئی۔ اُدھر محصورین کو بھی مدد پہنچ چکی تھی جس سے محاصرہ طویل ہوتا چلا گیا۔ سامان رسد کی برابر کمی ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کے کھانے کے لیے گھوڑے ذبح کرنے کی نوبت آ گئی۔ جس سے اسلامی لشکر میں بے دلی پھیل گئی۔ مگر قاضی اسد بن فرات نے بڑی ہمت اور دور اندیشی سے اس پر قابو پا لیا اور محاصرہ جاری رہا۔

اسی اثناء میں قاضی اسد بن فرات ایک جھڑپ میں اچانک زخمی ہو گیا۔ زخم اتنا کاری تھا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکا اور حالتِ محاصرہ ہی میں انتقال ہو گیا۔ اُدھر مجاہدینِ اسلام نے ایک فیصلہ کن حملہ کیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔ قاضی اسد بن فرات کو اسی جگہ دفن کیا گیا۔ مسلمانوں نے یادگار کے طور پر ایک شاندار مسجد تعمیر کرا دی۔

زیارۃ اللہ (بن ابراہیم بن اغلب) کو قاضی اسد بن فرات کی شہادت کا بہت صدمہ ہوا۔ اُس نے اپنے پایہ تخت قیروان میں ایک مسجد تعمیر کروائی جس کے کھنڈروں میں اَب تک ''اسد بن فرات'' کے الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں۔ اسد بن فرات کا زمانہ گورنری صرف ایک سال چند دن رہا۔

❀..........❀..........❀

49

اکبر

ہندوستان میں مغل سلطنت کی بحالی کو آٹھ ماہ گزر چکے تھے، ہمایوں بادشاہ ایک دن شام کو مغرب کی اذان سن کر دین پناہ کی بالائی منزل پر لائبریری سے نکلا اور نیچے اترنے لگا کہ سیڑھیوں پر سے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

مغل امراء نے یہ بُری خبر نہایت رنج والم کے ساتھ سنی، مغلوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کو سخت دھچکا لگا، مصائب کی تاریک گھٹائیں جو چاروں طرف منڈلا رہی تھیں، کچھ اور گہری ہوگئیں۔ افغان قوم نے بھی اپنی شکست تسلیم کر لی۔ پنجاب میں سکندر سور مغلوں سے نبرد آزما تھا۔ بہار میں سلطان عادل سور ہمایوں سے ٹکر لینے کے لیے اپنی افواج مرتب کر رہا تھا۔ محمد شاہ سور بنگال میں اور باز بہادر مالوہ میں تسلط جمائے بیٹھے تھے۔ جنوب کی طرف راجپوت پھر اپنے قدموں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ میواڑ، رنتھمبور، کالنجر، جیسلمیر، بیکانیر اور جودھپور کے طاقت ور راجے راجپوت قوم کی عظمت کو از سر نو زندہ کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ انہوں نے غلامی کا جوا اتار پھینکا تھا۔ سارا راجپوتانہ اب ایک مضبوط حصار تھا۔ گجرات میں بھی خود مختار حکومت قائم تھی۔ مغل سلطنت صرف دہلی آگرہ اور پنجاب کے کچھ حصے تک محدود تھی، ایسے عالم میں ہمایوں کی موت ایک نا قابل تلافی نقصان تھا۔ مغل امراء نے اس بڑی چیز کو پھیلنے نہ دیا۔ سترہ دنوں تک ایک شخص کو جس کی شکل ہمایوں سے بالکل ملتی جلتی تھی، شاہی تاج پہنا کر تخت پر بیٹھائے رکھا۔ آخر 14 فروری 1556ء کو دہلی شہر کے زعماء اور سر برآوردہ لوگ دربار میں جمع ہوئے اور جلال الدین محمد اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

جلال الدین محمد اکبر تخت نشینی کے وقت اپنے اتالیق بیرم خان کی سرکردگی میں سکندر

سور کا تعاقب کر رہا تھا، پنجاب کے ضلع گورداسپور میں کلانور کے مقام پر اس کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی، اس وقت اس کی عمر تیرہ سال اور تین ماہ کی تھی۔

ہندوستان میں مغلوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آیا، لوگ یہی سوچ رہے تھے کہ اب زیادہ دیر تک مغل یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ اکبر کی راہ میں مشکلات کے وہ پہاڑ تھے جن کو سر کرنا اس کے بس کی بات نظر نہ آتی تھی، اسے سلطنت کے کاروبار کا کوئی تجربہ نہ تھا، لکھائی پڑھائی میں اسے لطف نہ آتا تھا۔ اس کا بچپن کھیل کود میں گزرا، البتہ کامران اور عسکری کے زیرِ سایہ اس نے گھڑ سواری تیراندازی اور شمشیرزنی میں کافی مہارت حاصل کی۔

اکبر کے دور کا آغاز جن حالات میں ہوا، ان کے پیش نظر کون یہ کہہ سکتا تھا کہ اس کا عہد تاریخ ہند کا روشن ترین باب بنے گا اور وہ ہندوستان کا عظیم ترین بادشاہ سمجھا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا ستارا بلند تھا، وہ کسی نہایت ہی مبارک گھڑی پیدا ہوا تھا اس کی قسمت میں کامیابی ہی کامیابی تھی، جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا اور دشمنوں کے حوصلے پست ہوتے گئے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اکبر نے اپنی مشکلات کا مقابلہ نہایت پامردی دلیری اور دانشمندی سے کیا۔

بیرم خان نائب السلطنت کے عہدے پر فائز ہوا، وہ شاہی خاندان کا پرانا خادم تھا، اسی کے تدبر نے ہمایوں کو دوبارہ تخت دہلی پر لا بٹھایا، وہ سلطنت کے رؤساء میں سب سے زیادہ بااثر شخصیت کا مالک تھا۔ مگر جہاں دوسرے سردار اس کی برتری کا لوہا مانتے تھے، اس کی وفاداری اور خوش انتظامی کے قائل تھے وہاں وہ اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوف زدہ بھی تھے، بیرم خان شیعہ تھا، اور چغتائی امراء سے اس کا سلوک مخاصمانہ تھا۔ نائب السلطنت کا عہدہ سنبھالتے ہی اس نے شاہ ابوالمعالی کو جو اس کا حریف تھا گرفتار کروا دیا، وہ من مانی کرتا اور دوسروں کی رائے کو قابل توجہ نہ سمجھتا، یہ باتیں آخر اس کے زوال کا سبب بنیں، مگر شروع میں اس کا وجود اکبر کی سلطنت کے بقا کے لیے باعث رحمت ثابت ہوا، اس کی سیاسی دور اندیشی، انتظامی تجربہ، عمدہ عسکری صلاحتیں غیر معمولی شجاعت، کردار و عمل سے وابستگی، ذہنی اپچ، ادبی ذوق، اعلیٰ درجہ کی مہذب شخصیت اور سب سے بڑھ کر اس کی وفاداری اور نمک حلالی سلطنت کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، اس نے مخالفت کے ہر طوفان کا رُخ موڑا اور دشمنی کے ہر فتنے کو فرد کیا۔

محمد عادل سور کا لائق جرنیل، ہیموں ایک زبردست فوج لے کر دہلی کی طرف پیش قدمی کرر ہا تھا، دہلی کے مغل گورنر تردی بیگ نے بیرم خان کو کمک کے لیے پیغام بھیجا اور علاقے کے سب چھوٹے بڑے مغل سرداروں کو اپنے آدمیوں سمیت دہلی پہنچنے کا حکم دیا۔

ادھر کابل سے بھی بُری اطلاعات موصول ہو رہی تھیں، بدخشاں کے حاکم سلیمان مرزا نے ازبکوں سے شکست کھائی اور کابل پر حملہ آور ہوا، کابل کے مغل صوبیدار نے بھی شاہی فوج کو مدد کے لیے پکارا، اکبر کی نوخیز سلطنت کے لیے یہ نازک ترین وقت تھا، اگر تردی بیگ کو مناسب امداد نہیں ملتی تو دہلی ہاتھ سے نکل جاتا ہے اگر کابل کے ضائع ہو جانے کے خیال سے اکبر کی فوج کا ایک حصہ ادھر کا رُخ کرتا ہے تو خود شاہی افواج کی طاقت کو ضعف پہنچنے کا خطرہ ہے۔

ہیموں بڑی سرعت سے دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا، تردی بیگ کے ساتھیوں نے صلاح مشورہ کے بعد یہی بہتر سمجھا کہ باہر نکل کر کھلے میدان میں ہیموں کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا، تردی بیگ مقابلے کو نکلا اور اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ ہیموں کے لاؤ لشکر کا بڑی پامردی سے سامنا کیا، ایک نہایت ہی خونریز لڑائی کے بعد جس میں دیر تک فتح و شکست کا کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا آخر مغل فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور تردی بیگ جان بچا کر اپنے بچے کھچے ساتھیوں سمیت شاہی لشکر سے آملا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے تردی بیگ کے پاس بیرم خان کی طرف سے پیر محمد عبداللہ آزمودہ کار جرنیل پہنچ چکا تھا، مگر اس سے کچھ بن نہ آئی، اور میدانِ جنگ میں پسپا ہونے میں اسی نے پہل کی تھی۔ اس کے بعد چونکہ مقابلے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تردی بیگ کو بھی ناچار پیر محمد کی تقلید کرنی پڑی۔

بیرم خان نے شکست خوردہ جرنیلوں کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا، ان کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر ایک شام شاہی فوج کے سرداروں نے نہایت رنج و الم کے ساتھ یہ حیرت ناک خبر سُنی کہ بیرم خان نے تردی بیگ کو اپنے خیمہ میں بلوا کر قتل کرا دیا ہے۔ ایک پرانے اور با اثر سردار کے اچانک قتل نے تمام مغل امراء پر دہشت طاری کر دی، تردی بیگ کا جرم یہ ظاہر کیا گیا کہ اس نے دہلی کی حفاظت میں کوتاہی سے کام لیا ہے، اور جنگ میں بزدلی کا ثبوت دیا ہے۔ مگر اس الزام نے بہت سے امرا کو مطمئن نہ کیا، شروع ہی سے بیرم خان کی دست درازیوں کے شاکی تھے، اکبر کی رسم تاجپوشی کے دن ہی شاہ ابوالمعالی جیسے باوقار اور ہردلعزیز سردار کو بیرم خاں کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا تھا، کیونکہ اثر و رسوخ میں بیرم کا ہم پلہ تھا، اس لیے بیرم خان اس

سے خائف تھا، اُسے خدشہ تھا کہ کہیں شیعوں کا یہ دشمن اُس کے لیے خطرے کا باعث نہ بن جائے، چنانچہ نائب السلطنت بنتے ہی خانخانان بیرم خان نے اپنے مخالفوں سے نبٹنا شروع کر دیا تھا، تردی بیگ کا قتل بھی اسی روشنی میں دیکھا گیا، یہ بات بالکل سچی نہیں کہ بیرم خان نے تردی بیگ سے جو سلوک کیا وہ محض سلطنت کے استحکام اور فوجی مصالحتوں کے پیشِ نظر کیا گیا تھا کہ دوسرے فوجی افسر اس سے عبرت پکڑیں اور بزدلی اور کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں حقیقت یہ ہے کہ مغل سردار اور فوجی جرنیل بھی حالات کی نزاکت کا پورا پورا احساس رکھتے تھے، ہمایوں کی موت نے جس آزمائش میں انہیں ڈال دیا تھا وہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کمر بستہ ہو چکے تھے، ان میں اتحاد و یگانگت تھی، اور وہ اپنی ذاتی رنجشیں بھلا بیٹھے تھے، انہی کی شجاعت و ہمت اس آڑے وقت میں کام آئی اور مغل سلطنت تباہ و برباد ہونے سے بچ گئی۔ بیرم خان کے اس طرزِ عمل پر اس وقت تو کسی نے سر نہ اٹھایا مگر آخر یہی دست درازیاں اور من مانی کارروائیاں اس کے زوال کا باعث بنیں۔

دہلی کا چھن جانا مغلوں کی ابھرتی ہوئی قوت کے لیے ایک زبردست نقصان تھا۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر دہلی کی طرف بڑھے، خان زماں علی قلی خان شیبانی، ہراول دستے کی کمان کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی مٹھ بھیڑ ہیموں کے توپ خانہ سے ہوئی ہیموں نے اپنا توپ خانہ فوج کے آگے آگے روانہ کر دیا تھا اور خود لشکر کو منظم کر کے مغل فوج کی پیش قدمی روکنے کے لیے بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا توپ خانہ کا محافظ دستہ اتنا مضبوط نہ تھا، علی قلی خان نے بڑی آسانی سے توپ خانہ ہیموں کے آدمیوں سے چھین لیا، اس سے ہیموں کی قوت بڑی حد تک کمزور ہوگئی۔

5 نومبر 1556ء کو پانی پت کے میدان میں ایک دفعہ پھر مغلوں اور افغانوں کا آمنا سامنا ہوا اور تاریخ نے پھر وہی فیصلہ صادر کیا، البتہ بابر کے مقابلہ میں اکبر کو ایک زیادہ طاقت اور فوج کا سامنا کرنا پڑا، جس کا سپہ سالار ابراہیم لودھی سے بدرجہا بہتر تھا، توپ خانہ چھن جانے کے باوجود افغان فوج کا پلہ بھاری نظر آتا تھا، اکبر کے بیس ہزار سپاہیوں کو ہیموں کی ایک لاکھ کی فوج بُری طرح گھیرے میں لے چکی تھی۔ اچانک ہیموں کی آنکھ میں ایک تیر لگا اور وہ ہودہ کے اندر گر پڑا، ہاتھی پر اس کے نظر نہ آنے سے اس کی فوج میں یہ خبر پھیل گئی کہ ہیموں قتل ہو گیا ہے۔ اس سے اس کے سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے، ایک ایسے معرکہ میں جب سپاہی کسی مقصد کے لیے نہیں بلکہ کسی فرد کے لیے لڑ رہے ہوں سپہ سالار کی موت جنگ کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔

ہیموں کو اکبر کے سامنے پیش کیا گیا وہ زخموں کی شدت سے کراہ رہا تھا، اور قریب المرگ تھا، بیرم نے اکبر سے کہا کہ ہیموں کا سر تن سے جدا کر دے مگر اس کی بلند طبعی نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک مرتے ہوئے آدمی پر تلوار اٹھائے اس پر بیرم خان نے خود بڑھ کر دشمن کا سر کاٹ دیا، اکبر کی منفرد شخصیت اور اس کے بلند کردار کا اظہار لڑکپن سے ہی ہو رہا تھا۔

پانی پت کی فتح کے فوراً بعد علی قلی خان، پیر محمد عبداللہ خان اور کیان خان کو فوجی دستے دے کر مختلف اطراف کو بھیج دیا گیا کہ دشمنوں کی روک کریں اور علاقے پر اپنا تسلط قائم کریں۔

کابل سے اطلاع موصول ہوئی کہ سلیمان مرزا واپس لوٹ گیا ہے، اس طرح وہاں سے بھی خطرہ ٹل گیا، سلیمان مرزا کو دراصل جب پانی پت کے میدان میں ہیموں کی شکست کی خبر ملی تو اسے یقین ہو گیا کہ اب ہندوستان سے کمک پہنچتی ہی ہوگی سردیوں کا موسم بھی شروع ہونے والا تھا اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ مبادا وہ برف کے طوفانوں میں گھر جائے، چنانچہ اس نے اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا۔

اب ہندوستان میں مغلوں کو اپنی قوت کی بحالی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ ہر میدان میں ان کا پلہ بھاری تھا، کامیابی ان کے قدم چوم رہی تھی، بیرم خان کا دور چار سال تک رہا، اس نے اپنے اقتدار کے زمانے میں نہایت تن دہی سے توسیع سلطنت اور استحکام حکومت کے لیے کوششیں کیں۔ پنجاب، گوالیار، جونپور اور اجمیر کے علاقے فتح ہوئے۔ گکھڑوں نے بھی اکبر کی قیادت تسلیم کر لی، رنتھمبور اور مالوہ کی فتح کے منصوبے بنے۔

مگر ملک کی اندرونی سیاست کروٹ بدل رہی تھی، اکبر اب حکومت کے کاروبار میں دلچسپی لینے لگا۔ کھیل کود اور سیر و شکار کا دور اب ختم ہو چکا تھا "یوں تو شکار کھیلنے وہ اب بھی جایا کرے گا، مگر اب زیادہ تر شکار کے پردے میں سیاسی چالیں تکمیل پذیر ہوں گی۔" بیرم خان کا تحکمانہ انداز اس کی آمریت اس کی خود مختاری اکبر کے لیے پریشانی کا باعث بن چکی تھی، وہ کسی طرح اس کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہو، وہ نوجوان بادشاہ کی رائے کو کوئی اہمیت نہ دیتا۔ جو کچھ اس کے جی میں آتا بلا تامل کر گزرتا۔ بادشاہ اور سلطنت کے دوسرے امراء سے صلاح مشورہ کرنا اس کے شایانِ شان نہ تھا۔

دربار کے امراء خاص کر اکبر کے اپنے خاندان کے لوگ اسے بیرم کے خلاف بھڑکاتے رہے، وہ نائب السلطنت کے ہاتھوں سخت نالاں تھے، وہ ان سے رعونت سے پیش آتا خواہ مخواہ ان

سے جواب طلبیاں کرتا رہتا، شمس الدین اتکہ جو وزیر مملکت تھا بیرم خان کی بے جا سختیوں سے تنگ تھا، بیرم ترک امراء کی بیخ کنی پر تلا ہوا تھا، وہ امراء کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتا تھا جو اپنے وجود کے لیے اسی کا مرہون منت ہو اور اپنی بقا کے لیے اسی کے رحم و کرم پر ہو۔ سلطنت کے سارے سردار بے اطمینانی اور سراسیمگی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ بیرم خان نے شیخ گدائی کو جو شیعہ تھا صدر الصدور کے عہدے پر فائز کر دیا، اس سے عوام نہایت برہم ہوئے۔ پھر کئی بار سنی مسلمانوں کا مقتدر بزرگ اور مذہبی رہنما شیخ محمد غوث بیرم خان کی رعونت اور سختی کا شکار ہوا۔ پیر محمد جودک کا مشہور جرنیل اور قابل منتظم تھا بیرم خان کے حکم پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا، اور اس نے دہلی کے گورنر شہاب الدین کے ہاں پناہ لی، ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اکبر بیرم خان کے متعلق کوئی مؤثر قدم اٹھائے اکبر کی اتا ماہم انگا اور اس کے بیٹے ادہم خان نے بھی اکبر کو خانخاناں کے خلاف اُکسانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اکبر نے بیرم سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک چال چلی وہ شکار کھیلنے کے بہانے اپنے چند وفادار ساتھیوں کو لے کر آگرہ سے نکلا اور دہلی جا پہنچا، 27 مارچ 1560ء کو دہلی کے صوبیدار شہاب الدین نے اس کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا، پیر محمد بھی دہلی پہنچا۔ سلطنت کے دوسرے روساء اور امراء بھی جو بیرم کے ہاتھوں تنگ تھے، دہلی میں اکبر کے گرد جمع ہو گئے اب دہلی سے اکبر نے بیرم خان کی برطرفی کا فرمان جاری کیا، ساری کارروائی اتنی سرعت اور راز داری سے سرانجام دی گئی کہ بیرم خان کو خبر تک نہ ہوئی، اور اس کے احکامات جب اسے ملے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اکبر اس طرح چپکے سے اسے چھٹی دے دے گا۔ اسے شک ہوا کہ اس کے مخالفوں نے ضرور کوئی چال چلی ہے، اور شہنشاہ کو اس کے خلاف کسی شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ اس نے اکبر سے ملنا چاہا۔ مگر اسے حاضر ہونے کی اجازت نہ مل سکی جب پیر محمد کو معزولی کے احکامات پر عمل درآمد کرانے کے لیے بھیجا گیا تو بیرم خان نے بادشاہ کے حامیوں سے جنگ کرنے کی ٹھان لی، اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ بادشاہ کے آدمیوں کے خلاف لڑائی دراصل بادشاہ سے جنگ کے مترادف ہے، اور ایسا کرنے سے اس پر سلطنت کا باغی ہونے کا الزام لگایا جا سکتا ہے، شاہی فوج کے دستوں سے بیرم کا آمنا سامنا ہوا مگر اس نے شکست کھائی اور بھاگ کو شوالک کی پہاڑیوں میں جا پناہ لی، چونکہ وہ بزعم خود سلطنت کا باغی نہ تھا اور اس کے دل میں بادشاہ کے لیے وفاداری اسی طرح موجود تھی، اس نے بادشاہ کی

مخالفت کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے آپ کو بادشاہ کے حوالہ کر دینا مناسب سمجھا۔ نوجوان بادشاہ نے اپنے پرانے اتالیق اور نائب السلطنت کا نہایت مہربانی سے خیر مقدم کیا، اسے اپنے سینے سے لگایا اور اپنے ساتھ تخت پر جگہ دی۔

بیرم خان کو کہا گیا کہ وہ اگر ملازمت کی خواہش رکھتا ہے تو کسی صوبہ کا انتظام سنبھال لے، اگر میدان جنگ میں اس کے لیے کوئی باقی ہے تو فوج کے ایک حصے کی کمان قبول کرے اور سلطنت کی وسعت کے لیے کوشاں ہو، اور اگر فراغت میں اس کا دل لگے اور ملازمت کی ذمہ داریوں سے اس کا جی اکتا گیا ہو، تو اسے باعزت طریقہ پر ریٹائر کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں اگر وہ حج بیت اللہ کا عزم کرے تو بہتر ہے، حکومت اسے بحفاظت ہندوستان کی حدود پار کرانے کی ذمہ داری لیتی ہے۔ بیرم خان نے آخری تجویز قبول کی اور اس کی مکہ کے لیے روانگی کا بندوبست کیا گیا، مگر حج اس کی قسمت میں نہ تھا، وہ ایک دن گجرات میں ایک مشہور و معروف تالاب کا نظارہ کر رہا تھا کہ افغان لٹیروں کی ایک جماعت کے ہاتھوں قتل ہوا، جو اس سے ذاتی عناد رکھتے تھے۔ اکبر نے اس کی بیوہ اور معصوم بچے عبدالرحیم کو شاہی محل میں داخل کیا، بیوہ سلیمہ بیگم سے خود شادی کر لی اور عبدالرحیم کو اپنے بچوں کی طرح پروان چڑھایا، اور آخر بڑے ہو کر اس نے اپنے باپ کی جگہ لی اور خانخانان بنا۔

بیرم کی خود مختاری اور آزادانہ طرزِ حکومت سے نجات پا کر بھی اکبر کو اپنی رائے سے حکومت کرنے کا موقعہ نہ ملا، وہ امراء جنہوں نے بیرم خان کے خلاف اکبر کا ساتھ دیا تھا، قدرتی طور پر اہمیت حاصل کر گئے، اور سلطنت کے کاروبار میں دخل دینے لگے، بعض فوجی جرنیلوں نے اکبر کے احکامات کی پرواہ نہ کی اور من مانی کارروائیاں شروع کر دیں، ان میں ادہم خاں، آصف خاں، پیر محمد اور خاں زمان علی قلی خاں اور اس کے ساتھی ازبک سردار پیش پیش تھے۔ انہوں نے بعض اوقات نئے علاقوں پر چڑھائی کے لیے اکبر سے اجازت تک نہ لی۔ کئی بار وہ نئے علاقے فتح کرنے کے بعد رعایا پر ظلم وستم کے مرتکب ہوئے، اور مالِ غنیمت سے مرکز کو کچھ حصہ نہ بھیجا، خاص کر ادہم خاں نے مالوہ کی فتح کے بعد غیر ذمہ داری اور آزادانہ روی کا ثبوت دیا۔ ادہم خاں اکبر کی اناماہم کا بیٹا تھا، ماہم انگہ کا اکبر پر بڑا اثر تھا وہ اس لیے ادہم خاں کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانے سے گریز کرتا رہا مگر ادہم خاں کی سفاکی اور دغابازی حد سے تجاوز کر گئی۔ مالوہ کی بیگمات پر ظلم کرنے کے بعد اس نے انہیں مروا دیا، کہ وہ اکبر سے اس کے ظلم وستم کی شکایت نہ کر سکیں، اکبر کو

ادہم خاں کی ان بدعنوانیوں کا علم ہو گیا۔ مگر وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکا۔ ادہم خاں کی والدہ ماہم انگہ جس کا دودھ اکبر نے پیا تھا، اکبر پر کافی اثر رکھتی تھی۔ اکبر نہیں چاہتا تھا کہ اسے صدمہ پہنچائے۔ ادہم خاں کی دیدہ دلیری بڑھتی گئی۔ ایک رات جب اکبر کا وزیرِ اعلیٰ اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا، وہ چند آدمیوں کو لے کر اُس پر پل پڑا اور اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ وزیر کو مارنے کے بعد اُدہم خاں ہاتھ میں تلوار لیے اکبر کی خواب گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ خواجہ سراؤں نے جب اُدہم خاں کو اس حالت میں محل میں گھومتے دیکھا تو شور مچا دیا۔ اس شور وغوغا سے اکبر بیدار ہو گیا اور اپنی خواب گاہ سے شب خوابی کے لباس میں ہی باہر آ گیا۔ اُدہم خاں ننگی تلوار لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ڈانٹ کر اُدہم خاں سے پوچھا۔ ادہم خاں تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو۔ اکبر کی آواز میں نہ جانے کیا جادو تھا۔ ادہم خاں کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور وہ خوف و ہراس سے لرزنے لگا۔ اکبر نے طیش میں آ کر اسے ایک مکہ رسید کیا، وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ جب اکبر کو پتہ چلا کہ ابھی اس میں کچھ جان باقی ہے تو اس نے حکم دیا کہ اس کو قلعہ کی دیوار سے نیچے پھینک دیا جائے۔ یہ عمل دو دفعہ کیا گیا۔ دوسرے دن صبح اُدہم خاں کی والدہ ماہم انگہ کو اس جانکاہ حادثہ کا علم ہوا۔ وہ آہ وزاری کرتی ہوئی اس کے حضور آئی اور فریاد طلب ہوئی کہ میرے بیٹے کا کیا ہوا۔ اسے ابھی پوری طرح علم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اکبر نے مختصراً اُسے جواب دیا۔ ادہم خاں نے ہمارے وزیر کو قتل کیا تھا۔ ہم نے اسے سزا دے دی ہے۔ ماہم انگہ کو یہ سن کر اندازہ نہ ہوا کہ اکبر کا سزا سے کیا مطلب ہے، مگر جب اس نے کچھ دیر بعد اپنے بیٹے کی لاش دیکھی تو اس کا سینہ غم سے چھلنی ہو گیا۔

بیرم خاں کی برطرفی اور ادہم خاں کو سزائے موت ایسے اقدامات تھے جن کے ذریعہ اکبر اپنے تخت کی بنیادوں کو مضبوط کر رہا تھا۔ وہ ایسے تمام عناصر کا قلع قمع کر دینا چاہتا تھا، جو اس کی سلطنت کے لیے کمزوری کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ازبکوں کی طاقت کا بھی اس نے قلع قمع کیا۔ ازبکوں کا سردار علی قلی خاں تھا۔ اس سے بھی اکبر نے نجات حاصل کر لی۔ اب اکبر تمام مخالفوں کا سر کچل چکا تھا اور سلطنت میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کے اقتدار کے لیے خطرہ ثابت ہوتا۔

اکبر نے سلطنت کا کاروبار سنبھالتے ہی راجپوتوں کے متعلق کوئی خاص رویہ اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ راجپوت بڑی جنگجو اور بہادر قوم تھی۔ وہ آسانی سے اپنی آزادی کھو بیٹھنے پر رضامند نہ ہو سکتی تھی۔ اکبر انہیں اپنے قوتِ بازو سے زیر تو کر سکتا تھا، مگر انہیں ہمیشہ کے

لیے زیر رکھنا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اسی ایک مسئلہ کو سلجھانے کے لیے اکبر کی ساری قوت اور اس کی سلطنت کے سارے وسائل خرچ ہو جاتے۔ اکبر نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت بغاوتوں کو دبائے اور فتنوں کا سر کچلنے میں ہی مصروف رہے۔ وہ محض ایک عظیم فاتح ہی نہ تھا۔ قدرت نے اسے اعلیٰ پایہ کی انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ان صلاحیتوں کے جوہر دکھانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ راجپوتوں کو یا تو بالکل نیست و نابود کر دے یا ہمیشہ کے لیے انہیں اپنے ساتھ ملا لے۔ سلاطینِ دہلی کی تاریخ اس کے سامنے تھی۔ ابراہیم لودھی کو پانی پت میں شکست اسی وجہ سے ہوئی کہ رانا سانگا نے بجائے اس کا ساتھ دینے کے الٹا بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے پر آمادہ کیا۔

اکبر نہیں چاہتا تھا کہ ان ہی خطوط پر تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے۔ راجپوتوں کو ہندوستان سے بالکل نیست و نابود کرنا عقلمندانہ پالیسی نہ تھی۔ اور نہ ہی اکبر کو یہ ممکن نظر آیا۔ پہلا راستہ اکبر نے اس لیے بھی اختیار نہ کرنا چاہا کہ یہ اس کی وسیع النظری اور صلح کل پالیسی کے خلاف ہوتا۔ اکبر فطری طور پر تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا۔ کسی نسل یا قوم کو صفحہ ہستی سے بالکل محو کرنے کا خیال اسے پیدا ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ چنگیز کی نسل سے تھا مگر چنگیز نہ تھا۔ اس کے لاشعور میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اپنی مخلوق پر حکومت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور حکومت بھی ایسی جو بندگانِ خدا کے لیے باعث رحمت ہو۔ اس پہلو کا ذکر آگے آتا ہے یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اکبر نے اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق راجپوتوں کو ہمیشہ کے لیے رام کرنا چاہا تھا تاکہ وہ اپنی جرأت و ہمت اور جنگی صلاحتیں بجائے حکومت کے خلاف استعمال کرنے کے اس کے حق ہی میں استعمال کریں۔ تاکہ ان کی قوت حکومت کے خلاف ہونے کی بجائے اس کے دشمنوں کے خلاف ہو اور وہ سلطنت کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو جائیں اور اس طرح سلطنت کو استحکام نصیب ہو۔ اکبر نے اس حکمت عملی کو بروئے کار لانے کے لیے دو راستے اختیار کیے۔ ایک تو یہ کہ انہیں سلطنت میں بڑے عہدوں پر فائز کیا دوسرے یہ کہ اچھے راجپوت گھرانوں سے شادی بیاہ کے تعلقات استوار کیے۔ مسلمانوں نے اس کی اس پالیسی سے یہ سمجھا کہ اکبر خواہ مخواہ راجپوتوں کو اعزاز بخش رہا ہے۔

راجپوتوں نے اپنے ان سرداروں کے متعلق جنہوں نے اکبر کے ساتھ رشتے استوار کیے تھے یہ کہا کہ مسلمانوں سے شادی بیاہ کے تعلقات پیدا کر کے راجپوتوں کی نسلی پاکیزگی کو بٹہ لگایا۔ شادیوں کے ذریعے سے قوموں اور سلطنتوں کی تقدیروں کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

50

امام شامل

اٹھارویں صدی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا دور عالم اسلام کے لیے ایک کٹھن اور مشکل دور کی حیثیت سے گزرا ہے۔ 1799ء میں ٹیپو سلطانؒ نے شہادت پائی اور اسی سال ترکی کے بیڑے کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اسی لیے ٹیپو سلطانؒ کی قبر پر یہ عبارت تحریر ہے:

''روم اور ہندوستان کی عظمت غروب ہو گئی۔''

اسی پُر آشوب سال میں بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے درمیان واقع داغستان کے ایک غیر معروف قصبے میں امام شاملؒ پیدا ہوئے جنہوں نے تقریباً پچاس سال تک رُوسی استعمار کو مسلم آبادیوں پر مسلط ہونے سے روکے رکھا۔

تحریک آزادی کا یہ خونچکاں باب برصغیر کے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ اس جدوجہد کا یہ پہلو خاصا اہم ہے کہ داغستان کے جنگلوں اور پہاڑوں میں لڑی جانے والی یہ گوریلا جنگ عالمِ اسلام میں منفرد نوعیت کی حامل تھی۔ بے سروسامان داغستانیوں کو روسیوں کی منظم اور کثیر التعداد افواج کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انہوں نے بے سروسامانی کے باوجود رُوسی قوت کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا تھا۔

گوریلا جنگ نے بیسویں صدی میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے خاصی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ ویت نام اور لاطینی امریکہ میں لڑی جانے والی جنگوں کی وجہ سے مغربی فوجی مصنفین نے اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔ آج کل کے تکنیکی دور میں بڑی طاقتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے کئی اقوام نے گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہوچی منہ نے پہلے فرانسیسیوں اور پھر امریکیوں کو گوریلا جنگ ہی کے ذریعے نیچا دکھایا۔ الجزائری سرفروشوں نے بھی

اسی طریقۂ جنگ کو اپنا کر اپنے وطن کو آزاد کرایا۔ امام شامل ؒ کی حیثیت اس میدان میں پیش رو کی تھی۔ انہیں بجا طور پر عالمِ اسلام کا پہلا گوریلا لیڈر قرار دیا گیا ہے۔ وہ مکمل طور پر فتح سے ہم کنار تو نہ ہوئے لیکن مظلوم اقوام کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل چھوڑ گئے جو آج بھی ان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

امام شامل ؒ "تحریکِ جہاد کے بانی نہ تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ قفقاز میں ایک ایسے سلسلے سے وابستہ تھے جسے عرفِ عام میں مریدیت کا نام دیا گیا ہے۔ طریقت کے اعتبار سے یہ سلسلہ نقشبندیہ سے منسلک تھے۔ یہ محض خانقاہی تصوف کا سلسلہ نہ تھا بلکہ اس نے جہاد و اصلاح کے عظیم کارنامے سرانجام دیے۔ داغستان میں اس سلسلے کی ابتدا مُلا محمد ؒ نے کی جو یاراغل کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس کی راہنمائی اپنے ہاتھوں میں لینے کی بجائے قاضی ملا کے سپرد کر دی جو غمری کے رہنے والے تھے۔ ان کے بعد یکے بعد دیگرے ہمزاد بیگ ؒ اور امام شامل ؒ اس تحریک کے رہنما رہے۔

قاضی مُلا ؒ 1793ء میں غمری میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کونائی کے مقام پر عربی سیکھی اور ارا کنی میں سعید آفندی سے دینی تعلیم حاصل کی۔ وہ انتہائی سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ امام شامل ؒ نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ "وہ پتھر کی مانند خاموش تھے۔" ایک رُوسی مصنف لکھتا ہے کہ "وہ لوگوں کے دل میں آگ بھڑکا دیتے تھے۔" ان کا ایک ایک لفظ عوام کی رُوح میں ارتعاش پیدا کر دیتا تھا۔ انہوں نے اپنے علم وفضل کی وجہ سے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا اور ان کے دل میں ان کی عزت و تکریم رچی بسی تھی۔ وہ انتہائی دلیر اور ارادے کے پکے تھے۔ اپنے مقصد کی راہ میں انہیں اپنی جان کی قطعاً پرواہ نہ تھی۔

امام شامل ؒ قاضی مُلا ؒ کے بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک ہی گاؤں میں رہنے والے ان دو افراد نے غمری کے نام کو روشن کیا۔ امام شامل ؒ کا نام بچپن میں علی رکھا گیا۔ لیکن وہ ابتدائی چھ سال کے دوران بیمار رہے اس لیے مقامی بڑے بوڑھوں کے کہنے پر ان کا نام شامل رکھ دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت سے ان کی صحت بہتر ہوتی گئی اور ان میں غیر معمولی قوت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے اپنی صحت بہتر بنانے کی پوری کوشش کی اور دوڑنے، چھلانگیں لگانے، نیزہ بازی اور دوسری ورزشوں میں وہ کمال حاصل کیا کہ 20 سال کی عمر میں پورے داغستان میں ان کا کوئی ہم

پلہ نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 27 فٹ چوڑی خندق بڑی آسانی سے عبور کر سکتے تھے اور عام قد کے دو افراد کے سر کے اوپر سے سے چھلانگ لگا سکتے تھے۔ غمری کے محاصرے میں انہوں نے روسیوں کے سر کے اوپر سے چھلانگ لگا کر ان پر عقب سے حملہ کیا تھا اور پھر زخمی ہونے پر ایک اور جست لگا کر جنگل میں غائب ہو گئے تھے۔

وہ ننگے پاؤں اور کھلے سینے ہر موسم میں گھومتے رہتے اور اس طرح انہوں نے داغستانیوں جیسے سخت جان اور جفاکش لوگوں میں بھی اپنی بہادری اور جفاکشی کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا تھا۔ وہ انتہائی تیز فہم، محنتی، علم کی طلب اور جستجو رکھنے والے انسان تھے۔ ان میں راہنمائی کی تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ کسی حد تک حساس بھی واقع ہوئے تھے اور قوم اور ملک کی حالت پر کڑھتے رہتے تھے۔ ایک حساس ذہن ہی ایسے حالات میں ایک عظیم تحریک کی قیادت کر سکتا ہے۔

قاضی مُلا کی مختصر لیکن ہنگامہ پرور زندگی کئی نمایاں کامیابیوں اور نمایاں ناکامیوں سمیت ایک ایسا دور تھا جو اُن کی شکست اور شہادت پر ختم ہوا۔ لیکن وہ آنے والے دنوں کے لیے ایسی سلگتی چنگاریاں چھوڑ گیا جو ایک بار پھر شعلہ جوالہ بنیں اور انہوں نے زارِ رُوس کی افواج کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ قاضی ملا کو کئی اہم قسم کی کامیابیاں نصیب ہوئیں اور انہیں زندگی میں متعدد ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ وہ کئی بار موت کے منہ میں جاتے جاتے بچے لیکن اپنی تمام زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے اپنے مقصدِ حیات کو فراموش نہیں کیا۔ غمری کے اعلانِ جہاد سے لے کر اُن کی شہادت تک ہمیں ان کی زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں ملتا جس میں انہوں نے ہمت ہار دی ہو یا شکست کی وجہ سے ناامید ہو کر بیٹھ گئے ہوں۔ داغستان کے مسلم عوام کے نام انہوں نے پہلی بار 1829ء میں اعلانِ جہاد تحریر کیا۔ غمری میں ایک عام اجلاس میں جس میں داغستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے علماء بھی شریک تھے قاضی مُلا کو امام بنایا گیا اور سب لوگوں نے ان کے اعلانِ جہاد کی حمایت کی۔

امام شامل کے دور کا پہلا اہم واقعہ جنرل فیسی کی 1837ء کی مہم ہے۔ پانچ ہزار دو سو کی تعداد میں یہ فوج جس کے ہمراہ 180 توپیں اور مارٹر توپیں تھیں، مئی کے آغاز میں تیمر خان شورا سے کاکا شورا کے راستے ہوتی ہوئی دریائے اروما کے کنارے پہنچی۔ راستے کی مشکلات کا اندازہ

اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 100 میل کا یہ فاصلہ 20 دنوں میں طے ہوا۔ خونزاخ میں دفاعی انتظامات مکمل کیے گئے۔ یہاں چار کمپنیاں چھوڑ دی گئیں اور چھ توپوں کے سوا تمام توپ خانہ اور بھاری سامان یہیں چھوڑ کر دو ہفتے کا راشن ساتھ لے کر جنرل فیس 5 جون کو اونتوکول اور اشیتا روانہ ہو گیا۔

اونتوکول کے لوگوں نے روسیوں کے آنے پر اطاعت قبول کر لی، انہیں یرغمال دیے اور ان کے تمام قیدی اور بھگوڑے واپس کرنے کا عہد کیا۔ رُوسی افواج کے بھگوڑوں کی تعداد اچھی خاصی ہوا کرتی تھی اس لیے تقریباً ہر جگہ شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ بھی ہوا کرتی تھی۔

7 جون کی رات کو امام شامل، تاشوف حاجی اور کبیت یا ہوما نے محاصرہ توڑنے کی غرض سے اچانک حملہ کیا اور اس کے بعد خونریز جنگ شروع ہو گئی جس میں رُوسیوں کے دو افسر اور 92 سپاہی ہلاک اور 13 افسر اور 183 آدمی زخمی ہو گئے۔ مریدین کے نقصان بھی تقریباً اتنے ہی تھے، روسی تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ مریدین میں سے 100 کے قریب شہید اور خاصی تعداد میں زخمی ہوئے تھے۔ روسیوں کے یہ نقصانات اس لحاظ سے خاصے تھے کہ اس وقت داغستان میں روسی افواج کی تعداد صرف پانچ ہزار تھی۔

امام شاملؒ جہاں انتہائی جری کمانڈر اور قابل سپہ سالار تھے وہاں تنظیمی صلاحیتوں میں بھی بہت بڑی حد تک انہیں کمال حاصل تھا۔ اس قدر تباہ کن لڑائی کے بعد نئے سرے سے تمام علاقے کی تعمیر اور قبائل کا حوصلہ بحال کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ روسیوں کے ظلم وستم نے بھی بہت بڑی حد تک داغستانیوں کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی لیکن یہ امام شاملؒ کا کمال تھا کہ انہوں نے اس جذبے کو اپنی تحریک کے استحکام کے لیے موثر طور پر استعمال کیا۔ ان کی تحریک روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور رُوسی حکومت کو بجا طور پر خطرہ محسوس ہوا کہ امام کی بڑھتی ہوئی طاقت کہیں ان کے لیے وبالِ جان نہ بن جائے۔ 1839ء کے آغاز میں رُوسی حکومت نے امام شاملؒ کے اثرات کی روک تھام کے لیے شمالی داغستان میں ایک فیصلہ کن مہم بھجوانے کا فیصلہ کر لیا۔

امام شاملؒ کی حکومت آویریا، آندی اور گومیٹ کے تمام علاقوں میں تسلیم کر لی گئی تھی۔ صرف اندالیال اور اونتوکول کے لوگوں نے غمری کے رہنے والوں سے نفرت کی بناء پر اسے تسلیم

نہیں کیا تھا۔ تخچینیا میں ان کے نائب تاشوف حاجی نے اس تمام علاقے میں تحریک کی بالادستی کو تسلیم کروالیا تھا۔ سلاتو اور رادخ کے قصبوں نے کھلے بندوں امامؒ کی اطاعت تسلیم کر لی تھی اور سوائے ان علاقوں کے جو رُوسی سرحد سے ملحق تھے تمام علاقے امامؒ کے زیرِ نگیں آ چکے تھے۔ رُوسی سرحد سے ملحقہ علاقے بھی سازگار وقت کے انتظار میں تھے۔ جنوبی داغستان میں بالائی سمور کے علاقے رُوس سے کھلم کھلا باغی ہو چکے تھے۔

بیرن روزن کی جگہ جنرل گولودن نیا کمانڈر انچیف بن چکا تھا۔ اس کے منصوبے میں شہنشاہ نکولائی نے ترمیمات کی تھیں اور وہ منصوبہ اَب کچھ اس طرح تھا:

1) بحیرہ اسود کے ساحل پر اُترا جائے۔

2) بالائی سمور کے علاقے کو زیر کیا جائے۔

3) تخچینیا اور شمالی داغستان کو فتح کیا جائے۔ ہر ایک حصے کے لیے الگ الگ فوج روانہ کی جائے اور اس طرح یہ منصوبہ مکمل کیا جائے۔

آیئے تخچینیا اور شمالی داغستان کے بارے میں منصوبے کا جائزہ لیں۔ اس علاقے کے لیے جو فوج منظم کی گئی اس کی کمانڈ جنرل کاؤنٹ گریب کے سپرد تھی۔ اس کا مقصد امام شاملؒ کے قلعے اخالگو کی تسخیر اور امامؒ کے اقتدار کا مکمل خاتمہ تھا۔ مشرقی حصے اور شمالی داغستان کی تمام فوجی قوت کاؤنٹ گریب کے سپرد کر دی گئی۔ اس فوج کی تعداد 9000 تھی جن میں سے 2000 فوجی ونز پایا اور 3000 تیمر خان شورا میں تھے۔ ارادہ یہ تھا کہ پہلے داغستان میں امام شاملؒ کے خلاف تمام تر قوت سے حملہ کیا جائے اور بعد میں موسم سرما میں تخچینیا کا رُخ کیا جائے لیکن مجاہدین کی کامیاب جنگی منصوبہ بندی کی وجہ سے روسی کمانڈر اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کے قابل نہ رہا۔

1843ء کے موسمِ سرما تک امامؒ نے فیصلہ کُن فوج کشی کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ انہوں نے ایک مستقل فوج کے مرکز کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔ اس علاقے کی مخصوص صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے شاید اس سے بہتر فوجی تنظیم کا ڈھانچہ تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ امامؒ نے مسلح سواروں کے ایسے دستے تیار کیے تھے جن کا نام مرتھسک تھا۔ ہر دس گھروں سے ایک دستے کا انتخاب کیا جاتا تھا جس کا یہ فرض ہوتا کہ وقت پڑنے پر اشارہ ملتے ہی تیار ہو کر پہنچ جائے۔ اس فوجی خدمت کے بدلے میں ان لوگوں کے گھوڑوں کا دانہ پانی، ان کی فصلوں کی کٹائی، زمین کی تیاری اور دوسرے

گھریلو کام دیگر گھرانوں کے سپرد ہوتے۔ یہ درحقیقت ان کی فوجی خدمت کا معاوضہ تھا۔ ان لوگوں کے فرائض اوران کو دی گئی مراعات ان کے ذوقِ جہاد کے عین مطابق تھے۔

مرتھک سواروں کو دس، سو اور پانچ سو کے مختلف گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر گروپ کی قیادت اس گروپ کی اہمیت اور تعداد کے مطابق ایسے افسر کے سپرد کی جاتی جو اس کا اہل ہوتا۔ سپاہیوں کو زرد اور افسروں کو سیاہ رنگ کے چوغے دیے جاتے تھے۔ ایک سو اور پانچ سو کے گروپوں کے افسر اپنی وردیوں پر تمغے بھی لگاتے تھے۔ پانچ سو کے گروپ کا افسر عام طور پر نائب ہوتا۔ یہ نائبین دیگر مریدوں میں خاصی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان تمام لڑائیوں میں جو امام شاملؒ اور روسیوں کے درمیان ہوئیں، کوئی نائب روسیوں کے ہاتھوں گرفتار نہیں ہو سکا۔ ایک معرکے میں کسی رُوسی افسر کو نائب کے گرفتار کرنے پر جرأت کا تمغہ دیا گیا تھا لیکن بعد میں مزید تحقیق پر یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ ان نائبین کی قیادت کا نتیجہ تھا کہ دور دراز علاقوں کے عوام تحریکِ مریدیت کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔

نمایاں کارکردگی کے لیے دوسرے نشانات اور تمغے بھی عطا کیے جاتے تھے۔ آخوردی ماہوما کے پاس، جو نائب اول تھے، ایک تلوار تھی، جس پر یہ عبارت تحریر تھی:

''تیز ترین تلوار، بہادر ترین انسان''

مرتھک سواروں کو بوقتِ ضرورت ہر گھر سے ایک ایک فرد مزید دے دیا جاتا۔ یہ لوگ عارضی عہدے داروں کے زیرِ کمان ہوتے اور ان کی تنظیم بھی پہلے کی طرح ہی ہوتی۔ اِسی طرح شدید ہنگامی صورتِ حال میں بستیوں اور علاقوں کے تمام ہتھیار اُٹھانے کے قابل افراد کو بلا لیا جاتا تھا۔ فدائین کے گروہ کو ہر ماہ دو بوری آٹا دیا جاتا اور وہ لوگ جو جنگ میں کسی طرح کی بزدلی یا کم ہمتی کے مرتکب ہوئے ہوں، کسی طرح موت سے بچ نکلتے تو ان کی پُشت پر تانبا داغ دیا جاتا تھا تاکہ لوگ ان بزدلوں کو پہچان لیں۔ امامؒ شریعت کے احکامات کے معاملے میں خاصے سخت واقع ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ کی طرح ان کے ہاتھ میں کوڑا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں کی جاہلانہ رسوم کو قوانین کی سختی سے پابندی کروائے بغیر نہیں مٹایا جا سکتا تھا۔ امامؒ کی یہ پالیسی خاصی کامیاب رہی اور لوگوں کی بگڑی ہوئی عادات کچھ ہی عرصے میں رُوبہ اصلاح ہو گئیں۔

رُوسی افواج کی حالت ان علاقوں میں خاصی خراب تھی۔ قلعے بنانے، بیرکیں تعمیر

کرنے، ایندھن کاٹ کر لانے اور چارہ مہیا کرنے کا کام ان کی دوسری عام فوجی ذمہ داریوں کے علاوہ ہوتا۔ پھر یہی نہیں، خراب موسم میں انہیں ناقص خوراک ملتی اور رسد کی کمی کے اثرات بھی ان کو برداشت کرنے پڑتے۔ اپنے گھروں سے دُور، دشمن کے رحم و کرم پر پڑے ہوئے ان سپاہیوں کی زندگی اس قدر تلخ تھی کہ بھگوڑے سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا۔ ان تمام مہمات میں جو داغستان اور تختینیا کے علاقوں میں جاری رہیں، ہمیں جگہ جگہ بھگوڑوں کا ذکر ملتا ہے۔ اِسی صُورت حال کا نتیجہ تھا کہ ایک مؤرخ کے بقول ہمزاد بیگ کا حفاظتی دستہ انہی روسی بھگوڑوں پر مشتمل تھا۔

امامؒ ایک کامیاب فوجی لیڈر کی طرح دشمن کی تمام کمزوریوں کا علم رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کی کمزوریوں کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کو تہس نہس کر دیا۔ رُوسی افواج داغستان میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ غیر محفوظ اور دفاعی اعتبار سے کمزور قلعوں میں منقسم یہ افواج داغستان میں ایک دوسرے سے فاصلوں پر ہونے کی وجہ سے امامؒ کے گوریلا دستوں کا بڑی آسانی سے نشانہ بن سکتی تھیں اور انہوں نے دشمن کی اس کمزوری کو بھانپ لیا تھا۔

انہوں نے اپنی تمام فوجی مہموں کی منصوبہ بندی اور ان کے بارے میں مکمل اطلاعات اس ہنر مندی سے اکٹھی کی تھیں کہ موجودہ دور میں شاید کئی سٹاف افسروں کی مدد سے کوئی چیف آف سٹاف بھی اتنی اچھی منصوبہ بندی نہیں کر سکتا۔ امام شاملؒ کے مقابلے میں رُوسی سٹاف افسروں کی ایک بڑی تعداد کمانڈر انچیف اور چیف آف سٹاف کی قیادت میں جنگی سکیموں کو مرتب کرنے کا کام انجام دے رہی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے باضابطہ طور پر جنگی امور کی تربیت لی تھی۔ جنہوں نے کتنی ہی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سے کتنے ہی ایسے تھے جن کے سینوں پر تمغوں کی کئی کئی قطاریں آویزاں تھیں اور جو بے شمار ساز و سامان، توپ خانہ، رسالہ اور پیادہ فوج کی مدد سے داغستان کے قلعے سے نصف صدی سے اپنا سر پھوڑ رہے تھے۔

اور دوسری طرف داغستان کے مجاہدین تھے جن کے پاس نہ توپ خانہ تھا اور نہ بہتر قسم کا دوسرا اسلحہ، جن کے پاس نہ ساز و سامان کی کثرت تھی اور نہ گولہ بارود کی۔ وہ فوجی اکیڈمیوں کے تربیت یافتہ نہ تھے۔ انہوں نے آپریشن روم میں بیٹھ کر جنگی نقشوں کی مدد سے لڑائیوں کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ نہ انہیں زارِ رُوس کی فوجوں میں رہ کر جنگوں کا وسیع تجربہ تھا۔ اس کے باوجود

انہوں نے زار کی فوجوں کا ایک طویل عرصے تک ناطقہ بند کیے رکھا۔ رُوس کی تمام تر توقعات ان پہاڑوں کے ساتھ سر ٹکراتی رہیں لیکن اسے لاشوں اور زخمیوں کے انبار کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

امام شاملؒ کے گھریلو نوکروں میں مسلمان اور عیسائی دونوں تھے۔ مؤخرالذکر جنگی قیدی تھے اور امامؒ نے مسلمانوں کو از خود آزادی دے دی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ امامؒ کے اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے ان کی خدمت میں بدستور مصروف رہے۔ امامؒ کے دوست جمال الدین کے بیٹے عبدالرحمٰن نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''وہ عام آدمیوں پر بے حد مہربان تھے۔ نوکروں، فقیروں اور حتیٰ کہ قیدیوں تک کے معاملے میں انتہائی نرم دل واقع ہوئے تھے۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ غریبوں کے دل سے نزدیک ہے اور غریبوں کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ جب بھی وہ کسی مہم پر نکلتے، غریبوں کو اکٹھا کر کے انہیں کپڑے دیتے، ان کی روپے پیسے سے مدد کرتے اور ان سے فتح کی دعا کے لیے کہتے۔''

شامل (پیدائش 1799ء، وفات 1871ء) نے مقامی جاگیرداروں اور روسی شہنشاہیت کی نوآبادیاتی پالیسی کے خلاف مریدیت کے جھنڈے تلے مسلح جدوجہد کی۔

امامؒ 1869ء تک کلوگا میں رہے اور بعد میں انہیں ان کی خواہش کے مطابق خیوا منتقل کر دیا گیا۔ یہاں سے انہیں حج پر جانے کی اجازت مل گئی۔ بالآخر 4 فروری 1871ء کو مدینہ منورہ میں انتقال ہو گیا۔

❀............❀............❀

امیر تیمور

اکثر لوگوں نے امیر تیمور کے خاندان کا سلسلہ مغلوں سے جاملایا ہے لیکن یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ شخص اصل میں ترکوں کے برلاس قبیلہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو گورگان کے نام سے مشہور ہے۔ تیمور کا باپ اپنے قبیلہ کا سردار تھا۔ تیمور 634 ہجری میں پیدا ہوا۔ اُسے بچپن سے سپاہیانہ کرتبوں اور مردانہ کھیلوں میں شریک ہونے کا بڑا شوق تھا۔ ان سے جو وقت ملتا وہ لکھنے پڑھنے یا شطرنج کھیلنے میں گزار دیتا تھا۔

تیمور نے جب ہوش سنبھالا تو مغلوں کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی اور ترکستان، ماوراء النہر اور خراسان میں کئی ترک اور مغل سرداروں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ تیمور اس زمانے کے ایک طاقتور سردار امیر قرغن کے ہاں ملازم ہو گیا۔ امیر قرغن اس کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ یعنی اسے ایک ہزار سپاہیوں کا افسر مقرر کر کے اپنی پوتی ترکان خاتون اس سے بیاہ دی۔ تیمور کی اقبال مندی کا زمانہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد وہ ترقی کے میدان میں برابر بڑھتا چلا گیا۔

امیر قرغن کے بعد اس کا پوتا امیر حسین ماورء النہر کا سردار مقرر ہوا۔ پہلے تو مدت تک تیمور امیر حسین کی حمایت میں اس طرف کے دوسرے سرداروں سے لڑتا بھڑتا رہا لیکن آخر ان دونوں میں اَن بَن ہو گئی۔ امیر حسین شکست کھا کر مارا گیا۔ اور تیمور ماوراء النہر کا بادشاہ مقرر ہوا۔ حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی اس نے ملک کے انتظام کی طرف توجہ دی اور سلطنت کے جو دستور اور قاعدے چنگیز خاں مقرر کر گیا تھا انہوں نے پھر رواج پایا۔ اس حکومت کا پایہ تخت سمرقند مقرر ہوا تھا۔ اس لیے اس شہر نے جو مغلوں کے حملہ کے زمانہ میں بالکل اجڑ گیا تھا۔ بہت

ترقی کی۔

اِدھر سے فارغ ہو کر تیمور نے خوارزم کو فتح کیا۔ لیکن جیحوں اور سیحوں کے میدانوں میں اس بلند ہمت شخص کے حوصلے کیا نکلتے؟ آخر فتح مندی کے شوق نے جو برسوں سے اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا اسے ان میدانوں نے نکالا۔ پہلے شمال کی طرف بڑھا۔ اور چنگیزی مغلوں کو شکست دے کران کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر خراسان کا رُخ کیا اور یہاں کے گردن کشوں کو دباتا اور بادشاہوں کے تخت الٹتا افغانستان، سیستان اور بلوچستان پر قبضہ کر کے فارس کی طرف بڑھا۔ اس زمانے میں عراق اور آذربائیجان میں ایک مغل خاندان کی حکومت تھی۔ فارس میں مظفری خاندان کا اقتدار تھا۔ تیمور نے انہیں بھی شکست دی۔ پھر دجلہ سے اتر کر بغداد پر جا چڑھا اور اسے فتح کر کے دیار بکر، گرجستان اور آرمینیا کو تہ و بالا کرتا روس کی طرف بڑھا اور ماسکو کو فتح کر کے لوٹا۔

اگرچہ اب تیمور کی عمر 63 سال کی تھی اور سارے ایشیا میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کے حوصلے پوری طرح نہیں نکلے تھے اور اس کی آرزو تھی کہ روم اور ہندوستان کو فتح کر کے انہیں اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لے۔ چنانچہ پہلے اس نے ہندوستان کا رُخ کیا اور کوہ ہندوکش سے اتر کر سارے شمالی ہندوستان کو زیروزبر کر ڈالا۔

ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے بعد کئی اتار چڑھاؤ ہو چکے تھے۔ پہلے غوریوں نے شمالی ہندوستان کو فتح کر کے اپنے ملک میں شامل کیا۔ ان کے مٹنے کے بعد ایک ترک قطب الدین ایبک نے خاندان غلاماں کی بنیاد ڈالی۔ کچھ عرصہ کے بعد خلجی اس ملک کے حکمران ہوئے اور اس خاندان کے دوسرے بادشاہ علاؤالدین خلجی نے بندھیاچل سے اتر کر جنوبی ہند کو فتح کر لیا۔ خلجی بھی جلد مٹ گئے اور تغلق ان کے جانشین ہوئے۔ تیمور کے حملہ کے وقت اس خاندان کی حکومت بہت کمزور ہو گئی تھی اور دلی کے تخت پر محمود تغلق متمکن تھا۔ تیمور نے اس موقع پر بڑے ظلم کیے اٹک سے اترا تو اس کے ساتھ کوئی ایک لاکھ قیدی تھے۔ تیمور نے ان سب کو قتل کروا ڈالا اور پھر یلغار کرتا ہوا دلی کی طرف بڑھا۔ محمود تغلق تو بھاگ گیا۔ لیکن دلی خوب لٹی اور تیموری ترکوں اور مغلوں نے خون کی ندیاں بہا دیں۔

تیمور نے ہندوستان کو خوب لوٹا کھسوٹا اور بے شمار دولت لے کر واپس لوٹا۔ اب اس کی توجہ ایشیائے کوچک کی عثمانی حکومت کی طرف ہوئی۔ اس زمانے میں عثمانی ترک بڑے عروج پر

تھے اور ان کا سلطان بایزید یلدرم بڑے دبدبہ کا فرمانروا تھا۔ کئی چھوٹے چھوٹے معرکوں کے بعد انگورہ کے میدان میں عثمانی اور ترک تیموری آمنے سامنے ہوئے، عثمانیوں نے شکست کھائی۔ سلطان بایزید گرفتار ہو کر قید ہوا۔ اور قید کی حالت میں ہی وفات پائی۔ تیمور نے یہاں سے آگے بڑھ کر سمرنا تک سارا علاقہ فتح کر لیا۔ شاید اب وہ یورپ کی طرف رُخ کرتا۔ لیکن بیچ میں سمندر حائل تھا۔ اس لیے وہ پلٹ کر سمرقند چلا آیا اور دو سال کے بعد 807 ہجری میں وفات پائی۔

تیمور میانہ قد اور وجیہ شخص تھا۔ چوڑا چکلہ سینہ، مضبوط جسم، آنکھیں روشن۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ جنگ کے شور وغل میں بھی سنائی دے جاتی تھی۔ جوانی کے معرکوں میں اس کی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ لنگڑا کے چلتا تھا۔

تیمور دنیا کے بڑے بڑے فتح مند بادشاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے بھی انسانوں کا خون خوب بہایا لیکن وہ خونریزی میں چنگیز اور ہلاکو کو نہیں پہنچتا۔ سمرقند سے اسے بہت محبت تھی۔ چنانچہ اس نے اس شہر کو بہت ترقی دی اور اس میں کئی عمارتیں بنوائیں جن میں دو محل باغ بہشت اور باغ دلکشا بہت مشہور تھے۔ باغ بہشت تبریز کے سنگِ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ باغ چناراں ایک اور محل تھا جو چنار کے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ تیمور اپنے ساتھ دمشق، حلب، انگورہ اور گرجستان سے بہت سے کاریگر بھی لے آیا تھا جن کی وجہ سے سمرقند صنعت و حرفت کا مرکز بن گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے حالات ایک کتاب میں لکھے ہیں۔ جو تزک تیموری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

❁............❁............❁
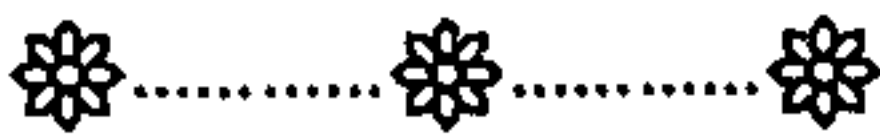
52

غازی انور پاشا (فاتح طرابلس)

انور پاشا 1882ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوئے۔ والد کا نام غازی احمد پاشا تھا۔ انور پاشا کو بچپن ہی سے ایسے کھیلوں سے دلچسپی تھی جن سے دلیری اور جرأت دکھانے کا موقع ملے۔ ان کی شروع ہی سے یہ آرزو تھی کہ وہ سپاہی بنیں۔ چنانچہ جب وہ بڑے ہوئے تو ترکی کے مشہور فوجی کالج میں داخل ہو گئے اور تھوڑی ہی مدت میں اپنی ذہانت سے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی۔ انہوں نے عربی، فارسی، فرانسیسی، انگریزی، جرمنی اور روسی زبانیں سیکھیں۔ حربی کالج سے نکلنے کے بعد وہ فوج میں داخل ہو گئے۔ اور ترقی کر کے نائب کے درجہ تک پہنچ گئے۔ بہت دنوں تک کئی نامور اور تجربہ کار ترک افسروں کے ایڈی کانگ رہے اور اس طرح ان کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ 1913ء میں انہیں پاشا کا معزز خطاب ملا اور وہ ترکی کے وزیرِ جنگ مقرر ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر اکتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔

اس زمانہ میں ترکی پر سلطان عبدالحمید کی حکومت تھی۔ یہ بڑا عیش پرست بادشاہ تھا۔ رعایا کا بڑا حصہ اس کی حکومت سے بیزار تھا۔ ترک کسانوں کو بڑے بڑے ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے۔ یہ غریب سال بھر کی محنت اور کفایت شعاری سے جو سرمایہ جمع کرتے اس کا بڑا حصہ ٹیکس جمع کرنے والے لے جاتے۔ یوں تو پولیس کا محکمہ بھی تھا اور عدل و انصاف کا بھی۔ لیکن لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ فوج کی حالت بھی ابتر تھی۔ فوجوں کو پورا راشن نہ ملتا تھا۔ غرض ملک کے ہر حصے میں بیزاری پھیلی ہوئی تھی، اور عوام سلطان کے خلاف ہو رہے تھے۔

ملک کی یہ حالت دیکھ کر چند دلیر ترکوں نے ایک انجمن قائم کی۔ جس کا نام "انجمن اتحاد و ترقی" رکھا۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید ملک میں دستوری حکومت کو رائج کرے۔

تا کہ دوسرے ملکوں کی طرح ترکی بھی شخصی ظلم سے نجات حاصل کرے۔ لوگوں کو بھی حکومت میں حق ملے اور ان کی آواز بھی سُنی جائے۔ اس انجمن نے بہت جلد ملک میں مقبولیت حاصل کر لی اور ہزاروں لوگ اس میں شامل ہو گئے۔

اس انجمن کا رکن ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جب کوئی شخص اس کا رکن بننا چاہتا اسے یہ قسم کھانی پڑتی کہ وہ خدا اور حضرت محمد ﷺ کی قسم کھاتا ہے کہ جب تک اس کے خون کا ایک قطرہ بھی باقی رہے گا، وہ قوم، آزادی اور صداقت کے لیے جنگ کرتا رہے گا۔

1905ء میں انور پاشا صوبہ مقدونیہ کے انسپکٹر جنرل علمی پاشا کے ایڈی کانگ تھے۔ انہوں نے بھی ملک وقوم کی خاطر اپنی وردی اتار پھینکی اور اس انجمن میں شامل ہو گئے۔ ان کی شمولیت سے انجمن میں ایک نئی رُوح پیدا ہو گئی۔ سلطان عبدالحمید کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا گیا اور بغاوت کے شعلے نہایت سرعت کے ساتھ سارے ملک میں پھیلنے لگے۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس تحریک کو دبا دیا جائے، مگر اسے ناکامی ہوئی۔ انور پاشا نے اس وقت ہردلعزیزی حاصل کر لی تھی اور لوگ ان پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار تھے۔

سلطان عبدالحمید نے کوشش کی کہ انور پاشا کو لالچ وخوشامد سے راضی کیا جائے۔ چنانچہ انہیں قصر یلدیز میں آنے کی دعوت دی گئی۔ جہاں سلطان رہتا تھا۔ ان سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں جنرل بنا دیا جائے گا۔ انور پاشا سلطان عبدالحمید کی چالوں سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ قسطنطیہ جانے کے معنی یہ ہیں کہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، کیونکہ بہت سے محبانِ وطن ترقی اور انعام کے وعدوں پر اس سے پہلے بھی قصرِ یلدیز میں بلائے گئے تھے، مگر پھر دنیا کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیسے اور کہاں غائب ہو گئے۔

انجمنِ اتحاد وترقی اب کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ فوج کے ایک بڑے حصے نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ آخر سلطان کو بھی جھکنا پڑا اور اس نے دستوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ انور پاشا کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

1910ء میں اٹلی نے بغیر کسی وجہ کے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ طرابلس ترکوں کے ماتحت تھا۔ اٹلی نے طرابلس کے شہروں پر گولہ باری شروع کر دی اور ترکوں کی بحری فوج کو کئی مقامات پر شکست دی۔ اس شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے عہدِ حکومت میں بحری فوج کی

طرف کوئی توجہ نہ کی تھی۔

طرابلس میں ترکی کی فوج کی تعداد بیس ہزار تھی اور چونکہ سمندر پر اٹلی کے جہازوں کا قبضہ تھا۔ اس لیے جنگ شروع ہو جانے کے بعد بحری راستے سے فوجی مدد بھی نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ خشکی کا راستہ مصر میں سے گزرتا تھا۔ جہاں مصر پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ انہوں نے غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس لیے اس راہ سے بھی ترکی کی فوجیں طرابلس نہ جا سکتی تھیں اس معاملے پر غور کرنے کے لیے انجمن اتحاد و ترقی کا ایک جلسہ ہوا اور اس میں یہ طے پایا کہ بہت سے ترک افسر طرابلس بھیجے جائیں، جو وہاں کے عربوں کو جنگی قواعد سکھائیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ترک اپنی وردیوں اور لباس میں رہ کر وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ لہٰذا قرار پایا کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے بھیس بدل کر طرابلس پہنچیں۔

انور پاشا وہاں جانے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ بھیس بدل کر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر انگریز افسروں کی آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے مصر کے راستے طرابلس پہنچ گئے۔ انہوں نے طرابلس میں قدم رکھتے ہی سب قبیلوں کو دعوتِ جہاد دی تو چند ہی دنوں میں ہر طرف سے مجاہد نیزے تانے اُن کے پاس آنے لگے۔ اب انور پاشا تن تنہا دشمن کے لشکر کے سامنے دلیرانہ آ کر کھڑے ہو گئے۔ تمام عرب قبائل انور پاشا کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ اُن میں آپس میں بڑی مدت سے اختلافات اور دشمنی چلی آتی تھی مگر انور پاشا نے انہیں مؤثر اور دل نشین طریقے سے سمجھایا کہ وہ سب اسلام کے رشتے میں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پھر یہ دشمنی اور اختلاف کیا؟ لہٰذا سب عرب قبائل متحد و متفق ہو گئے۔ انور پاشا نے اُنہیں فوجی قواعد کے تحت لانے کا کام شروع کیا۔ تمام قبیلوں کو مختلف پلٹونوں میں تبدیل کر دیا اور ہر پلٹون کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک افسر مقرر کر کے ان کو دن رات قواعد کی مشق کرانا شروع کر دی۔

اِسی دوران میں اٹلی کی فوجوں نے جرأت کر کے ایک دو قدم آگے بڑھائے اور عربوں پر بم برسانے لگے تو ایک دن عربوں کے ایک قبیلے نے ہلہ بول دیا اور اپنی خوں آشام تلواروں سے اٹلی کے سینکڑوں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اِسی طرح کچھ دنوں کے بعد چند عربوں نے اٹلی کے ایک کیمپ پر حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری پلٹن تباہ کر دی۔ انہیں اس حملے میں بہت سا مالِ غنیمت ملا۔ اس میں اور چیزوں کے علاوہ آٹھ سو بندوقیں بھی تھیں۔ انور پاشا بہت

خوش ہوئے اب اٹلی کی فوجوں پر حملہ کرنا بچوں کا کھیل بن کر رہ گیا تھا۔ چند سو عرب اٹھتے اور اٹلی کی پوری پلٹن کا صفایا کر دیتے۔ اٹلی کا بے حد نقصان ہوا اور وہ وحشت و بربریت پر اتر آیا۔ اسے امید تھی کہ ترک صلح کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ دشمن کو مکمل شکست دینے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن اس اثنا میں بلقان کی ریاستوں نے ٹرکی پر حملہ کر دیا اور اسے مجبوراً اٹلی سے صلح کرنی پڑی۔ طرابلس میں انور پاشا نے جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ان پر اس وقت کی ساری دنیا حیران تھی۔

جب انور پاشا طرابلس سے قسطنطنیہ پہنچے تو جنگ بلقان شروع ہو چکی تھی۔ اُس وقت جنگ کی یہ حالت تھی کہ ترکی کے پرانے دشمنوں بلغاریہ اور یونان نے اورنہ (ایڈریا نوپل) کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ان کی فوجیں شتلجہ کے سامنے پڑی تھیں۔ جو قسطنطنیہ سے صرف پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دوسری طرف سرویوں اور یونانیوں نے بعض اہم مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت جنگ عارضی طور پر ملتوی تھی اور ٹرکی اور دوسری قوموں کے نمائندے لندن میں صلح کی بات چیت کر رہے تھے۔ اس وقت ٹرکی حکومت کا وزیر اعظم کامل پاشا تھا۔ جو اس بات پر آمادہ تھے کہ اورنہ سے دستبردار ہو جائیں اور ادرنہ سے دستبرداری کا مطلب قسطنطنیہ سے دستبرداری تھی۔ مگر عین وقت پر وزیر اعظم کامل پاشا کی وزارت بدل گئی اور جو نئی وزارت قائم ہوئی اُس نے ادرنہ سے دست بردار ہونے سے صاف انکار کر دیا اور اس کے ساتھ ہی صلح کانفرنس بھی برخاست ہو گئی۔ یہ غیبی ہاتھ اسی مجاہد اور غازی انور پاشا کا تھا۔ جس نے ملک کو سلطان عبدالحمید کے ظلم سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کرائی تھی۔

انور پاشا طرابلس سے قسطنطنیہ پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک دن چند جاں فروشوں کو لے کر اچانک وزیر اعظم کے دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر کئی افسروں اور لوگوں کے دستخط تھے۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ وزارت تبدیل کر دو۔ یا صلح سے انکار کر دو۔ فوج کا جو حصہ وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھا اسے پہلے ہی کسی بہانے سے قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ جس قدر فوج شہر میں تھی وہ انور پاشا کے ساتھ تھی۔ وزیر اعظم ان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور پاشا اندر داخل ہوئے۔ ناظم پاشا وزیر جنگ کے ایڈی کانگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی اور پستول چلایا۔ یکا یک دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا گر کر

وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ ایک سپاہی نے اس کی طرف بندوق کی نالی بھی کر دی، لیکن اُس بہادر نے ذرا بھی پروانہ کی اور فوراً قدم بڑھا کر اس کمرے کے اندر پہنچ گئے جہاں وزیراعظم اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے موجود تھا انور پاشا نے تند لہجے میں کہا:

''مَیں حکم دیتا ہوں کہ جنگ جاری رکھنے کی قسم کھاؤ یا اس کرسی سے الگ ہو جاؤ۔ یاد رکھو! تمہاری عذر جوئی سے یہاں خون خرابہ ہو جائے گا۔''

وزیراعظم مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔ وہ بولا: ''مَیں جنگ جاری رکھنے کے خلاف ہوں۔'' اور یہ کہہ کر استعفیٰ لکھ کر دے دیا۔ انور پاشا نے استعفیٰ جیب میں ڈال کر کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی اور دوسرے وزیروں سے کہا:

''جب تک نئی وزارت قائم نہ ہو جائے آپ لوگ اپنے آپ کو نظر بند سمجھیں۔''

اس کام سے فارغ ہو کر انور پاشا نے فوج کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور انہوں نے چند ہی روز میں اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ لندن میں جو صلح کانفرنس ہو رہی تھی وہ بے اثر ثابت ہوئی اور فروری 1913ء کو پھر جنگ شروع ہو گئی اور اب کے نتیجہ ترکوں کے حق میں اچھا نکلا۔ 15 جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے اور پانچ دن کے بعد ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اور کئی مقامات بھی دوبارہ فتح کیے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد صلح ہو گئی اور ترکی کو ایک بڑے علاقہ سے دست بردار ہونا پڑا۔

فوج کی حالت اگرچہ بہت کچھ درست ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی اس کی طرف توجہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انور پاشا وزیر جنگ مقرر کر دیئے گئے۔ انہوں نے فوج میں اصلاحات کے احکام نافذ کیے۔ مختلف فوجی چھاؤنیوں کا معائنہ کیا اور اپنی تمام کوشش صرف اس بات پر صرف کرنے لگے کہ ملک اور قوم کو اسی عروج پر پہنچائیں جو اسے کسی زمانے میں حاصل تھا۔

بلقان کی جنگ ختم ہوئے ابھی ایک سال ہوا تھا کہ یورپ میں ایک نئی اور مہیب پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ ترکی کسی جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار نہ تھا مگر حالات کچھ ایسے پیش آ گئے کہ انہیں اس جنگ میں مجبوراً شامل ہونا پڑا۔ اس جنگ میں ایک طرف برطانیہ، فرانس اور روس تھے اور دوسری طرف جرمنی اور آسٹریلیا۔ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ چار سال کی خونریز جنگ کے بعد انگریزوں اور اُس کے اتحادیوں کو فتح ہوئی اور جرمنی اور اس کے ساتھیوں کو شکست۔ ترکی کو اس

جنگ میں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔اس کے بہت سے علاقے اس سے چھن گئے۔ان حالات کو دیکھ کر انور پاشا اکتوبر 1919ء میں وزیرِ جنگ کے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور ٹرکی سے نکل گئے۔

آپ ٹرکی سے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے سمرقند پہنچے۔ وہاں کے شہریوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ترکستان میں اُس وقت ایک نئی جمہوریت قائم ہوئی تھی۔اُس کے صدر نے آپ کو ایک معزز عہدے پر مقرر کر کے فوج کی تنظیم آپ کے سپرد کر دی۔ یہاں آپ نے یہ کوشش کی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کیا جائے۔

اس وقت روس میں ایسے لوگوں کی حکومت تھی جنہیں بالشویک کہا جاتا ہے انہیں انور پاشا اور اُن کی تحریک سے سخت خطرہ تھا۔چنانچہ بالشویک حکومت نے اُن کے خلاف ایک فوج بھیج دی۔ یہ فوج اچانک اُن کے سر پر آ پہنچی۔ اگرچہ ان کے ساتھ بہت تھوڑی فوج تھی مگر آپ نے دشمن پر حملہ کر دیا اور نہایت دلیری اور بہادری سے لڑے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

انور پاشا کی دلیری وشجاعت کا دوست دشمن سب اعتراف کرتے ہیں۔ان کے عظیم الشان کارنامے ٹرکی کی تاریخ میں زندہ جاوید ہیں۔انہوں نے ملک وملت کے لیے جو کام کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔اُن کی جنگی قابلیت کو ایک دنیا مانتی ہے۔وہ ایک بے مثال جرنیل تھے۔وہ بڑے متحمل مزاج اور بردبار تھے۔وہ اتنے شیریں زباں تھے کہ ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔وہ دل میں جو ٹھان لیتے تھے، کر گزرتے تھے۔ وہ اپنی ہمہ گیر شخصیت کی وجہ سے نہ صرف ترکی بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے محبوب تھے۔اس زمانے کے متحدہ ہند کے مسلمان تو ان پر جان چھڑکتے تھے۔بچے گلیوں میں ان کی تعریف میں شعر پڑھتے تھے:

"انور پاشا وے! تیریاں دُور بلاواں۔"

یہ پنجابی نظم اس زمانے میں بے حد مقبول تھی۔

❋............❋............❋

53

اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب ارادے کا پکا، شریعت کا پابند اور زاہدانہ زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ شجاعت اور اولوالعزمی اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ عدل و انصاف میں لاثانی تھا۔ سورت کے انگریزی سوداگر اسے عدل وانصاف کا سمندر کہتے تھے۔ اس کا سلوک اپنے بیٹوں، افسروں اور عام لوگوں سے یکساں تھا۔ خود عالم تھا اور عالموں وقاضیوں کی رہنمائی کے لیے اس نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کی جو اس وقت تمام اسلامی ممالک میں فقہ کی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اکبر نے غیر مسلموں کو انتظام سلطنت میں مساویانہ درجہ دے کر ایک مثبت قدم اٹھایا تھا۔ اس کے اس طرزِ عمل سے سلطنت مغلیہ کی سیاسی حیثیت بہت بلند ہو گئی تھی۔ مسلمانوں میں غیر مسلموں سے تعاون کرنے کے سلسلے میں دو متضاد نظریئے قائم ہو گئے تھے۔ ایک فریق کی رائے یہ تھی کہ امور سلطنت میں غیر مسلموں سے اتحاد کر کے ان کی حمایت حاصل کی جائے۔ مگر باہمی مفاہمت کا جذبہ بھی ہندوؤں کے دلوں میں اصلی اور مخلصانہ وفاداری کا احساس پیدا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ مسلمانوں کو ملیچھ اور اجنبی سمجھتے تھے۔ اگر داراشکوہ کو حصولِ تخت میں کامیابی ہو جاتی تو مسلمانوں کے لیے تباہ کن صورتِ حال پیدا ہو جاتی اور نتائج بدرجہا مہلک اور بدتر ہوتے۔ ان حالات میں عالمگیر نے مسلمانوں کو متحد کر کے ریاست کی نوعیت کو بدلنے کی کوشش کی تاکہ ایک مرتبہ پھر ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم ہو اور مسلمانوں کو اسلامی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع میسر ہوں۔ باہمی مفاہمت و مصالحت کے آسان ترین راستہ کو اختیار کرنے سے بھی سلطنت کا اسلامی طرز اختیار کرنا محال تھا۔ لہٰذا عالمگیر نے ضمیر کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے اسلامی میراث کے بچاؤ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

تخت نشین ہوتے ہی اورنگ زیب نے جھروکہ سے ''درشن'' دینے کی رسم کو بند کر دیا۔ تقریباً اسی قسم کے ٹیکس معاف کر دیئے۔ یاتریوں اور تیوہاروں کے ٹیکس اڑا دیئے۔ ہر قسم کے ناچ اور گانے بند کر دیئے۔ بھانڈوں اور شاعروں کی تنخواہیں بند کر کے طالبِ علموں اور عالموں کے وظائف مقرر کر دیئے۔

شجاع کو شکست دینے کے صلے میں عالمگیر نے میر جملہ کو حاکم بنگال مقرر کیا۔ میر جملہ نے آسام پر حملہ کیا اور ایک کثیر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ مگر برسات کے شروع ہونے پر اُسے پیچھے ہٹنا پڑا اور شاہی فوجوں کی نقل و حرکت ختم ہو گئی۔ میر جملہ نے 1662ء میں وفات پائی۔ میر جملہ کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اپنے ماموں شائستہ خان کو حاکم بنگال مقرر کیا۔ شائستہ خان نے اپنی تیس سالہ گورنری کے دوران پرتگیز ڈاکوؤں کا انسداد کیا اور ارکان اور چاٹ گاؤں کے علاقے سلطنت مغلیہ میں شامل کیے۔

میوات میں ست نامیوں کا ایک فرقہ تھا جس کے اکثر لوگ کاشت کار تھے۔ ایک سرکاری ملازم نے ایک ست نامی برہمن کو عدول حکمی کے سلسلہ میں سزا دی۔ اس پر سارا فرقہ مشتعل ہو گیا۔ ابتداء میں ست نامیوں نے ایک شاہی دستے کو شکست بھی دی۔ جب ان کی باغیانہ سرگرمیاں تیز ہو گئیں تو مغلیہ فوجوں نے ست نامیوں کو شکست دے کر انہیں کچل دیا۔

راجہ جسونت سنگھ نے تخت نشینی کی جنگ میں دارا کا ساتھ دیا تھا مگر بعد میں معافی مانگ کر اورنگ زیب کی ملازمت میں شامل ہو گیا۔ اسے اورنگ زیب نے کابل کا گورنر مقرر کر دیا۔ 1678ء میں راجہ جسونت سنگھ اور اس کی رانیاں اور بچے بادشاہ کی اجازت لیے بغیر کابل سے چل پڑے۔ دریائے اٹک کے پاس ایک سرکاری افسر نے انہیں روکا اور پروانہ راہداری دکھانے کو کہا۔ راجپوتوں نے اس مغل افسر کو قتل کر دیا اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اورنگ زیب نے اپنے بیٹے اکبر کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا مگر وہ بادشاہت کے لالچ میں آ کر راجپوتوں کے ساتھ مل گیا۔ اورنگ زیب کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ مگر وہ اولوالعزم بادشاہ ذرا نہ گھبرایا اور ایک عجیب چال سے راجپوتوں کو اکبر سے توڑا۔

اکبر تو مایوس ہو کر ایران کی طرف چلا گیا۔ جہاں اس نے 1705ء میں وفات پائی۔ اورنگ زیب نے راجپوتوں کو پے در پے شکستیں دے کر مطیع کیا۔ رانا اودھے پور نے اطاعت

قبول کر لی اور راجہ جسونت سنگھ کے بیٹے راجہ اجیت سنگھ کو جودھ پور کا حاکم تسلیم کر لیا گیا۔

ان دنوں دکن میں سیواجی مرہٹہ نے شورش برپا کی ہوئی تھی۔ اس اولوالعزم مرہٹہ سردار نے شاہِ بیجاپور کے جرنیل افضل خان کو دھوکے سے قتل کر کے دکن کے علاقے میں اپنی دھاک بٹھا دی۔ اورنگ زیب نے اس کے خلاف راجہ جسونت سنگھ اور اپنے ماموں شائستہ خاں کو بھیجا۔ مگر ان دونوں جرنیلوں کو کامیابی نہ ہوئی اور سیواجی کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس نے سورت کو لوٹ لیا۔ آخر کار اورنگ زیب نے راجہ جے سنگھ اور دلیر خان کو سیواجی کی بیخ کنی کے لیے روانہ کیا۔ راجہ جے سنگھ نے سیواجی سے کئی قلعے چھین لیے اور اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ سیواجی نے اطاعت قبول کر لی اور اپنے بیٹے سمیت دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ شاہی دربار میں پنج ہزاری امراء کی صف میں اسے کھڑا کیا گیا۔ سیواجی نے اس منصب کو اپنی کسرِ شان سمجھا۔ وہ بھیس بدل کر دہلی سے بھاگ گیا۔ اور دسمبر 1666ء میں اس نے دکن پہنچ کر پھر شورش برپا کر دی۔ 1667ء میں راجہ جے سنگھ مر چکا تھا اس لیے اورنگ زیب نے سیواجی کی سرکوبی کے لیے راجہ جسونت سنگھ اور شہزادہ معظم کو بھیجا۔ مگر انہیں سیواجی کے مقابلے میں کامیابی نہ ہوئی۔ 1671ء میں سیواجی نے سورت کو دوبارہ لوٹا۔ علاقہ خاندیش کو تاخت و تاراج کیا۔ 1674ء میں اس کی رائے گڑھ کے مقام پر تاج پوشی کی رسم ادا ہوئی اور اس نے راجائی لقب اختیار کیا۔ چھ سال کے بعد اپریل 1680ء میں 53 سال کی عمر میں رائے گڑھ کے مقام پر سیواجی نے معمولی علالت کے بعد وفات پائی۔ مہمات دکن میں اورنگ زیب کا اولین مقصد یہ تھا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی آزاد ریاستوں کو ختم کر کے انہیں سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر مغل جرنیلوں نے پچیس سال تک متواتر کوشش کی کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستیں فتح ہوں۔ مگر وہ ناکام رہے۔ آخر کار اورنگ زیب بذاتِ خود دکن کی طرف گیا اور شاہی افواج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ 1686ء میں بیجاپور کی ریاست کا خاتمہ ہوا۔ اور 1687ء میں گولکنڈہ پر بھی مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

گولکنڈہ کے آخری فرماں روا ابوالحسن تاناشاہ کی جاگیر مقرر ہوئی۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کی تسخیر کے بعد اورنگ زیب مرہٹوں کی طرف متوجہ ہوا۔ 1689ء میں مغل جرنیل مقرب خان نے مرہٹوں کے سردار سنبھاجی کو گرفتار کر کے شاہی دربار میں بھیجا جہاں وہ ناشائستہ حرکات کے باعث قتل کر دیا گیا۔ البتہ اس کے لڑکے ساہو کو ہفت ہزاری کا

منصب اور راجہ کا لقب اورنگ زیب نے دیا اور اس کی پرورش بھی کی۔ سنبھاجی کے قتل کے بعد اورنگ زیب نے 1704ء تک مرہٹوں کے تمام مضبوط قلعے اور مستحکم مقامات فتح کر لیے اور شاہی فوجیں تنجور اور ترچناپلی تک پہنچ گئیں اور ان علاقوں کے حکمرانوں سے خراج وصول کیا۔ ان مہمات سے فارغ ہو کر اورنگ زیب نے دہلی کی طرف واپس کوچ کیا۔ مگر راستے ہی میں اورنگ آباد کے مقام پر اپریل 1707ء میں فوت ہو گیا۔

تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ عالمگیر نے بحیثیت حکمران ایک اعلیٰ نمونہ اپنے جانشینوں کے لیے قائم کیا۔ اُس کی سادگی، پرہیزگاری، تحمل واستقامت بُردباری، شجاعت، محنت و مشقت کی عادت۔ خوش مزاجی اور فرض شناسی کی داد دیے بغیر کوئی متعصب ترین شخص بھی نہیں رہ سکتا۔ امورِ سلطنت میں وہ حق شناسی اور عدل دوستی کا قائل تھا۔ وہ عہدہ داروں کی تقرری لیاقت، دیانت اور حسنِ کارکردگی کی بناء پر کرتا تھا۔ مظلوموں کی حق رسی میں اسے لطف آتا تھا اور بڑے سے بڑا آدمی بھی ظلم کرنے کے سلسلے میں اس کے مواخذہ سے نہ بچ سکتا تھا۔ غرضیکہ حکومت کرنے کے سلسلے میں اُس نے خلافتِ راشدہ کی یاد اپنے سنہری کارناموں کی بدولت مسلمانوں کے ذہنوں میں تازہ کر دی تھی۔

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔

❀..........❀..........❀

بایزید یلدرم

بایزید کی مسند نشینی کی رسم عین میدانِ جنگ میں ادا کی گئی۔ وہیں فوج نے سلامی اُتاری۔توپیں سر کی گئیں اور وہیں فوجی افسر نذریں لے کر حاضر ہوئے۔ پھر یہ فوج نئے سلطان کی سرکردگی میں شمال کی طرف بڑھی۔ سردیہ کا بادشاہ مارا جا چکا تھا۔اس کے بیٹے نے اپنے آپ میں مقابلہ کی تاب نہ پائی تو صلح کی درخواست کی اور اپنی بہن بایزید کو بیاہ دی۔

کہتے ہیں کہ بایزید کو اپنی نئی بیگم یعنی سردیہ کی شہزادی سے بہت محبت تھی۔ حرم سرا میں اور بھی بیگمات تھیں۔لیکن اس کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ آخر اس عورت کی محبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ چنانچہ محل میں ناچ رنگ کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں اور اُن میں طرح طرح کے سامان مہیا کیے گئے۔لیکن اس بہادر سپاہی نے اس حالت میں بھی سپہ گری اور شجاعت کا جوہر نہیں کھویا۔یعنی ایک مرتبہ پھر بلقانی ریاستوں کی فتح کا ارادہ لے کے چلا اور ولیشیا کو فتح کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اتنے میں خبر ملی کہ ایشیائے کوچک کی ترک ریاستوں نے بڑا فساد مچا رکھا ہے۔فوراً پلٹا اور ان ساری ریاستوں کو فتح کر کے دَم لیا۔

جن دنوں بایزید ایشیائے کوچک میں لڑ بھڑ رہا تھا۔اُدھر یورپ کے فرمانروا عثمانیوں کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ہنگری کا بادشاہ جو ترکوں سے بار بار مقابلہ کر کے شکست کھا چکا تھا بڑے جوڑ توڑ کا آدمی تھا۔اُس نے جب دیکھا کہ عثمانیوں کو نیچا دکھانا اِکا دُکا سلطنت کا کام نہیں تو رومن کیتھولک عیسائیوں کے پیشوا پوپ کے پاس جا کے فریاد کی۔اُس نے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا۔ یورپ کے تمام بادشاہوں کے دربار میں پوپ کے قاصد پہنچے اور ملک ملک کے شہسوار ثواب کمانے کی نیت سے چل پڑے۔فرانس والوں نے بہت بڑی فوج

بھیجی۔ جس میں شاہ فرانس کے تین چچیرے بھائی اور کئی بڑے بڑے نواب جن کی بہادری کی دھوم سارے یورپ میں تھی، شامل تھے۔ جرمنی کی مختلف ریاستوں سے بھی الگ الگ لشکر مشہور شہسواروں کی سرکردگی میں آئے اور شاہ ہنگری کی فوج سے مل گئے۔ اِدھر دلیشیا اور بلغاریہ کو جب یہ خبر ملی کہ عثمانیوں پر ہر طرف سے فوجیں بڑھ رہی ہیں تو انہوں نے بھی ترکوں کی اطاعت کا جوا اُتار پھینکا۔ سرویہ اس لشکر میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ان عیسائی بہادروں نے سب سے پہلے اُس پر غصہ نکالا۔ یعنی اُس کے علاقہ کو خوب لوٹا کھسوٹا اور کئی قلعے فتح کر کے نکوپولس کے قلعہ کو جا گھیرا۔

بایزید ایشیائے کوچک کے معرکوں سے فارغ ہو کر بروصہ پہنچا ہی تھا کہ یکا یک عیسائی فوجوں کے جماؤ کی خبر ملی۔ شیر کی طرح انگڑائی لے کر اُٹھا اور ضلع سے فوجیں سمیٹ کڑکتا اور گرجتا چلا۔ یہاں فرانسیسی شہسوار دو تین قلعے فتح کر کے ایسے مغرور ہوئے تھے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نکوپولس کے سامنے ڈیرے ڈالے شرابیں پی پی کر بدمستی کے عالم میں ہنکار رہے تھے کہ بایزید کو ہمارے مقابلہ پر آنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔ وہ آ بھی گیا تو کیا کر لے گا۔ آج تو اگر آسمان بھی گر پڑے تو ہم اُسے اپنے نیزوں پر روک لیں۔

نکوپولس کے محاصرہ کو چھٹا دن تھا۔ اتنے میں جاسوس خبر لائے کہ سلطانی فوج کوئی دم میں پہنچا چاہتی ہے۔ لیکن کسی نے اس بات کا یقین نہ کیا۔ ابھی یہ لوگ رنگ رلیوں میں مصروف تھے کہ بایزید آندھی طوفانوں کی طرح آ پہنچا۔ فرانسیسی شہسواروں نے جنگ کا آغاز اس طرح کیا کہ پہلے دو تین معرکوں میں جو مسلمان قیدی ہاتھ آئے تھے اور جن کی جان بخشی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ انہیں قتل کر ڈالا اور پھر شجاعت کے جوش میں گھوڑے اڑاتے عثمانی فوج پر جا گرے۔

انہوں نے دو تین حملوں میں ترک فوج کی پہلی صف کو توڑ ڈالا اور مسلمانوں کی لاشیں پامال کرتے دائیں بائیں تلواریں چلاتے بڑھے۔ دوسری صف ینی چری جنگ آزماؤں کی تھی۔ فرانسیسیوں نے اُن کو بھی پیچھے ہٹا دیا۔ اور بہت سے بہادروں کو تلوار کے گھاٹ اُتار کر درانہ بڑھتے چلے گئے۔ تیسری صف سواروں کی تھی۔ یہاں بھی انہیں کسی نے نہ روکا۔ اور انہوں نے اس خیال سے قدم آگے بڑھایا کہ اَب ترک فوج آن کی آن میں بھاگ کھڑی ہو گی۔ لیکن اس صف سے آگے گزرتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو لوہے کی دیواروں کے سامنے کھڑا پایا اور دفعتہً

چالیس ہزار بھالے اُن پر جھک پڑے۔ یہ دیکھ کر فرانسیسی جنگ آزماؤں کے ہوش اُڑ گئے۔ اور وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہیں بھاگتے دیکھ کر ہنگری اور دلیشیا کی پیدل فوج جو دشمن کے داہنے اور بائیں بازو پر کھڑی تھی بدحواس ہو کر پسپا ہو گئی۔ صرف ہنگری کا بادشاہ اور دلیشیا اور بوریا کے نواب اپنی اپنی فوج سمیت کچھ دیر کھڑے رہے۔ لیکن آخر وہ بھی ترکوں کے حملوں کی تاب نہ لا سکے اور ہنگری کا بادشاہ اور خاص خاص سردار بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے۔ وینس کا جنگی بیڑا ان لوگوں کی مدد کے لیے دریائے ڈینیوب کے دہانے پر تیار کھڑا تھا۔ ان لوگوں نے جو یہاں سے بھاگے تھے انہیں جہازوں میں سوار ہو کر اپنے وطن کا رُخ کیا۔

اس فتح نے ترکوں کی دھاک سارے یورپ میں بٹھا دی اور جو سلطنتیں عثمانیوں کو یورپ سے نکالنے کی سازشیں کر رہی تھیں اُن کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ بایزید نے اِدھر سے قسطنطنیہ کی طرف باگ موڑی۔ اور چھ سال اسے گھیرے پڑا رہا۔ اب عیسائیوں کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اور وہ ہتھیار ڈالنے کو تھے۔ کہ تیمور نے عثمانی مملکت پر حملہ کر دیا اور بایزید اس فتح کو اُدھورا چھوڑ کر دشمن کو روکنے مشرق کی طرف پلٹا۔

تیمور نے 1401ء میں ایشیائے کوچک کے ایک شہر سیواس پر حملہ کیا اور اُسے فتح کر کے شام اور مصر پر حملہ کرنے کے ارادہ سے جنوب کی طرف ہٹا۔ چنانچہ جب بایزید سیواس پہنچا تو تیمور جا چکا تھا۔ لیکن عثمانی علاقے میں اپنے آدمی چھوڑ گیا تھا جو ایشیائے کوچک کے ترک سرداروں کو بایزید سے برگشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ قوم اور وطن کی محبت اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ تیمور اور بایزید دونوں ترک تھے۔ لیکن تیمور اور اُس کے ساتھی وسط ایشیا سے آئے تھے جو ترکوں کا اصلی وطن ہے۔ ایشیائے کوچک کے ترکوں کو اگرچہ وطن سے نکلے مدت ہو چکی تھی لیکن وہ اُن صحراؤں اور پہاڑوں کو نہیں بھولے تھے جہاں اُن کے باپ دادا برسوں تک بھیڑ بکریوں کے گلّے چراتے رہے تھے۔ اور بچپن میں بزرگوں سے سرائے مولیاں اور نہر زرفشاں کے متعلق جو کچھ سُنا تھا وہ دل پر نقش تھا۔ اب جو سنتا کہ فتح مند تیمور اسی سرزمین سے آیا ہے اور سارے ایشیا کو زیر و زبر کر کے یہاں پہنچا ہے تو خود بخود دل اُس کی طرف کھنچنے لگے۔

تیمور نے سال بھر کے بعد اس طرف کا رُخ کیا۔ بایزید کی فوج اتنے عرصہ تک بے کار بیٹھے بیٹھے بددل سی ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب وہ ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر چلا تو

سپاہیوں میں جوش وخروش کا نام ونشان نہیں تھا۔ انگورہ کے میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ تیمور کے پاس بایزید سے پانچ گنا فوج تھی۔ پھر غضب یہ ہوا کہ عین معرکہ جنگ میں بہت سے ترک سپاہی بایزید سے ٹوٹ کر دشمن سے جا ملے۔ اس میں شک نہیں کہ ینی چری بڑی بہادری سے لڑے اور بایزید نے بھی آخری وقت تک ہمت نہ ہاری لیکن تیمور کے ٹڈی دل سے پیش پانا محال تھا اس لیے شکست کھا کر گرفتار ہوا اور قید کی حالت میں ہی انتقال کیا۔

تیمور کے حملے نے عثمانی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایشیائے کوچک کی جن ترک ریاستوں کو بایزید نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا وہ سب خود مختار ہو گئیں۔ یورپ کی ریاستیں بھی سر اٹھانے لگیں۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عثمانی حکومت بالکل ختم ہو گئی۔ لیکن یہ ترکوں کا قومی وصف ہے کہ وہ بار بار اُٹھتے اور گرتے ہیں کہ ترکوں کا نام ونشان دنیا کے پردے سے ہٹ گیا۔ لیکن جب وہ اُٹھے ہیں تو سب حیران رہ گئے کہ ہم کیا سمجھے تھے اور کیا ہو گیا۔ چنانچہ تیمور کے حملہ کے بعد کوئی بارہ سال کے عرصہ میں ترکوں نے پھر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کر لی۔

❀............❀............❀

جنرل بخت خاں

1857ء کے متعلق جس قدر بھی لٹریچر نظر سے گزرا یا بسلسلہ روایت بزرگوں سے سننے میں آیا اس سے جنرل بخت خاں کے حسب ونسب کے متعلق ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بہت سے لوگوں مثل مولوی ذکاء اللہ نے جن کا قلم جنرل صاحب کی تحقیر وتخریب کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ ان کا تعلق کسی گمنام اور پست خاندان سے تھا۔

لیکن بخت خاں نے 1857ء میں جو کارہائے نمایاں کیے اور تحریک کو جس قابلیت کے ساتھ تمام ہندوستان میں پھیلایا۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا تعلق ضرور کسی اعلیٰ خاندان سے ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی اہم شہادت نواب دوندے خاں کی پر پوتی چندا بیگم کی ہے۔ جو خدا کے فضل سے ابھی بقید حیات ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ غلام قادر روہیلہ شہید سے ان کی قرابت قریبہ تھی اور خاندان روہیلہ سے تھے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ والئے روہیل کھنڈ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کا خاندان جب انگریزوں اور شجاع الدولہ کے مظالم کا شکار ہو کر برباد ہوا تو غلام قادر خاں کا خاندان بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس انتشار میں جس کا جدھر منہ اٹھا چلا گیا۔ چنانچہ بخت خاں کے والد معہ اہلِ خاندان اودھ کے موضع سلطان پور میں آباد ہو گئے۔

نواب عبداللہ خاں روہیلہ جو خوبصورتی اور بہادری میں منفرد زمانہ تھے۔ شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہ کے مرکز بن گئے اور اس معتوب روہیلہ سردار کی نوابان اودھ سے قرابت داری ہو گئی۔

خود بخت خاں نے بھی ایک مرتبہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے کہا تھا کہ:

''مَیں موضع سلطان پور کا رہنے والا ہوں اور خاندان اودھ سے ہوں۔ اگر آپ کو میرے بیان پر شک ہو تو آپ تصدیق فرما سکتے ہیں۔'' بادشاہ نے فرمایا تصدیق کی ضرورت نہیں مجھے آپ کی شرافت ونجابت پر پورا یقین ہے۔

یہ امر کچھ بعید از قیاس نہیں کہ جو قوم حافظ الملک نواب نجیب الدولہ اور غلام قادر جیسے سرفروش اور الہ وردی خاں جیسے مدبر پیدا کر سکتی ہے۔ کیا وہ ہندوستان کو آخری جنگ آزادی میں بخت خاں جیسے جانبازوں کو جنم نہیں دے سکتی۔

تعلیم وتربیت اور ملازمت

زمانہ قدیم کے نوابی خاندان کے لوگ کافی پڑھے لکھے ہونے کے علاوہ فنونِ حرب میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ بخت خاں بھی اس سے مستثنٰی نہ تھے۔ سلطان پور کی جاگیر نواب اودھ کی جانب سے ملی تھی جو اول تو خاندان کی ضروریات کے لیے ناکافی تھی دوسرے ان کی اولوالعزم اور بے چین طبیعت اس پرسکون زندگی کی متحمل نہ ہوئی۔ بنابرآں انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کی اور بہت جلد ترقی کر کے ممتاز عہدے پر فائز ہوئے۔ مسٹر سیل کے تحت جنگ افغانستان میں ایسے ایسے بہادرانہ کارنامے دکھائے کہ توپ خانہ باتری کے سب سے بڑے افسر ہو گئے۔ ان کے ماتحت تمام ہندوستانی توپچی رہتے تھے۔ یہ باتری اپنی کارگزاریوں کے لیے بہت مشہور تھی۔ اعزاز کے طور پر ان کی توپوں پر پھولوں کا محراب نما تاج بھی رکھا گیا تھا۔ جنرل بخت خاں جلال آباد میں بھی اس باتری کے ساتھ کام کر چکے تھے۔

افغانستان سے واپس آنے کے بعد بریلی کی چھاؤنی پر بھیج دیئے گئے اور صوبیداری کا عہدہ عطا کیا گیا۔ اس طرح بخت خاں توپ خانہ کے بڑے افسر تھے اور انگریزی لشکر گاہ میں بہت سے لوگ ان کو جانتے تھے۔ وہ ایک فربہ اندام شخص تھے اور انگریز ان کو بہت ہوشیار اور بڑا دانشمند سمجھتے تھے۔

جنرل بخت خاں کی قیادت

مولوی عظیم اللہ خاں کانپور چھاؤنی کے مشن اسکول میں ملازم تھے۔ اپنی لیاقت سے انگریزی، فرانسیسی اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں نانا صاحب کو انگریزی پڑھانے کے لیے انگریزوں کی طرف سے عظیم اللہ خاں مقرر ہوئے۔ اس شخص کو قدرت نے عجب دل و دماغ عطا کیا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا معاملہ تو غتر بود ہو گیا تھا استاد اور شاگرد کی دور بین نگاہوں نے انگریزوں سے جنگ کی اسکیم مرتب کرنا شروع کر دی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق بیرونی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے "عظیم اللہ خاں اور بالا صاحب گوکھلے" یورپ روانہ ہوئے۔ عظیم اللہ خاں روس ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔ دونوں نے یورپ کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر تاریخ بغاوت اور نقشہ جنگ تجویز کیا۔

چنانچہ سب سے پہلا شخص جس نے بغاوت کا آغاز کیا۔ وہ منگل پانڈے تھا۔ جس کو 8 اپریل 1857ء کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ تحریک کا آغاز منگل سنگھ کی قربانی سے ہوا۔

چپاتیوں کی تقسیم نے بغاوت کو ہر جگہ بیک وقت شروع کرنے میں نمایاں کام کیا۔ کوئی گاؤں، قصبہ یا شہر باقی نہیں تھا جہاں یہ چپاتیاں نہ پہنچی ہوں۔ تمام انگریزی اہل قلم کی یہ متفقہ رائے ہے کہ بغاوت کو پھیلانے اور ترقی دینے میں چپاتیوں نے بڑا کام کیا۔ مصنف تاریخ بغاوت ہند تحریر کرتا ہے۔

اِسی مصنف نے اپنے لیکچر میں بیان کیا تھا۔

مولانا احمد اللہ صاحب خودروٹی کے ٹکڑے اور کنول کے پھول تقسیم کرتے تھے۔

روہیل کھنڈ میں نوابی

شورش کی آگ بھڑکتے ہی بخت خاں نے جو بعد کو جنرل کے لقب سے مشہور ہوئے اپنے اجداد کے وطن بریلی کا رُخ کیا۔ بریلی جا کر خان بہادر خاں کو جو حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے پوتے اور خاندان میں بہت زیادہ با اثر اور بہادر تھے تخت امارت پر بٹھایا۔ روہیلکھنڈ میں روہیلہ قوم اپنے غیر معمولی شجاعانہ کارناموں کی وجہ سے ابھی تک تفوق خاص کی مالک تھی۔ دولت اور حکومت تو ختم ہو چکی تھی لیکن ترکۂ آبائی میں شجاعت و بسالت کا تھوڑا اندوختہ باقی رہ گیا تھا۔ جو

اس وقت بروئے کار آیا۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

''جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیل کھنڈ کی بغاوت کے آگے خفیف تھی۔''

بریلی جو عرصہ تک حافظ رحمت خاں کا دارالسلطنت رہا تھا، جنرل بخت خاں کی جدوجہد کا مرکز قرار پایا۔ ظہیر دہلوی رقم طراز ہیں کہ:

''بریلی میں ہر طرف کے معززین کا اجتماع ہے اور سب سردار مثل نانا راؤ، فیروز شاہ وغیرہ جمع ہیں۔ رامپور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور مرد مان رام پور کا یہ حال ہے۔ کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہوا ہے اور اس پر گوٹا لگا ہوا ہے۔ آدھا دوپٹہ سر سے بندھا اور آدھا گھوڑنے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہوا ہے اور چار چار طمنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں دوہری تلواریں ڈاب میں رکھی ہوئی ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کداتے پھرتے ہیں۔ پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔''

جب تک جنرل صاحب کا بریلی میں قیام رہا نواب خان بہادر خاں کے دست راست رہے۔ چنانچہ جو امن وامان اس نواب گردی میں عوام کو میسر تھا۔ اس میں بخت خاں کا بھی حصہ ہے۔ مَیں نے اپنے خاندان کی ایک بزرگ خاتون کی زبانی سنا جن کی والدہ نے اپنے چشم دید حالات انہیں بتائے تھے کہ اس دوران میں کثرت سے شادی بیاہ اور دوسری تقریبات ہوئیں اور ان میں کسی قسم کی بے اطمینانی یا انتشار نہیں پایا جاتا تھا۔ ہر چیز کی ارزانی اور بہتات تھی۔ گرانی کا کہیں ذکر نہ تھا۔

روہیلکھنڈ کے علاوہ تمام ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف سخت ہیجان برپا تھا۔

انگریزوں سے جنگ

9 جولائی کو بخت خاں نے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ انگریزی فوج پر حملہ کیا اور گھوڑے، ہتھیار اور بہت سا سامان میدانِ جنگ سے ہاتھ آیا۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

''29 جولائی کے دربار میں جنرل بخت خاں بادشاہ کا قائم مقام ہو کر آیا۔ بادشاہ نے ساری سپاہ اور شہر پر نیم بادشاہ بنا دیا۔ جنرل نے بھی کمانڈر انچیف کی نقل اتاری۔ آج میگزین دیکھتا ہے۔ اس میں بالترتیب سامان

رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ لال ڈگی اور جامع مسجد کے درمیان ہزاروں فوج کی پریڈ لی۔ نمک اور شکر پر جو محصول تھا وہ معاف کر دیا تا کہ غرباء کو تکلیف نہ ہو۔ نیز یہ بھی کہا کہ جو شہزادہ شہر کو لوٹے گا میں اس کی ناک کٹوا دوں گا۔''

آگے چل کر مولوی صاحب پھر لکھتے ہیں:

''جب تک بخت خاں دلی نہیں آیا تھا جہاد کے فتویٰ کا چرچا بہت کم تھا۔ مگر جب بخت خاں دلی آیا۔ تو اس نے یہ فتویٰ لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لیے فرض ہے کہ اگر کافروں کو فتح ہوگئی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر دیں گے۔ جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے ان کے دستخط کرائے اس فتوۂ جہاد کے علاوہ ایک حلف نامہ بھی تقسیم کرایا اور اس پر ہر سپاہی سے جن کی تعداد اسّی ہزار کے لگ بھگ تھی عہد لیا۔ مرزا مغل نے یہ حلف نامہ فوجوں کو پڑھ کر سنایا۔ جس پر انہوں نے اقرار کیا کہ ہم آخری دم تک لڑیں گے۔ جنرل بخت خاں خلوت وجلوت میں جب چاہتے بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتے۔ کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ عید قربان کے روز حسب ذیل شعر لکھ کر ان کو بھیجا۔

لشکرِ اعداء الٰہی آج سارا قتل ہو
گورکھا، گوجر سے لے کرتا نصاریٰ قتل ہو

پیدل فوج کی دو پلٹنیں اور پانچ سو رسالے کے سپاہی چھ توپوں اور سامان اسلحہ کے ساتھ بخت خاں کے حکم سے باغپت روانہ ہوئے تا کہ انگریزوں کو پل تعمیر کرنے سے روکیں۔ اس کے علاوہ فوج کی کثیر تعداد مع سامان حرب کے علی پور روانہ ہوئی۔ سہ پہر کو یہ افواہ اڑی کہ باغیوں کو بہت بڑی فتح ہوئی۔ اس کی وجہ سے عوام میں بڑا جوش وخروش پھیل گیا۔ دہلی سے اجمیری دروازے تک فوجوں کی پریڈ لی گئی۔

جنرل نے سپاہیوں کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ بات چیت کی

اور بادشاہ کا پیغام پہنچایا کہ جو شخص میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں
کرے گا۔ اسے پانچ بیگہ زمین دی جائے گی اور یہ اعزازی عہدہ بھی
دیا جائے گا۔''

جنگی کونسل کے روبرو بخت خان نے بیان کیا کہ وہ کشمیری دروازہ کے بالمقابل مورچہ بنا رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں کہیں بغاوت ہوتی اس کی سرپرستی اور رہنمائی بادشاہ کی طرف سے ان کے سپرد تھی۔ وہ لوگ ان سے براہِ راست ہدایتیں منگواتے اور اس کے مطابق عملدرآمد ہوتا تھا۔ جنرل صاحب کے ایک خط سے جو انہوں نے جنرل سدھاری سنگھ اور غوث محمد خاں کو لکھا تھا، ان کے اس مقصدِ عظیم کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کو لے کر وہ اٹھے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''محمد بخت خاں گورنر بہادر اور دہلی کے دارالخلافے میں جو فوج ہے اس
کے سپاہی اور افسران آداب بجالاتے ہیں اور تم کو مبارکباد دیتے ہیں۔ جو
بہادرانہ کارنامے تمہارے متعلق ہیں ہم سب کو ان پر فخر ہے۔ ہم میں سے
ہر شخص اور تمہارے بادشاہ شب و روز مٹھی بھر عیسائیوں کو تباہ کرنے کی
کوشش کر رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو بہت تھوڑے عرصہ میں دہلی کا ملک
ان سے پاک ہو جائے گا۔''

جواب سدھاری سنگھ

''خدا کے فضل سے دہلی کی جو سلطنت وجود میں آئی ہے عالمِ طفولیت میں
ہے۔ خدا نے آپ کو اس بچہ کی پرورش کے لیے بھیجا ہے۔ آپ کے تحت
پانچ دستے ہیں اور آپ کا خطاب جنرل بہادر ہے اور آپ کے ہاتھ میں
ہر قسم کی قوت ہے۔''

جنرل اور ان کی فوج کی بہادری

توپچیوں نے جنرل کی سرکردگی میں بہادری کے وہ جوہر دکھلائے کہ دشمن کی صفوں میں ہل چل ڈال دی۔ ظہیر دہلوی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں:

''چاندنی رات ہے اور میں ایک دوست کے کوٹھے پر بیٹھا ہوا ہوں کہ تیاری کا بگل ہوا

اور فوج کی کمر بندی ہوگئی اور میگزین سے بڑی بڑی چھتیں پٹی بندیاں دس دس بارہ بارہ جوڑی بیل لے چلے اور میگزین کی کراچیاں جدا گانہ نہ تھیں۔کوئی پانچ گھڑی رات گئے یہ سب فوج باہر ہوگئی۔ بڑی بڑی توپیں پہاڑوں پر چڑھا کر مورچے باندھ لیے۔دریا درمیان ہر دو لشکر کے بیچ ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔بڑی توپوں نے بڑا کام کیا اور فوج انگریزی کا بڑا نقصان ہوا۔زرد کوٹھی کے متصل پوربیوں نے ایک مورچہ قائم کر رکھا تھا اور بڑی بڑی توپیں لگا رکھی تھیں۔

ان توپوں سے انگریزی فوج کو بہت نقصان پہنچا تھا۔اس مورچہ کی حفاظت کے لیے ہر وقت دو پلٹنیں اور گولہ انداز موجود رہا کرتے تھے۔"

"انگریزی فوج نے ایک رات شبخون مارا، رات بھر ہنگامۂ بگیر و بکش گرم رہا۔دونوں طرف سے توپ چلتی رہی۔لڑائی کیا قیامت کے آثار نمودار تھے۔خدا جانے طرفین سے تین سو توپیں چل رہی تھیں یا چار سو، اس کا علم خدا کو ہے۔"

"گھڑ چڑی کے توپ خانے نے یہ کام کیا کہ مخلدار خاں برابر ترپولیہ ہے۔اس میں توپیں لگا دیں اور دو پلٹنیں باغیچہ میں چھپ کر کھڑی ہوگئیں۔ترپولیہ کے تینوں دروں پر توپیں لگی ہوئی تھیں اور دونوں طرف سے باغیوں نے راستہ رکھا تھا۔لیکن انگریزی توپ خانہ نے ایسے گولے برسائے کہ تینوں توپیں بے کار ہو کر شہر روانہ ہوگئیں۔فوج انگریزی اس سے بے خبر کہ پلٹنیں گھات میں بیٹھی ہیں، دو رویہ سلسلے میں بندھی تعاقب میں بڑھی چلی آئیں۔باغیوں نے جب دیکھا کہ وہ بیچ میں آگئیں، یکبارگی باغات کی دیوار کے پیچھے سے کھڑے ہو کر دونوں طرف سے باڑھ جھونک دی۔اس وقت فوج کا یہ حال ہوا جیسے کبوتروں میں چھرہ مار دیا ہو۔بہت سے آدمی ضائع ہوئے اور مورچہ چھوڑ کر الٹے چھاؤنی کہنہ کی طرف روانہ ہوئے۔"

جنرل صاحب کی قیادت میں عوام نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بے جگری سے اپنے خون کی ہولی کھیلی اور ان کو معلوم ہوگیا کہ مقابلہ کسی معمولی دشمن سے نہیں ہے۔فوج باغی نے بڑی سختی اور مضبوطی سے فوج انگریزی پر حملہ جاری رکھا اور کوئی تدبیر یا دقیقہ ان کے وہاں سے نکال دینے میں اور غارت کرنے میں باقی نہیں چھوڑا۔دشمنوں نے اپنی مورچہ بندی ایک بہت اچھے موقعہ پر باغات اور مکانات کی آڑ میں کی تھی۔توپیں بہت عقلمندی کے ساتھ سرکیں۔اور اس سرعت سے آگ برسائی کہ ایک لمحہ کے لیے بھی توقف نہ تھا۔"

ولیم فوریس رقم طراز ہے کہ:

''محاصرے کے زمانہ میں باغیوں نے متعدد حملے کیے اور یہ باغیوں کی لیاقت کا اچھا ثبوت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کسی معمولی دشمن سے مقابلہ نہ کر رہے تھے۔ ان حملوں کی تعداد 36 تھی۔ ان میں سے ہر ایک نہایت ہی منظم اور باقاعدہ اقدام اور حملہ تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار حملے دور افتادہ چوکیوں اور ہر اول پر ہوئے۔ یہ ہمارے آدمیوں کے بہت کم قریب آتے تھے اور یہ بھی اس وقت جب ان پر اچانک حملہ کر دیا جاتا تھا۔ مگر روزانہ جنگ آزما ہوتے تھے۔ ان کی اس مستقل جرأت و بہادری سے کوئی چیز بازی نہیں لے جا سکتی تھی۔''

چارلس بال صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''شہر کے جس حصہ پر ہم نے سب سے پہلے حملہ کیا اس پر شراب کا کافی مقدار میں موجود ہونا باغیوں کی انتہائی چالاکی کا ثبوت ہے۔''

مجاہدین علماء اسلام سے اتحاد عمل

1857ء کی تحریک سے بھلا علماء کی جماعت کیسے علیحدہ رہتی۔ 1830ء میں ان کو سرحدی جنگ میں جو ہزیمت ہوئی، گورنمنٹ نے جو قیامت توڑی تھی، اس کا بدلہ لینے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس زمانہ میں وہابیوں کو مجاہدین کہا جاتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی رقمطراز ہیں:

''بخت خاں خود بھی وہابی تھے اور محمد رفیع رسالہ دار، مولوی امام خاں، مولوی عبدالغفور خاں، مولوی سرفراز علی بھی وہابی تھے۔ بخت خاں نے سرفراز علی کو پیشوائے مجاہدین مقرر کیا تھا اور وہی ان کی سرپرستی کرتے تھے۔''

علماء کی جماعت پر جنرل صاحب کو اس قدر اعتماد تھا کہ تخلیہ کے ان مخصوص مشوروں میں جن میں سوائے ان کے اور بادشاہ کے کوئی نہ ہوتا تھا، یہ لوگ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جنرل بخت خاں کے ساتھ ایک سو علماء دہلی آئے تھے۔ دورانِ ہنگامہ ایک

جماعت وہابی علماء کی ٹونک سے بھی آئی تھی۔ اس کے علاوہ جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار اور آگرہ سے بھی کافی تعداد میں علماء آئے اور جنرل کے ساتھ کام کیا۔

لیکن علماء کی جماعت میں مولوی لیاقت علی خاص لیاقت اور شخصیت کے مالک تھے۔ جن کی کارگزاریوں سے خوش ہوکر بخت خاں نے ان کو الہٰ آباد کا گورنر بنا دیا تھا۔ انہوں نے ایک رسالہ جہاد حریت بھی لکھ کر شائع کیا۔ اس میں تحریر تھا کہ:

''جہاد میں سب سے بڑا سامان یہ ہے کہ بندے توکل بخدا کریں اور امداد جانب خالق کون و مکاں سے ہو۔ مسلمانان ہندوستان کہ بوجہ بے استطاعتی زر، عدم موجودگی گولہ بارود و توپ و لشکر تھے، مجبور و ناتواں ہو رہے تھے سو اس خالق احد اللہ نے دین احمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا باطنی طور پر قوی و توانا کیا ہے ویسا ہی ظاہری سامان تسکین خاطر ہم ضعفاء و مساکین ان نابکار نصاریٰ بداطوار سے بلا سبب و کوشش ہم لوگوں کو دلوایا۔''

ہنٹر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

''جب 1857ء میں غدر شروع ہوا۔ تو مولوی جعفر تھانیسری اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی اس کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو نمایاں کر دیا۔ اور اب وہ ان لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دہلی میں جب باغیوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تو جعفر پھر تھانیسر واپس آ گیا۔''

تاریخ بغاوت ہند میں تحریر ہے:

اس کے علاوہ ملک میں اور طرح بھی سازشیں کی گئیں۔ انقلابی لوگ فقیرانہ لباس پہن کر شہروں میں نکل جاتے تھے تاکہ انتظام سرکار میں خلل ڈالیں اور ہندوستانی سپاہیوں کو باغی بنائیں۔''

علماء کی جماعت میں مولوی احمد اللہ شاہ صاحب بھی تھے ان کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ:

''جب آگرہ میں وعظ فرماتے تھے تو دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ فیض آباد

کی چھاؤنی پر دروبست قابض ہو گئے۔ بیگم حضرت محل نے انہیں لکھنؤ بلا کر فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ جہاں وہ دس ماہ تک انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے۔ جب انگریزوں کا لکھنؤ پر قبضہ ہو گیا۔ تو راجہ پوایاں نے اپنے مکان میں بلا کر جبکہ وہ اس سے باتیں کر رہے تھے، شہید کروا دیا۔ ان کی قبر موضع گنج متصل شاہجہاں پور میں ہے۔"

مولوی صاحب کی نسبت مالیس لکھتا ہے کہ:

"مولوی ایک بہت بڑا تجربہ کار شخص تھا۔ کوئی شخص فخر کے ساتھ نہ کہہ سکتا تھا کہ میں نے کالین کیمبل کمانڈر انچیف ہند کو دوبارہ میدان میں شکست دی۔ مولوی احمد اللہ شاہ سچا محبِ وطن تھا۔ اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہیں کیا۔ اس نے بہادر کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان بدیشیوں کے ساتھ جنگ کی جنہوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا۔ ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو مولوی احمد شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے۔ مولوی صاحب کے قتل کے بعد انگریزوں کو مکمل فتح ہوئی۔ 21 جنوری 1857ء کو نواب ممو خاں نائب حضرت محل 50 نفر قیدیاں بغاوت کالے پانی بھیجے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔

انہیں مجاہدین میں ایک مجاہد جھنڈا شاہ تھے۔ جن کو مولانا جعفر تھانیسری نے کالے پانی میں دیکھا اور ان کے متعلق تحریر کیا۔

"جھنڈا شاہ ایک سر بھنگی فقیر سالہا سال سے مونٹ ہیرٹ میں دھونی لگائے بیٹھا تھا اور 21 دسمبر 1858ء کو ضلع بریلی سے بجرمِ ترغیب دہی بغاوت 14 سال کا سزایاب ہو کر پورٹ بلیئر آیا اور جس کو حسب وارنٹ ضلع بریلی کے 21 دسمبر کو رہا ہونا چاہیے تھا۔ مگر اب تک رہا نہیں ہوا۔ اس کے بظاہر بے وجہ قید رکھنے میں جو حکمت ہے ہم عوام اس کو نہیں جانتے۔"

1796ء میں جو جزیرہ اپنی ہولناک اور جانکاہ آب و ہوا کی وجہ سے آباد ہو کر اُجڑ چکا تھا۔ علماء ہند کی بدولت پھر آباد ہوا۔ مولوی جعفر صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ان جزائر کی آب و ہوا سم قاتل ہے۔ لیکن پھر بھی مَیں نے جا کر دیکھا کہ اس غدر 1857ء کی بدولت بیسیوں راجے مہاراجے اور نواب، زمیندار، مولوی، مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، مصنف، صدر بین، رسالہ دار اور صوبے دار وغیرہ قید ہیں۔ جو کہ چوہڑے، چماروں کی طرح موٹا جھوٹا کھانا کھاتے ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ محنت مشقت کرتے ہیں۔''

اس کے علاوہ ایک اور انتہائی شرمناک سزا نوشتہ تقدیر کی تھی۔ محمد جعفر لکھتے ہیں کہ:

''ہم جب پہنچے ہزاروں مرد و عورت قیدیوں کو دیکھا کہ ماتھا کھود کر پیشانی پر ان کا نام اور جرم اور لفظ دائم الحبس لکھا ہوا ہے۔ کہ وہ مثل نوشتۂ تقدیر کے تمام عمر نہیں مٹتا۔ مگر بتائید الٰہی سنئے کہ ہمارے جانے سے کچھ عرصہ پہلے وہ حکم منسوخ ہو چکا تھا۔ اس سبب سے اس دائم الحبسی سے بھی ہم محفوظ رہے۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی قیدی بھی اس نوشتۂ تقدیر سے نہیں بچتے تھے۔

اسباب ناکامی

مذکورۂ بالا قربانیوں کا جو افسوس ناک انجام ہوا اس کا ایک بڑا سبب اس میگزین کی تباہی تھا۔ جس کی بربادی نے کامیابی کو ناکامی میں اور فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ:

''اسی زمانے میں یہ ستم ہوا۔ کہ ثمرد کی بیگم کی حویلی میں جو میگزین تھا اور جس میں سات سو من بارود تھا سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ مَیں اپنے دومنزلہ پر چڑھا۔ دیکھتا کیا ہوں گرد و غبار اور دھواں آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ میگزین اڑ گیا۔ بارود کی عدم فراہمی کی وجہ سے تمام آلاتِ حرب بے کار تھے۔ دشمن دروازے پر کھڑا تھا۔ باہر سے امداد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بادشاہ پہلے ہی سے سوختہ جگر اور سوختہ سامان ہو رہے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے کچھ ایسا افسوں کیا کہ قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے

مقبرے میں گوشہ گیر ہونے میں عافیت سمجھی۔"

میلسن لکھتا ہے کہ:

"باغی فوج کے سپہ سالار بخت خاں نے اسی شب شہر کو خالی کر دیا اور اپنے ہمراہ ان لڑنے والوں کو بھی لے گیا۔ جن پر اس کو اعتماد تھا۔ بخت خاں نے ممکن الفاظ میں بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ چلیں انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ لیکن ملک کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور یہ کہ بادشاہ کی موجودگی سے اب بھی اس کے نام پر جنگ کو جاری رکھنا ممکن ہے اور کامیابی کے امکانات ہیں۔"

اگر بہادر شاہ کی فطرت میں اپنے اجداد بابر، ہمایوں اکبر اور عالمگیر کی سی ثابت قدمی ہوتی یا قوت ارادی کا شائبہ ہوتا۔ تو بخت خاں کی درخواست بے کار نہ جاتی۔ شہزادوں نے بھی فیروز شاہ کے علاوہ بادشاہ کا اتباع کیا۔

جنرل بخت خاں کی روپوشی

میگزین ختم ہو چکا تھا۔ بادشاہ قلعہ چھوڑ چکے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ جنرل صاحب نے مع اپنی فوج کے لکھنؤ کا رُخ کیا جہاں پہنچتے پہنچتے ان کے ہمراہ صرف پانچ ہزار فوج، 33 عورتیں نیز دلی وفرخ آباد کے کچھ لوگ باقی رہ گئے۔ خلد منزل میں سلطان بہو صاحبہ کے یہاں بسبب قرابت قریبہ قیام کیا۔ حضرت محل ملکہ اودھ نے جنرل بخت خاں کا پر خلوص خیر مقدم کیا۔ پانچ ہزار روپے دعوت کے علاوہ خلعت ورومال بھیجا۔ جنرل صاحب نے جلال آباد (ضلع ہردوئی) پر مورچہ لگایا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد محسوس کیا۔ کہ تحریک کے رہنماؤں کی باہمی چشمک اور اندرونی غداریوں کا یہاں بھی زور ہے اور جو دردانگیز انجام دہلی کا ہوا وہی لکھنؤ کا بھی ہونے والا ہے۔ لہٰذا ایک روز اچانک کہیں روپوش ہو گئے۔ سالہا سال تک ان کی تلاش جستجو جاری رہی۔ لیکن اس بہادر اور غیور جنرل کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ اکثر کا خیال ہے کہ وہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ وہاں فیروز شاہ اور تجمل حسین وغیرہ کو تو لوگوں نے دیکھا اور بخت

خاں کو کسی نے نہ دیکھا۔ایک خیال یہ بھی ہے اور ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرحد آزاد کی طرف چلے گئے اور قبائل میں انگریزوں کے خلاف کام کرتے رہے۔مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

بادشاہ کو تختِ حکومت پر برقرار رکھ کر خود تحریک کی قیادت کرنا شخصی دورِ حکومت میں ان کی زبردست سیاسی غلطی تھی جو ان کی ناکامیابی کا باعث ہوئی۔خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

''بخت خاں بے چارے پر دو حریفوں کا بوجھ پڑا۔ایک طرف انگریز تھے۔دوسری طرف مرزا مغل۔اِسی کشمکش میں فوجیں قابو سے باہر ہو گئیں۔انتظام کی مشین بے کار ہو گئی۔انگریزوں نے دہلی فتح کر لی اور انقلاب کی اسکیم دھواں ہو کر اڑ گئی۔''

تحریک بغاوت: نیک دل انگیزوں کی نگاہ میں

مندرجہ بالا واقعات سے ہمارے بزرگوں کی قربانیوں اور جانکاہیوں کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ کون سا مقصدِ اعلیٰ سامنے رکھ کر کیا۔بعض انصاف پسند انگریزوں نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔وہ تحریر کرنا بے محل نہ ہوگا۔

مسٹر لیکی لکھتے ہیں:

''اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے۔تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بغاوت تھی۔''

ڈاکٹر ہنٹر نے تحریر کیا:

''انہوں نے بغاوت میں حصہ لیا۔تو کسی ادنیٰ مقصد سے نہیں لیا۔''

مسٹر ڈزرائیلی وزیرِاعظم انگلستان نے 27 جولائی 1857ء کی تقریر میں بیان کیا:

''مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں۔کہ محض فوجی تکلیف کی بناء پر یہ بغاوت نہیں ہوئی تھی۔بلکہ وہ در پردہ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے۔''

مجیڈی لکھتا ہے:

جن کو ہم نے گرفتار کیا تھا۔ ان میں سے بہت سے تو اسی وقت ختم ہو گئے۔
لیکن آخر وقت تک ان کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا
تھے۔ جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایانِ شان علامات تھیں۔''

وہ مقصد عظیم جس کے لیے جنرل بخت خاں اور دوسرے لوگوں نے جان کی بازی لگائی۔ ہندوستان کی کامل آزادی اور احیائے سلطنت اسلامیہ تھا۔ لیکن جب کوئی قوم ایک مرتبہ اپنی حماقتوں سے غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر بہ آسانی چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ آزاد قوموں کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ تاہم 1857ء کی جدوجہد کو بالکلیہ ناکام بھی نہیں کہا جا سکتا۔

مابعد کے ملکی حالات پر اس جدوجہد کے اثرات بہت جلد ظاہر ہو کر رہے۔ کمپنی کی جابرانہ مطلق العنانی اور غیر ہمدردانہ طرز حکمرانی ختم ہوئی۔ انگریزی پارلیمنٹ نے عنان اختیار اپنے ہاتھ میں لی۔ اہلِ ملک کے حقوق اور اربابِ حکومت کی ذمہ داریوں کا تعین شروع ہوا۔ مسلح جدوجہد کی بجائے غیر مسلح جمہوری جنگ آزادی کا میدان کھلا اور آج سو سال سے بھی کم عرصہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو جنگ ہتھیاروں کے زور سے نہ جیتی جا سکی۔ اس میں بعد کے آنے والوں نے انگریزوں پر اپنے حسن تدبر، صبر و استقلال اور ایثار و جانبازی سے شاندار فتح حاصل کی۔ ایسی شاندار فتح کہ تاریخ اس کی نظر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس جنگ میں ہتھیار دوسرے تھے، ذرائع اور اسباب دوسرے تھے، لیکن جذبہ و روح وہی کارفرما تھی، جس نے 1857ء میں ہندوستانیوں کے دلوں کو گرمایا اور سربکف میدانِ کارزار میں لا کر کھڑا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ آزادی وطن کی جدوجہد کے ان سابقوں الاولون پر رحمت فرمائے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

56

پیری رئیس پاشا

ترکوں کے بحری بیڑے کو پرتگیزوں نے بحر ہند میں شکست دی۔ اس سے پرتگیزوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ انہوں نے عدن کی بندرگاہ پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور حجاز کی بندرگاہ، جدّہ پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

جدہ پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے وہ خانہ کعبہ کی بے حرمتی کرنا چاہتے تھے۔ ان باتوں کی روک تھام کے لیے سلیمان اعظم نے پیری رئیس کو ایک زبردست بیڑا دے کر بحرِ ہند میں پرتگیزوں سے لڑنے کے لیے بھیجا۔

امیر البحر پیری رئیس نے پرتگیزوں پر بندرگاہ عدن میں حملہ کر کے ان کو وہاں سے نکال دیا اور عدن کی حفاظت کے لیے ایک زبردست بحری بیڑا وہاں چھوڑا اور عرب کے ساحلی مقامات سے گزرتا ہوا مسقط کی بندرگاہ میں پہنچا۔

مسقط میں پرتگیزی بحری بیڑا غافل پڑا تھا۔ پیری رئیس نے اُسے گرفتار کر کے اپنے قبضے میں کرلیا اور مسقط سے پھر خلیج فارس کے ساحلوں پر پرتگیزوں کو زبردست شکستیں دے کر ہُرمز پہنچا۔ یہاں پرتگیزوں کی تازہ فوجوں سے اس کا سامنا ہوا۔ جن سے پیری رئیس کو شکست ہوئی۔ پیری رئیس صرف دو جہاز دشمن کے پنجہ سے نکال کر لا سکا۔

امیر البحر پیری کی شکست کی خبر سن کر سلیمان اعظم نے امیر البحر مرادِ اعظم کو بھیجا تھا۔ مرادِ اعظم نے ترکی بیڑے کو خلیج ہرمز کے سامنے مقابلہ کر کے چھڑانے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

پیری رئیس ایک عرصے تک بحیرۂ روم میں امیر البحر رہا اور آخر ستر سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

57

سلطان ٹیپو شہید

ٹیپو! مادر وطن کا مایہ ناز فرزند ٹیپو۔ غیرت وحمیت کا مجسمہ ٹیپو۔ پیکر حریت ٹیپو۔ شیر دل ٹیپو۔ ٹیپو جس نے ہندوستان کے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ بہادر ٹیپو دیوان ہلی کی مردم خیز سرزمین میں عین اس وقت پیدا ہوا جب آزاد ہندوستان کی عظمت کا آفتاب تنزل کی گہرائیوں میں غروب ہو رہا تھا۔

آپ کے والد ماجد حیدر علی سلطان بے اولاد تھے۔ انہیں اپنے جانشین کے نہ ہونے کا بے حد دکھ تھا۔ اور یہ تھی بھی بالکل قدرتی سی بات۔

ہوتا ہے درختوں کو بھی غم بے ثمری کا

حیدر علی کی پہلی بیوی مدت سے عارضہ فالج میں مبتلا تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو دوسری شادی کرنے کی بخوشی اجازت دے دی۔ حیدر علی نے میسور کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ میر معین الدین کی صاحبزادی کو منتخب کیا اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔

کہتے ہیں کہ حیدر علی نے شادی کے بعد شہر ارکاٹ میں حضرت ٹیپو مستان ولی رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں پہنچ کر التجا کی کہ حضور دعا فرمائیں کہ خداوند تعالیٰ اس بندہ کو فرزند بلند اقبال عطا فرمائے۔ ٹیپو مستان نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور بشارت دی کہ تمہارا فرزند ہندوستان کا ایک نامور، جلیل القدر اور عظیم المرتبت بادشاہ ہوگا۔ اس کا نام ٹیپو رکھنا۔ ٹیپو کناری زبان میں شیر کو کہتے ہیں۔ بچے کی پیدائش پر اس کا نام ابوالفتح ٹیپو رکھا گیا اور بعد میں ''ٹیپو سلطان'' مشہور ہوا۔

وہ گھر جس میں ہندوستان کی شجاعت و بسالت کے اس آفتاب نے پہلے پہل ضیا باری کی اور اپنے اقبال کے عروج کو دیکھا آفات زمانہ سے تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ البتہ ایک ٹوٹا پھوٹا

چبوترہ اور چار دیواری اب بھی موجود ہے۔ جہاں عظمت رفتہ حسرت ویاس کی آغوش میں گہری نیند سو رہی ہے۔ اس چار دیواری پر ٹیپو کی تاریخ پیدائش کندہ ہے۔ ٹیپو 1753ء میں پیدا ہوا۔

نسب

ٹیپو سلطان کا خاندان ابتدا میں پنجاب میں رہتا تھا۔ ان کا پر دادا محمد بہلول نامی فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ افغان تھا اور لودھی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بہلول دکن میں آ کر گلبرگہ میں مقیم ہوا۔ اس کا چھوٹا فرزند علی احمد تھا۔ جو کولار میں جا کر آباد ہوا۔ علی احمد کا سب سے چھوٹا لڑکا فتح محمد تھا۔ جس کے دو فرزند شہباز اور حیدر علی تھے۔

تعلیم و تربیت

حیدر علی خاں نے اپنی قابلیت اور زور بازو سے میسور کی حکومت حاصل کی۔ مگر وہ بالکل اَن پڑھ تھے۔ تعلیم کی کمی کے باعث خود جن ناموافق حالات اور کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑا وہ انہیں کبھی بھلا نہیں سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ٹیپو کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ شہزادے کو پہلے دینی علوم کی تعلیم دی گئی پھر مغربی اور اور مشرقی فنونِ جنگ سکھائے گئے۔ اس نے بہت جلد ان تمام علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی اور پندرہ برس کی عمر میں ہی فاضل ادیب اور قابل سپہ سالار بن گیا۔ وہ زیرک، جری، بہادر، مستقل مزاج اور مردِ میداں تھا۔ کیوں نہ ہو آخر شیروں کے بیٹے بھی تو شیر ہی ہوتے ہیں۔ کڑی آزمائش اور خطرناک حالات میں وہ سب سے پہلے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتا تھا۔ اس کی شجاعت سے سپاہیوں کے دل بڑھ جاتے تھے اور وہ بھی اپنے سردار کی پیروی میں جان پر کھیل جانا فخر سمجھتے تھے۔

مدراس کی جنگ

سلطان کی عمر ابھی پندرہ سولہ برس کی ہی تھی کہ اس کو میدانِ جنگ میں اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ ہاتھ لگا۔ 1768ء میں انگریزوں اور حیدر علی کے درمیان لڑائی شروع ہوئی۔ اس جنگ میں حیدر علی نے اپنی ایک فوج کی کمان شہزادہ ٹیپو کے سپرد کی۔

ٹیپو نے اپنا جاہ و جلال پہلے پہل مدراس میں دکھایا۔ مدراس کے محاذ پر ہی اس نے

انگریزی فوجوں کو پہلی شکست دی۔

جنگ ٹھن چکی تھی۔ ٹیپو سلطان کو پیش قدمی کا حکم ملا۔ وہ سواروں سمیت آندھی کی طرح مدراس پر چڑھ آیا۔ گولیوں کی بارش موسلا دھار تھی۔ تلواروں کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایک زبردست طوفان تھا جو تباہی مچاتا چلا آ رہا تھا۔ توپوں نے گولے پھینک پھینک کر فضا میں سیسے کی سیاہ چادر پھیلا دی۔ گورنر مدراس اور محمد علی والا جاہ مدراس میں ایک محفوظ مقام پر بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ اچانک ایک گولہ ان کے بالکل قریب آ کر گرا۔ گولے کا گرنا تھا کہ افراتفری پھیل گئی۔ گورنر بہادر بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور چھڑی، ٹوپی، تلوار میز پر چھوٹ گئی۔ اِدھر گورنر نے جہاز پر جا کر پناہ لی۔ اُدھر محمد علی گھوڑے پر سوار ہو کر محل کو بھاگ گیا۔

شہزادہ مدراس پر پہنچ چکا تھا۔ حیدر علی خاں بھی کرناٹک کو پامال کرتے چلے آ رہے تھے۔ حکومت مدراس کو اس یلغار کی خبر ملی تو عافیت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اوسان خطا ہو گئے۔ فی الفور کرنل بروک کو صلح کے لیے بھیجا۔ حیدر علی خاں مان تو گئے۔ لیکن انہوں نے مطالبہ کیا کہ محمد علی والا جاہ نے میرے ملک کو تباہ و برباد کیا ہے اسے میرے حوالے کر دیا جائے۔ جب مدراس گورنمنٹ نے یہ مطالبہ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ تو حیدر علی نے کہلا بھیجا کہ: ''اب میں مدراس کے دروازے پر پہنچ رہا ہوں وہاں گورنر اور کونسل کے ممبروں کی تجاویز پر غور کروں گا۔''

حیدر علی خاں آندھی کی طرح تین دن میں ایک سو تیس میل کی مسافت طے کر کے مدراس سے پانچ میل کے فاصلے پر سینٹ تھامس کے مقام پر آ پہنچے۔ جب مدراس گورنمنٹ نے حیدری فوجوں کی شان و شوکت کو دیکھا تو پامالی سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے اور 4 اپریل 1769ء کو یہ معاہدہ ہوا کہ بیرونی حملہ کی صورت میں فریقین ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ فریقین نے جو علاقے اب تک فتح کیے ہیں وہ ان کے قبضے میں رہیں گے اور محمد علی والا جاہ چھ لاکھ روپیہ سالانہ حکومت میسور کو بطور نعل بندی ادا کرے گا۔ اس سلسلہ میں کروڑ کا علاقہ حیدر علی کے سپرد کیا گیا۔

اس معاہدہ سے حیدر علی نے انگریزی حکومت کو مدراس سے نکالنے کی بجائے اُسے پھر وہاں قائم رہنے دیا اور اس طرح آخر کار اپنی حکومت کے فنا ہونے اور انگریزی حکومت کے حاوی

ہونے کا دروازہ بند کرتے کرتے پھر کھول دیا۔ کروڑ کا علاقہ حیدر علی کے سپرد کرنے سے انگریز مدبروں نے حیدر علی اور محمد علی والا جاہ میں ایک نئی خلش پیدا کردی جس نے رفتہ رفتہ اپنا کام کیا۔

مرہٹوں سے جنگ

انگریزوں سے جنگ کو ختم ہوئے ابھی تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ مرہٹوں نے سلطنت خداداد پر حملہ کر دیا۔ وہ بڑی قوت اور جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھے۔ ان کے تزک و احتشام اور جاہ و جلال کو دیکھ کر حیدر علی خاں نے معاہدے کے مطابق انگریزوں سے مدد مانگی لیکن انہوں نے مدد دینے سے صاف اور باقاعدہ انکار کر دیا۔ مرہٹے ترمیک راؤ کی سرکردگی میں بڑی آن بان کے ساتھ حملہ آور ہوئے۔ یوں سمجھیے کہ ایک طوفان مرگ تھا جو چلا آ رہا تھا۔ مرہٹوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اس لیے جان توڑ توڑ کر لڑنے کے باوجود حیدر علی خاں کو میدان چھوڑنے کے سوا چارہ نہ رہا۔

فضا گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ لڑتے لڑتے شہزادہ باپ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شفقت پدری جوش مارنے لگی۔ حیدر علی خاں ٹیپو کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ جب کوئی شہزادہ کے گم ہو جانے کا ذکر کرتا تو وہ نہایت بے تابی سے آسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہتے کہ: ”خدا کی امانت تھی وہ لے گیا۔“

غروب آفتاب کے قریب شہزادہ مرہٹی لباس پہنے ہوئے چند سواروں کے ہمراہ نمودار ہوا۔ باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ خوشی کے مارے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر صدقے اتارتے، خوشیاں مناتے، اشرفیاں لٹاتے، شہزادے کے ہمراہ سرنگا پٹم واپس آ گئے۔

ابھی جنگ جاری تھی کہ مرہٹوں کو ایک تیوہار آ گیا۔ اس روز ہر ایک مرہٹہ دریائے کاویری کے سنگھم پر نہانا باعث سعادت خیال کرتا تھا۔ ترمیک راؤ بھی بڑی آن بان اور شان و شوکت کے ساتھ اشنان کے لیے دریا کی طرف چلا اس کے ساتھ ساتھ مرہٹہ فوج قطار اندر قطار چلی آ رہی تھی۔ جب تمام فوج دریا کے کنارے جمع ہو گئی۔ تو ٹیپو نے ایک زبردست حملہ کر دیا۔ مرہٹہ فوج سراسیمگی کی حالت میں بھاگ نکلی۔ ترمیک راؤ بھی گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا۔

مدت تک مرہٹوں سے لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ابھی جنگ جاری ہوئی تھی کہ مادھو راؤ

پیشوا نے انتقال کیا۔ مرہٹوں میں باہم اختلافات تو پہلے سے ہی تھے اب ان کے کھلم کھلا دو فریق ہو گئے۔ ایک نارائن راؤ کو پیشوا بنانا چاہتا تھا دوسرا رگھوبا کا حامی تھا۔ مرہٹوں میں نفاق کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی گئی اور وہ اندرونی الجھنوں میں پھنس گئے۔ بالآخر 1771ء میں دونوں حکومتوں میں صلح ہو گئی اور مرہٹے جنگ میسور سے دست بردار ہو کر واپس پونا چلے گئے۔

حیدر علی خاں نے جو خونریز معرکے اور لڑائیاں لڑیں ٹیپو اکثر اُن میں شامل ہوتا رہا۔ بہت کم لڑائیاں ایسی ہوں گی جن میں فتح نصرت نے شہزادے کے قدم نہ چومے ہوں۔ اِن معرکوں نے اسے ایک آزمودہ کار جرنیل اور سرفروش بہادر بنا دیا۔ اس کی بہادری، شجاعت اور عزم کو دیکھ کر سپاہی اس کا احترام کرتے تھے۔ اور بڑے بڑے سیاستدان اس کے شاندار مستقبل کا پتہ دیتے تھے۔

شہزادہ ٹیپو کے مختلف حملے

بیلی کی شکست کے بعد شہزادے نے ارکاٹ کے محاصرہ میں حصہ لیا اور محمد علی والا جاہ کو شکست فاش دی۔ والا جاہ کے اکثر سرداروں نے حیدر علی خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان سرداروں میں سے پورنیا اور میر صادق کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے میسور کی چوتھی جنگ میں اپنے آقا کے ساتھ غداری کی۔ ان کی بے وفائی اور ریشہ دوانیوں سے میسور کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور ہندوستان پر اجنبی اقتدار مسلط ہوا۔

اِسی میر صادق کی غداری اور بے وفائی سے متاثر ہو کر علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے:

جعفر از بنگال و صادق از دکن!
ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن

اس معرکے کے بعد شہزادہ ماہی منڈل اور کیلاش گڑھ کی طرف بڑھا۔ وہاں کی انگریزی فوج حیدری فوج کے تزک و احتشام اور جاہ و جلال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی اور بغیر جنگ کیے قلعہ شہزادہ کے حوالہ کر دیا۔

اس کے بعد ٹیپو نے آمبور میں انگریزی فوجوں کو شکست دی۔ پھر اس نے کوہ رادت، تیلور اور تیاگ گڑھ کے قلعے پر بھی قبضہ کر لیا۔ تیاگ گڑھ کے قلعہ داروں کو امان دی گئی۔ لیکن

انہوں نے کیمپ میں آ کر غداری کی۔ جس کے سبب آخر انہیں کیفر کردار تک پہنچانا پڑا۔

آئر کورٹ سے جنگ وجدل

انگریزوں نے پے در پے شکست کھانے کے بعد آئر کورٹ کو جو ایک پختہ کار جرنیل تھا اور بنگال کی لڑائیوں میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا میسور کے محاذ پر بھیجا۔ حیدر علی خان دکن کے محاذ پر حملے کی تیاریوں میں مشغول تھا اس لیے اس نے اس حالت میں شہزادہ ٹیپو کو فوج کا ایک دستہ دے کر ونڈی واش پر حملہ کا حکم دیا۔ 22 جون 1781ء کو شہزادہ نے ونڈی واش کا محاصرہ کر لیا اور سیڑھیاں لگا کر قلعے کے اندر پہنچنے کی سخت کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

یکا یک حیدر علی خاں کی طرف سے آئر کورٹ کا راستہ روکنے کا حکم ملا۔ اور وہ فوراً محمود بندر میں آ پہنچا۔ آئر کورٹ بھی آزمودہ کار جرنیل تھا۔ یہاں اس نے شہزادہ ٹیپو اور حیدر علی خاں کی متحدہ فوجوں کو پورٹو نو وو کے مقام پر شکست دی اور محمود بندر کے قلعے پر قابض ہو گیا۔

انگریزی فوجوں نے قلعے پر قبضہ تو کر لیا۔ مگر ان کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ جہازوں میں بیٹھ کر بنگال سے مدد کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد کرنل گال اور کرنل اسٹو آرٹ گولہ بارود لے کر آ پہنچے۔ انگریزی فوجوں کی جان میں جان آئی۔ اور وہ جہازوں سے ساحل پر اتریں۔

حیدر علی خاں اور ٹیپو سرعت کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کی فوج بھی کیل کانٹے سے لیس ہو چکی تھی۔ سر آئر کورٹ حیدر علی خاں کو شکست دے کر ارنی کی طرف بڑھا۔ یہ خبر سن کر حیدر علی خاں بہ نفس نفیس مقابلہ کے لیے میدان میں آ گئے۔ جب سر آئر کورٹ کو یہ خبر ملی کہ حیدر علی خاں ساز و سامان سے آراستہ ہو کر بہت بڑی جمعیت کے ساتھ آ رہے ہیں تو وہ کاویری ندی کے کنارے کنارے واپس مدراس چلا گیا۔ جہاں چند روز بعد اس کا انتقال ہو گیا اور جنرل اسٹو آرٹ انگریزی فوجوں کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔

کرنل بریتھ وڈ حراست میں

اس معرکہ میں شہزادہ ٹیپو نے 18 فروری 1782ء کو کاویری ندی کے کنارے بریتھ وڈ کے چھکے چھڑا دیئے۔ کرنل اپنے سپاہیوں سمیت ندی کے کنارے خیمہ زن تھا۔ اُسے بے حد سمجھایا

گیا کہ یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں مگر اس نے ایک نہ مانی اور وہیں جما رہا۔

شہزادے نے موسیو لالی اور دیگر فرانسیسی افسروں کے ہمراہ دس ہزار پیادہ اور دس ہزار سوار اور بہت سی توپوں کے ساتھ کرنل برتھ وڈ کو گھیرے میں لے لیا اور اس کو شکست دی۔ آخر وہ سب انگریز افسروں سمیت گرفتار ہو گیا۔ شہزادہ قیدی افسروں سے خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آیا۔

کرنل ہمبرسٹن سے جنگ

کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے مرہٹوں سے صلح کر کے کرنل ہمبرسٹن کو مالابار کے اضلاع پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ انگریزی فوجوں نے آگے بڑھ کر کالی کٹ میں ڈیرے ڈال دیئے اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ پھر انہوں نے پالی گال چری کے راستے پانیر، رام نگری اور منگیری کوٹہ پر قبضہ کر لیا۔ جب شہزادے نے یہ سُنا کہ وہ نہایت سرعت کے ساتھ آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ تو وہ بھی میسور کے سرفروش سپاہیوں کو لے کر مقابلہ کو بڑھا۔

کرنل ہمبرسٹن پالی گال چری پر قابض تھا۔ جب 19 اپریل کو اسے خبر ملی کہ شہزادہ ٹیپو کی فوج قطار در قطار سمندر کی لہروں کی طرح بے خوف بڑھتی چلی آ رہی ہے تو اس پر ہیبت چھا گئی اور اس کی فوج میدان سے بھاگ نکلی۔ شہزادے نے ایک ہی دن میں انگریزی فوجوں کو جا لیا اور بے پناہ گولے برسائے۔ انگریزی سپاہیوں میں بدنظمی اور بے ترتیبی پھیل گئی۔ مالِ غنیمت کثیر مقدار میں ٹیپو کے ہاتھ آیا۔

سرنگا پٹم میں سلطان کی آمد

جب کارنوالس نے مصالحت سے انکار کر دیا۔ تو سلطان اپنے پایۂ تخت کی حفاظت کے لیے خود بھی سرنگا پٹم آ گیا۔ نظام کے پندرہ ہزار بے قاعدہ اور بودے سوار بھی انگریزی فوجوں سے آ ملے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ سلطان نے اس وقت ان پر کوئی حملہ نہ کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس وقت ان پر حملہ کر دیا جاتا تو ان میں سے کوئی بھی سلامت نہ رہتا۔

کارنوالس مئی کے وسط میں اس مقام پر آ پہنچا جہاں سے وہ سلطان کے پایۂ تخت کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ فوج کے ہمراہ سرنگا پٹم کی طرف بڑھا۔ اُدھر سلطان نے دریائے کاویری کے

شمال میں ایک ایسے محفوظ مقام پر اپنی فوج متعین کر رکھی تھی۔ جس کے سامنے پہاڑوں کی گھاٹیاں اور بے شمار بل کھاتے ہوئے نالے تھے۔

کارنوالس نے یہاں طلوع آفتاب سے پہلے حملہ کر دیا۔ سلطان کی توپوں نے جو قلعہ پر نصب کی گئی تھیں۔ اتنی شدید آتش باری کی کہ کارنوالس کو پسپا ہونے کے سوا چارہ نہ رہا۔

کارنوالس کی بے بسی

یہاں لڑائی شروع ہونے سے کچھ روز پہلے بمبئی والی فوج بھی پہنچ چکی تھی اور پریا پٹم کے مقام پر مقیم تھی۔ جو سرنگا پٹم کے جنوب میں کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ کارنوالس چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ جا ملے۔ لیکن برسات کا موسم آ گیا۔ ندی نالے پانی سے بھرپور ہو گئے اور وہاں تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ جب مشکلات میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ تو کارنوالس نے اس خیال سے کہ علیحدہ علیحدہ فوجوں پر باری باری حملہ نہ ہو جائے۔ بمبئی والی فوج کو مالا بار واپس جانے کا حکم دے دیا۔

یہاں بھی وہی آفت تھی۔ توپوں کی گاڑیوں کو کھینچنے والے بیل تک کھائے جا چکے تھے اور فوج بھوکوں مر رہی تھی۔ بیلوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ایبر کرومبائی کو اپنا توپ خانہ اور بارود وہیں چھوڑنا پڑا۔ جب وہ واپس آیا تو سلطانی سواروں نے ایک زبردست حملہ کیا اور اس کا ساز و سامان لوٹ لیا۔ انگریزی فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جب انگریزی فوجیں بھاگیں تو جنرل نے بہت سا بارود پریا پٹم کے مندر کی ایک عمارت میں بند کر دیا۔ سلطان کو اطلاع ملی۔ تو حکم دیا کہ فوراً آگ لگا دی جائے۔ آگ لگتے ہی یہ عمارت بارود سمیت بھک سے اڑ گئی۔ سپاہیوں نے اپنے آقا کے ہر حکم کی نہایت وفاداری سے تعمیل کی اور انگریزی فوجوں کو میدان سے بھگا دیا۔

ادھر کارنوالس کی فوج کے آدھے سوار گھوڑوں سے اترنے پر مجبور ہو گئے۔ فاقہ پر فاقہ ہو رہا تھا۔ توپخانہ کے سینکڑوں بیل مر گئے کچھ سپاہیوں نے کھائے۔ سلطان نے سڑکوں پر جو سپاہی ناکہ بندی کے لیے مامور کیے تھے۔ وہ اتنے چست اور ہوشیار تھے کہ اتحادیوں کی سامان رسد سے بھری ہوئی گاڑیاں کیمپ تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔ رسل و رسائل کا سلسلہ بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ جو کچھ آتا راستہ ہی میں لٹ جاتا۔ ہری پنت اور پرس رام بھاؤ جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ سرنگا پٹم کے

قرب وجوار میں پہنچ گئے ہوں گے ان کا کوئی پتہ نہ ملتا تھا۔

اس خطرناک صورتِ حال میں کارنوالس اب اپنے توپ خانہ کو بھی برباد کرنے کو تیار ہوگیا۔ بارود کی گاڑیوں کو آگ لگادی گئی اور توپوں کو دریا میں پھینک دیا گیا۔ باقی ماندہ انگریزی فوج نے بنگور کا رُخ کیا۔

سرنگا پٹم میں رہنے والوں کی مسرت وانبساط کی کوئی حد نہ رہی۔ قلعہ کی فصیل پر سلامی کے لیے توپیں داغی گئیں۔ گھر گھر چراغاں کیا گیا۔ درباریوں نے مبارک سلامت کی دھوم مچا دی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ سلطان نے ایک دفعہ پھر اپنے دشمن کو نیچا دکھایا ہے۔

لیکن سلطان جانتا تھا کہ ابھی خطرہ پوری طرح دُور نہیں ہوا۔ کارنوالس کو اسی پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں دیکھ کر سلطان نے تحفے بھیجے اور مصالحت کے لیے خط لکھا۔ لیکن کارنوالس کو خیال تھا کہ اگر اتحادیوں کی پوری قوت اور فرانسیسیوں کی مدد نہ ہونے کے باوجود اس وقت سلطان بچ کر نکل گیا۔ تو پھر اس سے لڑنے کا ایسا زریں موقعہ ہاتھ نہ آئے گا۔ اس لیے اس نے تحائف تو واپس بھجوادیئے اور خط کا کوئی جواب نہ دیا۔

یکا یک بہت بڑی مرہٹہ فوج ساز وسامان لے کر آ پہنچی۔ کمک کے پہنچنے پر گورنر جنرل بہادر پھر سرنگا پٹم کا رُخ کرنے کے قابل ہوگئے۔

اتحادیوں کی نقل وحرکت دیکھ کر سلطان نے بھی جنگ کی تیاری شروع کردی۔ بارش کا موسم تھا۔ اس لیے فوراً جنگ ممکن نہ تھی۔ انگریزی توپ خانہ اور بارود بھی بہت حد تک برباد ہو چکا تھا۔ اس لیے کارنوالس نے سامان جنگ اکٹھا کرنا شروع کردیا۔ تاکہ موسم بدلتے ہی حملہ کر سکے۔ بنگلور کے مقام پر اگلی جنگ کے لیے سامان رسد جمع ہونے لگا اور محمد علی والا جاہ کو بھی مدد کے لیے خط لکھا گیا۔

اتحادیوں کی نقل وحرکت

اتحادیوں نے 4 جولائی کو پھر جنگ کے لیے نقل وحرکت شروع کردی۔ وہ ہلی ورگ، سادن ورگ، اتری، ورگ اور دوسرے ٹیڑھے راستوں سے چکر کاٹتے ہوئے 7 جولائی کو بنگور کی حدود میں آ پہنچے۔ یہاں سے اتحادیوں نے سلطان کے ملک کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جدا جدا

راستے اختیار کیے۔ مرہٹے چیتل ورگ کو بڑھے۔ نظام کے سواروں نے گنج کوٹہ کا رُخ کیا اور انگریزوں نے بنگلور کی راہ لی۔ انہوں نے ایک مہینے میں سلطان کے علاقہ کو پامال کر ڈالا۔ کرناٹک سے بھی ایک بڑی فوج کارنوالس سے آملی۔

اس موقعہ پر سلطان نے اپگی راؤ نامی مرہٹہ کو سفیر بنا کر مصالحت کے لیے کارنوالس کے پاس بھیجا۔ کارنوالس نے سلطان کے سفیر کی باتیں سننے سے انکار کر دیا اور اس کے ساتھ بہت بُری طرح پیش آیا۔ جب مرہٹوں نے اپنے ہم قوم کو صلح کے لیے آتے دیکھا۔ تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ اس پر پل پڑے۔ اپگی راؤ نے مرہٹوں کے اس غیظ وغضب سے بچنے کے لیے انگریزوں سے حفاظتی دستے کی درخواست کی۔ چنانچہ اسے انگریزی فوجوں کی حفاظت میں واپس پہنچا دیا گیا۔

انگریزوں اور ان کے حلیفوں نے اگست ستمبر اور اکتوبر میں حیدر آباد اور کرناٹک کو جانے والی سڑکوں پر بہت سے قلعے سر کر لیے۔ انہوں نے سلطان کی رعایا کو بڑی بیدردی سے تباہ وبرباد کیا۔ اور جو کچھ ان کے ہاتھ لگا۔ لُوٹ کھسوٹ کر لے گئے۔

کوئمبٹور میں لیفٹیننٹ چامرز کی شکست

شمال مغربی میسور میں ابھی یہ چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی کہ سلطان کو اچانک خبر ملی کہ کوئمبٹور میں تھوڑی سی انگریزی فوج مدافعت کر رہی ہے۔ فوراً فوج کا ایک دستہ اس قلعہ کو فتح کرنے کے لیے بھیج دیا۔ پہلے تو کچھ دیر انگریزی فوج نے مقابلہ کیا اور سلطان ٹیپو کے سپاہیوں کو روکے رکھا۔ لیکن جب سلطان کا ایک زبردست سپہ سالار قمر الدین خاں کمک لے کر آ گیا تو انگریزی فوج کے حوصلے پست ہو گئے۔ محصور فوج سراسیمگی میں بھاگ نکلی۔ لیفٹیننٹ چامرز اپنے ایک ہزار سپاہیوں اور جاسوسوں سمیت گرفتار ہو گیا۔

اس موقع پر سلطان نے ایک بہت بڑی جمعیت کے ساتھ بڈنور کی طرف کوچ کیا۔ اس یلغار کا مقصد انگریزوں کی رسد کو لوٹنا تھا۔ لیکن پرس رام بھاؤ کو اطلاع مل گئی اور یہ مہم کامیاب نہ ہو سکی۔ اس وقت مرہٹے چیتل ورگ کے قلعے کو گھیرے ہوئے تھے۔ سلطان نے سرنگا پٹم کو مراجعت فرمائی۔

ساون ورگ اور اتری ورگ پر حملے

کارنوالس نے سرنگاپٹم اور بنگلور کے تمام قلعوں کو فتح کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان میں ساون ورگ اور اتری ورگ سب سے مضبوط اور مستحکم قلعے تھے۔ ساون ورگ کو اپنی ساخت اور قدرتی تحفظات کی بناء پر ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔ اس علاقے کی آب وہوا ناساز گار تھی۔ اس وجہ سے لوگ اسے موت کا پہاڑ کہتے تھے۔ سلطان کو اس قلعہ کی مضبوطی کا پورا یقین تھا۔ اس لیے جب کارنوالس کے اس ارادے کی خبر اس کو ملی تو اطمینان ہوا کہ اس حملہ میں آدھے فرنگی سپاہی تباہ و برباد ہو جائیں گے اور جو زندہ رہیں گے وہ آب وہوا کی نذر ہو جائیں گے۔

کارنوالس 10 دسمبر 1791ء کو اس قلعے کے قریب پہنچ گیا۔ اور اس نے گیارہ دن کے محاصرے کے بعد دفعتہً ہلہ بول دیا۔ تھوڑے سے کشت وخون اور ہنگامے کے بعد وہ اس قلعہ پر قابض ہو گیا۔ پھر اُس نے بلا نقصان اٹھائے 24 دسمبر کو اتری ورگ پر قبضہ کرلیا۔ سلطان کے سپاہی گھبرا گئے۔ جونہی انگریزی فوجیں فصیل پر آئیں وہ بھاگ نکلے۔ اس کے بعد کارنوالس چھوٹے چھوٹے قلعوں کو فتح کر کے تمام علاقہ پر قابض ہو گیا۔

میسور کی چوتھی جنگ

اعلان جنگ کے بعد انگریزی فوجیں ٹڈی دل کی طرح یمین دیسار سے بڑی تیزی کے ساتھ سلطنت خداداد کی طرف بڑھیں۔ سلطان ان کی نقل وحرکت سے بے خبر تھا۔ بمبئی کی ستر ہزار فوج کورگ کے گھنے جنگلات سے گزر کر سداپور اور سدا سیر کے دوروں پر قابض ہو گئی۔

جب سلطان کو اتحادیوں کی یورش کی خبر ہوئی تو اس نے فی الفور اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا اور پانچ مارچ کو سداپور کے قریب دلکش پہاڑوں میں آ پہنچا۔ اس نے بارہا اپنے سپاہیوں سے کہا کہ: ''ٹیپو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ دشمن کو آگے بڑھنے دو اُسے اپنی قوت کا پتہ چل جائے گا۔''

اگلے دن آپ نے مہیب جنگلوں سے گذر کر لیفٹیننٹ کرنل مونٹریز کی فوج پر حملہ کیا اور سخت گولہ باری کے بعد اسے پوری طرح گھیر لیا۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنا چاہتا تھا کہ یکا یک جنرل اسٹوارٹ اس کی مدد کو آ پہنچا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر سلطان نے اپنی فوجیں پیچھے ہٹا

لیں اور انگریزی فوجوں کو بڑھنے کا راستہ مل گیا۔

کچھ دیر سرنگا پٹم کے آس پاس مقابلے ہوتے رہے۔ آخر سلطان نے سرنگا پٹم کا رُخ کیا۔ اس کے وزیر پورینا اور میر صادق انگریزوں سے ساز باز کر چکے تھے۔ جب کبھی مقابلہ ہوتا وہ اپنے سپاہیوں کو انگریزی توپوں کی زد میں رکھ کر کٹوا دیتے تھے۔ میر قاسم جس پر سلطان نے ہمیشہ عنایات کی تھیں انگریزوں کے جھانسے میں آ چکا تھا۔

جب سلطان نے دیکھا کہ وزراء دلزلی کی سازشوں کا شکار ہو چکے ہیں تو خطرناک حالات کے پیشِ نظر اس نے ایک دفعہ پھر مصالحت کی سلسلہ جنبانی کی اور 9 اپریل کو جنرل ہارس کے نام ایک خط لکھا کہ:

> ''گورنر جنرل لارڈ مارننگٹن بہادر نے مجھے ایک خط بھیجا تھا۔ اس کی نقل بھی شامل کر دی گئی ہے۔ آپ اس سے بخوبی سمجھ جائیں کہ مَیں نے عہد نامہ کی شرائط کو سختی کے ساتھ نبھایا ہے۔ پھر انگریزی فوجوں کی پیش قدمی اور جارحانہ اقدام کا کیا مطلب ہے؟ آپ ہی کہیے کہ مَیں آپ کو اس سے زیادہ کیا لکھوں؟''

جنرل ہارس نے جواب میں لکھا کہ اس خط کا جواب ....آپ کو گورنر جنرل بہادر سے مل جائے گا۔ آپ ان کی طرف رجوع کریں۔

خندقیں 11 اپریل کو بالکل تیار ہو چکی تھیں۔ اگلے روز سلطان نے انگریزی کیمپوں پر خوفناک گولہ باری شروع کر دی۔ دھوئیں کے تاریک بادلوں میں دُور دُور تک شعلوں اور چنگاریوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ توپوں نے اتنے فاصلے تک گولے پھینکے کہ ایک گولا کمانڈر انچیف کے کیمپ تک پہنچ گیا۔

دو دن بعد بمبئی والی فوج بھی جنرل ہارس کی فوج سے آملی اور اتحادیوں کا یہ طوفان مجتمع ہو کر آگے بڑھا اور جنگ زور شور سے ہونے لگی۔

20 اپریل کو انگریزی ہیڈ کوارٹر سے سلطان کو ایک خط موصول ہوا۔ جس میں صلح کی شرائط درج تھیں۔ پہلی اہم شرط یہ تھی کہ سلطان فرانسیسی سپاہیوں کو بَرطرف کر دے اور فرانسیسیوں کے ساتھ اپنے تعلقات بالکل منقطع کر دے۔ دوسری یہ کہ دو کروڑ روپیہ بھی اتحادیوں کو ادا کرے

جس میں سے آدھافی الفورادا کر دیا جائے اور باقی ایک کروڑ کے ادا ہونے تک چار شہزادے اور چار بڑے بڑے سردار یرغمال کے طور پر حوالے کر دے۔

لڑائی جاری تھی۔ سلطانی لشکر کافی دیر تک ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔لیکن اتحادیوں کے خوفناک طوفان نے 24اپریل کی شام تک قلعے کی مغربی فصیل کی توپوں کو بالکل خاموش کر دیا اور سلطان کے سواروں کی حد بندیوں کو توڑ ڈالا۔لیکن دریا کے پچھلے کنارے پر ابھی خندقوں اور مورچوں پر میسور کے بہادروں کا قبضہ تھا۔ وہ قلعہ شکن توپوں کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے جنرل ہارس نے اپنی فوجوں کو زبردست حملے کا حکم دیا۔ سیّد غفار پندرہ سو جانبازوں کے ساتھ دادِ شجاعت دے رہا تھا۔ان کھائیوں کے بچاؤ کے لیے قلعہ کے بندوقچی مسلسل گولیاں برسا رہے تھے۔ اپنی آزادی اور عزت کے تحفظ کے لیے سپاہی جان توڑ توڑ کر لڑے اور بالآخر دریا میں کود پھاند کر واپس چلے گئے۔

سلطان نے 28اپریل کو جنرل ہارس کے 20اپریل کے اس خط کا جواب لکھا۔ جس میں صلح کی شرائط درج تھیں اور کہا کہ:

> "مجھے آپ کی دوستانہ چٹھی کے وصول ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مَیں مضمون کو سمجھ چکا ہوں۔ جن معاملوں پر استفسار کیا گیا ہے۔ وہ سفیروں کے توسط کے بغیر طے نہیں ہو سکتے۔ مَیں دو معزز آدمی بھیجنے والا ہوں۔ بدگمانی نہ کیجیے۔ مصالحت سے بات طے ہو جائے گی۔ وہ سب کچھ آپ کو سمجھا دیں گے۔"

جنرل ہارس نے کہلا بھیجا۔ کہ ہم اپنی شرائط سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں۔ اس نے سفیروں کو آنے کی اجازت دینے سے قطعی انکار کر دیا اور کہا کہ کل تین بجے دوپہر تک ہر حالت میں جواب پہنچ جانا چاہیے۔

انگریزوں کی چال یہ تھی کہ سلطان ان کی طرف سے کوئی اطمینان کیے بغیر فرانسیسیوں کو جواب دے دے اور ایک کروڑ روپیہ بھی ادا کر دے۔ اس طرح فرانس کے سپاہی افسر اور توپچی جو لڑنے کے قابل ہیں اور مقابلہ میں مدد دے سکتے ہیں سلطان کی امداد کے قابل نہ رہیں اور زرِ نقد بھی سلطان سے لے لیا جائے۔ سلطان کے بہادر شہزادے اور سردار بھی قبضے میں لے لیے جائیں

اوراس طرح اس کو بے بس کر کے پھر جو چاہیں منوائیں۔لیکن ٹیپو اپنی واضح شکست کے وقت بھی اس طرح کی بے عزتی برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔

انگریزی فوجوں نے 2 مئی کو طلوع آفتاب سے پہلے ہیبت ناک گولہ باری شروع کر دی۔توپوں کی دنا دن اور دھائیں دھائیں سے خوف و ہراس چھا رہا تھا۔شام سے پہلے قلعہ کی دیوار میں شگاف ہو گیا۔ایک طرف کی فصیل پاش پاش ہو گئی۔سلطان کے ''گندم نما جو فروش'' امراء و وزراء انگریزوں سے ساز باز کر چکے تھے۔اگلے دن پو پھٹنے سے پہلے انگریزی فوجوں کو مناسب مقام پر اوٹ میں بٹھا دیا گیا تا کہ جونہی دیوار سے سفید رومال کا اشارہ ہو فوراً حملہ بول دیں۔میر قاسم تو رخصت کا بہانہ کر کے گیا تھا مگر وہ ولزلی سے جا ملا.......... سلطانی سپاہیوں نے بہت دور تک اس کا تعاقب کیا۔لیکن گرفتار نہ کر سکے۔

سلطان ٹیپو کے آخری سانس

سلطان محاصرے کے پچھلے دو ہفتوں سے اتری فصیل کے قریب ایک دروازے میں متمکن تھے۔جو ڈڈی دراز ے کے نام سے مشہور تھا۔وہ موریچوں کے قریب رہنا چاہتے تھے۔ تا کہ لڑائی کے اتار چڑھاؤ کو بچشم خود دیکھتے رہیں۔بارہا فرمایا:

''موت کا ایک دن معین ہے۔پھر ڈر کیسا۔موت جب چاہے زندگی کا رشتہ منقطع کر دے۔''

سلطان آخر دم تک مقابلہ کرنے کے لیے مستعد تھا۔انہیں یقین تھا کہ سرنگا پٹم پر کسی کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔دغا باز امراء خطرے سے خبردار ہونے کے باوجود کہتے تھے کہ جہاں پناہ! انگریز تو سامان رسد کی کمی کی وجہ سے محاصرہ تک کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ان کی گولہ باری سے دیواروں پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا۔

سلطان نے اس مصیبت کے وقت میں اپنے فرانسیسی افسروں کو بلا کر کہا:

''موجودہ حالت تم دیکھ رہے ہو۔جس پر کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔جن لوگوں کو میں اپنا معتمد اور وفادار جانتا تھا۔ان کی مکاری اور دغا بازی کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں۔غنیم کا زور روز بروز ساعت بہ ساعت ہر جگہ

بڑھتا جاتا ہے۔اب کیا کرنا چاہیے۔''

یہ فرانسیسی قول کے سچے، بہادر اور عزت و ناموس پر جان دینے والے تھے۔آقا کو مصیبت میں دیکھ کر انہوں نے دست بستہ عرض کی کہ:

''ہم نے حضرت کا نمک کھایا ہے اور حضرت نے ہم پر بھروسہ کیا ہے۔ہم حضرت کے پسینے پر اپنا خون گرانے کے لیے تیار ہیں۔اب صلاح وقت یہ ہے کہ آپ جواہرات کی پیٹیاں، اشرفیاں اور توشہ خانے کا قیمتی سامان لے کر حرم سمیت آدھی رات کے بعد خاموشی سے قلعہ معلیٰ سے باہر تشریف لے جائیں۔''

وہ چاہتے تھے کہ سلطان نرغے سے نکل کر کسی ایسے محفوظ قلعہ میں چلے جائیں جہاں سے وہ اپنی سلطنت کو اتحادیوں کے جبر و استبداد سے بچا سکیں۔انہوں نے صلاح دی کہ مناسب یہ ہے کہ آپ چیتل ورگ کے قلعے میں چلے جائیں اور ''یہ قلعہ ہمارے اور موسیو لالی کے سپرد کر دیں۔ جب تک ہم میں سے ایک بھی باقی رہے گا حضرت کے ادائے نمک میں قصور نہ ہوگا اور اگر یہ بات منظور خاطر نہ ہو۔تو ہم سب فرانسیسیوں کو پکڑوا کر انگریزوں کے سپرد کر دیں۔وہ ہمارے نکل جانے سے حضرت کے ساتھ مصالحت کی گفتگو شروع کر دیں گے۔کیونکہ ان کو ہمارے ہی ساتھ کینہ و پرخاش ہے۔''

فرانسیسی افسروں کی یہ درد بھری باتیں سلطان کے دل میں نشتر کی طرح اتر گئیں۔ انہوں نے فرمایا کہ مَیں آپ جیسے وفاداروں کو جیتے جی دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔میری سلطنت تباہ و برباد ہو جائے۔لیکن مَیں آپ سے کبھی منہ نہیں موڑ سکتا۔

سلطان نے حرم اور قیمتی اشیاء کو دوسرے قلعے میں منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ابھی کوچ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔کہ پورنیا میر صادق اور دوسرے غداروں نے کہا کہ حضور آپ قلعہ فرانسیسیوں کے حوالے نہ کریں۔یہ کبھی آپ کے ساتھ وفا نہیں کریں گے۔جونہی آپ یہ قلعہ ان کے حوالے کریں گے۔یہ اسے انگریزوں کے سپرد کر دیں گے۔

سلطان نے اس نازک موقع پر اور امراء کو بھی بلایا تا کہ ان سے بھی مشورہ لے۔
بدرالزمان خاں نائطہ نے فرانسیسیوں کی تجویز کا ذکر کرتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا:

"قبلہ عالم! جونہی حضرت کے معہ خواتین وخزانہ وشہزادگان قلعہ چھوڑ کر باہر جانے کی خبر ہوگی سب جاں نثاروں کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی اور شیرازہ بکھر جائے گا۔ پس اس وقت یہ عمل ہرگز شایاں ہمت شاہانہ نہیں ہوسکتا۔"

سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر کہا: رضائے مولا از ہمہ اُولیٰ۔

سلطان نے بندھا بندھایا سامان وہیں رکھ دیا۔ سازش مکمل ہو چکی تھی۔ سلطان کا اقبال ڈوب رہا تھا۔ اس حالت میں سلطان نے حرم سرا کے اردگرد کھائیاں کھدوا کر بارود بھر دی۔ تا کہ اگر خطرہ ہو تو حرم سرا کو ہی اڑا دیا جائے۔

سلطان نے 4 مئی کو فصیل کا معائنہ کیا اور بڑی احتیاط سے اس کی مرمت کرائی۔ پھر اس جگہ پہنچے۔ جہاں شگاف ہوا تھا اور سیّد غفار کو خاص ہدایات دے کر واپس آ گئے۔

یکا یک سلطان کے سرداروں نے آ کر خبر دی۔ کہ ہم انگریزی فوجوں کا منہ توڑ جواب دے رہے ہیں۔ لیکن دشمن کے کیمپ میں فوجی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج دن میں ہی یا رات کو حملہ ضرور ہوگا۔ سلطان نے فرمایا۔ کہ دن کو تو حملہ ممکن نہیں۔ البتہ رات کے لیے ایسی احتیاطی تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں کہ دشمن کے ہر حملے کا سختی سے جواب دیا جائے۔

سلطان دیر تک مورچوں میں گشت کرتے رہے۔ آخر جب تھک گئے تو ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر خاصہ طلب کیا ابھی ایک لقمہ ہی حلق سے اترا تھا کہ شور وشین کی آوازوں نے تڑپا دیا۔ لوگ چیختے چلاتے آئے کہ سیّد غفار شگاف پر کمان کرتا ہوا توپ کے گولے سے شہید ہو گیا ہے۔

سلطان کو اپنے باوفا جاں نثار کی شہادت کی خبر سُن کر بے حد صدمہ ہوا کچھ دیر پیچ وتاب کھانے کے بعد فرمایا کہ:

"مجاہد موت سے نہیں ڈرتے۔ سیّد غفار بھی موت سے نہیں ڈرا اُسے تاج

شہادت مل گیا۔"

پھر یاس وحسرت سے آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر کہا:

"اب ہم بھی آفتاب لب بام اور کوئی دم کے مہمان ہیں۔"

فوراً ہاتھ دھو کر اُٹھے۔تلوار لگائی، بندوق بھری اور سرداروں سمیت بڑی تیزی سے شگاف کی طرف روانہ ہوئے۔سلطان بڑی تمکنت سے طاؤس نامی گھوڑے پر سوار ہو کر محل سے نکلے اور فرمایا:

"اے پروردگار عالم میری حقیر قربانی کو قبول کیجیے۔"

اس وقت ہلکے رنگ کا جیکٹ اور نفیس چھینٹ کا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔کمر میں سرخ رنگ کا پٹکا اور سر پر قیمتی دستار تھی۔سونے کی دو پیٹیاں بھی تھیں۔جن میں رنگا رنگ کے قیمتی پتھر مزین تھے۔ایک میں تلوار اور دوسری میں کارتوس لٹک رہے تھے۔داہنے بازو پر چاندی کا ایک تعویذ بندھا تھا۔جس میں قرآن مجید کی آیات رقم تھیں۔

جب سلطان اپنے باوفا نوکروں کے ساتھ شگاف کی طرف جا رہے تھے۔تو میر صادق نے واپس آنے کا دروازہ بند کرا دیا اور فصیل سے انگریزی فوج کو ہلہ بولنے کا اشارہ کر کے خود کمک کے بہانے قلعہ سے باہر جانے لگا۔گھوڑے پر سوار ہو کر تیسرے دروازے پر پہنچا۔تو دربان سے کہا:

"خبردار میرے جانے کی خبر کسی کو نہ دینا۔"

یکا یک ایک غضبناک سپاہی نے سامنے سے آ کر کہا:

"او بے غیرت تو اپنے آقا کو اس خوفناک مصیبت میں پھنسا کر کہاں جا رہا ہے۔"

پھر اس نے جوش غضب میں تلوار کا ایک ایسا جچا ہوا ہاتھ مارا کہ میر صاحب کا سر تن سے جدا ہو گیا۔صاحب نشان حیدری لکھتے ہیں کہ:

> "اس واقعہ کے چار دن بعد اس کی بے کفن لاش اسی جگہ گاڑ دی گئی۔آج بھی لوگ آتے جاتے اس کی قبر پر تھوکتے اور پیشاب کرتے ہیں۔اس کو لعنت سے یاد کرتے ہیں۔"

اُدھر انگریزی فوجوں کو ہلہ بولنے کا حکم مل چکا تھا۔وہ برق و باد کی طرح آگے بڑھیں۔

گولیوں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جنرل بیرڈ بھی پیچ وتاب کھاتا ہوا نکلا۔ اس نے میر قاسم کے ہمراہ جس کی غداری کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں فصیل کی جانب بڑھ کر باآواز بلند کہا:

''اے مردان دلاور۔ میرے پیچھے چلے آؤ اور آج انگریزی سپاہیوں کی آبرو رکھ لو۔''

سلطان بھی شگاف پر پہنچ چکے تھے۔ ایک محفوظ مقام پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹنے سے روکا اور زبردست حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سلطان اپنی سپاہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے خود بھی انگریزی فوجوں پر بار بار حملے کرتے تھے۔ چند افسروں نے بتایا کہ بہت سے یورپین سپاہی آپ کی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔

سلطان کے اکثر رفقا یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کر کے جنت الفردوس کو سدھارتے گئے۔ انگریزی فوج لڑتے لڑتے بالکل قریب آ گئی جب تک جاں نثار زندہ رہے سلطان ایک ایک انچ زمین کے لیے برابر لڑتے رہے۔ لیکن جب دیکھا کہ اس مقام پر مدافعت بے سود ہے۔ تو واپس چلے آئے اور اس پل پر پہنچے جو قلعے کے اندر کے حصے میں جاتا تھا۔ قریب آئے تو دروازے کو بند پایا۔ دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میر صادق دروازہ بند رکھنے کی تاکید کر گیا تھا۔

ہجوم اس قدر تھا کہ سلطان کو کسی طرف جانے کی راہ نہ ملتی تھی۔ آخر گھوڑے کو مہمیز کی اور انگریزی فوجوں پر شیر غضبناک کی طرح حملہ کیا۔ سلطان کی ہمت مردانہ انتہائی عروج پر تھی۔ میسور کا شیر بپھرا کھڑا تھا اور سرنگاپٹم کی سرزمین اس کے خون کی پیاسی تھی۔

سلطان بندوق بھر بھر کر فائر کرتے رہے۔ جب گولیاں ختم ہو چکیں تو تلوار سونت کر لڑتے رہے۔ اس وقت چاروں طرف گولیاں برس رہی تھیں۔ اچانک ان کے سینے کی بائیں جانب ایک گولی لگی۔ سلطان نے بار بار انگریزی فوج کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن گولیوں کی بوچھاڑ نے ہر بار آگے بڑھنے سے روک دیا۔

''جہاں پناہ'' راجہ خاں نے کہا۔ ''یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں واپس چلیے۔''

سلطان نے گرجتی ہوئی آواز سے جواب دیا: ''نہیں! ہرگز نہیں!! میں اسی مقام پر جان دوں گا۔ دشمن میری لاش پر سے گذر کر قلعے میں پہنچے گا۔''

اُدھر انگریزی فوج نے غداروں کے ساتھ مل کر خندق کے اوپر سے ایک اور راستہ

دریافت کرلیا۔ جو قلعہ کے اندر جاتا تھا اور دوسری طرف سے آ کر گولیاں برسانے لگی اب سلطان کے سینے پر دائیں جانب بھی ایک گولی لگی اور گہرا زخم ہو گیا۔

12 رجمنٹ کے سپاہی گولیاں برساتے چلے آ رہے تھے۔ سلطان دست بدست جنگ میں مصروف تھے۔ جب آپ کا گھوڑا بھی زخموں سے چور چور ہو کر بیٹھ گیا۔ تو زین سے زمین پر آ گئے اور راجہ خاں سے کہا:

''میں زخمی ہو گیا ہوں۔''

اس نے کہا کہ حضور اپنے آپ کو انگریزوں پر ظاہر کر دیں۔ سلطان نے جواب دیا کہ:

''کیا تم دیوانے ہو گئے ہو خاموش رہو۔''

بہادر سلطان اپنے دشمنوں کا اسیر بننا نہ چاہتا تھا۔ جونہی سلطان گھوڑے سے گرے۔ چند باوفا جاں نثار فوراً پالکی میں لٹا کر دروازے کے پیچھے بہت دور لے گئے اور لاکھ منتیں کیں کہ اپنے آپ کو انگریزوں پر ظاہر کر دیجیے۔ لیکن غلامی کا بھیانک تصور انہیں بے چین کر رہا تھا۔ وہ دانستہ موت کے ویرانے میں جا رہے تھے۔ تاکہ قربانی کی مشعل سے آزادی کی شاہراہ کو روشن کریں۔ جان نثاروں کے پیہم اصرار سے تنگ آ گئے تو جھنجھلا کر کہا:

''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔''

گورہ فوج برابر بڑھ رہی تھی۔ جنرل بیرڈ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ کینہ و کدورت کا دھواں ابھی تک اس کے دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔ آخر کچھ انگریز سپاہی سلطان کے قریب آ گئے۔ ایک سپاہی نے زریں پیٹی پر ہاتھ ڈالا۔ سلطان نے پلٹ کر تلوار کا وار کیا۔ جس سے اس کا گھٹنا زخمی ہو گیا۔ سپاہی نے فوراً نشانہ تاک کر گولی چلائی وہ سلطان کی کن پٹی کو چیر کر نکل گئی اور آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ سلطان کی شہادت کے بعد تمام جاں نثار ایک ایک کر کے ان کی لاش کے اردگرد ڈھیر ہو گئے۔

آہ! مادر وطن کا غیور سرفروش مجاہد چل بسا اور اس کے ساتھ ہندوستان کی عظمت بھی صدیوں کے لیے رخصت ہو گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

58

جہانگیر

محمد جہانگیر بادشاہ غازی کے لقب سے آگرہ میں تخت نشین ہوا۔ایک طلائی زنجیر باندھ کر دریائے جمنا کے کنارے ایک ستون سے لٹکا دی گئی۔اس میں ساٹھ گھنٹیاں تھیں۔حکم ہوا کہ جو مظلوم دادرسی کا طالب ہو اس زنجیر کو ہلائے۔بادشاہ کا سایہ عاطفت فوراً اسے اپنی آغوش میں لے لے گا۔بارہ احکامات جاری ہوئے جن لوگوں نے جہانگیر کو تخت سے محروم کرنے کی سازش کی تھی انہیں معاف کر دیا گیا۔بے شمار قیدی رہا ہوئے، منصب داروں اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو مژدہ ہوا۔متعدد محصولات منسوخ ہو گئے شاہراہوں کی حفاظت کا اہتمام از سر نو ہوا۔شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کی خرید وفروخت پر پابندی عائد کر دی گئی۔مجرموں سے ہمدردانہ برتاؤ کی تاکید ہوئی۔جائیداد غصب کرنے کا رواج ختم کیا گیا۔شفاخانے تعمیر ہوئے۔مقررہ ایام میں لوگوں کو جانور ذبح کرنے سے روکا گیا۔

جہانگیر کی پشت پناہی عبدالرحیم خانخاناں، شیخ فرید بخاری عرف مرتضیٰ خان، سید صدر جہان اور مہابت خان نے کی تھی یہ سب لوگ حضرت مجدد الف ثانی سے عقیدت رکھتے تھے اور اکبر کی مذہبی آزاد خیالی سے متفق نہ تھے۔اس طرح عہد جہانگیری میں اکبری دور کی مذہبی پالیسی کے خلاف اُس ردّعمل کا آغاز ہوا جو اورنگ زیب عالمگیر کے تحت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا۔

جہانگیر اسلامی اقدار کے تحفظ کا ہی خواہش مند نہ تھا۔اس نے اپنے باپ کی مذہبی رواداری کو بھی بڑی حد تک قائم رکھا۔ہندوؤں کے قومی تہواروں کی سرپرستی کی اور انہیں ہر ممکن سہولت مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کیا۔

اکبر نے مرنے سے پہلے شہزادہ سلیم کو جانشین تسلیم کر لیا۔اس کے سر پر خود شاہی دستار

رکھی اور تیموری شمشیر اس کی بغل میں لٹکائی۔ شہزادہ خسرو نے علم بغاوت بلند کیا اور پنجاب میں آ کر اپنی طاقت منظم کرنے لگا۔ جہانگیر خود لشکر لے کر اس فتنہ کی بیخ کنی کے لیے نکلا۔ جالندھر کے قریب شاہی فوج نے آسانی سے باغیوں کو زیر کر دیا۔

سکھوں کے گرو ارجن نے خسرو کی کامیابی کے لیے دعا کی اور اسے مالی امداد سے نوازا۔ شاہی جرنیل شیخ فرید بخاری نے بھیروال کے مقام پر شہزادہ کی بچی کھچی طاقت کا قلع قمع کر دیا۔ شہزادہ اپنے آدمیوں کو لے کر کابل کی طرف بھاگ نکلا مگر دریائے چناب عبور کرتے ہوئے گرفتار ہوا۔ اور حسین بیگ اور عبدالعزیز کے ساتھ بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے شہزادہ کو قید کروا دیا اور اس کے ساتھیوں کو سخت سزائیں دیں۔

بہرحال اس واقع کے نتائج اچھے ثابت نہ ہوئے سکھ ہمیشہ کے لیے مغل سلطنت کے مخالف ہو گئے۔ ڈاکٹر بنی پرشاد لکھتا ہے کہ گرو اگر باغی شہزادے کی پشت پناہی نہ کرتا تو اس کی زندگی کے دن چین سے کٹ جاتے مگر بادشاہ کی سخت سزا سے سکھوں نے مغلوں کے خلاف اس حریفانہ مخاصمت کا آغاز کیا جس نے بعد میں خطرناک صورت اختیار کر لی۔

نور جہان، مرزا غیاث ایرانی کی بیٹی تھی جو اکبر کے عہدِ حکومت میں ہجرت کر کے ہندوستان آبسا تھا۔ مہر النسا دورانِ سفر میں قندھار کے مقام پر پیدا ہوئی۔ وہ سترہ سال کی تھی کہ اس کی شادی علی قلی بیگ استجلو سے ہوئی۔ جہانگیر کے عہد میں علی قلی بیگ بنگال میں بردوان کا جاگیر دار تھا۔ بادشاہ نے اس کی بہادری کی وجہ سے اسے شیر افگن کا لقب بھی عنایت کیا۔ بنگال میں اس وقت حالات دگرگوں تھے۔ متعدد زمیندار اور افغان سردار حکومت کے خلاف سر اُٹھا رہے تھے۔ بادشاہ کو علم ہوا کہ شیر افگن ان تخریب پسند عناصر سے ساز باز کر رہا ہے، شیر افگن سے اس کی بات چیت نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ جس میں دونوں مارے گئے۔ شیر افگن کی بیوہ مہر النسا اور اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کو شاہی محل میں لایا گیا۔ رسم تھی کہ عہدہ داروں اور منصب داروں کی بیوہ عورتیں شاہی محل میں بیگمات کی زیرِ سایہ زندگی بسر کرتی تھیں۔

نور جہان اور جہانگیر کے متعلق عجیب و غریب رومانوی داستانیں مشہور ہیں۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ جوانی کے ایام میں جب نور جہاں کی شادی شیر افگن سے نہیں ہوئی تھی جہانگیر اس کے دام محبت میں گرفتار ہو چکا تھا اور اس نے برسر اقتدار آتے ہی اپنی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا

بندوبست کیا مگر یہ الزام تراشی اب غلط ثابت ہو چکی ہے اور تاریخ دان حلقوں میں اقبال نامہ جہانگیری کے مصنف معتمد خان کا بیان ہی مستند سمجھا جاتا ہے۔ شاہی محل میں داخل ہونے کے کافی عرصہ بعد جہانگیر نے ایک دن مینا بازار میں اسے دیکھا اور اس کے بانکپن اور ذہانت کا یوں دلدادہ ہوا۔ کہ آخر کار اس سے شادی کر لی۔ جہانگیر نے مہر النسا کا نام تبدیل کر کے اسے نور محل کا لقب دیا بعد میں وہ نور جہاں کہلانے لگی۔

نور جہاں ایک عظیم خاتون تھی۔ اس کے جمال کی سحر طرازی، اس کی سیاسی بصیرت، غیر معمولی ذہانت، علم و ادب سے وابستگی خوش خلقی عالی حوصلگی، جرأت و دلیری اور جاہ و جلال نے مغلیہ عہد حکومت کے اس دور کو انوکھی سج دھج بخشی۔ وہ ایرانی تہذیب و تمدن کی اعلیٰ اقدار کا مجسمہ تھی۔ اس کی چمک دمک نے شوکت تیموری کی سابقہ روایات کو بھی ماند کر دیا۔ نور جہاں سلطنت کے کاموں میں جہانگیر کا ہاتھ بٹانے لگی۔ وہ حکومت میں برابر کی شریک تھی اس کا نام سکوں پر بادشاہ کے نام کے ساتھ لکھا جانے لگا۔ وہ خود جھروکے میں بیٹھتی سلطنت کے ذی شان امراء اور بڑے بڑے عہدہ دار اس کے حضور پیش ہوتے اور تسلیم بجالاتے۔ وہ سیاسی مسائل پر اپنی بصیرت افروز رائے کا اظہار کیا کرتی۔ انتظام سلطنت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتی صوبیداروں کو ہدایت بھیجتی، جنگی مہموں کے منصوبے بناتی اور سپہ سالار مقرر کرتی۔

غیر ملکی سفیر اس کے سامنے پیش کیے جاتے اور اس کے طمطراق اور جاہ و جلال پر انگشت بدنداں رہ جاتے۔ نور جہاں کے دورِ اقتدار میں اس کے رشتہ دار بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے اس کے باپ مرزا غیاث کو اعتماد الدولہ کا خطاب ملا اور اسے سلطنت کا دیوان مقرر کیا گیا۔ اس کا بھائی آصف خان وکیل مملکت اور امیر الامراء تھا۔ اس کے علاوہ ایرانیوں کا اور رسوخ بڑھا۔ درباریوں نے انہی کے طور طریقے اپنائے۔ عیش و عشرت کا آغاز ہوا۔ جس سے سلطنت کے مالی استحکام کو ضعف پہنچا۔ فضول خرچی کنبہ نظام کی اس غیر معمولی افراط سے حکومت کی مشینری نااہلیت کا شکار ہو گئی اور خزانہ پر بوجھ پڑا۔

اکبر نے صوبوں کی تقسیم میں جو توازن اقتدار قائم کیا تھا وہ جاتا رہا۔ ایرانیوں کا اثر و رسوخ حد سے بڑھنے لگا۔ جہانگیر کے عہد میں سینکڑوں ایرانی سردار شاعر اور ادیب ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے۔ ایرانیوں کے اس بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے ان خاندانوں کو بد دل کیا

جن کے آباؤ اجداد گزشتہ دور میں صاحبِ اقتدار تھے۔ ایرانی عناصر کا یہ غلبہ آخر سلطنت کی کمزوری کا باعث بنا۔ اٹھارہویں صدی میں یہ بُرے اثرات ذرا زیادہ کھل کر سامنے آئے۔ نور جہاں کے طور طریقوں سے شہزادہ خرم اور مہابت خان نالاں ہوئے اور حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہونے پر مجبور ہو گئے مگر ابتدا میں نور جہاں کے حواریوں نے خوش انتظامی کا ثبوت دیا۔ اعتماد الدولہ اور آصف خان لائق آدمی تھے۔ انہوں نے کافی عرصہ تک کامیابی سے حکومت کا نظم ونسق سنبھالے رکھا۔ بدقسمتی سے جہانگیر بالکل لاپرواہ ہو گیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مَیں نے شراب وکباب کے عوض سلطنت نور جہان کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ بادشاہ کی یہ عیش دوستی اور نااہلی ہی دراصل ان تمام خرابیوں کی جڑ ہے جو نور جہان کی کنبہ پروری اور جاہ پسندی کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔

کنبہ پروری اور رشوت ستانی کا دور دورہ ہوا۔ نور جہاں نے خود نذر گزارنے کی رسم شروع کروائی تحفے تحائف پیش ہونے لگے۔ سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ دار شاہانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کی ذاتی قیام گاہیں شاہی دربار کی طرح تکلفات ولوازمات سے پر تھیں۔ زندگی میں رکھ رکھاؤ اور کھوکھلا پن زیادہ ہو گیا۔ اکبر کے عہد میں لوگ سادہ زندگی بسر کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کی نظر میں دنیاوی زندگی کی زیادہ اہمیت نہ تھی مگر نور جہاں اور اس کے ساتھیوں کے زیرِ اثر ان رسومات نے رواج پایا جو بعد میں مغلیہ حکومت کی کمزوریاں بن گئیں۔ حکومت کی پالیسی کے رجحانات کا اندازہ مصنف معاصر الامراء کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔

''جہانگیر کے عہد زمانہ میں جو ایک لاپرواہ قسم کا بادشاہ تھا، سیاسی اور مالی مسائل کی طرف توجہ نہ دیتا تھا۔ خواب وخیال میں محو رہتا تھا اور شان وشوکت کا دلدادہ تھا، بددیانت سرداروں نے رشوت ستانی کا بازار گرم کر دیا۔ حکومت کی آمدن کم ہوتی گئی۔ مالیہ میں پچاس لاکھ کی کمی واقع ہو گئی۔''

ہندوستانی کلچر پر نور جہاں نے کچھ دائمی اثرات چھوڑے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی مہذب خاتون تھی۔ تہذیب وتمدن کی اقدار اس کی شخصیت سے مترشح تھیں۔ اس نے علم وادب کی سرپرستی کی۔ ایرانی شعروادب پر اسے خاصی دسترس تھی۔ وہ خود بھی مردِ سخن کا نہایت ہی سلجھایا ہوا ذوق رکھتی تھی۔ اس نے ملبوسات اور زیورات میں بعض خوشنما اختراعات کیں۔ عورتوں کے بناؤ سنگار کو

خوش سلیقگی عطا کی۔

نور جہاں نے غریب اور نادار عورتوں کی بڑی فراخدلی سے سرپرستی کی۔ شاہی خرچ سے سینکڑوں لڑکیوں کی شادی کرائی انہیں جہیز دیئے۔ بے سہارا اور عمر رسیدہ عورتوں کے وظیفے مقرر کیے۔ ملکہ نور جہاں ہر مظلوم کو اس کا چھینا ہوا حق واپس دلاتی۔ ہر بے نوا کی دادرسی کرتی۔ ہر مصیبت زدہ کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتی۔ اس کے لطف و اکرام کی بارش بے یارو مددگار انسانوں کو زندگی کا مژدہ سناتی۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ ہر آدمی اس کے عدل وانصاف سے بہرہ مند ہو۔ اور اس کی عنایات سے دامن بھرے۔ نور جہاں جہانگیر کی داستان کا وہ رومانوی ٹکڑا ہے جس کے بغیر یہ عہد اور زیادہ بے مزا اور پھیکا نظر آتا۔

بنگال کا صوبہ اکبر کے عہد میں مغل سلطنت کی حدود میں شامل ہوا تھا۔ مگر وہاں مغلوں کی حکومت برائے نام تھی چھوٹے بڑے زمینداروں نے کبھی اطاعت قبول نہ کی تھی یہ لوگ اپنے آپ کو مغلوں کے دائرۂ اختیار سے باہر ہی سمجھتے تھے۔ مرکز سے دُوری اور سیاسی خلفشار کی وجہ سے بنگال پر مکمل طور پر غلبہ پانا مشکل تھا۔ یہ ہندو زمیندار جو من مانی کاروائیاں کرتے تھے۔ بارا بھوئیاں کہلاتے تھے ان کا سرغنہ سنار گاؤں کا سردار عیسیٰ خان تھا۔ ان کے علاوہ افغانوں نے بھی وہاں اودھم مچایا ہوا تھا۔ ان کے جتھے مسلح ہو کر اِدھر اُدھر حملہ آور ہو رہے تھے۔ اور حکومت کے لیے مسلسل دردسر کا موجب بنے ہوئے تھے۔ عثمان لوہانی کی سرکردگی میں انہوں نے سلہٹ پر قبضہ کر لیا۔ ان کی ریشہ دوانیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جہانگیر کی حکومت نے بنگال کے ان تخریب پسند عناصر کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ 1607ء میں بادشاہ کا سوتیلا بھائی اسلام خان صوبے دار مقرر ہوا۔ اس نے مخالفت کا قلع قمع کرنے میں بڑی دانشمندی اور دلیری کا ثبوت دیا۔ بنگال کے صوبے داروں میں اسلام خان کا نام شائستہ خان سے کم مشہور نہیں۔ اس نے اَن تھک کوششوں سے طاقت ور زمینداروں کو اطاعت کرنے پر مجبور کر دیا۔ کوچ بہار اور کام روپ کے علاقے فتح کر کے صوبہ میں شامل کیے۔ 1612ء میں افغانوں کو شکست فاش دی اور ان کا سردار عثمان خان مارا گیا۔ اِسی سال اسلام خان نے راج محل سے دارالحکومت ڈھاکہ میں تبدیل کر دیا۔ ڈھاکہ سیاسی اور جنگی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم تھا۔ ڈھاکہ کا نام جہانگیر نگر رکھا گیا۔ اسلام خان کے بعد ابراہیم خان فتح جنگ نے اس کا کام پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سیاسی گٹھ جوڑ میل ملاپ اور رعب داب سے اس نے

ایک ایک کر کے سارے سرداروں کو مغل سلطنت کا مطیع و فرمانبردار بنا دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ مغلوں کے لیے ان کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ دراصل افغانوں کے سلسلے میں جہانگیر نے بڑی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا۔ اکبر کو افغانوں کی وفاداری پر شک تھا۔ وہ انہیں مغلوں کا سخت دشمن سمجھتا تھا۔ جب دولت خان لودھی مرا تو اکبر نے کہا تھا کہ شیر شاہ سوری آج اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ اس کے برعکس جہانگیر نے افغانوں سے غیر معمولی شفقت کا سلوک کیا۔ دولت خان لودھی کے بیٹے خان جہان لودھی کو 7,000 کے اعلیٰ منصب پر فائز کیا اور اسے دکن کا صوبے دار بنایا۔ اسی طرح دلاور خان کو 4,000 کا منصب دیا گیا۔ وہ لاہور کا صوبیدار تھا۔ اس کے علاوہ متعدد افغانوں کو عزت و اکرام سے نوازا۔ ان کے دلوں سے ہمیشہ کے لیے عداوت دھو ڈالی۔ اور انہیں سلطنت کی مخالفت کی بجائے خدمت پر آمادہ کر لیا۔ افغانوں کا مؤرخ نعمت اللہ لکھتا ہے۔

''جہانگیر بادشاہ نے افغانوں کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے لطف و کرم سے انہیں وفاداری کے رشتے میں باندھا ان پر اس نے اتنی توجہ کی کہ افغانوں نے مغلوں کی مخالفت ترک کر دی اور بادشاہ کی خدمت میں کمر بستہ ہو گئے اور سلطنت کے تحفظ کے لیے انہوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ لیں۔''

میواڑ کے راجپوت راجہ نے ابھی تک مغلوں کی اطاعت قبول نہ کی تھی اگرچہ چتوڑ پر اکبر نے قبضہ کر لیا تھا اور ہلدی گھاٹ کے مقام پر اس کے بہادر جرنیلوں نے رانا پرتاپ کو بری طرح شکست بھی دی مگر وہ رانا کو اطاعت پر مجبور نہ کر سکے۔ رانا پرتاپ پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ اس کا بیٹا راجہ امر سنگھ بھی ایک قابل جرنیل تھا۔ چھ سال تک مغلوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ شاہی فوج کی کمان شہزادہ پرویز اور مہابت خان کے سپرد تھی۔ راجپوتوں کے چھاپا مار دستوں نے کافی نقصان پہنچایا۔ آخر شہزادہ خرم نے کمان سنبھالی۔ اور راجپوتوں پر قابو پا لیا۔ راجہ امر سنگھ نے اطاعت قبول کی اور اپنے بیٹے کرن سنگھ کو مغلیہ دربار کی خدمت میں روانہ کیا۔ کرن سنگھ کو پنج ہزاری منصب عطا ہوا۔ اس کے علاوہ راجہ امر سنگھ نے ایک ہزار سوار بھیجے جو صلح نامہ کی رو سے مغل فوج میں شامل ہوئے۔ چتوڑ کا قلعہ راجہ امر سنگھ کو دے دیا گیا مگر وہ اس کی مرمت اور قلعہ بندی نہیں کر سکتا تھا۔ اس واقع کے متعلق جہانگیر یوں رقمطراز ہے۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ راجہ امر سنگھ اور اس کے آباؤ اجداد اپنے وطن کی پہاڑیوں کے دفاعی حصار پر نازاں تھے انہوں نے اس سے قبل ہندوستان کے

کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کی تھی نہ وہ کسی کے دربار میں پیش ہوئے۔ یہ سب کچھ میرے عہد میں ہوا۔"

دکن میں حالات دگرگوں ہو رہے تھے۔ نظام شاہی کے ایک لائق حبشی جرنیل ملک عنبر نے 1610ء میں احمد نگر مغلوں سے چھین لیا۔ ملک عنبر بڑا قابل سیاست دان تھا اس کا شمار کامیاب ترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے نظام شاہی سلطنت کے اندرونی بحران کو ختم کیا مضبوط حکومت قائم کی۔ نظام مالیہ نئی بنیادوں پر استوار کیا حکومت کا خزانہ جو عرصہ سے خالی پڑا تھا پھر بھرنے لگا۔ ملک عنبر نے مرہٹوں کی ایک زبردست چھاپا مار فوج تیار کی وہ علاقے کی ساخت کے مطابق جنگ کرنا جانتا تھا۔ بادشاہی لشکر کو خان جہان لودھی اور عبدالرحیم خان کی کمان میں یکے بعد دیگرے بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ شہزادہ پرویز بھی تھا۔ مگر مغل جرنیل آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے اور ملک عنبر حبشی ان کی کوششوں کو ناکام بناتا رہا۔ آخر شہزادہ خرم کو یہ مہم سونپی گئی۔ خرم نے ابتدائی معرکوں میں دکنیوں کے خلاف کامیابی حاصل کی۔ نظام شاہی سلطان علی عادل شاہ کو مغلوں کی فتح کا یقین ہو گیا اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور ملک عنبر کے فتح کیے ہوئے علاقے مغل سلطنت کو واپس کر دیئے۔ خرم کی اس عظیم الشان کامیابی پر اسے شاہجہان کا لقب عطا ہوا۔ اس کو تیس ہزاری منصب پر فائز کیا گیا۔ بلکہ نور جہاں نے اس خوشی کے موقع پر بڑی شاندار دعوت کی جس پر تین لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ مگر دکن پر مغلوں کا تسلط درحقیقت برائے نام تھا۔ ملک عنبر مسلسل اپنی طاقت استوار کرتا رہا۔ اسے کسی موزوں وقت کا انتظار تھا۔ جب شاہ جہاں نے اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ملک عنبر نے احمد نگر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ چنانچہ لاکھوں روپے اور ہزاروں جانیں ضائع کرنے کے باوجود مغلوں کا علاقہ 1605ء کی سرحد سے ایک قدم آگے نہ بڑھا۔

ملک کی اندرونی سیاست کروٹ بدل رہی تھی۔ جہانگیر نے سلطنت کے کاموں میں رفتہ رفتہ دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ نور جہاں کا تسلط روز افزوں تھا۔ 1622ء میں اس نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے کر دی ملک کا سارا نظم و نسق نور جہاں، اعتماد الدولہ، آصف خان اور شہریار کے ہاتھ میں تھا۔ عبدالرحیم خان خانان اور شہزادہ خرم کو ان لوگوں کا غیر محدود تسلط منظور نہیں تھا۔ نور جہاں کا طرزِ عمل سلطنت کے پرانے عہدہ داروں اور دربار کے امراء سے اچھا نہ تھا۔ وہ ان کے ساتھ فخر و تکبر سے پیش آتی۔ ان کی عزت افزائی کا مطلق خیال نہ رکھتی۔ مغل امراء اس ہتک

آمیز برتاؤ سے سخت نالاں تھے۔ سلطنت میں ایک طاقتور گروہ کی ہمدردیاں آہستہ آہستہ حکومت سے منقطع ہو رہی تھیں۔

جہانگیر کے عہد کا آخری قابل ذکر واقعہ جس پر وہ فخر کر سکتا کانگڑہ کی فتح تھی۔ پنجاب کی شمال مشرقی پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا یہ ایک ناقابل تسخیر حصار تھا۔ 1620ء میں اس پر قبضہ ہوا۔ اس کامیابی کے بعد پریشانیوں اور مصیبتوں کا ایک لامتناعی سلسلہ شروع ہو گیا جس نے بادشاہ کی موت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

1621ء میں اطلاع ملی کہ ایرانیوں نے قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے۔ ایرانی بادشاہ شاہ عباس کے جہانگیر سے تعلقات بظاہر بڑے اچھے تھے۔ اس نے ایک دفعہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ قندھار ایران کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے عوض کچھ اور علاقے مغل ایرانیوں سے لے لیں۔ جہانگیر نے اس تجویز کو نہ مانا۔ شاہ عباس نے اس پر کسی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ جہانگیر کے دربار میں بیش قیمتی تحائف ارسال کیے۔ اپنی دوستی اور وفاداری کا یقین دلایا۔ مغل بادشاہ نے اپنے جلیل القدر پڑوسی کے ان جذبات کی قدر کی اور خیر سگالی کے وفد ایرانی دربار میں بھیجے۔ شاہ عباس کو اپنا بھائی کہا۔ اسے ایران سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ ہوا اور اسی لیے وہ قندھار کی حفاظت سے غافل ہو گیا۔ شاہ عباس نے اچانک 1621ء میں اپنی فوج بھیجی اور قندھار کو محاصرہ میں لے لیا۔

قندھار، کابل کی طرف ہندوستان کی شاہراہ پر واقع تھا۔ یہ وسط ایشیا ایران اور ہندوستان کے درمیان تجارت کا ایک اہم مرکز بھی تھا۔ مغلیہ سلطنت کے لیے قندھار کا ہاتھوں سے نکل جانا ایک عظیم سانحہ تھا۔ جہانگیر نے شاہ جہان کو حکم دیا کہ فوج لے کر فی الفور قندھار میں محصور مغل صوبے دار کی مدد کے لیے روانہ ہو مگر اس نے پس و پیش کیا۔ نور جہاں شہریار کو جہانگیر کا جانشین بنانا چاہتی تھی اور اس سلسلے میں پیہم ساز باز میں مصروف تھی۔ شاہجہاں کو ان حالات میں مرکز سے غیر حاضر رہنا منظور نہ تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں اس کی غیر حاضری میں حالات کوئی خطرناک صورت اختیار نہ کر لیں اور اس کی جانشینی کے امکانات جاتے رہیں۔ اس نے بادشاہ کے سامنے یہ شرائط پیش کیں کہ آگرہ سے پنجاب کا صوبیدار مقرر کر دیا جائے اور رنتھمبور کا قلعہ بھی اس کے قبضہ میں ہو تو وہ اطمینان سے قندھار کی مہم پر روانہ ہو سکتا ہے۔ نور جہاں کے ایماء پر جہانگیر نے شہزادہ خرم کے یہ مطالبات ماننے سے انکار کر دیا اور اسے سختی سے شاہی حکم کی اطاعت کے لیے

مجبور کیا۔ شاہجہاں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ عبدالرحیم خان خاناں نے اس کی مدد کی۔ مغل سلطنت کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ سرحد پر دشمن للکار رہے تھے اور ملک کے اندر بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ شہزادہ خرم آگرہ پر حملہ آور ہوا چاہتا تھا کہ بلوچ پور کے مقام پر 1623ء میں شاہی جرنیلوں مہابت خان اور شہزادہ پرویز نے اسے شکست دی وہ دکن کی طرف بھاگ گیا اور ملک کنبہ سے سازباز شروع کر دی۔ مہابت خان نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ شاہجہان دکن سے بھاگ کر بنگال میں چلا آیا مگر یہاں بھی اس کے قدم نہ جمے۔ تین سال تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا آخر بادشاہ سے اس کی صلح ہوگئی۔ ضمانت کے طور پر اس نے اپنے دو بیٹوں اورنگ زیب اور داراشکوہ کو شاہی دربار میں بطور یرغمال بھیج دیا۔ اس بغاوت کا خاتمہ ہوگیا مگر اس عرصے میں قندھار ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ ناقابل تلافی نقصان تھا۔ مغلوں کی شہرت کو سخت دھچکا لگا اور حکومت کے استحکام کو ضعف پہنچا۔

مہابت خان حکومت کا وفادار جرنیل تھا۔ مگر نور جہاں کی ناعاقبت اندیشی اور آصف خاں کے ہتک آمیز برتاؤ نے اسے مخالف بنالیا۔ جب جہانگیر کے عہد کا آغاز ہوا مہابت خان 500 کا منصبدار تھا۔ مگر میدان جنگ میں اس کے کارنامے اس کی مزید ترقی کا سبب بنے۔ شہزادہ خرم کے خلاف اس نے خوب جوہر دکھائے اور اس کے اردوں کو خاک میں ملا دیا۔ مگر آصف خان مہابت خان کے خلاف کوئی مؤثر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ شہزادہ خرم کا طرف دار تھا۔ اور اسے ہی تخت شاہی پر متمکن دیکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ شہزادہ اس کی بیٹی ممتاز محل کا شوہر تھا۔ شہزادہ کی بغاوت کے وقت آصف خان نے اپنی اصل ہمدردیوں کا اظہار نہ کیا اور خاموش رہا۔ جب بغاوت کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو اس نے مہابت خان کی قوت توڑنے کا عزم کیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جب تک مہابت خان موجود ہے۔ شہزادہ خرم کی جانشینی یقینی نہیں۔ اس نے بڑی چالاکی سے مہابت خان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ عبدالرحیم خاں خانخاناں نے بغاوت میں شہزادہ خرم کا ساتھ دیا تھا۔ نور جہاں اور بادشاہ کے دل میں یہ خدشہ پیدا کیا گیا کہ شہزادہ پرویز جو مہابت خان کے ساتھ مہموں پر جاتا رہا ہے مہابت کے بل بوتے پر خرم کی طرح باغی ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مہابت نے مال غنیمت کا بہت سا حصہ حکومت کے حوالے نہ کیا اور وہ جنگی ہاتھی جو اس نے بنگال اور بہار کی مہموں میں حاصل کیے تھے اپنے پاس ہی رکھ لیے۔ دیوان کی حیثیت میں

آصف خان نے مہابت خان سے مطالبہ کیا کہ ان ہاتھیوں کا حساب کتاب اس کے سامنے پیش کرے۔ مالِ غنیمت کے سلسلے میں بھی اس سے جواب طلبی ہوئی۔ ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے حالات مزید بگڑ گئے۔ مہابت خان نے اپنی لڑکی کی شادی کی۔ قاعدہ کی رو سے اسے شادی کے لیے بادشاہ کی رضا مندی حاصل کرنی چاہیے تھی مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ بادشاہ نے ایک احدی جرنیل کو ایک ہزار سواروں کا دستہ دے کر مہابت خان کی طرف بھیجا کہ اسے دربار میں حاضر ہونے کا حکم سنائے۔ اس خلاف معمول طرزِ عمل پر مہابت خان کو خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے چار ہزار راجپوت فوج اور مغلوں کے چند دستے اکٹھے کیے اس عرصے میں اس کے داماد کو حراست میں لے لیا گیا۔ اور مہابت خان کا دیا ہوا جہیز ضبط کر لیا۔ بادشاہ کابل کو جا رہا تھا جب مہابت خان حکم کے مطابق حاضر ہوا تو شاہی دستہ دریائے جہلم عبور کر رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کے آدمیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ نور جہان زد سے باہر تھی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ وہ باوجود کوشش کے بادشاہ کو مہابت خان کی قید سے نہیں آزاد نہیں کرا سکتی تو اس نے بادشاہ کی رفاقت منظور کر لی مہابت خان نے بادشاہ کو قبضے میں لینے کے بعد کوئی انتہائی قدم نہ اُٹھایا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی وفاداری میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بادشاہ کو صرف آصف خان کے اثر سے نکالنا چاہتا تھا۔ نور جہان بڑی عقلمندی سے مہابت خان کو اس سے الگ کرتی رہی۔ انعام و اکرام کے وعدوں پر اس نے کافی سرداروں کو جیت لیا۔ اور بادشاہ کو بھگا کر رہتاس کے قلعے میں لے گئی یہاں بادشاہ کے حامیوں کا ایک زبردست لشکر اکٹھا ہو چکا تھا۔ مہابت خان نے اپنی حفاظت پتلی دیکھی۔ تو بچے کھچے ساتھیوں کو لے کر ٹھٹھہ کی طرف بھاگ گیا جہاں سے وہ دکن میں جا کر شاہجہان کے ساتھ مل گیا۔ جس نے بڑی خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ بعد میں بادشاہ نے بھی اس کو معاف کر دیا۔ بادشاہ کی صحت بھی مسلسل گر رہی تھی۔ اکتوبر 1627ء میں وہ کشمیر سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت سے چار دن قبل ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ شاہی قافلہ ایک پہاڑی علاقے سے گزر رہا تھا کہ ایک بلند چٹان سے کوئی نوجوان شکاری پھسلا اور بادشاہ کے قدموں میں آ گرا اور مر گیا۔ اس بات سے جہانگیر کی طبیعت بے حد ملول ہوئی اور اس کی صحت یکا یک بگڑنے لگی۔ چار روز کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

جہانگیر کے عہد میں دور دراز ممالک نے مغلیہ دربار میں سفیر بھیجے۔ 1608ء میں

کپتان ہاکس انگلستان سے آیا۔ 1615ء میں جیمز اول نے سرٹامس روکو سفارت کا کام دے کر مغل بادشاہ کے پاس بھیجا۔ جس نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت چاہی۔ اور ایک عہد نامہ لکھا گیا۔ شہزادخرم گجرات کا صوبیدار مقرر ہوا۔ تو سرٹامس رو نے اس سے ایک فرمان حاصل کیا۔ جس کی رو سے انگریزوں کو تجارت کے لیے متعدد مراعات دی گئیں۔ لیکن انہیں رہائش گاہیں بنانے کی اجازت نہ مل سکی۔

جہانگیر انگلستان میں اپنے ہم عصر بادشاہ جیمز اول کی طرح عجیب وغریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس میں متضاد صفات پائی جاتی تھیں۔ ٹیری Terry اس کے متعلق لکھتا ہے۔ ''اب اس بادشاہ کی طبیعت اور مزاج کے متعلق مجھے ہمیشہ یہ نظر آیا کہ متضاد عناصر سے اس کا خمیر اُٹھا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات وہ ظالم وقاہر ہوتا اور کبھی بے حد نرمی اور منکسر المزاجی کا ثبوت دیتا۔'' Beveridge ہمیں بتاتا ہے۔ ''جہانگیر واقعی ایک عجیب قسم کا آمیزہ تھا وہ ایک ایسا شخص تھا جو بڑی تمکنت کے ساتھ کھڑا ہوکر زندہ انسانوں کی کھال اترتی دیکھ سکتا تھا اور پھر وہ انصاف کا دلدادہ بھی تھا اور ہر جمعرات کی شام کو علم وادب کی محفل جماتا۔ وہ ابوالفضل کو قتل کروا سکتا تھا اور بغیر کسی خجالت کے اس کا اقبال بھی کر لیتا اور ادھر اس کا دل ہاتھیوں کے لیے رحم سے پسیج جاتا جب وہ اپنے آپ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے اور سردی سے ٹھٹھرنے لگتے تھے۔ جہانگیر میں ایک اچھا وصف یہ تھا کہ وہ قدرتی نظاروں کا فریفتہ تھا اور فطرت کی رعنائیوں سے اس کا دل مچل اُٹھتا۔ اسے پھولوں سے بے پناہ محبت تھی۔ ڈاکٹر بنی پرشاد لکھتا ہے'' جہانگیر کو عیش وعشرت میں ڈوبا ہوا متلون مزاج ظالم حکمران سمجھ کر نظر انداز کر دینا سخت ناانصافی ہے۔ وہ ایک حساس اور نرم دل انسان تھا۔ اپنے رشتہ داروں کے لیے محبت کے جذبات، ہر شخص سے فراخ دلی اور مروت سے پیش آنے والا، جبر وتشدد کا دشمن اور انصاف پسندی کا مجسمہ۔ اسکی زندگی میں کچھ مواقع ایسے پیش آئے جب وہ بعض وجوہات کی بناء پر غیض وغضب سے آگ بگولہ ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے ظلم و ستم کے چند انفرادی فعل سرزد ہوئے۔ مگر عموماً انسان دوستی، شائستگی اور غیر جانبداری ہی اس نمایاں صفات تھیں۔ اپنے جلیل القدر باپ اور اپنے پرشکوہ بیٹے کے درمیان آجانے سے جہانگیر کا عہد نظر میں کم جچتا ہے۔

فرالیس گلیڈون کے الفاظ ہیں'' اپنے عہد کے شروع سے لے کر آخر تک جہانگیر کا اپنی

رعایا سے برتاؤ ہمدردی اور شفقت پر مبنی نظر آتا ہے۔"

جہانگیر کا عہد عدل وانصاف کا عہد تھا۔ زنجیر عدل کی وجہ سے عدل جہانگیری پاک وہند کی تہذیب میں ایک محاورہ بن چکا ہے۔ یہ ترکیب حق وانصاف کی اعلیٰ ترین اقدار کی علامت ہے۔ اس نے اکبر کی صلح کل کی پالیسی کو برقرار رکھا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح مختلف مذاہب کے علماء سے گفتگو کرنے میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ مگر اکبر کے مذہبی تجربات اس نے نہ کیے اس لیے عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

جہانگیر بادشاہ حسن فطرت کا شیدائی تھا۔ مغلیہ دور کے بیشتر باغات اسی کے عہد کی یادگار ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی سرپرستی اس نے دل کھول کر کی۔ اس کے دور میں مصوری کا فن اپنے کمال کو پہنچا۔ جہانگیر اس فن پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا۔

علم وادب کے خزانوں سے اسے حصہ وافر ملا تھا۔ اس کی خودنوشت سوانح عمری تزک جہانگیری دلکشی، صداقت اور ادبی چاشنی میں تزک بابری کی ٹکر کی ہے۔

جہانگیر کی موت کے ساتھ ہی ملکہ نور جہاں کا دورِ اقتدار بھی ختم ہوا اسے ناسہارا حالات نے آ گھیرا۔ تخت وتاج چھن گیا۔ اسے ابھی اٹھارہ سال کا طویل عرصہ کس مپرسی کے عالم میں گزارنا تھا۔ اس نے زندگی کا یہ حصہ عجب وضعداری اور رکھ رکھاؤ میں بسر کیا۔ شاہجہاں نے دو لاکھ سالانہ کے حساب سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اسی میں گزر اوقات ہوتی رہی۔ تنہائی اور بے بسی کے ان نازک لمحوں میں اس کی بیٹی لاڈلی بیگم اس کے ساتھ تھی۔ وہ بھی زمانہ کی بے وفائی اور وقت کی ناقدر شناسی کا شکار ہو چکی تھی۔ یہی لیل ونہار تھے کہ 1665ء میں نور جہان قید حیات سے رہا ہوئی اور شاہدرہ (لاہور) میں مقبرہ جہانگیر کے قریب اسے دفن کر دیا گیا۔ اس قبر کی جو عمارت اٹھائی گئی وہ ہرگز اس کی شایان شان نہ تھی۔ اس کا مقبرہ کسی جوگن کی کٹیا نظر آتا ہے اور آج بھی دنیاوی جاہ وجلال کے کھوکھلے پن پر ماتم کناں ہے۔

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا گماں ہے
کہتے ہیں کہ یہ آرام گہ نور جہاں ہے

نور جہاں ہر پہلو سے ایک مثالی عورت تھی۔ اس کا حسن وجمال نظر کو خیرہ کرتا تھا۔ اس کی ذہانت، خوش مزاجی، سلیقہ شعاری انتظامی قابلیت، سیاسی بالغ نظری، فراخدلی، مروت، سخاوت

رحمدلی اور انصاف پسندی نے تخت شاہی کے اردگرد رنگ و نور کا ایک ہالہ سا بُن دیا تھا۔ فنون لطیفہ نے اس کے ہاتھوں پرورش پائی۔ درباری زندگی کو اس کی ذات سے رنگ و روغن عطا کیا۔ وہ تہذیب و نفاست کا سرچشمہ تھی۔ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بناء پر اس نے بادشاہ بیگم کا لقب پایا۔ سلطان علاؤالدین خوارزم شاہ کی والدہ ترکان خاتون کی طرح اس کا نام سکوں کی زینت بنا۔ وہ تاریخ عالم کی ان چند عظیم ترین خواتین میں سے ہے۔ جن پر انسانیت اور خاص کر صنف نازک بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

سلطنت پر اس کا اثر و رسوخ ہر لحاظ سے خوش آئند تھا۔ ان میں کسی قسم کا سستا پن یا بے جا نمائش کا پہلو نہ تھا۔ مگر تاہم ملک کے بعض مقتدر عہدہ داروں اور امراء کو ملکہ سے خدا واسطے کا بیر پیدا ہو گیا تھا۔ ایک عورت سے غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نور جہاں موردالزام بنی اور آخری ایام میں جہانگیر جن مشکلات کا شکار رہا ان کے لیے اسے ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس کے متعلق کذب و افترا کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی گئی جس میں بیشتر غلط اور بے بنیاد باتیں اس سے منسوب ہوئیں۔

نور جہاں کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو اپنے شوہر جہانگیر بادشاہ سے اس کی بے پناہ محبت اور جانثاری ہے۔ مہابت خان نے جب بادشاہ کو حراست میں لے لیا تو نور جہان اس پر حملہ آور ہوئی اور کمال متحمل مزاجی اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ اسے جب یہ احساس ہوا کہ بادشاہ کو قوت سے رہا کرانا ممکن نہیں ہے تو وہ اس آزمائش کے وقت حراست میں بادشاہ کی شریک بن گئی۔ اور بڑی ہوشیاری سے مہابت خان کی طاقت کا قلع قمع کر دیا۔ نور جہان بہترین گھڑ سوار تھی اور فنون جنگ میں کافی مہارت رکھتی تھی اس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا۔ مگر عملی طور پر صرف وہ اِسی موقعہ پر میدان میں کودی اور ملکی سیاسیات میں ایک انقلاب آفرین کردار ادا کیا۔ عام حالات میں اس نے عملی طور پر سیاسی اکھاڑے میں مظاہرہ نہ کیا۔ اپنے شوہر پر اس کی اثر اندازی زیادہ تر اخلاقی، جذباتی، روحانی اور ذہنی قسم کی تھی۔

❀..........❀..........❀

59

حاجی شریعت اللہ

یہ انیسویں صدی کے شروع کا زمانہ ہے۔ایک شخص بیس برس تک مکہ اور مدینہ میں تعلیم پانے کے بعد بحری جہاز سے اپنے وطن لوٹ رہا ہے۔کلکتہ کی بندرگاہ پر اتر کر وہ سیدھا فرید پور کی طرف جاتا ہے۔بنگال کے اسی ضلع میں اس کا گاؤں بندر کھولا ہے۔

ابھی وہ گاؤں کے راستے ہی میں ہے کہ اچانک ڈاکوؤں کا ایک قافلہ آتا ہے اور چاروں طرف سے اسے گھیر لیتا ہے۔اس شخص کے پاس جتنا بھی مال ہے، وہ سب لوٹ لیا جاتا ہے۔ڈاکو اسی پر بس نہیں کرتے۔اس مسافر کی تمام کتابیں بھی چھین لیتے ہیں۔

عربی کی قیمتی کتابیں لٹتے دیکھ کر اس شخص کو بہت رونا آتا ہے۔یہ ساری کتابیں اس نے بڑی مشکلوں سے جمع کی تھیں۔بعض مکہ سے لائی گئی تھیں۔بعض مدینے میں خریدی تھیں۔بعض کتابیں اس نے قاہرہ سے خریدی تھیں جب وہ جامعہ ازھر میں تعلیم پانے گیا تھا۔لیکن اب اس کا یہ قیمتی اثاثہ لٹ چکا تھا۔

اسے اپنے مال کی ذرا بھی فکر نہیں، البتہ کتابوں کے لیے بہت بے چین ہے۔ڈاکوؤں سے بڑی منت سماجت کرتا ہے۔مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔آخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آتی ہے۔

وہ آگے بڑھتا ہے۔ڈاکوؤں کے سردار کے پاس جاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ اسے بھی اس گروہ میں شامل کر لیا جائے۔سردار دیکھتا ہے کہ یہ شخص جوان اور تندرست ہے۔کام کر سکتا ہے۔لہٰذا اس کی درخواست قبول کر لیتا ہے۔اب یہ مسافر بھی ڈاکو بن جاتا ہے۔

یہ شخص ڈاکوؤں کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔وہ ڈکیتی کے لیے جہاں جہاں جاتے ہیں،

یہ بھی ان کے ہمراہ جاتا ہے لیکن اس کا رنگ سب سے جدا ہے۔ یہ نمازیں پڑھتا ہے۔ روزے رکھتا ہے۔ سچ بات کہتا ہے سادہ زندگی گزارتا ہے۔

اس کی یہی سادگی اور سچائی رنگ لاتی ہے۔ ڈاکو اس کی شرافت اور نیکی سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور ایک دن سبھی برائی سے توبہ کر لیتے ہیں۔ ڈاکوؤں کو سچا مسلمان بنانے والے یہ شخص حاجی شریعت اللہ تھے۔

حاجی شریعت اللہ جب اپنے والدین کے انتقال کے بعد گھر سے نکلے تھے، اس وقت ان کی عمر مشکل سے آٹھ سال کی تھی۔ وہ نو سال کلکتہ میں رہ کر مولانا بشارت علی سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر مکہ چلے گئے۔ اور اب 1818ء میں، جب کہ ان کی عمر سینتیس سال کی تھی، واپس اپنے گاؤں لوٹے تھے۔

یہاں آ کر انہوں نے نقشہ ہی کچھ اور دیکھا۔ اسلامی حکومت کے ختم ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کا رعب و دبدبہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہر جگہ انگریزوں کا تسلط قائم ہو رہا تھا۔ انہوں نے بنگالی مسلمانوں کو فوج اور پولیس سے علیحدہ کر دیا تھا۔ ان کی جگہ ہندو سپاہی بھرتی کیے جا رہے تھے اور یہ لوگ خوب من مانی کر رہے تھے۔

مال گزاری وصول کرنے کے لیے ہندوؤں کو مقرر کیا جا رہا تھا۔ یہ لوگ بھی حاکم کے گماشتے بن کر بڑا ظلم ڈھا رہے تھے۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے بنگال کی تمام تر زمین مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اب اس غیر ملکی حاکم نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ جو شخص زمین کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم نقد دے گا اسے مستقل طور پر زمین مل جائے گی۔

مسلمانوں کے پاس نقد روپیہ کہاں تھا۔ فقط زمین ہی زمین تھی اور اب وہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ البتہ ہندو بنیوں کے پاس نقد روپے بہت تھے۔ چنانچہ وہ زمین خریدتے رہے اور اس طرح بنگال میں ہندو زمین داروں کی تعداد بڑھتی رہی۔

اور جب انگریزوں کی شہ پر ہندو ہر جگہ چھانے لگے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دیہاتوں میں چوکیدار، مکھیا اور دوسرے سرکاری کارکن ہندو بھرتی کیے جانے لگے ۔۔۔ پھر کیا تھا۔ عام مسلمانوں کی حالت روز بروز گرتی چلی گئی۔ وہ ہندو زمین داروں کی رعایا بن گئے۔ صبح و شام ان کی ڈیوڑھی پر جا کر سلام کرتے، ان کے یہاں بیگار میں پکڑے جاتے، ان کے کھیتوں میں ہل

چلاتے، ان کے لیے خون پسینہ بہا کر اناج اگاتے۔ مگر یہ ساری محنت اکارت جاتی۔ سارا غلہ ہندو گماشتے اٹھا کر لے جاتے اور مسلمان کسان بھوکا ہی رہ جاتا۔

حاجی شریعت اللہ نے بنگالی مسلمانوں کی یہ دردناک حالت دیکھی تو تڑپ اٹھے۔ وہ ایک مخلص اور دردمند انسان تھے۔ ان کے دل میں عام مسلمانوں کی بھلائی کا جذبہ بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ اسلامی ممالک میں بیس سال گزار آئے تھے۔ وہاں اسلام کی شان و شوکت نظر آئی تھی۔ مسلمانوں کا عروج دیکھا تھا۔ ان کو مالی طور پر خوش و خرم پایا تھا۔ لیکن یہاں ہندوستان میں حالت برعکس تھی۔ چنانچہ شریعت اللہ نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ قوم کی حالت سدھاریں گے۔

حاجی شریعت اللہ خوب سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں دینی بیداری نہیں پیدا کی جائے گی، وہ سیاسی طور پر بیدار نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے مسلمان بننے کی تعلیم دی۔ انہیں بتایا کہ اسلام کی تعلیم پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ انہیں یہ بھی احساس دلایا کہ ان کی تباہی اور بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اسلام سے دور ہو گئے ہیں۔ ہندوانہ رسموں کو اختیار کرلیا ہے اور اپنا عقیدہ تک بدل دیا ہے۔

انہوں نے کام کی ابتدا اپنے گاؤں سے کی۔ انہیں بہت جلد کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلمان تاجر، کسان اور صنعت کاران سے متاثر ہونے لگے۔ پھر یہ پیغام دوسری جگہ بھی پہنچنے لگا۔ بیداری کی لہر آہستہ آہستہ پھیلنے لگی۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، ایک شہر سے دوسرے شہر۔

ہندو زمین داروں کے زیر اثر آنے کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت سی ہندوانہ رسمیں تو آ ہی گئی تھیں، وہ ان کے تہواروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اس موقع پر مالک ٹیکس لگایا کرتا تھا اور مسلمان اسے ادا بھی کیا کرتے۔ اس لیے کہ مجبور تھے۔

لیکن جب حاجی شریعت اللہ کی تعلیم پھیلی تو مسلمان کاشتکاروں میں بہادری اور جرأت پیدا ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف غیر اسلامی رسمیں ترک کر دیں بلکہ زمین داروں کو ٹیکس دینے سے صاف انکار کر دیا۔

ہندو زمین داروں کے غلبے کو ختم کرنے کی یہ پہلی کامیاب کوشش تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بیداری کی لہر فرید پور، باریسال اور ڈھاکہ کے علاقوں میں پھیلنے لگی۔

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے، حاجی شریعت اللہ نے عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھا تھا کہ انہیں اسلام کے قریب لایا جائے۔ ان کی تحریک کا سارا زور مذہبی فرائض کی

ادائیگی پر تھا اس لیے ان کی تحریک ''فرائضی تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ تمام مسلمانوں میں ''مساوات'' پیدا کرنا اس کا اہم اصول تھا۔ اس حلقے میں امیر و غریب سب ''ایک'' تھے۔

فرائضی تحریک کی کامیابی کے بعد حاجی شریعت اللہ نے سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انہوں نے شاہ عبدالعزیز کا طریقہ اختیار کیا اور اعلان کر دیا کہ ''ہندوستان دارالحرب ہے۔ یہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے۔ بلکہ ایسی حکومت قائم ہے جو مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھا رہی ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں عید، بقر عید اور جمعہ کی نماز پڑھنا جائز نہیں۔''

مسلمانوں میں عید، بقر عید اور جمعہ کی نماز کی بڑی اہمیت ہے۔ حقیقت میں یہ خوشی اور مسرت کے دن ہوتے ہیں۔ مسلمان ان دنوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ مگر حاجی شریعت اللہ نے ان ہی نمازوں کے نہ پڑھنے کا فتویٰ دیا تھا۔

اس اعلان کا مقصد دراصل یہ تھا کہ مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے۔ دوسرے اس فتوے کے مطابق تمام مسلمان وطن چھوڑ تو نہیں سکتے تھے، لہٰذا انہیں دارالحرب کو دارالاسلام یعنی اسلامی ملک بنانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ نئے حکمرانوں سے مخالفت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا۔ ہندوؤں سے بھی ٹکر لینے کی جرأت پیدا ہو گئی۔

حاجی شریعت اللہ نے مسلمانوں میں اس قدر جرأت اور بہادری پیدا کر دی کہ انہوں نے بیگار دینے سے انکار کر دیا۔ ہندو زمین داروں کے گھر کام کاج کے لیے مسلمان کسانوں کی عورتیں جایا کرتی تھیں، اسے بھی روک دیا گیا۔ اس تحریک سے جو اثرات پیدا ہوئے اس کا اندازہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''فرائضی تحریک نے مسلمان کسانوں میں بھائی چارہ اور محبت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اس سے ہندو اور انگریز دونوں پریشان ہیں۔ کیوں کہ اتحاد نے زمینداروں کا کام ناممکن بنا دیا ہے۔''

غرض حاجی شریعت اللہ کی تحریک پورے مسلم بنگال میں پھیلتی چلی گئی اور یہی وجہ تھی کہ جب سیّد احمد شہید نے باضابطہ جہاد کا اعلان کیا اور سکھوں سے جنگ کرنے چلے، تو اسی بنگال سے مسلمان کسان اپنے ہل، بیل اور کھیت چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سر سے کفن باندھ کر پنجاب پہنچے اور مسلمان مجاہدوں کے ساتھ مل کر بڑی بہادری سے لڑے۔

❀.........❀.........❀

60

حسن پاشا

سلطان عبدالحمید اوّل کے زمانے میں روسیوں اور ترکوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ سلطان چاہتا تھا کہ روسیوں سے صلح کر کے جنگ ختم کر دی جائے۔ چنانچہ 16 جولائی 1774ء کو دونوں حکومتوں کے فوجی نمائندوں کی کانفرنس کینارجی کے مقام پر ہوئی۔ اس مجلس میں ایک معاہدہ مرتب ہوا جس کا نام صلح نامہ کینارجی تھا۔

اس صلح نامے کا ترکی پر بہت بُرا اثر پڑا۔ ترک روسیوں سے مرعوب ہو گئے۔ لیکن ترکوں میں ایک جماعت ایسی تھی جو ترکی کو مرعوب ہونے سے بچانا چاہتی تھی۔ اس جماعت کا سب سے ممتاز رکن اور رہنما، حسن پاشا الجزائری تھا۔ سلطان عبدالحمید اوّل کو اور ترکوں کو اُس پر پورا بھروسا تھا۔ سلطان نے حسن پاشا کو بہت سے اختیارات دے رکھے تھے۔ حسن پاشا ایک طرف برّی فوج کا سپہ سالار تھا تو دوسری طرف بحری بیڑے کا امیر البحر۔ حسن پاشا نے ایک انگریز جہاز ساز کی مدد سے نئے قسم کے جنگی جہاز تعمیر کرائے۔ الجزائر، بحیرہ ایڈریاٹک اور بربری ریاستوں سے جتنے اچھے ملاح اور جہاز ران مل سکتے تھے اُن سب کو قسطنطنیہ بلایا اور انہیں جہازوں پر مقرر کیا۔ حسن پاشا خود بھی بہترین جہاز راں تھا جہاز رانی اور جہاز سازی کی اہمیت کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے کہ اُسے اس فن سے دلی لگاؤ تھا۔

ترکی کے اُمراء البحر میں حسن پاشا وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جہاز کے افسروں کے لیے فنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک بحری مدرسہ قائم کیا۔ ترکی زبان میں بحری کتابوں کے ترجمے کرائے اور ترک جوانوں میں فن جہاز رانی کا شوق پیدا کیا۔

ترکی میں اُس زمانے میں بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ پہلی بغاوت شام کے ایک قبیلے کے

سردار شیخ طاہر نے کی۔ بحری اور برّی دونوں فوجیں استعمال کی گئیں۔ عکّہ کی بندرگاہ کا محاصرہ کر کے شیخ طاہر کو پکڑ کر قید کر دیا گیا اس سے کچھ عرصے بعد مصر میں مملوکوں نے بغاوت کی۔ حسن پاشا برّی اور بحری فوج لے کر اس بغاوت کو دبانے کے لیے گیا۔ چنانچہ اس نے قاہرہ پر قبضہ کر کے اس بغاوت کا بھی استحصال کر دیا۔

اٹھارھویں صدی میں روس کے تخت پر زارین کیتھرائن بیٹھی۔ یہ بڑی متعصب عورت تھی اور ترکوں کی سخت دشمن تھی۔ زارین کیتھرائن نے بڑی تیاری کے بعد ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ سلطان نے امیر البحر حسن پاشا کو بحری اور برّی فوجوں کی کمان دے کر اوکزاکوف روانہ کر دیا، تاکہ وہاں سے کلبرن پر حملہ آور ہو جو دریائے نیٹر کے دہانے پر اوکزاکوف کے مقابل دوسرے ساحل پر واقع تھا۔ کلبرن میں روسی فوج کا مشہور سپہ سالار سوار و پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ اس نے ترکی فوج کے آدھے حصہ کو بغیر روک ٹوک دریا پار کرنے دیا۔ اس کے بعد اچانک حملہ کر کے ترکی فوج کے بہت بڑے حصے کو نقصان پہنچایا۔ ترکی اور روسی بحری بیڑوں کے بھی مقابلے ہوئے۔ ترکی کے بیڑے کو شدید نقصان پہنچا اور حسن پاشا کے جہازوں کا بیشتر حصہ برباد ہو گیا۔

ترکی نے 1789ء میں یوسف پاشا کی سرکردگی میں تازہ دم نوے ہزار فوج روس کے مقابلے پر روانہ کی۔ یوسف پاشا ترکی کا بڑا تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ اس نے فوج کے کچھ حصے دشمن کی پشت پر حملہ کرنے کی نگرانی کے لیے چھوڑے۔ نوے ہزار تازہ دم جرار فوج کے ساتھ دریائے ڈینیوب پار کر کے ٹرانسلوانیا میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے وہ آسٹریا پر چڑھائی کرنا چاہتا تھا کہ 17 اپریل 1789ء کو سلطان عبدالحمید اوّل کا انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے یوسف پاشا کو واپس بلا لیا گیا۔ وہ اس مہم کو ادھورا چھوڑ کر فوجوں کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچا۔

عبدالحمید اوّل کے بعد سلیم ثالث تخت پر بیٹھا۔ یہ چاہتا تھا کہ ترکی سلطنت کی تنظیم کی جائے۔ برّی اور بحری فوجوں کو مضبوط کیا جائے۔ لیکن دشمنوں نے اُسے موقع نہ دیا۔ چنانچہ اب زارین کیتھرائن کے اشارے سے آسٹریا نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ سلطان سلیم نے اپنے پرانے تجربہ کار امیر البحر اور سپہ سالار حسن پاشا کو سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ حسن پاشا ایک بڑی فوج کے ساتھ شہزادہ کوبرگ کے مقابلے کو بڑھا۔ یہ سپہ سالار مولدیویا کی سرحد پر فوکشانی کے مقام پر فوجیں لیے پڑا تھا۔ ادھر سے سوار و اس کی مدد کو پہنچ گیا اور اس نے ترک فوج کے حملہ کا بالکل انتظار

نہ کیا۔ بلکہ پہنچتے ہی ترکی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ سوارو کا حملہ کامیاب رہا۔ ترکی فوج کے پاؤں میدانِ جنگ سے اُکھڑ گئے اور دشمن نے ترکی کے تمام سامان پر قبضہ کر لیا۔ اس ناکامی کے بعد سلطان سلیم ثالث نے تازہ دم فوج بھیجی۔ 6 ستمبر 1889ء کو دریائے رمنگ کے پاس جنرل سوارو کی فوجوں نے ان تازہ دم فوجوں کو پھر شکست دے دی۔

ان لگاتار شکستوں کی وجہ سے قسطنطنیہ میں عوام نے شورش برپا کر دی۔

عوام ان شکستوں کا سارا الزام سالار لشکر حسن پاشا پر عائد کرتے تھے۔ لوگوں نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ حسن پاشا کو سزا دی جائے۔ چنانچہ حسن پاشا کو جو دولت عثمانیہ کی خدمت کرتے ہوئے بوڑھا ہو گیا تھا، قید کر دیا گیا۔

غیرت مند، بہادر امیر البحر قید خانہ میں انتقال کر گیا لیکن تاریخِ اسلام میں اپنے کارنامے پیچھے چھوڑ گیا۔

❀............❀............❀

61

حیدر علی

حیدر علی ہندوستان کی نہایت نامور ہستیوں میں شمار ہوتا ہے۔وہ ایک معمولی سپاہی تھا۔ لیکن بڑھتے بڑھتے بادشاہ بن گیا۔اُس نے ایک زبردست سلطنت کی بنیاد رکھی اور ملک بھر میں اپنی بہادری کی دھاک بٹھادی۔

دکن یعنی جنوبی ہندوستان میں شہر کولار سونے کی کان کے لیے مشہور ہے۔اُس کے قریب بودی کوٹہ ایک گاؤں ہے۔ حیدر علی وہاں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ فتح محمد صوبے دار عبدالرسول کے ماتحت کالور کا فوج دار تھا۔وہ اپنے آقا کے دشمن نواب طاہر محمد خاں کے مقابلے میں ایک لڑائی میں مارا گیا۔نواب نے اُس کے گھر کا تمام مال اسباب لوٹ لیا۔حتیٰ کہ کپڑے اور اناج بھی نہ چھوڑا۔اُس کے دونوں لڑکوں شہباز اور حیدر علی کو دو بڑے بڑے نقاروں میں بند کر کے اوپر سے چمڑا منڈھوادیا اور ہوا جانے کے لیے اُس نے نقاروں میں سوراخ کر دیئے۔اُس وقت حیدر علی پانچ سال اور شہباز دس سال کا تھا۔اُن کی والدہ مجیدہ بیگم نے اُن کی رہائی کے واسطے بہت کچھ دہائی دی۔لیکن بے رحم نواب نے ایک نہ سُنی اور بہت سارو پیہ مانگا۔آخر اُس بے چاری نے اپنے مرحوم شوہر کے بھتیجے حیدر صاحب کو سارا حال کہلا بھیجا۔حیدر صاحب نے نواب کو منہ مانگا روپیہ بھیج کر انہیں قید سے چھڑالیا اور اپنے پاس سرنگا پٹم میں بُلا لیا۔

حیدر صاحب میسور کے راجہ کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ دار تھا۔جب شہباز اور حیدر علی ذرا بڑے ہوئے۔تو وہ انہیں وزیر نندراج کے پاس لے گیا۔اُس نے شہباز کو ڈیڑھ سو سپاہیوں کا افسر مقرر کر دیا لیکن حیدر علی کم عمر تھا۔اُسے سپاہی بھرتی کر کے میسور کی راجدھانی سرنگا پٹم ہی میں رکھ لیا۔کچھ عرصے کے بعد حیدر صاحب ایک لڑائی میں زخمی ہو کر چل بسا۔اس کی جگہ شہباز کو مل

گئی۔ حیدر علی اپنی خوبیوں کے باعث بہت جلد ترقی پا گیا اور راجہ کی خاص محافظ فوج کا افسر بن گیا۔ وزیر نندراج حیدر علی کے طور طریقوں اور کارگزاری سے اتنا خوش ہوا۔ کہ جب وہ انیس برس کا ہوا۔ تو اُس کی شادی ایک شریف گھرانے میں اپنے خرچ پر کرا دی۔

ایک دفعہ وزیر نندراج حیدر علی کو ساتھ لے کر ایک بغاوت کو فرد کرنے گیا۔ حیدر علی نے ایسے بہادرانہ کارنامے دکھائے کہ وزیر نے خوش ہو کر اُسے علاقہ ڈنڈی گل کا گورنر مقرر کر دیا اور اُسے عزت کے نشان ہاتھی، نقارہ اور پالکی بھی دے دی۔ اب وہ پانچ سو سوار کا افسر ہو گیا۔

نظامِ دکن اور مرہٹے ریاست میسور کے ہمسائے تھے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ زبردست تھے اور وسیع ملکوں کے مالک تھے۔ ایک دفعہ نظام کی فوجوں نے سرنگا پٹم کو گھیر لیا اور بہت سارا روپیہ لے کر محاصرہ اُٹھایا۔ ابھی نظامی فوجیں لوٹی ہی تھیں کہ مرہٹی لشکر چڑھ آیا۔ راجہ نے ایک کروڑ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن خزانہ خالی تھا۔ وزیر نندراج رات دن اِسی اُدھیڑ بُن میں تھا۔ کہ اتنا روپیہ کہاں سے ہاتھ آئے۔ جو مرہٹوں سے پیچھا چھوٹے۔ حیدر علی نے اِدھر اُدھر کے علاقوں کی لوٹ مار سے ایک کروڑ سے زیادہ روپیہ جمع کر کے نندراج کے حوالے کر دیا۔ اُس نے وہ رقم دے کر مرہٹوں کو ٹال دیا۔ راجہ حیدر علی کی اس اعلیٰ خدمت سے نہایت خوش ہوا۔ اُس نے اُسے میسور کی فوجوں کا سپہ سالار مقرر کر دیا اور حیدر بہادر کا خطاب بھی دیا۔

حیدر علی نے سپہ سالار ہوتے ہی میسور کے وہ تمام علاقے واپس لے لیے جو مرہٹوں یا دوسرے دشمنوں نے دبائے ہوئے تھے۔ اُس کے بے پناہ حملوں کے آگے کسی کے قدم نہ جم سکے۔

وزیر نندراج کو بے حد وقار اور اختیار حاصل تھا اور راجہ ایک کاٹھ کی پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اُسے موقوف کر کے خود مختار بننا چاہتا تھا۔ لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخر رانی نے حیدر علی کے سیکرٹری کھانڈے راؤ کی زبانی حیدر علی سے درخواست کی۔ کہ راجہ کو وزیر سے نجات دلائی جائے حیدر علی نے نہایت آسانی اور صفائی سے نندراج سے وزارت کی سند لے کر راجہ کو دے دی۔ راجہ نے حیدر علی کا بہت شکریہ ادا کیا اور اِس احسان کے بدلے اسے فرزند کا خطاب دیا۔ پھر کھانڈے راؤ کو وزیر مقرر کر لیا۔

کچھ عرصہ کے بعد راجہ رانی اور کھانڈے راؤ نے سوچا کہ دشمن ملک سے جا چکے ہیں۔ نندراج کی حکومت سے بھی رہائی مل گئی ہے۔ اَب حیدر علی کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ

انہوں نے حیدر علی کو ٹھکانے لگانے کی سازش مرہٹوں کے ساتھ شروع کر دی۔ مرہٹی فوج اچانک سرنگا پٹم کے قریب آ گئی۔ حیدر علی تاڑ گیا۔ کہ یہ اُس کو گرفتار کرنے کی چال ہے۔ وہ رات کے پردے میں اکیلا ہی گھر سے نکلا اور دریائے کاویری پر پہنچا۔ برسات کے سبب دریا زوروں پر تھا۔ لیکن آن اور جان کا سوال تھا۔ دریا میں کود کر پار اُتر گیا اور بنگور جا پہنچا۔ وہاں اُس کی خاص فوج مقیم تھی۔ کھانڈے راؤ بھاری لشکر لے کر حیدر علی کے پیچھے آیا۔ حیدر علی نے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ ہزاروں موت کا شکار ہوئے۔ کھانڈے راؤ اُلٹے پاؤں بھاگ کر سرنگا پٹم چلا گیا۔ حیدر علی نے بھی اس کا پیچھا کیا اور سرنگا پٹم کا محاصرہ کر کے گولہ باری شروع کر دی۔ جلد ہی راجہ نے ہار مان لی اور کھانڈے راؤ کو جاں بخشی کی شرط پر حیدر علی کے حوالے کر دیا۔ حیدر علی اپنے قول پر قائم رہا۔ اُس نے کھانڈے راؤ کو جان سے نہ مارا۔ بلکہ ایک لوہے کے پنجرے میں بند کر دیا اور دودھ چاول اُس کی غذا مقرر کر دی۔ حتیٰ کہ وہ مر گیا۔ حیدر علی اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ یہ میرا طوطا ہے۔ مَیں اِسے پال رہا ہوں۔

سرنگا پٹم کی فتح کے دوسرے دن حیدر علی نے احسان فراموش راجہ کو تخت سے اتار دیا اور اُسے گزارے کے لیے تین لاکھ روپے سالانہ کی ایک جاگیر دے دی۔ پھر حیدر علی نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور میسور کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

ملک میسور کی سرحد پر بدنور ایک ریاست تھی۔ وہاں سے ایک نوجوان فریادی حیدر علی کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مَیں بدنور کے راجہ کا متبنیٰ ہوں میرا نام مہابدی ہے۔ راجہ کے مرنے کے بعد رانی وزیر سے مل گئی۔ دونوں نے میرا گلا گھونٹ کر مجھے ایک مندر میں دفن کر دیا۔ میری زندگی ابھی باقی تھی ایک جوگی نے مٹی ہٹا کر مجھے زمین سے باہر نکال لیا اور میرا علاج کیا۔ مَیں اچھا ہو گیا۔ اَب مَیں آپ کے پاس امداد اور انصاف کے لیے آیا ہوں۔ حیدر علی نے بدنور پر چڑھائی کر دی اور چھوٹی سی لڑائی کے بعد بے رحم رانی کو گرفتار کر کے چھوڑ دیا اور مہابدی کو گدی پر بٹھا دیا۔ تب چالاک رانی نے مہابدی کو بہکا کر حیدر علی کے قتل پر آمادہ کر لیا اور حیدر علی کے رہائشی مکان کے نیچے سرنگیں کھدوا کر اُن میں بارود بھر دیا۔ تا کہ سرنگوں میں آگ لگا کر اُسے مکان سمیت اُڑا دیا جائے۔ ایک برہمن اس سازش سے آگاہ تھا۔ اس نے حیدر علی کو خبردار کر دیا۔ تب اُس نے رانی کو قتل اور مہابدی کو قید کر دیا اور ریاست بدنور پر خود قبضہ کر لیا۔ بدنور کے خزانے سے اُسے بارہ کروڑ روپے

ہاتھ آئے۔اس خوشی میں حیدر علی نے بدنور کا نام اپنے نام پر حیدر نگر رکھا۔وہاں ٹکسال بنا کر اپنے نام کا سکہ چلایا اور سپاہیوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سال کی تنخواہ انعام میں دی۔

حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے انگریز مرہٹے اور نظام جل گئے۔انہوں نے اپنی متحدہ فوجوں سے میسور پر حملہ بول دیا۔حیدر علی نے اپنے بے پناہ حملوں سے اُن کا ناک میں دم کر دیا۔مرہٹے اور نظام میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔انگریزوں نے بھی اپنے صدر مقام مدراس کی راہ لی۔حیدری لشکر اُن کا پیچھا کرتے کرتے مدراس کے قریب جا پہنچا۔تب مجبور ہو کر انگریزوں نے صلح کر لی۔حیدر علی کے نام کا ڈنکا چاروں طرف بج گیا۔

ریاست انا گندی کے راجہ تمراج نے خود بخود حیدر علی کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے بیٹے کے ہاتھ تین لاکھ روپے بطور خراج بھیج دیئے۔ہاکل واڑی کا راجہ بڑا کاہل اور احمق تھا۔اُسے افیون کی سخت چاٹ تھی۔اُس نے کئی کوٹھیاں افیون سے بھروا رکھی تھیں لیکن پھر بھی اُس کی سیری نہ ہوتی تھی۔وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ کاش! یہ پہاڑ جو میرے شہر کے سامنے ہے۔افیون کا بن جاتا۔ حیدر علی ہاکل واڑی گیا اور راجہ سے پوچھا کہ آپ مجھے کیا نذر دیں گے؟ اُس نے جواب دیا کہ کھانے کے لیے سیکڑوں من افیون اور دودھ پینے کے لیے ہزاروں گائیں ہیں اور میری زیوروں بھری رانی آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے یہ سُن کر حیدر علی مسکرا دیا اور فرمایا کہ یہ افیونی تو راج گدی کے قابل نہیں۔چنانچہ اُس کی ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اُس کے خرچ کے لیے ایک گاؤں بطور جاگیر دے دیا۔

کڑپہ، بنگن پلی اور کرنول کے نواب لوٹ مار کا بازار گرم رکھتے تھے اور رعایا کو چین نہ لینے دیتے تھے۔حیدر علی نے اُن پر فوج کشی کی۔معمولی جنگ کے بعد سب مغلوب ہو گئے۔کڑپہ کے نواب عبدالحلیم نے پانچ لاکھ، بنگن پلی کے نواب نے سات لاکھ اور کرنول کے نواب منور خاں نے پچاس لاکھ روپیہ نذر دے کر جان بچائی اور آئندہ خراج دینے اور پُر امن رہنے کا وعدہ کیا۔

حیدر علی جہاں بہت بڑا جنگجو تھا وہاں قابل منتظم بھی تھا۔وہ رعایا کے آرام کا خاص خیال رکھتا تھا۔راتوں کو بھیس بدل کر رعایا کا حال چال دریافت کرتا پھرتا تھا۔ظالم رشوت لینے والے حاکموں کو کوڑوں سے پٹواتا تھا۔دکن میں حیدری کوڑا آج تک مشہور ہے۔اُسے سپاہیوں سے بہت محبت تھی۔بہادری دکھانے والے ہر سپاہی کو خاطر خواہ انعام دیتا تھا۔فوج بھی اُس کی خاطر

مرنے مارنے کے لیے تیار رہتی تھی۔

حیدر علی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ شاہی فرمانوں پر اپنی مہر لگاتا تھا اور دستخط کے طور پر صرف حرف ''ح'' لکھ دیتا تھا۔ وہ بڑا ذہین تھا۔ دربار میں کئی کئی منشی ایک ہی وقت میں عرضیاں سناتے جاتے تھے۔ وہ ایک طرف تو سنتا جاتا تھا اور دوسری طرف جواب اور حکم احکام لکھاتا جاتا تھا۔ اُس کا حافظہ اس قدر تیز تھا کہ جسے وہ ایک بار دیکھ لیتا تھا۔ اُسے کبھی نہ بھولتا تھا اور اپنے ہر ایک سپاہی کو پہچانتا تھا۔

حیدر علی بڑا عادل بادشاہ تھا۔ ایک روز وہ ہوا خوری کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بڑھیا نے فریاد کی کہ ایک امیر آغا محمد نے میری لڑکی مجھ سے چھین لی ہے۔ تحقیقات کے بعد حیدر علی نے آغا محمد کا سر قلم کر دیا اور لڑکی بڑھیا کو واپس لا دی۔

حیدر علی کو شکار کا بھی شوق تھا۔ وہ شیر چیتے اور ہرن کا شکار صرف نیزے اور تلوار سے کرتا تھا۔ وہ بیلوں کی لڑائیاں اور ہاتھیوں کی ٹکریں دیکھنے کا بھی از حد شوقین تھا۔ پہلوانوں کی کشتیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ بہادر سپاہی زرہ بکتر پہن کر ریچھوں اور شیروں کا مقابلہ کرتے تھے۔ اگر سپاہی غالب آتے تو وہ انہیں بیش بہا خلعت اور انعام دیتا تھا اور اگر جانور غالب آنے والا معلوم ہوتا تھا۔ تو فوراً اُس کی پیشانی میں گولی ماردی جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر حیدر علی بندوق رکھتا تھا اور گولی وہی مارتا تھا۔

حیدر علی نے ساٹھ برس کی عمر پائی۔ اُس کا شاندار مقبرہ شاہ سرنگا پٹم میں ہے۔

❁..........❁..........❁

خیرالدین باربروسا

یونان کے آس پاس بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ جن پر کبھی ترکوں کی حکومت تھی۔ انہی جزیروں میں سے ایک جزیرے کا گورنر یعقوب نامی ایک شخص تھا اس کے چار بیٹے تھے۔ اسحاق، الیاس، عروج اور خضر۔ آخرالذکر بعد کو خیرالدین مشہور ہوا۔ اسحاق نے لوٹ مار کا پیشہ اختیار کیا اور بہت دولت کمائی۔ باقی تینوں بھائی بہت جری تھے۔ انہوں نے بحری مشاغل پسند کیے اور اس زمانے کے دستور کے مطابق اِکاّ دُکاّ جہازوں پر حملے کر کے انہیں لوٹنے لگے۔ تھوڑے عرصے بعد الیاس ایک جنگ میں مارا گیا اور عروج اور خیرالدین نے اپنا مشغلہ جاری رکھا۔ عروج خیرالدین سے بڑا تھا، اور چھوٹے سے بیڑے کا مالک یہی تھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے بہت ترقی کر لی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی تھی اور ہزاروں مسلمان اپنا ملک چھوڑ کر افریقہ کے ساحل پر آ رہے تھے۔ تا کہ وہیں مستقل رہائش اختیار کر لیں۔ ان بے کس مسلمانوں کے پیچھے بحری ڈاکو پڑ جاتے تھے اور انہیں لوٹ کر مار ڈالتے تھے۔ عروج نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنا چھوٹا سا بیڑا افریقہ کے ساحل پر لے آیا یہاں اسے اتفاق سے ایک چھوٹی سی بندرگاہ حلق الوید مل گئی۔ جس میں ایک چھوٹا سا قلعہ بھی تھا۔ عروج نے اس بندرگاہ کو اپنا مرکز بنایا۔ یہیں سے وہ ان عیسائی لیٹروں کا خاتمہ کرتا تھا جو سپین کے مسلمانوں کو لوٹنے کے لیے اُن کا پیچھا کرتے تھے۔

جب عروج نے اپنی قوت بڑھائی تو اس نے ٹیونس کے سلطان سے درخواست کی کہ اُسے شاہی ملازموں میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ سلطان نے ٹیونس کی تمام بندرگاہیں اُس کے لیے کھول دیں اور ان کا ذمہ دار عروج کو ٹھہرایا۔ عروج نے وعدہ کیا کہ وہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ شاہی خزانے میں داخل کر دیا کرے گا۔ اس کے بعد عروج نے اپنے بیڑے کو بہت طاقتور بنا لیا تو سب سے پہلے اُس نے یورپ کے عیسائی بیڑے کو زبردست نقصان پہنچایا۔ پھر اس نے عیسائی

دنیا کے مذہبی پیشوا پوپ کے بحری بیڑے پر حملہ کیا اور پوپ کے بیڑے کو شکست فاش دی۔ اُس کے تمام افسر قیدی بنا لیے۔ اب عروج نے سپین سے مقابلہ کے لیے ایک زبردست بحری بیڑا تیار کیا۔ جبرالٹر کے پاس دونوں بیڑوں کا مقابلہ ہوا۔ جس میں عروج کو فتح حاصل ہوئی۔

اب عروج کا نام دُور دُور تک مشہور ہو گیا تھا۔ اُس نے الجزائر کو بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد عروج نے اور کئی بحری لڑائیاں کیں۔ آخر سپین سے جنگ کرتے ہوئے عروج مارا گیا۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس کا بھائی خیر الدین باربروسا اُس کا جانشین ہوا۔ تو سب سے پہلے اس نے ٹرکی کے سلطان سلیم کے پاس قسطنطنیہ میں اپنا قاصد بھیجا۔ ٹرکی اس وقت سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی اُس کی خدمت کرنا گویا مسلمانوں کی خدمت کرنا تھا۔ قاصد کے ہاتھ خیر الدین نے سلطان کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ الجزائر کو ترکی کی سلطنت میں شامل کرنے کے لیے فتح کیا گیا ہے۔ سلطان سلیم نے اُس کے جواب میں خوشنودی کا اظہار کیا اور خیر الدین کو الجزائر کا گورنر مقرر کر دیا۔ مہر اور تلوار وغیرہ عطا کی دو ہزار بہادروں کی ایک فوج اُس کی مدد کے لیے بھیج دی۔

جب خیر الدین حکومت کی بنیاد مستحکم کر چکا تو اپنے پرانے دشمن سپین کی طرف متوجہ ہوا اور ایک ہولناک جنگ میں سپین کا سارا بیڑا غرق کر دیا۔ اس کے بعد خیر الدین باربروسا کا نیر اقبال بلند تر ہوتا چلا گیا۔

اس وقت شہنشاہ چارلس یورپ کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ مگر اُس کا بیڑا ابھی بحیرۂ روم میں آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس وقت سلطان سلیم کی وفات کے بعد سلطان سلیمان اعظم ترکی کے تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ اسے بحری بیڑے کے لیے کسی تجربہ کار شخص کی ضرورت تھی۔ کیونکہ یورپ کا مشہور امیر البحر جنرل ڈوریا قسطنطنیہ کے مضافات میں اکثر حملے کرتا رہتا تھا۔ سلطان سلیمان کی نظر انتخاب خیر الدین باربروسا پر پڑی۔ سلطان نے اسے ٹرکی کا امیر البحر مقرر کر دیا۔

خیر الدین الجزاء سے روانہ ہوا اور راستے میں اپنے دشمنوں کو نیچا دکھاتا ہوا سالونیکا میں لنگر انداز ہوا اور اپنے آنے کی اطلاع قسطنطنیہ بھیج دی۔

سلطان کی طرف سے ایک وفد اس کے استقبال کے لیے بھیجا گیا۔ خیر الدین باربروسا سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو سلطان نے بھرے دربار میں اسے امیر البحر کا خطاب دے کر ترکی بحریہ کا نگران اعلیٰ مقرر کر دیا۔

اُس وقت شہنشاہ چارلس کے امیر البحر نے بحیرۂ روم میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ خیر الدین

سب سے پہلے ڈوریا کے بحری بیڑے کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر ڈوریا کو اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خیرالدین نے تمام ساحلی شہروں پر قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد سلطان سلیمان نے اسے حکم دیا کہ وہ شمالی افریقہ کی مشہور بندرگاہ ٹیونس پر قبضہ کر کے اسے الجزائر میں شامل کرلے۔ خیرالدین نے حکم کی تعمیل کی، مگر ٹیونس کے سلطان نے شہنشاہ چارلس سے امداد کی درخواست کی۔ چارلس فوراً پانچ سو جہازوں کا بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر ٹیونس پر حملہ آور ہوا۔ خیرالدین نے مقابلہ کیا مگر شہر والوں نے وفا نہ کی اور اسے ٹیونس چھوڑنا پڑا۔ شہنشاہ چارلس بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوا اور اس کی فوج نے وہاں کے مسلمانوں پر سخت ظلم ڈھائے۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ترکی اور فرانس میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس کی ایک شرط یہ تھی کہ کسی بیرونی حملہ کے وقت دونوں ملک ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اسی اثنا میں فرانس اور شہنشاہ چارلس کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ معاہدے کی رُو سے سلطان سلیمان نے فرانس کی مدد کی اور خیرالدین باربروسا کی زیر کمان ایک بیڑا چارلس کے خلاف بھیجا۔ اس نے سب سے پہلے جزیرہ کارنور پر قبضہ کیا اور اس کے بعد کئی جزیرے جو جمہوریہ وینس کے ماتحت تھے، فتح کر کے سلطنت ترکی میں شامل کر لیے تو چارلس نے ہنگری کے بادشاہ اور جمہوریہ وینس کو اپنے ساتھ ملا کر ترکوں کے خلاف ایک زبردست بحری بیڑا تیار کیا، جس کی کمان جنرل ڈوریا کے سپرد کی۔ اس بیڑے میں دو سو جنگی جہاز تھے۔ جن میں دھائی ہزار توپیں نصب تھیں۔ اس کے علاوہ کئی مشہور جرنیل ڈوریا کی مدد کے لیے اس مہم میں شامل تھے۔

پریوسیا کے مقام پر دونوں بیڑوں میں مقابلہ ہوا۔ کئی روز تک بحری جنگ ہوتی رہی۔ آخر ایک صبح خیرالدین باربروسا نے دشمن کے جہازوں پر فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ یہ حملہ ایسا سخت اور اچانک تھا کہ ڈوریا اور اُس کے ماتحت جرنیلوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور گھمسان کی جنگ کے بعد ترکوں کو کامل فتح ہوئی۔ دشمن کے بیسیوں جہاز پکڑ لیے گئے۔ جانی نقصان بھی بہت زیادہ ہوا۔ یہ ایک بہت بڑی فتح تھی جو خیرالدین باربروسا کو جنرل ڈوریا پر ہوئی۔ جب سلطان سلیمان کو اس فتح کی خبر ملی تو بے انتہا خوش ہوا۔ سارے شہر میں چراغاں کیا گیا۔ خیرالدین کو خطابات اور خلعت فاخرہ دی اور اس کی سالانہ تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا۔

اس شکست کے بعد شہنشاہ چارلس نے کوشش کی کہ الجزائر پر قبضہ کر لے۔ اُس نے

ایک بیڑا اس مقصد کے لیے روانہ کیا۔ مگر اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اگلے سال فرانس اور چارلس میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ فرانس نے ترکی بیڑے کی مدد سے وینس پر قبضہ کر لیا اور اس مدد کے بدلے میں فرانس نے تولون کی بندرگاہ ترکوں کے حوالے کر دی۔ ایک عرصے تک ترکی بیڑا تولون میں مقیم رہا اور جب پوری کامیابی کے بعد قسطنطنیہ واپس آیا تو حکومت فرانس نے سپاہیوں کی تنخواہ، کافی سامان سفر، بیش بہا تحفے اور جنگ کے اخراجات ادا کیے اور اس کے علاوہ چار سو مسلمان غلام جو فرانسیسی جہازوں پر خلاصی تھے، آزاد کر دیئے۔

اب مشرق سے مغرب تک ترکی بیڑے کا راج تھا۔ بحیرۂ روم کے تمام جزیرے ترکوں کے قبضہ میں آ چکے تھے۔ یورپ کی تمام سلطنتیں ترکی کے سامنے سر جھکاتی تھیں۔ اس وقت کی تمام بحری طاقتیں خیر الدین باربروسا سے کانپتی تھیں۔ اُس نے ترکی کی بحری قوت کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا تھا۔

وینس کی مہم سے فارغ ہو کر خیر الدین باربروسا بحری مشاغل سے بالکل الگ ہو گیا اور دو سال کے بعد جولائی 1546ء میں اُس کا انتقال ہوا۔ اسے بشک طاش میں دفن کیا گیا۔ اس کی قبر پر جو کتبہ ہے اس میں یہ الفاظ کندہ ہیں۔

"مات امیر البحر"

انتقال کے وقت خیر الدین باربروسا کی عمر نوے برس کے قریب تھی۔ اس کا چہرہ بڑا بارعب تھا۔ بدن مضبوط اور گٹھا ہوا۔ داڑھی اور پلکوں کے بال لمبے اور گھنے آنکھیں روشن اور دلیری اور اولوالعزمی کا پتہ دیتی تھیں۔ وہ بڑا بہادر تھا۔ حملہ کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتا تھا۔ جب وہ حملہ کرتا تو صفوں کی صفیں درہم برہم کر دیتا تھا۔

خیر الدین باربروسا اپنے زمانے کا سب سے بڑا امیر البحر تھا۔ وہ بڑا رحم دل تھا۔ دشمنوں سے مہربانی کا سلوک کرتا تھا۔ اپنے ماتحت افسروں اور سپاہیوں کی خوشی و آرام کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ترکوں کا سچے دل سے جانثار اور بہی خواہ تھا اس پر ترکوں کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ سلطان سلیمان اس کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ ہر کام میں اُس سے ضرور مشورہ لیتا تھا۔ ترک بھی اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ اس کی وفات کے بعد ایک عرصے تک یہ رسم رہی، کہ جب کوئی ترکی بیڑا کسی مہم پر روانہ ہوتا تو اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور اس کے احترام میں ایک توپ کی سلامی دے کر بندرگاہ سے لنگر اُٹھاتا۔

رضیہ سلطانہ

رضیہ سلطان پہلی اور آخری مسلمان عورت تھی جو دہلی کے تخت پر بیٹھی اور ہندوستان کی حکمران بنی۔ وہ نہایت بہادر تھی۔ اُس کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ عورتیں بھی عقل اور دلیری میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتیں۔

رضیہ دہلی کے بادشاہ التمش کی بیٹی تھی۔ وہ اسے اپنے بیں بیٹوں سے زیادہ چاہتا تھا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے قابل تھی۔ وہ کئی علوم وفنون جانتی تھی۔ مذہب کی بے حد پابند تھی۔ قرآن شریف روزانہ نہایت اُدب سے تلاوت کرتی تھی۔ اُسے شاعری سے بھی ذوق تھا۔ اور خود شعر کہتی تھی۔ سلطنت کے کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی۔ اکثر مشکل ملکی معاملات اُس کی رائے سے طے ہوتے تھے۔ التمش کو بھی اپنی بیٹی کے علم و عقل پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ وہ اُس کے صلاح مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا اور جب کبھی کسی مہم پر پایۂ تخت سے باہر جاتا تھا تو اُسے اپنا قائم مقام بناتا تھا۔

جب سلطان التمش گوالیار کی مہم سے واپس آیا اور فتح کا جشن منایا، تو اُس موقع پر اُس نے رضیہ کو اپنا ولی عہد بنایا۔ امیروں نے کہا کہ بادشاہ سلامت! بیٹوں کے ہوتے ہوئے بیٹی کو ولی عہد بنانے میں کیا حکمت ہے؟ التمش نے جواب دیا کہ مَیں اپنے بیٹوں کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ دن رات عیش وعشرت میں پڑے رہتے ہیں۔ مَیں انہیں سلطنت کا بوجھ اُٹھانے کے بالکل قابل نہیں سمجھتا۔ رضیہ بے شک عورت ہے۔ لیکن عقل و ہمت کے لحاظ سے مرد ہے۔ مَیں اُسے بیٹوں پر ترجیح دیتا ہوں اور حکومت کے قابل سمجھتا ہوں۔

سلطان التمش کی وفات پر شہزادہ فیروز شاہ بادشاہ بن بیٹھا۔ اُس نے چند ہی مہینوں میں

اپنے آپ کو نالائق ثابت کر دیا۔ امیروں نے اسے معزول کر کے رضیہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ فیروز شاہ نے لڑائی شروع کر دی۔ رضیہ نے اُسے شکست دی اور ایک قلعہ میں نظر بند کر دیا پھر رضیہ سلطانہ کے لقب سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

تخت پر بیٹھتے ہی رضیہ نے حکومت کی ذمہ داریوں کے باعث پَردہ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی۔ فریادیوں کی فریاد خود سنتی تھی اور مقدموں کے فیصلے کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ انصاف سے کام لیتی تھی۔ اکثر جنگی مہموں پر خود سپہ سالار بن کر جاتی تھی اور میدانِ جنگ میں خود مردانہ وار لڑتی اور اپنی فوجوں کو لڑاتی تھی۔

بعض امیروں نے اُسے عورت سمجھ کر بغاوت کر دی۔ بہادر ملکہ نے سب کو باری باری شکست دی اور تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ اِس سے رضیہ کے رُعب داب کا سکہ رعایا کے دلوں پر اچھی طرح بیٹھ گیا اور ملک باغیوں اور فسادیوں سے صاف ہو گیا۔ تب اُس نے سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر اعتباری آدمیوں کو مقرر کر دیا۔

سلطنت کے بہت سے خیر خواہ سلطان التمش کے زمانے سے رن تھمبور کے راجہ کی قید میں تھے۔ ملکہ کو اُن کے حال پر رحم آیا۔ ایک جرار لشکر اُن کے چھڑانے کو روانہ کیا۔ راجہ نے معمولی سی لڑائی کے بعد اطاعت قبول کر لی اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔

جمال الدین یاقوت ایک حبشی سردار تھا۔ پہلے وہ اصطبل کا داروغہ تھا۔ ملکہ نے اُسے میر شکار کے اعلیٰ عہدے پر مقرر کر دیا اور امیر الامراء (امیروں کا امیر) کا خطاب دے دیا۔ وہ اپنے اثر رسوخ سے شاہی دربار پر چھا گیا۔ خاندانی امیر یاقوت کی ترقی سے جَل بُھن گئے اور اُس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

ملک عز الدین لاہور کا صوبے دار تھا۔ اُس نے بغاوت اختیار کر لی۔ اُس کی سرکوبی کے لیے ملکہ خود لشکر لے کر چلی۔ جب لاہور کے قریب پہنچی تو وہ شاہی لاؤ لشکر دیکھ کر ڈر گیا اور بغیر لڑائی کے ہی اِطاعت قبول کر لی۔ ملکہ نے اُسے معاف کر دیا اور ملتان کا صوبہ بھی اُس کے سپرد کر دیا۔

ملک التونیہ بھٹنڈہ کا حاکم تھا۔ وہ یاقوت کی سختیوں سے تنگ آ کر باغی ہو گیا۔ ملکہ نے خود سپہ سالار ہو کر بے شمار فوج سے اُس پر چڑھائی کر دی۔ فوج کے سردار یاقوت کے دشمن تھے۔ وہ

التونیہ سے مل گئے۔ انہوں نے موقع پا کر یاقوت کو قتل کر ڈالا اور ملکہ کو گرفتار کر کے بھٹنڈہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ پھر دہلی جا کر ملکہ کے بھائی بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

رضیہ نے قید میں خاموش زندگی بسر کرنا پسند نہ کیا۔ اُس نے ملک التونیہ سے نکاح کر لیا اور پھر تخت دہلی کے واسطے قسمت آزمانے چلی۔ دربار کے چند امیروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور اِدھر اُدھر جاٹوں کا ایک لشکر بھی اکٹھا کر لیا۔ کیتھل کے قریب بہرام شاہ کی فوجوں سے مٹھ بھیڑ ہوئی۔ ملکہ نے اپنے شوہر سمیت جاں توڑ مقابلہ کیا۔ مگر تقدیر کے آگے تدبیر کا کچھ بس نہ چلا۔ شکست فاش ہوئی۔ ملکہ اور ملک التونیہ دونوں گرفتار ہو کر مارے گئے۔

رضیہ سلطان نے تین سال تین ماہ چھ دن حکومت کر کے اِس دنیا کو خیر باد کہا۔ وہ دہلی میں دفن ہوئی۔ اُس کی پختہ قبر آج تک موجود ہے۔ لیکن بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ دہلی کے عام اَن پڑھ لوگ اُسے رجی کی درگاہ کہتے ہیں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والی میں۔

سلطان سلیمان اعظم

سلطان سلیمان چھبیس برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ وہ بہت رحم دل تھا۔ اس کے انصاف کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُسے دن رات رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رہتا تھا۔ اُس زمانے میں ہنگری کی سرحدیں ترکی کے ساتھ ملتی تھیں۔ سلطان سلیمان نے ہنگری کے بادشاہ لوئی ثانی کے پاس اپنے سفیر بھیجے اور اُس سے خراج کا مطالبہ کیا۔ جس کی ادائیگی کا اُس نے وعدہ کر رکھا تھا۔ شہنشاہ لوئی ثانی نے سلطان سلیمان کے سفیروں کو قتل کرا دیا تو اُسے بڑا غصہ آیا اور فوراً ہنگری کی فتح کے لیے روانہ ہو گیا۔ اور بلغراد کو گھیرے میں لے لیا۔ سات روز کی گولہ باری کے بعد بلغراد فتح ہو گیا۔ تو وہاں کے سب سے بڑے گرجے میں نماز ادا کی۔

بلغراد میں اس نے ایک فوجی دستہ متعین کیا اور قلعے کو مضبوط کر کے قسطنطنیہ واپس ہوا۔ اب ہنگری میں داخل ہونے کے تمام دروازے کھل گئے تھے۔ وہ چاہتا تو ہنگری پر دھاوا بول سکتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ جزیرہ روڈس کو فتح کرنا چاہتا تھا۔

جزیرہ روڈس پر عیسائیوں کی حکومت تھی اور اُن کے جہاز بحیرۂ روم اور اناطولیہ کے ساحلوں تک لوٹ مچاتے رہتے تھے۔ چنانچہ سلطان نے تین سو جہازوں کا بیڑا قسطنطنیہ سے روڈس کی جانب روانہ کیا اور خود ایک لاکھ فوج لے کر ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل سے بڑھتا ہوا روڈس کے ساحل پر جا اُترا۔ تقریباً پانچ مہینے کی مدافعت کے بعد عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب ادھر سے اطمینان ہو گیا تو سلیمان نے ہنگری پر حملہ کیا۔ سلطان کے ساتھ تین سو توپیں اور ایک لاکھ فوج تھی۔

28 اگست 1526ء کو موہاکز کے میدان میں ہنگری کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ یہ لڑائی

دو گھنٹے سے بھی کم جاری رہی اور ہنگری کو شکست فاش ہوئی۔ چوبیس ہزار ہنگروی سپاہی اور سردار مارے گئے اور شہنشاہ لوئی ثانی بھی دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ سلطان سلیمان ہنگری کے پایہ تخت بوڈاپسٹ پہنچا تو شہریوں نے شہر کے دروازے کھول دیئے اور ہنگری کے امیروں وزیروں نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔ شہنشاہ لوئی کی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے امیروں کے مشورے سے سلیمان نے وہاں کے ایک سردار کاؤنٹ زاپولیہ کو وہاں کا بادشاہ بنا دیا۔

سلطان سلیمان کے قسطنطنیہ واپس آ جانے کے بعد آسٹریا کے شہنشاہ چارلس پنجم کے بھائی فرڈیننڈ نے ہنگری کے تخت کا دعویٰ کیا۔ اس نے زاپولیہ کو شکست دے کر ملک سے نکال دیا تو اُس نے سلطان سلیمان سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ سلطان پھر قسطنطنیہ سے روانہ ہوا اور بوڈاپسٹ کا محاصرہ کیا۔ چھ روز میں شہر فتح ہو گیا۔ زاپولیہ کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اور سلطان سلیمان آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کی طرف بڑھا جہاں چارلس پنجم کی فوج کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ ترکوں کو اپنی بڑی بڑی توپیں ہنگری ہی میں چھوڑنا پڑی تھیں۔ اب انہوں نے یہی سوچا کہ سرنگیں کھود کر قلعے کی فصیلیں گرائی جائیں۔ اگرچہ کئی جگہ سے فصیلوں میں شگاف ہو گئے تھے مگر ترک فوجیں شہر میں داخل نہ ہو سکیں اور موسم بہت خراب ہو گیا۔ ترک سپاہی ایسے موسم کے عادی نہ تھے۔ سلطان سلیمان نے محاصرہ اٹھا لیا اور تین سال بعد اُس نے پھر ویانا کا رُخ کیا۔ شہنشاہ چارلس پنجم بھی اپنی فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلا۔ اس مہم میں بھی سلطان سلیمان کو کامیابی نہ ہوئی۔ دو قلعوں کو فتح کرنے میں کافی عرصہ لگ گیا۔ سلطان قسطنطنیہ واپس لوٹ آیا۔

چند سال تک زاپولیہ اور فرڈی ننڈ میں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر میں ان دونوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ اس طرح ہنگری کے دو حصے ہو گئے۔ مشرقی حصے کا بادشاہ زاپولیہ کو تسلیم کیا گیا اور مغربی حصے کا فرڈی ننڈ کو۔ لیکن دوسرے ہی سال زاپولیہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی بیوہ اور فرڈی ننڈ کے درمیان پھر جنگ چھڑ گئی۔ زاپولیہ کی بیوہ نے اپنے بچے کے لیے سلیمان سے مدد کی درخواست کی۔ تو وہ تیسری بار ہنگری میں داخل ہوا اور فرڈی ننڈ کو شکست دے کر بوڈاپسٹ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے ہنگری کو کئی صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ وہاں ترکی فوجیں اور ترکی گورنر مقرر کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ چارلس اور فرڈی ننڈ نے صلح کی درخواست کی۔ اس میں صدر جمہوریہ وینس، پوپ اور شاہِ فرانس بھی شریک ہو گئے۔ سارے

ہنگری پر سلطان سلیمان کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا۔

سلطان سلیمان کے عہد میں خیر الدین پاشا ترکی کے بیڑے کا امیر البحر تھا۔ جس نے کئی جزیرے فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیے اُس نے بحیرۂ روم، بحیرۂ احمر اور بحر ہند میں ترکی کی بحری طاقت کو کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو پرتگال سے بہت زیادہ نقصان پہنچ رہا تھا۔ پرتگیزوں نے ایک بیڑا تیار کر کے مشرقی ملکوں کے ساتھ تجارت شروع کر دی تھی۔ اور اس سلسلے میں وہ عرب جہازوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ جب سلطان سلیمان نے یہ خبریں سنیں تو اسے پرتگیزوں کی اس جرأت پر بڑا سخت غصہ آیا اور اس نے ایک بیڑا ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اس بیڑے نے پہلے عدن کو پرتگیزوں کے قبضہ سے چھڑایا اور پھر آگے بڑھ کر دشمن کے بیڑے کو گرفتار کرلیا۔ اس طرح سے پرتگیزوں کی لوٹ مار کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا۔

ادھر ہنگری میں فرڈی ننڈ کے انتقال کے بعد اس کے جانشین میکسی ملن ثانی نے زاپولیہ کے لڑکے کو تخت سے اُتارنے کے لیے کئی اہم قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ جب سلطان سلیمان کو یہ معلوم ہوا تو اُس نے خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی عمر اُس وقت 76 سال کی ہو چکی تھی اور کمزوری اور بیماری کی وجہ سے وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ وہ پالکی میں سوار ہوا اور ہنگری کے کئی قلعے فتح کرتا ہوا ایک مشہور قلعے زلی جت کے سامنے جا پہنچا یہاں کے حاکم نے سیاہ جھنڈا بلند کر کے یہ قسم کھائی کہ جب تک ایک سپاہی بھی زندہ رہے گا ہتھیار نہ ڈالیں گے۔ ترکوں نے اس قلعے پر تین حملے کیے لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ آخر انہوں نے قلعے کے سب سے بڑے بُرج کے نیچے سرنگ کھود کر بارود بچھا دیا اور اس میں آگ لگا دی۔ اوپر سے گولہ باری کی تو قلعہ فتح ہو گیا۔ لیکن اس کے تین دن بعد سلطان سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ وزیراعظم نے اس کے انتقال کی خبر پوشیدہ رکھی اور سلطان کے نام سے تمام حکم جاری کرتا رہا۔ لیکن اُس نے سلطان کے لڑکے شہزادہ سلیم کے پاس یہ خبر بھیج دی۔ اس عرصے میں ترکی کی فوجوں نے کئی شہر فتح کر لیے تھے۔ وزیراعظم نے سلطان کی لاش کو حنوط کر کے خراب ہونے سے محفوظ کرلیا تھا۔ اور لاش کو پالکی میں رکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتا رہا۔ اُس نے سپاہیوں سے کہہ دیا تھا کہ سلطان بیماری کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس تدبیر سے اُس نے سات ہفتے تک سلطان کی وفات کو چھپائے رکھا۔ جب اسے معلوم ہو گیا کہ قسطنطنیہ میں شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھ چکا ہے، تو اُس

نے تمام فوج کو جمع کر کے اعلان کر دیا کہ سلطان سلیمان کا انتقال ہو چکا ہے۔

سلطان سلیمان کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور خوشحالی کے لحاظ سے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل سے زیادہ تھا اور اس میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملک شامل تھے۔

بہادری، شجاعت اور فوجی قابلیت کے ساتھ ساتھ سلطان کو عمارتوں کا بھی خاص شوق تھا۔ اس نے قسطنطنیہ، بغداد، دمشق اور دوسرے شہروں میں نہایت خوبصورت اور عالی شان عمارتیں بنوائی تھیں۔ کئی مسجدیں تعمیر کرائیں۔ قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑی نہر کھدوائی اور مکہ معظمہ کی نہروں کی مرمت کروائی۔ اس کے علاوہ سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہسپتال اور پُل تعمیر کرائے۔

سلطان سلیمان علم و فضل کا بڑا قدر دان تھا۔ وہ خود بھی ادیب اور شاعر تھا۔ اس کا روزنامچہ جو وہ ہر جنگ کے دوران لکھا کرتا تھا، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس نے بہت سے کالج اور مدرسے بنوائے اور عالموں کے منصب میں بڑا اضافہ کیا۔ ان کے لیے سلطان نے یہ قانون بنا دیا کہ ان کی جائیداد کسی صورت میں بھی ضبط نہ کی جائے گی۔ غرض سلطان سلیمان اعظم ہر لحاظ سے ترکوں کا ایک بہت بڑا شہنشاہ تھا۔

65

سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ

سلطان محمد 21 سال کی عمر میں ترکی کے تخت پر بیٹھا۔ اُس وقت قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ قسطنطین یازدہم تھا۔ جو بڑا بہادر شخص تھا۔ مگر اس نے ایک ایسی حرکت کی جس سے سلطان محمد کو اُس پر بڑا غصہ آیا۔

بات یہ ہوئی کہ ایک ترکی شہزادہ جس کا نام ادرخان تھا قسطنطنیہ میں نظر بند تھا۔ اُس کا خرچ سلطان کی طرف سے ادا ہوتا تھا۔ قسطنطین نے مطالبہ کیا کہ اُس کا خرچ زیادہ کیا جائے اور دھمکی دی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو وہ ادرخاں کو سلطان محمد کے سامنے لاکھڑا کرے گا۔

اُس وقوت سلطان محمد ایشیائے کوچک میں بعض شورشوں کو دبانے میں مشغول تھا۔ اُس نے بازنطینی سفیروں کو جو اس مقصد کے لیے آئے تھے۔ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ مگر اس کے وزیراعظم خلیل پاشا نے سفیروں سے کہا کہ تمہاری حماقت قسطنطنیہ کو سلطان کے ہاتھوں میں دے کر رہے گی۔ سلطان محمد نے قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ اس نے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل اور قسطنطنیہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ایک زبردست قلعہ بنوانا شروع کر دیا۔ یہ قلعہ اُس کے بعد والے قلعے کے بالکل سامنے تھا جو سلطان بایزید نے آبنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر بنوایا تھا۔

1452ء میں نیا قلعہ بن کر تیار ہو گیا۔ اس طرح والے تقریباً تمام آبنائے باسفورس ترکوں کے قبضہ میں تھی۔ کوئی جہاز اُن کی اجازت کے بغیر اُسے عبور نہیں کر سکتا تھا۔ سلطان محمد نے اردنہ میں فوج جمع کی جو ڈیڑھ لاکھ تھی مگر قسطنطنیہ کی فتح کے لیے صرف فوج ہی کافی نہ تھی چاہے اُس کی تعداد کئی لاکھ کیوں نہ ہوتی۔ یہ شہر تکون کی شکل پر تھا۔ اُس کے دو حصے پانی میں گھرے ہوئے

تھے۔ شمال میں شاخ زریں اور جنوب میں بحیرہ مار مورا تھا۔ بری فوجیں فقط تیسرے حصہ پر حملہ کر سکتی تھیں۔ جو مغرب کی جانب واقع تھا مگر اُس کی حفاظت کے لیے تین مضبوط دیواریں بنی ہوئی تھیں توپوں کی ایجاد سے پہلے یہ دیواریں ہر قسم کے حملے سے محفوظ خیال کی جاتی تھیں۔

قسطنطنیہ کی فتح کے لیے ضروری تھا کہ ان دیواروں پر کامیابی سے گولہ باری کی جائے۔ اگر چہ سلطان کے پاس کافی توپیں تھیں مگر یہ ناکافی خیال کی گئیں۔ سلطان نے خاص طور پر بڑی توپیں بنوائیں، جو دُور تک مار کرتی تھیں اور بھاری بھرکم گولے پھینکتی تھیں۔

اس کے علاوہ ہنگری کے ایک ماہر اسلحہ اور باغی نے جو ترکی فوج میں ملازم تھا ایک بہت بڑی توپ بنائی، جس کے گولے کا قطر ڈھائی فٹ تھا۔ اُس نے اور بھی توپیں بنائیں جو چھوٹی تھیں، مگر تیزی کے ساتھ گولے برسا سکتی تھیں۔ سلطان محمد نے محاصرے کے لیے ایک بحری بیڑہ بھی تیار کروایا جس میں ایک سو اسّی جہاز تھے۔

قسطنطین بھی ترکوں کی تیاریوں سے غافل نہ تھا۔ وہ بھی اپنی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے شہر کی دیواروں کی مرمت کروائی اور کھانے پینے کا جتنا سامان جمع کر سکتا تھا کر لیا۔ اس کے بعد اُس نے عیسائی بادشاہوں سے مدد کی درخواست کی تو انہوں نے کئی دستے قسطنطین کے پاس اُس کی حفاظت کے لیے بھیج دیئے۔

سب سے زیادہ مدد حکومت جنیوا نے دی۔ اس کا مشہور اور دلیر کمانڈر جان جنٹیانی دو جنگی جہازوں اور سات سو منتخب بہادروں کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچ گیا۔

9 اپریل 1453ء کو قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہوا۔ جنٹیانی کی فوج نے بڑی مہارت دکھائی۔ بڑی جنگ جاری تھی کہ اچانک ایک بحری جنگ بھی پیش آگئی۔ جنیوا کے چار جہاز اہل قسطنطنیہ کے لیے رسد لا رہے تھے۔ جب وہ بحیرہ مار مورا کو عبور کرنے کے بعد آبنائے باسفورس میں داخل ہوئے تو ایک سو چالیس کشتیاں ان کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ جس وقت یہ جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچے، ترکی کے بیڑے نے ان پر حملہ کر دیا۔ جنیوا کے جہاز ترکی کی کشتیوں کے مقابلے میں بہت بڑے اور اونچے تھے۔ انہوں نے ترکوں کی کشتیوں پر آگ اور پتھروں کی بارش شروع کر دی جس سے ان میں گڑبڑ پھیل گئی۔

سلطان محمد ساحل پر کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بے اختیار ہو کر اپنا گھوڑا سمندر

میں ڈال دیا۔ مگر اس وقت تک جنیوا کے جہازوں کو نکل جانے کا راستہ مل گیا تھا اور وہ بندرگاہ میں حفاظت سے داخل ہو چکے تھے۔ اس سے اہل قسطنطنیہ بہت خوش ہوئے اور اُن کے حوصلے بڑھ گئے۔

ترکی بیڑا عیسائیوں کے طاقتور جہازوں کے مقابلے قسطنطنیہ میں داخل ہو گئیں اور انہوں نے فتح کے جوش میں قتل عام شروع کر دیا۔

سلطان محمد سینٹ جان صوفیا کے گرجے کے پاس پہنچ کر گھوڑے سے اُترا اور اس عالیشان گرجے میں داخل ہو گیا، جس میں گیارہ سو سال سے تین خداؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ سلطان نے مؤذن کو حکم دیا کہ وہ اذان دے۔ سلطان نے اس گرجے میں نماز پڑھی اور ان تمام عیسائیوں کو واپس آنے کی اجازت دے دی۔ جو لڑائی کے دوران میں قسطنطنیہ سے بھاگ گئے تھے۔ بڑے پادری کی بڑی عزت کی۔ عیسائیوں پر سختی کی ممانعت کر دی۔ سلطان نے بڑے پادری کو اپنے ہاتھ سے وہ عصا عنایت کیا جو اُس کے عہدے کا نشان تھا۔ اس کے علاوہ ایک گھوڑا اور ایک خریطہ عطا کیا، جس میں ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔ جب قسطنطنیہ کی فوجوں کا سپہ سالار گرفتار ہو کر اُس کے سامنے آیا تو اس معاف کر دیا گیا۔ بلکہ سلطان اس کی بیمار بیوی کی عیادت کے لیے بھی گیا۔

ضروری انتظام کرنے کے بعد سلطان محمد قسطنطنیہ کو نئے سرے سے آباد کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک عرصے سے وہاں کی آبادی برابر کم ہوتی جا رہی تھی۔ ترکی کے دوسرے حصوں سے بھی بہت سے یونانی، یہودی اور تُرک خاندانوں کو یہاں بسایا گیا اور قسطنطنیہ بہت جلد ہی ترقی کر گیا۔

قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لیے جو پہلی فوج گئی تھی، اُس میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اُن کی وفات وہیں ہوئی تھی، مگر اس وقت تک اُن کے مزار کا نشان مٹ گیا تھا اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں دفن ہیں۔ سلطان محمد نے ہر ممکن طریقے سے اسے تلاش کیا مگر ناکامی ہوئی۔ آخر ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا تھا۔

"فصیل کے پاس فلاں جگہ کھودو۔ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار کا پتہ چل جائے گا۔"

دوسری صبح کو اُسی جگہ کھدائی شروع کی گئی تو مزار کا تعویز دکھائی دیا۔ سلطان نے اس مزار پر ایک عالیشان عمارت اور پاس ہی ایک مسجد بنوادی۔

اگر چہ قسطنطنیہ کی فتح سلطان محمد کا سب سے شاندار کارنامہ ہے اور اِسی بناء پر وہ ''فاتح'' کے لقب سے مشہور ہوا۔ مگر اس نے اور بھی کئی فتوحات حاصل کیں چنانچہ اُس نے کریمیا بھی فتح کیا۔

تخت نشینی سے موت تک سلطان کی زندگی میدانِ جنگ میں گزری۔ ہر جنگ میں وہ خود سپہ سالار تھا۔ وہ کئی جنگیں لڑا مگر اُسے بلغراد کے علاوہ کسی معرکے میں شکست نہیں ہوئی۔ اُس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اپنے ارادوں کو بالکل راز میں رکھتا تھا فوج کے کسی افسر کو پتہ نہ چلتا تھا کہ حملہ کس طرف ہونے والا ہے۔ ایک بار جب کسی مہم کے لیے فوجیں جمع ہوئیں تو اس کے خاص افسروں میں سے ایک نے پوچھا:

''کس ملک یا شہر پر حملے کا ارادہ ہے؟''

سلطان نے بڑی سختی سے جواب دیا:

''خدا کی قسم! اگر میری داڑھی کے ایک بال کو بھی اس کی اطلاع ہو جائے تو میں اسے توڑ کر آگ میں ڈال دوں۔''

سلطان سمجھتا تھا کہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں بہت لازم ہیں۔ ایک تو رازداری اور دوسرے بجلی کی سی تیزی۔ وہ ہمیشہ دونوں باتوں پر عمل کرتا تھا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان نے ترکی بیڑے کی طرف خاص طور سے توجہ کی اور اسے اس قدر مضبوط بنا دیا کہ وہ جنیوا اور وینس کے بیڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔

سلطان محمد علوم وفنون کا سرپرست تھا۔ اپنی مادری زبان ترکی کے علاوہ عربی، فارسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی زبانوں پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ سے اُسے پوری واقفیت تھی۔ وہ خود ایک شاعر تھا اور شاعروں کا قدردان تھا۔ اس کے خزانے سے تیس ترکی شاعروں کو وظیفے ملتے تھے۔

❀............❀............❀

سلطان محمود غزنوی

تیسری صدی ہجری کے آخر میں خلافتِ عباسیہ کی سیاسی قوت میں زوال آیا تو ترکستان میں سامانی خاندان کی ترک سلطنت قائم ہوئی۔ خراسان، کابل اور غزنی اس کے ماتحت تھے اور اس کا پایۂ تخت بخارا تھا۔ انہیں بادشاہوں کا ایک ترک غلام امیر الپتگین گزرا ہے، جس نے چوتھی صدی ہجری میں اپنی حکومت غزنی میں قائم کی۔ اس کا چوتھا جانشین ناصر الدین سبکتگین مشہور بادشاہ تھا۔ محمود غزنوی سبکتگین کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ پہلی اور دوسری نومبر 971ء کی درمیانی رات کو پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت اسی طرح کی گئی، جیسے اس زمانے میں شہزادوں کی کی جاتی تھی۔ اس کے لیے بڑے بڑے عالموں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ محمود بڑا ذہین اور ہونہار تھا۔ اس نے بہت جلد علومِ دین کی تکمیل کر لی۔ وہ حافظِ قرآن تھا، اور حدیث و فقہ میں مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے سیاسی پہلو کی طرف خود سبکتگین نے توجہ کی۔ اس کے علاوہ اسے جنگ کے طور طریقوں میں پوری طرح تربیت دی گئی۔ تلوار چلانے میں وہ بڑا ماہر تھا۔ نشانہ بازی اور تیر چلانے میں بھی اُسے کمال حاصل تھا۔ پندرہ سال ہی کی عمر میں اس نے اپنے باپ کے ساتھ کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ سپاہی اور جرنیل کی حیثیت سے اُس نے ایسے کارنامے دکھائے کہ سبکتگین بے حد خوش ہوا اور اسے نہ صرف سیف الدولہ کا خطاب دیا، بلکہ خراسان کی فوجوں کا سپہ سالار بھی مقرر کر دیا۔ اس وقت سامانی سلطنت ختم ہو رہی تھی، اور وہاں بڑی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

997ء میں امیر سبکتگین کا انتقال ہوا، اور محمود غزنی تخت پر بیٹھا۔ تخت حاصل کرنے کے لیے اُسے اپنے بھائی سے لڑنا بھی پڑا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ محمود حکومت کا زیادہ حق دار ہے، تو اُس نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

سب سے پہلے محمود نے اپنی توجہ خراسان، وسطِ ایشیا اور ایران کی طرف کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہ رہے اور کوئی بھی اس کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے خراسان پر مکمل قبضہ کر لیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کئی سال کے عرصہ میں خوارزم اور غرجستان فتح کیا گیا۔ سلجوقی ترکوں کو شکست فاش دی گئی۔ ترکستان سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے گئے۔

سیستان، ہمدان اور اصفہان پر قبضہ کیا گیا۔ اُسے یہ کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے کئی شدید جنگیں لڑنا پڑیں۔ کئی زبردست معرکے ہوئے مگر محمود کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ ہمیشہ اسی کو فتح ہوتی رہی۔ اس کا رُعب ودبدبہ اتنا تھا، کہ وہ جب ان علاقوں سے دُور دراز فاصلوں پر ہوتا تھا، تب بھی کسی کو سرکشی کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب لڑائیاں اور معرکے بڑے اہم ہیں۔ مگر محمود غزنوی نے ہندوستان پر جو حملے کیے اور فتوحات حاصل کیں، وہ زیادہ مشہور ہیں۔ نہ صرف مشہور بلکہ حیرت انگیز اور پُر لطف بھی۔

ہندوستان شروع ہی سے الپتگین اور اس کے جانشینوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس وقت وہاں بہت سے راجے مہاراجے حکومت کرتے تھے۔ مگر ان میں سے راجہ جے پال بہت مشہور تھا جس کی سلطنت سرہند سے لمغان تک اور کشمیر سے ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ امیر سبکتگین سے جے پال کے کئی معرکے ہوئے، اور اُس نے اپنی سلطنت کی سرحد ہندوستان کی طرف لمغان تک بڑھا دی۔ محمود نے اپنے والد کے اس کام کو جاری رکھا، اور جب خلیفہ بغداد نے اسے خود مختار سلطان مان لیا، تو اُس نے عہد کر لیا کہ ہر سال ہندوستان پر ایک نہ ایک حملہ ضرور کرے گا۔ ہندوستان پر اس کے بارہ حملے مشہور ہیں۔ مگر وہ سترہ دفعہ وہاں آیا۔ ان میں سے یہاں صرف مشہور لڑائیوں کا ذکر کیا جائے گا۔

اپنا عہد پُورا کرنے کے لیے محمود غزنوی نے 1000ء میں ہندوستان کا رُخ کیا۔ پہلی لڑائی پرانے دشمن راجہ جے پال سے پشاور کے قریب ہوئی۔ غزنی کے سواروں نے چن چن کر ہندی سپاہیوں کو مارا۔ راجہ جے پال گرفتار ہوا۔ محمود نے آگے بڑھ کر ننددنہ پر جو دریائے جہلم کے کنارے مضبوط پہاڑی قلعہ تھا۔ قبضہ کر لیا۔ راجہ جے پال نے محمود کی خدمت میں بیس لاکھ دینار اور پانچ ہاتھی پیش کیے اور وعدہ کیا، کہ وہ ہمیشہ غزنی کا فرمانبردار رہے گا۔ اس پر اُسے رہا کر دیا گیا۔ مگر جلد ہی اُس کے بعد شرم کے مارے اُس نے اپنے آپ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا اور

مر گیا۔ انند پال اُس کا جانشین بنا۔

پنجاب میں آگے بڑھنے سے پہلے محمود نے ملتان اور مشرقی سندھ کا رُخ کیا۔ اگلے سال اس نے بھاٹیہ کے راجہ پر چڑھائی کی۔ اُسے اپنی فوجی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جب محمود اس کے پایۂ تخت کی طرف بڑھا، تو وہ بھی مقابلہ کے لیے آیا۔ تین روز لگاتار لڑائی ہوتی رہی۔ چوتھے روز محمود نے خدا کی درگاہ میں فتح کی دُعا کی اور ہندوؤں کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ راجہ کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ وہ نکل بھاگا اور ایک گھنے جنگل میں چھپ گیا۔ سلطانی فوج کے ایک دستہ نے جنگل کو گھیر لیا۔ راجہ نے جب بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی، تو اپنے سینہ میں خنجر بھونک کر مر گیا۔

اس وقت ملتان کا حاکم ابوالفتح داؤد تھا۔ اس کا دادا امیر سبکتگین کے بہی خواہوں میں سے تھا، اور اس کی پوری اطاعت کرتا تھا۔ مگر اس کے پوتے ابوالفتح نے اپنے باپ دادا کا طریقہ چھوڑ دیا اور بے دین ہو گیا۔ اسکے علاوہ ابوالفتح ہندوؤں کو بھڑکاتا اور مسلمانوں کے خلاف مدد پہنچاتا تھا۔ جب محمود ملتان کی طرف بڑھا، تو راجہ انند پال نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مگر جب مقابلہ ہوا تو بدحواس ہو کر بھاگا اور چناب تک کہیں نہ ٹھہرا اور مارے ڈر کے کشمیر کے پہاڑوں میں جا چھپا۔ جب غزنوی فوجیں ملتان کے سامنے پہنچیں، تو ابوالفتح نے اپنے قصور کی معافی مانگی، اور بُرے عقیدوں سے توبہ کی۔ محمود نے اسے معاف کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ آس پاس کے علاقوں کو بھی فتح کر لے۔ مگر اتنے میں اُسے خبر ملی کہ ترکستان کا امیر ایک خان خراسان پر چڑھ آیا ہے۔ محمود فوراً اُدھر روانہ ہوا اور مغربی پنجاب کا حاکم ایک نومسلم سکھ پال کو بنا دیا۔ محمود خراسان پہنچا، تو اُسے معلوم ہوا کہ ایک خان نے ایک بڑا لشکر جمع کر لیا ہے۔ اُس نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور فوراً اس پر حملہ کر دیا۔ بلخ کے قریب بڑی خونریز جنگ لڑی گئی۔ جس میں محمود کو فتح ہوئی۔ اس فتح نے بہادر سے بہادر دشمن کے دل پر بھی اس کی دھاک بٹھا دی۔

سلطان محمود کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر انند پال بہت پریشان تھا وہ اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ متحد ہو کر محمود کا مقابلہ کیا جائے۔ اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج اور اجمیر کے راجہ فوراً تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی فوجیں انند پال کے پاس بھیج دیں۔ اس طرح ایک زبردست لشکر تیار ہو گیا۔ اس کو لے کر وہ پشاور کی طرف بڑھا۔ سلطان محمود نے اس حملہ کی خبر سُنی تو وہ غزنی سے روانہ

ہوا۔ دریائے سندھ کو عبور کیا۔ اور دیہند کے مقام پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ چالیس روز دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی رہیں۔ لیکن لڑائی کی ابتداء کسی طرف سے بھی نہ ہوئی۔ ہندوؤں کا لشکر روز بروز بڑھتا جاتا تھا محمود کو پتہ چل گیا تھا کہ اس دفعہ ہندو سردھڑ کی بازی لگا کر آئے ہیں۔ اُس نے بھی بے حد احتیاط سے کام لیا۔ اس نے حکم دیا، کہ فوج کے دونوں طرف ایک خندق کھودی جائے۔ تاکہ کسی طرف سے بھی ہندوؤں کا بس نہ چلے۔ اس کے بعد محمود نے لڑائی شروع کی۔ ایک ہزار تیر چلانے والے اس کے حکم سے آگے بڑھے اور ہندوؤں پر تیر برسانے لگے۔ ہندوؤں نے بھی زور سے حملہ کر دیا۔ کھوکھر قوم کے سپاہی ننگے سر، ننگے پاؤں لڑتے ہوئے خندق کو پھاند گئے اور سلطانی لشکر میں گھس آئے۔ انہوں نے وہاں کھلبلی مچادی۔ قریب تھا کہ محمود کی فوج کے پاؤں اُکھڑ جاتے مگر اس نے اپنے خاص دستہ کو حکم دیا کہ وہ دشمن پر پیچھے کی طرف سے حملہ کر دے۔ اس حملہ سے دشمن میں بدحواسی پھیل گئی، اور اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے دو سرداروں نے اُن کا پیچھا کیا۔ آٹھ ہزار ہندو مارے گئے۔ یہ بڑی زبردست فتح تھی۔ ہندوستان کی اتنی بڑی جنگی طاقت اب تک کسی میدان میں جمع نہیں ہوئی تھی۔

اب شمالی پنجاب کا سارا میدان خالی تھا۔ محمود منزل بہ منزل مشرقی سرے تک آگے بڑھا، اور نگرکوٹ (کانگڑہ) کا قلعہ گھیرے لیا۔ یہ قلعہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا تھا، جس کے اندر سینکڑوں بتوں کے علاوہ بے شمار دولت بھی تھی۔ دو ہی روز میں راجہ امان کا طالب ہوا۔ محمود نے اس کی جان بخشی کر دی۔ پھر قلعہ میں داخل ہوا جہاں سے اُسے سات لاکھ اشرفیاں، سات سو من سونے چاندی کے آلات، دو سو من خالص سونا، دو ہزار من خالص چاندی اور بیس من طرح طرح کے قیمتی جواہرات ملے۔ اس موقع پر سلطان نے اعلان کیا کہ جو ہندو سلطانی فوج میں بھرتی ہونا چاہے، وہ خوشی سے ہوسکتا ہے۔ یہ سنتے ہی دس ہزار ہندو بھرتی ہو گئے۔ محمود نے انہی میں سے ایک کو سپہ سالار بنا دیا۔ نگرکوٹ کی فتح کے دو سال بعد تھانیسر کے بڑے مندر کو بھی محمود نے ڈھایا۔ جنوبی پنجاب اور دہلی کے راجہ تلواریں تولتے رہ گئے۔

اگلے سات سال میں محمود نے افغانستان، سیستان اور بلوچستان کے سرکشوں کو تلوار کے زور سے مطیع کیا۔ دوسری طرف ایران میں قزدین اور شمال میں خوارزم تک ایسی یلغاریں کیں کہ اسلامی دنیا میں اس کی فتوحات کا غلغلہ بپا ہو گیا۔ اب سلطان نے ہندوستان کے مشہور شہر قنوج پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ اس مہم میں سلطان کی فوج میں ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیادے تھے۔ ان

میں سمرقند اور بخارا کے ملکوں کے باشندے بھی تھے۔ پنجاب میں اب کوئی دشمن نہیں رہا تھا۔ مگر کشمیر کی طرف سے اطمینان کرنا ضروری تھا۔ تین سال پہلے بھی اس نے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ مگر برف کی زیادتی کے سبب وہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ اس مرتبہ راجہ نے اطاعت قبول کر لی، اور سلطانی لشکر قنوج کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں سب سے پہلے برن (موجودہ بلند شہر) کا محاصرہ کیا۔ وہاں کے راجہ نے اپنے دس ہزار ساتھیوں سمیت اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ متھرا کے سامنے پہنچا۔ اگرچہ یہ ہندوؤں کا بڑا مقدس شہر تھا اور آس پاس کئی راجے حکومت کرتے تھے مگر کسی کو ہمت نہ ہوئی، کہ مقابلہ کے لیے نکلتا۔ یہاں سے منوں سونا چاندی اور بیش قیمت جواہرات اونٹوں پر لاد کر غزنی بھیج دیئے گئے۔ غرض محمود کو کہیں روکنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کئی ریاستوں کے راجے، جدھر سے اس کا لشکر گزرا، دور ہی سے خبر سن کر بھاگ گئے۔

قنوج پرتی ہارا شہزادوں کی راجدہانی تھی۔ یہ شہزادے شمالی ہندوستان کے سردار گنے جاتے تھے۔ اس زمانے میں شہر کی شہر پناہ پندرہ کوس کے گھیرے میں تھی۔ راجہ کا نام راج پال تھا۔ اس کی فوج میں پانچ لاکھ پیادے، تیس ہزار سوار اور 80 ہزار زرہ پوش تھے۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جب محمود قنوج کے سامنے وارد ہوا، تو راجہ نے سفیر بھیج کی اطاعت کا اقرار کیا۔ پھر خود سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر پیش کی۔ سلطان نے اُسے اپنی پناہ میں لے لیا اور آئندہ محض اس کے دشمنوں کو سزا دینے کی خاطر ان علاقوں پر دوبارہ فوج کشی کی۔

ہندوستان کے راجے سلطان محمود سے تو دبکتے تھے اور اس کے سامنے نہ ٹھہر سکتے تھے، لیکن جب وہ غزنی واپس چلا گیا، تو وہ قنوج پر چڑھ دوڑے اور وہاں کے راجہ راج پال کو مسلمانوں سے مل جانے کے قصور پر ہلاک کر دیا۔ اس کا بانی مبانی کالنجر کا راجہ گنڈا تھا۔ محمود کو جب یہ خبر ملی تو اُسے سخت غصہ آیا، اور راجہ کو اس کی سزا دینے کی خاطر پھر ہندوستان آنا پڑا۔ کالنجر پر حملہ کرنے سے پہلے اس نے گوالیار کے مضبوط قلعہ کو گھیر لیا۔ راجہ بہت بدحواس تھا۔ چار روز کے بعد اس نے صلح کی درخواست کی جسے منظور کر لیا گیا۔ اِدھر سے اطمینان کر کے سلطان بندھیل کھنڈ میں آیا۔ گنڈا نے بھاگ کر جنگلوں میں پناہ لی۔ سلطان شمال کی طرف پلٹا، اور ان راجوں کی جو راجہ راج پال کے قتل میں شامل تھے، سخت سرکوبی کی۔ اس کے بعد پلٹ کر دوبارہ بندھیل کھنڈ پہنچا اور کالنجر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ بہت بڑا اور مضبوط تھا۔ سلطان نے چاروں طرف سے راستے بند کر دیئے، تا کہ ایک دانہ بھی اندر نہ پہنچ سکے۔ گنڈا نے مجبور ہو کر امان طلب کی اور سالانہ خراج دینے کا وعدہ

کیا۔ سلطان نے اس کو مان لیا۔ اس موقعہ پر گنڈا نے ہندی کا ایک شعر سلطان محمود کی تعریف میں لکھ کر بھیجا۔ جس سے محمود اتنا خوش ہوا، کہ اس نے گنڈا کو پندرہ قلعوں کا حکمران بنا دیا اور بہت سا مال اور ساز و سامان لے کر غزنی واپس ہوا۔

جب محمود غزنی واپس پہنچا۔ تو اس نے حکم دیا کہ ان فتوحات کے شکرانے میں ایک جامعہ مسجد بنائی جائے۔ چنانچہ غزنی میں ایک نہایت خوب صورت مسجد بنائی گئی۔ اس کے ساتھ ایک مدرسہ اور ایک کتب خانہ قائم کیا۔ محمود نے ہندوستان کے تمام معرکوں کا تفصیلی حال خلیفۂ بغداد کی خدمت میں بھیجا۔ خلیفہ بہت خوش ہوا۔ سارے اسلامی ملکوں میں خوشیاں منائی گئیں۔

راجہ انند پال کے وارث پنجاب میں شورش پیدا کر رہے تھے۔ سلطان نے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی ٹھان لی۔ وہ پنجاب آیا اور لاہور کو فتح کر کے اس صوبے کو سلطنت غزنی میں شامل کر لیا۔ یہاں کا گورنر اُس نے اپنے عزیز ترین غلام ایاز کو مقرر کیا۔

پنجاب کا انتظام ٹھیک کرنے کے بعد اس اَن تھک مجاہد نے سومنات پر حملہ کی تیاری کی۔ سومنات بُت کا نام بھی تھا اور شہر کا بھی۔ جس مندر میں سومنات تھا، وہاں پر باہر کی روشنی نہ آتی تھی۔ ہیرے جواہرات دیواروں میں جڑے ہوئے اور جڑاؤ قندیلوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی جگمگاہٹ سے وہاں دن رات برابر تھے۔ چھپن ستون جواہرات سے مرصع تھے۔ دو سو من وزن سونے کی زنجیر لٹکتی تھی۔ اس میں گھنٹے اور گھڑیال تھے۔ اس کے خرچ کے واسطے دو ہزار گاؤں کا لگان مخصوص تھا۔ دو ہزار پنڈت حفاظت کے واسطے مقرر تھے۔ دروازہ کے سامنے سومنات کھڑا تھا۔ پورا پانچ گز لمبا۔ دو گز زمین کے اندر اور تین گز باہر۔ دریائے گنگا اگر چہ چھ سو کوس کے فاصلے پر تھا۔ مگر سومنات کو اشنان کرانے کے لیے روزانہ تازہ گنگا جل آتا تھا۔ دولت اس مندر میں اتنی جمع تھی کہ کسی راجہ کے خزانے میں نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ سومنات نہ صرف جنگی بلکہ سازشی مرکز بھی تھا۔

سومنات نہایت محفوظ قلعہ بند جزیرہ تھا۔ گجرات کے مغربی ساحل سے ایک پتلی سی پٹی اُسے خشکی سے ملاتی تھی۔ اس پٹی پر فصیلیں بنا دی گئی تھیں۔ غزنی سے یہاں آنے کا راستہ جنوبی سندھ اور کچھ سے تھا۔ مگر محمود راجپوتانہ کے اُن راستوں سے آیا جس کا وہاں کے باشندوں کو خیال بھی نہ آیا ہوگا چنانچہ جب وہ یکایک کاٹھیا واڑ کے پایۂ تخت انہل واڑہ (موجودہ پٹن) کے میدانوں میں نمودار ہوا، تو راجا اور پرجا سب حیران رہ گئے۔ راجہ بھاگ کر کہیں دُور چلا گیا۔ سلطانی لشکر بلا روک ٹوک گجرات میں داخل ہو کر سومنات کے سامنے جا پہنچا۔ یہ سارا سفر غیر

معمولی جرأت اور سلطان کی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت ہے۔ سلطان محمود نے دیکھا کہ یہاں کا قلعہ بلندی میں آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اسے یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوئی، کہ اہلِ سومنات قلعہ کی دیواروں پر کھڑے اس کی فوج کو دیکھ دیکھ کر چلاّ چلاّ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اُن کا بڑا بت مسلمانوں کو یہاں کھینچ لایا ہے۔ تاکہ سب کو ایک ہی بار ہلاک کر ڈالے۔ سلطانی فوج نے قلعہ کی طرف حرکت کی اور قلعہ کی دیوار کے نیچے پہنچ کر لڑائی شروع کی۔ جب ہندوؤں نے مسلمانوں کی یہ دلیری دیکھی تو تیروں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے قلعہ کی دیوار سے نیچے اُترے، اور اندر جا کر سومنات سے فتح کی دعائیں مانگنے لگے۔ مسلمان کئی سیڑھیاں لگا کر قلعہ کے ایک حصہ پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے تکبیر کے نعرے بلند کیے۔ اس دن صبح سے شام تک لڑائی کا بازار گرم رہا۔ جب اندھیرا ہوا تو سلطانی لشکر واپس ہوا۔ دوسرے دن پھر انہوں نے قلعے پر حملہ کیا اور تیروں کی بارش اور نیزوں کی ضربوں سے ہندوؤں کو قلعہ کے اس حصہ سے پسپا کر دیا او پھر پہلے روز کی طرح سیڑھیاں لگا کر چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ اہلِ سومنات نے مختلف گروہ بندیاں کیں۔ سومنات سے لپٹ لپٹ کر روئے اور فریاد کرتے ہوئے سلطانی فوج پر پل پڑے۔ وہ اتنا لڑے کہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ تیسرے روز ہندو راجاؤں کے وہ لشکر جو سومنات کی مدد کو آئے تھے، سلطانی فوج کے سامنے آکر صف آرا ہو گئے۔ محمود نے اپنی فوج کے ایک حصہ کو اِدھر روانہ کر دیا۔ بڑی شدید لڑائی ہوئی۔ میدان میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہندو بڑا جم کر لڑ رہے تھے آخر محمود نے ایک عام ہلّہ کا حکم دیا۔ اس حملہ سے دشمن نہ سنبھل سکا اور اُسے سخت شکست ہوئی۔ پانچ ہزار تو میدان میں کام آئے۔ باقی کشتیوں میں سوار ہو کر بھاگے۔ سلطان نے پہلے ہی فوج کا ایک دستہ اُدھر بھیج دیا تھا۔ چنانچہ بہت سے ہندو سمندر میں غرق ہو گئے اندر قلعے والوں کا دل بیٹھ گیا اور انہوں نے ہار مان لی۔

جب قلعہ فتح ہو گیا تو سلطان محمود اپنے امیروں وزیروں کے ساتھ مندر میں داخل ہوا۔ پجاری جو مندر میں رہ گئے تھے، گڑگڑائے کہ بہت سا مال قبول کر لیا جائے اور بت نہ توڑا جائے۔ کئی امیروں نے بھی یہ مشورہ دیا مگر محمود نے جو جواب دیا وہ سب سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یعنی ''میری آرزو ہے کہ قیامت کے دن محمود بُت شکن کے نام سے پکارا جاؤں، محمود بُت فروش نہ کہلاؤں۔'' پھر آگے بڑھ کر اپنا فولادی گرز گھما کر اس زور سے مارا کہ وہ بُت جس کو صدیوں سے سجدے کیے جاتے تھے، پاش پاش ہو کر نیچے گرا۔ اس کے چند ٹکڑے مکہ اور بغداد بھیج دیئے گئے اور چند غزنی تاکہ وہاں جامع مسجد اور شاہی محل کے سامنے رکھ دیئے جائیں۔ محمود نے یہاں سے بے

انتہا دولت سمیٹی اور غزنی واپس ہوا۔ سومنات کی بربادی بُت پرستی پر اسلام کی ایک بہت بڑی فتح تھی۔ ساری اسلامی دنیا نے محمود کے کارنامے کو سراہا اور شاعروں نے بڑھ چڑھ کر محمود کی تعریف میں نظمیں لکھیں۔

سلطان محمود کے ہندوستان پر حملے اور جنگیں اس کی فوجی قابلیت اور ذہانت کے بہترین کارنامے ہیں۔ اُس نے ایسے ملک پر حملے شروع کیے تھے، جس میں بڑے بڑے دریا تھے، گھنے جنگلات، چٹیل میدان اور مخالف باشندے۔ کوئی اور شخص ہوتا تو سراسیمہ ہو جاتا۔ مگر محمود نے کسی خطرے کی پروا نہیں کی۔ اُس نے شروع میں دُور اندیشی سے کام لیا اور جلد ہی اس کا رعب و دبدبہ اور ہیبت سارے ہندوستان پر چھا گئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے دشمن پر گرتا اور اُسے ایسی سخت شکست دیتا کہ وہ پھر نہ سنبھل سکتا۔

بعض متعصب مورّخ سلطان محمود پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُس نے جبراً ہندوؤں کو مسلمان بنایا اور اگر کسی نے انکار کر دیا، تو اُسے قتل کروا ڈالا۔ یہ سب بالکل جھوٹ ہے۔ تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے کہ اُس نے کسی ہندو کو جبراً مسلمان کیا ہو۔ ایک شہادت بھی ایسی نہیں ملتی کہ جنگ کے سوا اس نے کسی ہندو کو قتل کرایا ہو۔ اُس نے کہیں کہیں بُت ضرور توڑے ہیں۔ مگر صرف انہی مندروں میں جہاں اس کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں۔

تقریباً بتیس برس کی حکومت کے بعد اس مردِ مجاہد اور غازی نے 1030ء میں وفات پائی، اور غزنی کی چھوٹی سی بادشاہت کو اپنے زمانے کی سب سے بڑی سلطنت بنا گیا، جس میں موجودہ افغانستان، خراسان، ایران و ترکستان کے وسیع علاقے، کرمان اور مغربی پاکستان شامل تھے ہندوستان میں ایک طرف قنوج اور دوسری طرف گجرات تک اکثر راجے مہاراجے فرمانبرداری کا دم بھرتے تھے۔

سلطان محمود محبت کرنے والا اور شفیق انسان تھا۔ ہر ایک سے اُس کا برتاؤ بہت اچھا ہوتا تھا۔ کسی سے بے رحمی اور بے دردی سے پیش نہیں آتا تھا اور تو اور باغیوں کو بھی انتہائی سزا قید کی دی جاتی تھی۔ وہ خداترس بھی بہت تھا۔ ایک رات وہ اپنے محل سے نکل کر پا پیادہ کہیں جا رہا تھا اور فراش طلائی شمعدان لیے آگے آگے تھا۔ راستے میں ایک طالب علم بیٹھا اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ اس کے پاس نہ چراغ تھا نہ تیل جب کبھی وہ کچھ بھول جاتا، تو ایک بنیے کے چراغ کی روشنی میں اپنی کتاب دیکھ لیتا تھا۔ محمود کو اس غریب طالب علم کی حالت پر بڑا رحم آیا۔ اُس نے طلائی شمعدان

فراش سے لیا اور اس طالب علم کو دے دیا۔ جس رات یہ واقعہ ہوا، اُسی رات خواب میں محمود کو جناب رسول کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، اور آپ نے اس سے فرمایا۔ ''اے سبکتگین کے بیٹے خدا تجھ کو دنیا اور آخرت میں عزت دے کہ تو نے آج میرے ایک وارث کی قدر کی ہے۔''

عدل وانصاف میں سلطان بڑا سخت تھا۔ اس کی عدالت میں کسی کی رورعایت نہیں کی جاتی تھی۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ اپنی رعایا کی جان و مال محفوظ رکھے۔ اس کے انصاف کے کئی مشہور واقعات ہیں اسے اولیاء اللہ اور درویشوں سے بڑی ارادت تھی۔ جب کسی باکمال درویش کی شہرت سنتا تو اس کے پاس خود چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے مذہبی فرائض کو پورا کرنے میں بھی بڑا پابند تھا۔ وہ باقاعدگی سے پانچوں نمازیں پڑھتا تھا روزانہ قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا، اور اپنی جائیدار پر باقاعدہ زکوٰۃ دیتا تھا۔ عیش وعشرت سے اُسے بڑی نفرت تھی۔

سلطان میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ بہت بہادر، نڈر اور دلیر تھا۔ جنگوں میں وہ اپنی فوج کے اگلے دستوں کے ساتھ لڑتا تھا۔ عام طور پر وہ ایسی جگہ دیکھا جاتا جہاں گھمسان کا رن پڑ رہا ہو۔ اسے مختلف لڑائیوں میں بہتر زخم لگے تھے۔ ملتان کے محاصرہ میں اُس نے اتنے دشمنوں کو قتل کیا، کہ اُس کا ہاتھ خون کی وجہ سے اُس کی تلوار کے دستہ کے ساتھ جم گیا اور دستہ سے الگ کرنے کے لیے اِس ہاتھ کو گرم پانی سے دھونا پڑا۔ یہ سلطان کی اپنی بہادری اور خطروں سے بے پروائی تھی جس نے اس کے سپاہیوں میں ایک عجیب وغریب اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ مایوسی کے وقت بھی وہ پریشان اور سراسیمہ نہیں ہوتا تھا۔

سپاہیوں کو اس بات کا پورا بھروسہ ہوتا تھا کہ ان کا بے خوف سردار اُن کے ساتھ ہے اور کوئی اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ فوجی ذہانت اور قابلیت تو اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار اور فوجی ماہر تھا۔ وہ نہایت احتیاط سے جنگ کا نقشہ تیار کرتا اور پھر بڑی ہوشیاری سے اس پر عمل کرتا۔ سکندرِ اعظم کے کارنامے سلطان محمود کی شاندار فتوحات کے آگے گرد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی جنگوں کا میدان عراق سے گنگ دوآب اور خوارزم سے کاٹھیاواڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میدان میں بتیس سال تک وہ بے مثال بہادری اور کامیابی سے لڑتا رہا اور ایک مرتبہ بھی ناکام نہیں رہا۔ اس نے فوجی چالوں پر حملہ کرنے کے طریقوں میں کوئی نئی ایجاد نہیں کی۔ مگر اس نے اپنی ہمت اور دلیری سے فوج میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس کی فوج میں مختلف ملکوں اور قوموں کے سپاہی تھے۔ مگر کیا مجال کہ ان میں کسی قسم کی بدنظمی پیدا ہو۔ وہ سب اس کے

ماتحت بے جگری سے اور متحد ہو کر لڑتے تھے۔ محمود آرام طلب نہیں تھا اور ایک جنگجو ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ وہ مشکلوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ گرمی، سردی اور قدرتی رکاوٹیں اس کو جنگ کرنے سے نہیں روک سکتی تھیں اس کے راستے میں نہ بلند پہاڑ حائل ہو سکتے تھے نہ گہرے دریا اور نہ تپتے ہوئے صحرا۔ وہ راجپوتانہ کے بنجروں میں سے بھی گزرا ہے اور پنجاب کے ایسے علاقوں سے بھی جہاں گھاس کی پتی تک نہیں ہوتی۔ مگر کوئی چیز اس کے عزم کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ دشمنوں پر اس کی ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ اُس کا نام سنتے ہی وہ اطاعت قبول کر لیتے یا بھاگ جاتے۔

اتنی کثیر دولت اور ایسی حیرت انگیز فتوحات حاصل کرنے سے بھی بڑھ کر سلطان محمود کی عظمت کا باعث یہ ہے کہ فارسی علم و ادب کو اُس نے پروان چڑھایا اور مشرق کی تہذیب پر وہ احسان کیے جو اس کے نام کو سینکڑوں سال تک زندہ رکھیں گے۔ محمود بڑا بامذاق اور فاضل بادشاہ تھا۔ خود بھی شعر کہتا تھا۔ غزنی میں اس نے ایک بہت بڑا کالج قائم کیا تھا جس کے ساتھ اعلیٰ درجے کا کتب خانہ بھی تھا۔ وہ علماء کو بڑی عزت سے غزنی میں بلاتا اور انہیں بڑی بڑی تنخواہیں دیتا تھا۔ علماء کے علاوہ سلطان کی قدردانی نے سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کو دربار میں کھینچ بلایا تھا۔

غرض سلطان محمود محبت کرنے والا، منصف مزاج، ہمدرد، مہربان، فیاض، خداترس اور دین دار شخص تھا۔ اِتنی بڑی سلطنت حاصل کرنے کے باوجود وہ آخر تک سادہ مزاج رہا۔ فاتح کی حیثیت سے دیکھیے تو وہ بہت بڑا اور کامیاب فاتح تھا، جس نے ساری زندگی میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ علم و فن کے سرپرست کی حیثیت سے دیکھیے تو فارسی پر اس کے بے شمار احسان ہیں۔ فارسی نظم و نثر میں ترقی اُس کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ جہاں تک اس کے منتظم ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں بھی اُس کا نام عزت سے لینا پڑتا ہے۔ جنگوں کی وجہ سے اُسے غزنی سے لمبے عرصے کے لیے غیر حاضر رہنا پڑتا تھا مگر اس کے باوجود حکومت کے کاروبار میں کسی قسم کی خرابی، بدنظمی اور ملک میں بدامنی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بیٹے سلطان مسعود نے ٹھیک کہا ہے کہ:

''خدا کی اس پر رحمت ہو،
کوئی ماں محمود جیسا بچہ نہیں جنے گی!''

❁............❁............❁

67

سلیم اول

بایزید ثانی نے اکتالیس سال حکومت کی۔ اُس کے بیٹوں نے بغاوت کر دی۔ کئی معرکوں کے بعد شہزادہ سلیم نے اپنے سب بھائیوں کو نیچا دکھایا اور باپ کی جگہ خود حکومت سنبھال لی۔ سلیم کے ہاتھ اپنے بھائیوں کے لہو میں آلودہ نظر آتے ہیں لیکن یہ جرم صرف اُسی نے نہیں کیا بلکہ اکثر ترک اور مغل بادشاہوں کی نیک نامی کا دامن بھائیوں کے خون سے داغدار ہے اور اُس زمانے کے حالات پر غور کرو تو یہ بات چنداں عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر سلیم سلطنت کے دعویداروں سے خاندان کو صاف نہ کرتا تو خود مارا جاتا۔

تخت پر بیٹھتے ہی سلیم نے ملک گیری کے سے اِردگرد کے ملکوں پر نظر ڈالی۔ اُس کے بزرگوں کی عمریں یورپ میں تلواریں مارتے گزر گئی تھیں۔ لیکن اس نے فتح مندی کے حوصلے نکالنے کے لیے اپنے گھوڑے کی باگ ایشیا کی طرف موڑی۔ اُس زمانے میں صفوی حکومت عروج پر تھی۔ سلیم نے ایک لاکھ چالیس ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر ایوان کا رُخ کیا۔ اُدھر سے شاہ اسمٰعیل مقابلہ پر بڑھا۔ بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ جن میں دونوں فریقوں کے بڑے بڑے سردار کام آئے۔ اس جنگ میں خود شاہ اسمٰعیل گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا اور اس کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ لیکن کچھ جاں نثار جانوں پر کھیل کر اُسے نکال لے گئے۔ سلطان سلیم تبریز پہنچ کر کچھ دن اٹکا اور آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی فوج جس نے اس سفر میں بڑی تکلیفیں اُٹھائی تھیں بہت بددل ہو گئی تھی اس لیے یہیں سے واپس ہوا۔ تبریز سے چلتے وقت وہ ایک ہزار کاریگروں کو جن میں ہر فن کے ماہر شامل تھے اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا۔ ان لوگوں کی وجہ سے اس شہر میں اکثر ایرانی صنعتوں نے رواج پایا۔ ایران پر سلطان سلیم کے اس حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیار بکر اور کردستان کے

صوبے جو ایران کی سلطنت میں شامل تھے۔ عثمانیوں کے ہاتھ آئے۔

اس فتح کے بعد سلطان سلیم نے مصر کے کلوک فرمانروا سے جنگ چھیڑ دی۔ کلوکوں کی بہادری میں تو کوئی کلام نہیں لیکن سلطان کا توپ خانہ بڑا زبردست تھا اور کلوک جنہوں نے سلطان بیبرس کے زمانے میں سب سے پہلے جنگ میں بارود سے کام لیا تھا توپ اور بندوق کا استعمال بھول چکے تھے۔ پھر بھی اُن کی لڑائی کا طریقہ ایسا تھا کہ بڑی بڑی فوجیں اُن کے مقابلہ پر نہیں ٹھہر سکتی تھیں۔ یعنی ایک مرتبہ باگیں اُٹھا کر اس طرح حملہ کرتے تھے کہ دشمن کی صفیں اُلٹ کے رکھ دیتے تھے۔ آخری معرکہ میں جو قاہرہ کے قریب ہوا۔ کلوکوں نے عثمانی فوج پر ایسا بگٹٹ پر حملہ کیا کہ صفوں کو توڑ کر نکل گئے۔ وہ تو سلیم کی تاک میں تھے لیکن سلطان کی قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا اور اس کے بدلے ایک نامور سپہ سالار مارا گیا۔ بہرحال توپیں اس معرکہ میں بہت کام آئیں۔ یعنی انہوں نے آگ برسا کر مملوکوں کے دھوئیں اڑا دیئے۔ پچیس ہزار جانباز مارے گئے۔ جو بچے انہوں نے ہٹ کر قاہرہ میں پناہ لی۔ شام تک گلی کوچوں میں تلوار چلتی رہی اور عثمانیوں نے بڑی مشکل سے شہر پر قبضہ کیا۔

اس فتح کی بدولت سلطان سلیم کی حکومت مصر کے علاوہ شام اور فلسطین میں بھی پھیل گئی۔ ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ ملک کے ساتھ خلافت کا اعزاز بھی ہاتھ آیا۔ متوکل عباسی جو برائے نام خلیفہ تھا اور مصر میں مملوک بادشاہوں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کر رہا تھا سلطان سلیم کے ساتھ قسطنطنیہ چلا آیا۔ یہاں سلطان نے اس سے خلافت کی سند حاصل کی اور اُس کے لیے معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طرح خلافت کے تن بیجان میں پھر سانس آئی۔ قسطنطنیہ میں دربار خلافت آراستہ ہوا۔ جگہ جگہ خطبوں میں عثمانی خلیفہ کا نام لیا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اَب تک جن حکمران خاندانوں نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ سب کے سب خاندان قریش سے تھے۔ دمشق اور اُندلس کے خلیفے اموی تھے بغداد والے عباسی اور مصری فاطمی۔ لیکن اب ایک نئی بات یہ ہوئی کہ خلافت ایک ایسے خاندان میں چلی گئی جو سرے سے عرب ہی نہیں تھا۔

سلطان سلیم نے تقریباً نو سال سلطنت کر کے 54 برس کی عمر میں وفات پائی۔ اُس نے اپنی عمر کا آخری سال جنگی تیاریوں میں گزارا۔ بہت سے جہاز بنائے گئے، توپیں ڈھالی گئیں۔ نئی فوج بھرتی ہوئی۔ ان تیاریوں میں سلطان کو خود بڑی محنت کرنی پڑی۔ سارا سارا دن دربار میں

بیٹھا رہتا اور راتیں جاگ کے کاٹتا تھا۔ صحت پہلے ہی خراب ہو رہی تھی۔ رات دن کی محنت مشقت سے توانائی بالکل جواب دے گئی۔ یلغار کی تیاریاں تھیں کہ طبیعت بگڑی۔ موت سے پہلے جنگ کے ساز و سامان کو دیر تک حسرت بھری نگاہوں سے تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا کہ اب اگلی دنیا کے سفر کے سوا میرے لیے کوئی سفر باقی نہیں رہا۔

سلیم ملکی کارناموں کے علاوہ اپنے علمی شوق کے لحاظ سے بھی عثمانی فرمانرداؤں میں بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ اس خاندان میں شاعری کا شوق ابتدا سے چلا آتا ہے۔ عثمانیوں میں کل چھتیس حکمران ہوئے ہیں جن میں سے اکیس شاعر تھے اور ان میں سلیم سب سے بڑا شاعر ہوا تھا۔ اُس نے اگرچہ ترکی زبان میں بھی شعر کہے ہیں لیکن اُس کا کلام زیادہ تر فارسی میں ہے۔

❀..........❀..........❀

سیّد احمد شہیدؒ

بارھویں صدی ہجری میں ہندوستان میں ایک انقلاب آفریں تحریک اُٹھی جس کا مقصد مسلمانوں کو جو مذہب کے راستے سے ہٹتے چلے جارہے تھے سچا اور پکا مسلمان بنانا تھا۔ آپ نے دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدوں کی ایک زبردست جماعت بنالی۔ ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کو اپنا مستقر بنایا اور سکھوں کے خلاف جہاد شروع کردیا جو اُس رُخ سے مجاہدوں کے راستے میں سب سے پہلے آتے تھے۔

آپ کا نام سیّد احمد تھا۔ والد کا نام سیّد محمد عرفان تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت علی ؓ تک پہنچتا ہے۔ ہندوستان میں آپ کے اسلاف صدیوں سے اسلام کی تبلیغ کرتے آرہے تھے اور انہوں نے ریاضت اور تقویٰ کی زندگی بسر کی تھی۔

مگر سیّد صاحب کا مرتبہ صرف اِس لیے بلند نہیں ہے کہ آپ ایک اونچے دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے بلکہ آپ کی عظمت کا سبب آپ کی وہ دینی خدمات اور کارنامے ہیں جو آپ نے بے سروسامانی کی حالت میں انتہائی بے جگری سے انجام دیئے۔

سیّد صاحب 29 نومبر 1786ء کو پیر کے دن قصبہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں سرکار مانک پور اور الہٰ آباد میں شامل تھا۔ سیّد صاحب کو سپہ گری اور جہاد سے جو دلچسپی تھی، اُس کی وجہ سے آپ نے سخت ورزشیں کرکے اپنے جسم کو سختیاں برداشت کرنے کا عادی بنایا۔ اِسی طرح آپ نے تلوار، تیر کمان اور بندوق چلانے میں بھی مہارت حاصل کرلی تھی۔ تیراکی میں بھی کمال حاصل تھا۔ پانی کے بہاؤ کے خلاف بے تکلف تیر لیتے تھے اور رفتہ رفتہ دَم اِتنا بڑھالیا تھا کہ غوطہ مار کر پانی کی تہ میں بیٹھ جاتے تو کافی دیر تک وہیں بیٹھے رہتے۔ آپ کا جسم پہلے ہی غیر

معمولی طور پر قوی اور مضبوط تھا، اِس قسم کی سخت ورزشوں سے تو فولاد کا کُندہ بن گیا۔

آپ کا معمول تھا کہ روز صبح شام بیواؤں، اور بے سہارا عورتوں کے گھر جا کر اُن کا حال پوچھتے اور جس چیز کی انہیں ضرورت ہوتی فوراً لا دیتے۔

پاس پڑوس اور محلے کے یہ لوگ جن کی سیّد صاحب نوکروں کی طرح خدمت کرتے تھے، اُن کے خاندان کے مرید اور خادم تھے۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ ہم تو آپ کے بزرگوں کے خدمت گزار ہیں، آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں، مگر آپ نہ مانتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رشتے داروں اور ہمسایوں کے گھروں میں پہنچ کر جو برتن خالی دیکھتے، اُسے اُٹھا کر لے جاتے اور باہر سے پانی بھر کر لے آتے یا اگر کسی کو ایندھن کی ضرورت ہوتی تو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لا دیتے۔

آپ کے خاندان کے لوگ آپ کو ایسے کاموں پر لعنت ملامت کرنے لگے، کیونکہ اُن کے نزدیک یہ رذیل لوگوں کے کام تھے جو آپ جیسے عالی خاندان نوجوان کو نہیں کرنے چاہئیں تھے۔ مگر آپ نے اِن باتوں کی پروا نہ کی اور برابر خدمت خلق میں مشغول رہے۔

آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت کر لی تھی۔ کافی دن دلّی میں رہنے کے بعد آپ نے ان سے وطن جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اجازت دے دی۔ جب آپ رائے بریلی پہنچے تو چونکہ پانچ برس بعد وطن میں قدم رکھا تھا اور داڑھی مونچھیں بھی نکل آئی تھیں، اس لیے شروع میں لوگ باگ آپ کو پہچانے تک نہیں۔

نواب امیر خاں ایک طاقت ور مسلمان نواب تھا۔ وہ اِس وقت انگریزوں کے اثر سے آزاد تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ حضرت سیّد احمد اُس کی فوج میں اِس غرض سے شامل ہوئے تھے کہ ایک وہی ہندوستان میں اسلام کی آزادی کے لیے جہاد کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اسلام کے اِحیا اور جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ آپ کو اُس کے لشکر میں لے پہنچا تھا۔

آپ ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے، مگر جب امیر خاں کو آپ کے حسب نسب کا حال معلوم ہوا اور اُس نے آپ کے جوہر دیکھے تو اپنا مشیر خاص بنا لیا۔

حج سے واپس آنے کے بعد سیّد صاحبؒ نے خود کو جہاد کی تیاریوں کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کے داعی شہر شہر اور قریے قریے پھرے اور ہر جگہ مسلمانوں نے اُن کی دعوتِ جہاد پر لبیک

کہی۔ اِس طرح بہت جلد سینکڑوں سرفروش آپ کی پکار پر میدان میں نکل آئے۔
آپ نے ہندوستان کو دارُالحرب قرار دیا اور فرمایا کہ اِسلامی سلطنت کے زوال کے بعد یہ ملک دارُالاسلام نہیں رہا ہے۔ جب بلادِ اسلامیہ پر غیر مسلم مسلّط ہو جائیں تو مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کے خلاف جہاد کریں اور یہ جہاد اُس وقت تک جاری رکھیں، جب تک بلادِ اسلامیہ کو اُن کے قبضے سے چھڑا نہ لیں۔ ورنہ وہ گنہگار قرار پائیں گے۔
جب آپ نے سب تیاریاں کر لیں تو ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کو جہاد کا مرکز بنایا۔ اِس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو ہندوستان میں ایسا اور کوئی آزاد مقام نہ تھا، دوسرے یہ علاقہ پورے کا پورا مسلمانوں کا تھا۔ وہاں کے لوگ جنگ جو تھے اور انہوں نے امداد کا یقین بھی دلایا۔ تیسرے یہ کہ وہ سکھوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔
جنگی تدبیروں کے لحاظ سے بھی یہی علاقہ موزوں تھا۔ اس کے شمال مغرب میں اسلامی ملک تھے، اُن سے امداد کی امید ہوسکتی تھی یا کم سے کم مخالفت کا اندیشہ نہ ہوسکتا تھا۔ پھر اِس پر عقب سے دشمن کا حملہ نہ ہوسکتا تھا اور یہاں سے پنجاب میں بھی گھسا جا سکتا تھا، جہاں سکھوں کی حکومت تھی اور وہ مسلمانوں پر بے پناہ مظالم کر رہے تھے۔
17 جنوری 1826ء کو آپ صرف پانچ ساڑھے پانچ سو مجاہدین اور پانچ ہزار روپے کی رقم ساتھ لے کر اپنے وطن سے روانہ ہو گئے اور راجپوتانے کے راستے سرحدی علاقے کا رُخ کیا۔ راستے میں سفر بڑا کٹھن رہا۔ گھنے جنگل آئے۔ بعض علاقوں میں پانی کی قلت تھی یا اگر تھا تو نمکین، جسے جانور بھی پینے کو تیار نہ ہوئے۔ یہاں مجاہدین نے خود کنوئیں کھودے۔ کہیں کہیں قزاقوں سے بھی واسطہ پڑا۔ بعض جگہ لوگ سیّد صاحبؒ کے لشکر کو قزاقوں کا جتھا سمجھ کر لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ سندھ کے علاقے میں لوگوں نے آپ پر انگریزوں کا جاسوس ہونے کا شُبہ کیا۔
راجپوتانے اور سندھ سے گزر کر مجاہدین کا لشکر بلوچستان کے صحراؤں اور پہاڑوں میں داخل ہوا تو وہاں اُونٹ نہ ملے۔ ہر جگہ قزاقوں کا ڈر رہتا تھا۔ پھر تیز گرمی، بے پناہ تپش، پانی ناپید اور سائے کا کوسوں تک کہیں نام نہیں اور یہ اندیشہ بھی کہ نہ جانے کب بادِ سُموم چلنے لگے۔ مگر مجاہدین اِن سب بلاؤں کو جھیلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔
اس جنگ میں پہل سیّد صاحبؒ نے کی۔ آپ نے نو سو مجاہدین کو سکھ فوج پر شب خون

مارنے بھیجا۔ رات کے پچھلے پہر شب خون مارا گیا۔ سکھ فوج میں ابتری پھیل گئی۔ شب خون کی کامیابی یقینی تھی، لیکن سرحدی علاقے کے جو لوگ مجاہدین کے ساتھ تھے، انہوں نے لڑائی چھوڑ کر سامان سمیٹ کر اپنے گھروں کا رُخ کیا۔ یوں مجاہدین کمزور پڑ گئے۔ ایک ایک مجاہد نے دس دس سکھوں کو ہلاک کیا۔ مگر چونکہ سرحدیوں کے چلے جانے کی وجہ سے تعداد کم رہ گئی تھی، اس لیے کام نہ بنا اور مجاہدین واپس آ گئے۔ مجاہدین میں سے صرف بیاسی شہید اور تیس چالیس زخمی ہوئے تھے۔ سکھوں کے سات سو سپاہی ہلاک اور اس سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے تھے۔

مجاہدین اور سکھوں کے درمیان ایک خشک نالا تھا۔ سکھوں نے اس نالے میں مورچے بنا کر مسلمانوں پر گولیاں برسانی شروع کیں۔ مجاہدین نے یہ مورچے فتح کر لیے۔ بہت سے سکھ ہلاک ہوئے۔ باقی بھاگ گئے۔ اس دوران میں یار محمد خاں اپنے لشکریوں سمیت الگ تھلگ کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ مجاہدین آگے بڑھے اور سکھوں کی لشکر گاہ کے اندر گھس گئے۔ قریب تھا کہ سکھوں کو شکست ہو جائے کہ اتنے میں یار محمد خاں اپنے لشکریوں کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور اُس کے کئی آدمیوں نے پکار پکار کر اعلان کیا کہ یار محمد بھاگ گیا۔ یہ سُن کر پشاور کے اور سردار بھی میدان سے بھاگ نکلے۔ اس سے مجاہدین کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

سیّد صاحب جنگ چھڑنے سے عین قبل بے ہوش ہو گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یار محمد خاں نے زہر دلوایا تھا۔ اُس نے دراصل سکھوں سے خفیہ ساز باز کر لی تھی اور اُس کا عین لڑائی میں میدان سے بھاگنے کا سبب بھی یہی تھا۔

اس کے بعد ڈمگلہ اور شنکیاری پر مجاہدوں اور سکھوں میں دو دو ہاتھ ہوئے۔ دونوں میں سکھ ہارے۔ ڈمگلہ کے معرکے میں صرف چند مجاہدین شہید ہوئے، مگر سکھوں کے تین سو سپاہی مارے گئے۔ سرحدی لوگ مجاہدین کے ساتھ تو ہو لیے تھے، مگر جب میدانِ جنگ کے قریب پہنچے تو اِدھر اُدھر چھپ گئے اور جس دوران میں مجاہدین سکھوں پر حملے کر رہے تھے، یہ سامان اُٹھا اُٹھا کر بھاگتے رہے۔ شنکیاری کی جنگ میں مجاہدین تو چھ سات ہی شہید ہوئے، سکھ دو اڑھائی سو مارے گئے۔ اِن دونوں معرکوں میں مجاہدین نے جیسی بہادری دکھائی، اِس سے سکھوں کے ہوش اُڑ گئے اور اُن میں سراسیمگی پھیل گئی۔

شروع میں پنجاب کے راجا رنجیت سنگھ کا یہ خیال تھا کہ سیّد صاحبؒ اپنے لیے ریاست

بنانی چاہتے ہیں، دوچار شکستوں کے بعد دل برداشتہ ہوکر واپس چلے جائیں گے۔لیکن آگے چل کر جب اسے اندازہ ہوگیا کہ آپ کس پائے کے انسان ہیں اور آپ کے ساتھ جو مسلمان ہیں وہ کیسے بے غرض، ایثار پیشہ اور بہادر لوگ ہیں تو اُس نے سیّد صاحب پر صلح کے ذریعے قابو پانے کی کوشش کی اور ایک سفارت اِن کی خدمت میں بھیجی۔اس سفارت نے سیّد صاحبؒ کو رنجیت سنگھ کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ ماورائے سندھ کا سارا علاقہ آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہے، بشرطیکہ آپ اُس پر قناعت کر کے آگے قدم نہ بڑھائیں۔مگر سیّد صاحبؒ نے رنجیت سنگھ کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔

بالاکوٹ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے بڑا محفوظ مقام تھا۔سکھ اِس پر حملہ نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ اِس تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ تھا جو ایک پگڈنڈی کی شکل میں تھا۔سکھوں کو یہ راستہ معلوم نہ تھا۔علاقے کے کسی باشندے نے انعام کے لالچ میں یہ راستہ انہیں بتادیا اور سکھ فوج نے اِس راستے سے بالاکوٹ پر حملہ کر دیا۔مجاہدین انہیں روکنے میں ناکام رہے۔سیّد صاحبؒ کے مشیروں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ راتوں رات عقب کے پہاڑوں پر چلے جائیں یا وادیٔ کاغان کی طرف ہٹ جائیں۔مگر سیّد صاحبؒ نے بالاکوٹ سے ہٹنے سے انکار کر دیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ اگلے دن یہیں سکھوں سے فیصلہ کُن جنگ کریں گے۔

اگلے دن (6 مئی 1831ء) صبح ہی لڑائی شروع ہوگئی۔سکھ گولیاں چلاتے اور گولے برساتے ہوئے اس ٹیلے سے نیچے اُترنے لگے، جس پر انہوں نے پچھلی رات قبضہ کرلیا تھا۔اُن کی فوج میں بے شمار سپاہی تھے۔مجاہدین کی تعداد بہت کم تھی۔اب انہوں نے قصبے کا رُخ کیا۔سیّد صاحبؒ نے اُن پر حملہ کر دیا۔سکھ بھاگے۔مجاہدین ٹیلے کی جڑ تک جا پہنچے بے شمار سکھ مارے گئے۔ مگر جو سکھ ٹیلے پر تھے، انہوں نے باڑھیں مارنی شروع کر دیں۔سیّد صاحبؒ اور اُن کے ساتھی ان باڑھوں سے شہید ہو گئے۔یہ جمعے کا دن تھا اور گیارہ بارہ بجے کا وقت۔مگر نہ کسی نے سیّد صاحبؒ کو گرتے دیکھا نہ آپ کی لاش دیکھی۔

سیّد صاحبؒ کے میدانِ جنگ سے اِس طرح ہٹ جانے سے مجاہدین میں اِضطراب پھیل گیا۔انہوں نے لڑنا چھوڑ دیا اور سکھوں کی فتح ہوگئی۔پھر بھی سکھوں کے سات سو سپاہی ہلاک ہوئے، جب کہ مجاہدین صرف تین سو شہید ہوئے۔

سکھوں نے بعض مسلمانوں کی مدد سے سیّد صاحبؒ کی لاش شناخت کی اور اُسے دفن کرادیا۔ پھر رات کو نہنگ سکھوں کے ایک گروہ نے اُسے قبر سے نکال کر دریا میں بہا دیا۔ آپ کا سَر تن سے جُدا ہو گیا تھا، اِس لیے سر اور تن الگ الگ بہتے چلے گئے۔ پھر اُن کو الگ الگ مقامات پر لوگوں نے پانی سے نکالا اور دفن کر دیا۔ بالاکوٹ میں جس قبر کو سیّد صاحبؒ کی قبر بتایا جاتا ہے، اُس میں آپ ایک دن ہی دفن رہے۔

❁............❁............❁

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

دہلی کے گلی کوچوں میں، میلوں ٹھیلوں میں، مجمع اور بازاروں میں ایک شخص بے دھڑک پہنچ جاتا۔ لوگوں کو دین کی سیدھی سادی باتیں بتاتا۔ انہیں بُری رسموں سے روکتا۔ اچھے اور نیک کام کی نصیحت کرتا۔

اس شخص کی باتوں میں بڑا اثر تھا۔ لوگ اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے۔ بڑے شوق سے اس کا وعظ سنتے اور اپنی بُری عادتوں پر شرمندہ بھی ہوتے۔

مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو بُرے رسم ورواج کی عادی تھے۔ وہ اس شخص کی باتیں پسند نہ کرتے، اس کا وعظ انہیں ذرا بھی نہ بھاتا، یہ لوگ اسے تقریر کرنے سے منع کرتے مگر وہ بھلا کب رکنے والا تھا۔ وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رہا۔

جب مخالفوں نے دیکھا کہ یہ شخص ہماری رسموں، ہماری عادتوں کو بُرا کہتا چلا جا رہا ہے تو دشمنی پر اتر آئے۔ آپس میں مشورہ کیا کہ اسے قتل ہی کرا دیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ چند نوجوانوں کو انعام کا لالچ دیا گیا۔ وہ اس کام کے لیے تیار ہو گئے اور لگے موقع تلاش کرنے لگے۔

گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ یہ شخص فتحپوری مسجد کے صحن میں اکیلا ٹہل رہا تھا۔ آس پاس کوئی بھی نہ تھا دشمنوں کو موقع اچھا ملا۔ وہ وہاں پہنچ گئے۔ مسجد کے باہر جوتے اتارے۔ ننگے پاؤں فرش پر چلے۔ دو چار ہی قدم گئے تھے کہ تپتے ہوئے فرش سے ان کے پاؤں جلنے لگے۔ وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ انہیں خیال آیا کہ یہ شخص کس ہمت کا ہے جو ننگے پاؤں نہایت اطمینان سے اس جلتے ہوئے فرش پر چل رہا ہے۔ وہ اس شخص کی ہمت اور بہادری سے بہت متاثر ہوئے۔ اپنے ارادے سے باز آئے اور اس کے سچے ساتھی بن گئے۔ یہ شخص مولانا شاہ اسمٰعیل تھے۔ شاہ ولی اللہ

کے پوتے۔شاہ عبدالغنی کے بیٹے۔شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے!

شاہ ولی اللہ کے خاندان کا ہر شخص علم کا ایک سمندر تھا۔قرآن اور حدیث سے خوب واقف، عربی اور فارسی زبان میں ماہر، تقریر کے فن میں استاد، لیکن یہ سب لوگ مدرسے کے اندر رہ کر دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔میدان عمل میں اترنا کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔البتہ شاہ اسمٰعیل اس خاندان کے پہلے شخص تھے، جنہوں نے علم کے ساتھ ساتھ جہاد کو فوقیت دی۔

انہوں ے دستور کے مطابق جب اپنی تعلیم مکمل کر لی تو ورزشی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔اس زمانے میں مرزا رحمت اللہ بیگ پٹا اور گتکا کے ماہر مانے جاتے تھے۔مغل شہزادے بھی ان کے شاگرد بننے کے خواہش مند رہتے تھے۔ان ہی مرزا رحمت اللہ سے شاہ اسمٰعیل نے بنوٹ کا فن سیکھا۔گھڑسواری مشہور چابک سوار میاں رحیم بخش سے سیکھی۔

پھر انہیں کسرت کرنے کا شوق ہوا۔گھر کے پاس ہی ایک اکھاڑہ قائم کیا۔دن رات اس کام میں لگے رہے۔حتیٰ کہ اس میں بھی مہارت حاصل کر لی۔تیراکی کا خیال آیا تو مہینوں جمنا ندی میں ڈبکی لگاتے رہے۔اس فن میں اتنا کمال حاصل ہو گیا کہ دہلی سے آگرے تک تیرتے ہوئے جاتے۔

انہوں نے تپتی ہوئی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی مشق بھی کی تھی۔وہ فتحپوری مسجد کے صحن میں ٹھیک دوپہر کے وقت کئی کئی گھنٹے چلتے رہتے۔اسی دوران قتل والا واقعہ پیش آیا تھا۔

شاہ اسمٰعیل نے بندوق چلانا بھی سیکھا۔نشانہ باندھنے میں اتنی مہارت ہو گئی کہ اڑتی ہوئی چڑیا کا بچ نکلنا مشکل تھا۔خود کہا کرتے تھے:

”ناممکن ہے کہ جانور میرے سامنے آئے اور وہ زندہ بچ نکلے۔“

تیراکی، گھڑسواری، نشانہ بازی اور دوسری مشقوں نے شاہ اسمٰعیل میں بلا کی بہادری، پھرتی اور جفاکشی پیدا کر دی تھی۔محنت کرنے کی صلاحیت آگے چل کر خوب کام آئی۔

1817ء میں سیّد احمد فوجی تربیت حاصل کر کے واپس آئے۔شاہ عبدالعزیز ان سے جہاد کا جو کام لینا چاہتے تھے اس میں خود بڑھاپے کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے۔البتہ شاہ اسمٰعیل کو ان کے حوالے کر دیا۔جب عوام میں جہاد کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے سیّد احمد کا قافلہ انقلابی دورے پر روانہ ہوا تو شاہ اسمٰعیل ایک فرمان بردار شاگرد کی حیثیت سے ان کے ساتھ ساتھ تھے۔

انہیں دہلی سے لے کر کلکتہ تک کا طویل سفر کرنا پڑا۔ وہ شہروں میں مارے مارے پھرے۔ گاؤں گاؤں کا چکر لگایا۔ مگر ان کی ہمت پست نہیں ہوئی۔ وہ ہر جگہ چاق و چوبند نظر آتے۔

وہ سیّد احمد کے ساتھ ایک مقصد سے روانہ ہوئے تھے اور وہ تھا آزادی کی تحریک پیدا کرنا۔ شاہ اسمٰعیل شروع ہی سے تقریر کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ اس مہم میں ان کا یہ فن خوب کام آیا۔ انہوں نے اپنی تقریروں سے سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کیا۔ ان کے دل سے مایوسی دور کی۔ ان کی باتوں کا ہی اثر تھا کہ عوام سیّد احمد کے گرد جمع ہونے لگے۔ مجاہدوں کا کارواں مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

اس انقلابی دورے کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور مؤرخ سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''سارے ملک میں جہاد کی آواز گونج اٹھی۔ ہمالہ کی چوٹی سے بنگال کی وادی تک مسلمانوں کا دل آزادی کے جذبے سے پُر ہو گیا۔ لوگ مجاہدوں کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ شراب کے پیالے توڑ ڈالے گئے، عیش و عشرت کے دروازے بند کر دیئے گئے، فوج میں بھرتی ہونے کے لیے علماء اپنے حجروں سے اور امراء اپنے محلوں سے باہر نکل آئے۔ غربت، مجبوری اور سیاسی ابتری کے باوجود مسلمانوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔''

جب شاہ اسمٰعیل کی تقریر کا کام ختم ہوا تو جنگ کی آزمائش شروع ہو گئی اور وہ اس امتحان میں پیچھے نہیں رہے۔ سیّد احمد کے ساتھ انہوں نے پشاور کا سفر کیا اور سکھوں سے باضابطہ جنگ کی۔ بالآخر بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے۔

شاہ اسمٰعیل ایک علمی خاندان کے فرد ہی نہ تھے بلکہ خود بھی بڑے پائے کے عالم تھے۔ انہوں نے عام مسلمانوں کو دین کی تعلیم سے آگاہ کرنے کے لیے نہایت آسان اُردو میں ''تقویۃ الایمان'' لکھی۔ اس کتاب نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا۔ ان کے وعظ میں مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبداللہ خاں اور مفتی صدرالدین جیسی شخصیتیں شریک ہوتی تھیں۔

شاہ اسمٰعیل کا علم اس قدر وسیع تھا کہ شاہ عبدالعزیز کے لکھے ہوئے فتویٰ پر بھی اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ اس پر چچا خوش ہو کر کہتے:

''الحمدللہ ابھی ہمارے خاندان میں علم باقی ہے۔''

ایک موقع پر شاہ عبدالعزیز ان کے علم کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''اسمٰعیل کا علم محدود نہیں۔''

لیکن جب آزادی کا مسئلہ سامنے آیا، جہاد کی تحریک اٹھی، تو یہی شاہ اسمٰعیل سیّد احمد کے ایک معمولی شاگرد بن گئے اور ایک فرماں بردار کی طرح ان کے پیچھے ہو لیے۔ ان کا ہر حکم بجا لائے۔ ان کی فوجی قیادت میں اپنے علمی مرتبے کو بھلا بیٹھے اور تحریک کی کامیابی پر کہا تو یہ کہا:

''میرا کوئی کمال نہیں۔''

❀............❀............❀

شاہ جہاں

جہانگیر کی وفات کے وقت شہزادہ شاہجہان دکن میں تھا۔ آصف خان نے اس کی طرف آدمی دوڑائے۔ مہابت خان کو بھی پیغام بھیجا کہ شاہجہان کی تخت نشینی کے لیے کوشش کرے۔ اس اثناء میں اس نے عبوری طور پر خسرو کے بیٹے شہزادہ داور بخش کو تخت پر بٹھانا چاہا تا کہ تخت خالی ہونے کی وجہ سے کوئی فتنہ برپا نہ ہو جائے۔ داور بخش نے تخت و تاج قبول کرنے میں تامل کیا مگر آخر آصف خان اپنے ارادوں میں کامیاب ہوا۔ بھمبر کی مسجد میں اس نے داور بخش کے سر پر تاج رکھا اور اعلان کر دیا کہ جہانگیر بادشاہ نے یہی وصیت کی تھی۔ داور بخش کو آصف خان نے اپنے خلوص نیت کا ہر ممکن یقین دلایا۔

اِدھر لاہور میں شہریار نے بڑے طنطنے سے اپنی رسم تاجپوشی ادا کی اور شاہ شہاں کا لقب اختیار کیا۔ وہ ہر لحاظ سے نااہل اور نالائق تھا۔ لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس نے تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ وہ حالات کو سمجھ نہ سکا اسے معلوم نہ تھا کہ اب نور جہاں کے اقتدار کا سورج غروب ہو چکا ہے اور اس کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہیں۔ آصف خان نے جلد ہی اس کے سنہری خواب پریشان کر دیئے اور اسے حراست میں لے لیا۔

شاہجہان بڑی سرعت سے آگرہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مہابت خان اس کے ہمرکاب تھا۔ آصف خان، شہریار دانیال کے بیٹوں اور دوسرے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر شاہجہان کے خیر مقدم کے لیے بڑھا۔ شاہ جہاں نے خود ہی اسے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کا خون کرنے کو لکھا تھا۔ اس نے محسوس نہ کیا کہ وہ ایک خطرناک روایت قائم کر رہا ہے۔ جس کا بُرا انجام اسے خود اپنی آنکھوں دیکھنا پڑے گا۔ تخت کے تمام مدعیوں سے کلی طور پر نجات حاصل کرنے کے بعد

شاہجہان آگرہ میں ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ایک نئے دور کا اعلان کیا گیا۔ دربار میں سجدہ کی رسم اڑا دی گئی۔ نئے سکوں کا اجراء ہوا۔ ان کے ایک طرف خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی کندہ کیے گئے۔ اور دوسری جانب شاہ وقت کا نام لکھا گیا۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی رقم شہزادوں اور درباریوں میں تقسیم کی گئی۔

داور بخش جسے قربانی کا بکرا کہا گیا ہے، تاج و تخت سے محروم ہو کر نظر بند ہوا۔ بعد میں رہا ہو کر اسنے ایران کی راہ لی اور اپنے باقی دن وہیں بسر کیے۔ شاہ ایران نے شاہی خزانے سے اس کی پنشن مقرر کر دی تھی۔

مؤرخین نے شاہ جہانی دور کو مغلیہ عہد کا سنہری زمانہ کہا ہے۔ جو امن و امان، جاہ و ثروت اور عام خوش حالی شاہجہان کے وقت دیکھی گئی نہ اگلوں نے دیکھی نہ پچھلوں نے سُنی۔ سلطنت کی حدود میں اس سے پہلے کبھی اتنی وسعت پیدا نہ ہوئی تھی۔ سعد اللہ خان کا عہد وزارت خوش انتظامی اور مالی استحکام کا ضامن تھا۔ سعد اللہ خان کو سمتھ (Smith) نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے: ''ہندوستان میں جو وزیر سامنے آئے ان میں سب سے زیادہ قابل اور بلند کردار۔'' اس کی دانشمندانہ حکمت عملی سے ملک میں زر و مال کی ریل پیل ہو گئی۔ رعایا کو آسودگی اور فراغت نصیب ہوئی۔ فنونِ لطیفہ میں وہ ترقی ہوئی کہ اس عہد کی یادگاریں پاک و ہند کے تہذیبی ورثہ کی عزیز ترین متاع بن گئی ہیں۔

اس عہد میں ایرانیوں کا زور کم ہوا ہندوستانی پھر اعلیٰ عہدوں پر سرفراز ہوئے۔ خود سعد اللہ خان ہندوستانی نژاد تھا۔ شاہجہان نے ہندوؤں کی سرپرستی کی اور ان کے ساتھ مربیانہ سلوک روا رکھا۔ اگرچہ وہ اکبر اور جہانگیر سے مقابلہ میں ذرا زیادہ پکا مسلمان تھا اور اسلام ہی کا بول بالا کرنا چاہتا تھا مگر اس کی ان خواہشات سے ہندو قوم کو سیاسی یا مالی نقصان نہ پہنچا۔ 1940ء میں سری رام شرما نے یوں لکھا: ''شاہجہان کے تحت انتظامیہ میں ہندو قوم آج کے ہندوستانیوں سے زیادہ بہتر مقام رکھتی تھی۔ اندرونی خلفشار اور بیرونی خطرات سے یہ دور بڑی حد تک محفوظ رہا۔ تجارت کو فروغ ہوا۔ مغربی ایشیا اور یورپ سے اشیائے درآمد و برآمد کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ فن تعمیر اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا۔ تاج محل، آگرہ کی موتی مسجد، اس کے علاوہ دیوان عام، دیوان

خاص، جامع مسجد اور تختِ طاؤس اس دور کے غیر فانی شاہکار ہیں۔ شاہجہاں کو اسی وجہ سے انجینئر بادشاہ کہا گیا ہے۔ تاج محل شاہجہانی عہد کی عظمت و شوکت، نفاست، دلکشی اور بانکپن کا آئینہ دار ہے۔ دنیا اس کی پرشکوہ عمارت پر انگشت بدنداں ہے۔ اس کا مرمریں حسن، دلربا نزاکت اور سرود آگیں بانکپن اپنی مثال آپ ہے۔ اجزء کا تناسب کل کی دلکشی میں اس طرح جذب ہو کر رہ گیا ہے کہ تاج محل کی جلوہ آفرینیاں غزل کا سوز و گداز بن کر دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ آج تک کسی بادشاہ نے اپنی محبوب رفیقہ حیات کی وفات پر اس سے عظیم تر نوحہ نہیں لکھا۔ شاہجہان نے اپنی محبت کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ موت اس غیر فانی معجزہ فن کے آگے سرنگوں ہے۔

کچھ عظیم باغات بھی ایسے ہیں جو زبان حال سے ماضی کے اس دور کی رعنائیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ لاہور کا شالیمار باغ حسن فطرت کا ایک اچھوتا شاہکار ہے۔ پاکستان کے غیر ملکی معزز مہمان ہمیشہ اسے حیرت و استعجاب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کی دلفریبی پر رشک کرتے ہیں۔ صدر امریکہ جان ایف کینیڈی کی اہلیہ نے کہا ''کاش ہمارے ملک میں بھی کوئی ایسا خوبصورت باغ ہوتا اور میں اپنے کینیڈنوں کو دکھایا کرتی۔''

نئے عہد کے آغاز میں ہی بندھیلا راجپوتوں کے سردار جھجر سنگھ نے شاہی احکامات کی نافرمانی کی اور علم بغاوت بلند کیا۔ جھجر سنگھ ابوالفضل کے قاتل بیر سنگھ بندھیلا کا بیٹا تھا۔ بیر سنگھ بندھیلا جہانگیر کے منظور نظر امراء میں سے تھا اور اس نے اپنی طاقت کافی مضبوط کر لی تھی۔ شاہجہان کی تخت نشینی پر جھجر سنگھ خراج اطاعت پیش کرنے کے لیے آگرہ گیا اور اپنی ریاست کا انتظام اپنے بیٹے بکرماجیت کے سپرد کیا۔ بکرماجیت پرلے درجے کا نااہل اور نالائق شخص تھا۔ وہ ظلم و ستم اور رعایا پر سختیاں کرنے میں اپنے باپ سے بھی بازی لے گیا۔ ریاست کے ایک عہدہ دار سیتا رام نے شاہجہان کو ایک شکایت نامہ بھیجا جس میں بندھیلوں کی چیرادستیوں کے خلاف شدید احتجاج درج تھا۔ شاہجہان نے جھجر سنگھ سے مروت برتی۔ اس کا منصب برقرار رکھا۔ سیتا رام کی شکایت کے سلسلے میں اس نے تفتیش کا حکم دیا اور اعلان کیا کہ مجسٹریٹوں کو عبرتناک سزائیں دی جائیں گی۔ جھجر سنگھ کو جب بادشاہ کے ارادوں کا علم ہوا تو دارالحکومت سے چوری چھپے بھاگ گیا اور اپنی ریاست میں واپس جا کر مہاجات کر دی۔

ایک طاقتور فوج بغاوت کی سرکوبی کے لیے روانہ کی گئی۔ مہابت خان کو سپہ سالار مقرر

کیا گیا۔ خان جہان لودھی جو جہانگیر کے وقت خان خانان کے عہدے پر فائز تھا اسے حکم ہوا کہ مہابت خان کی مدد کو پہنچو اور اس سے تعاون کرو۔ بادشاہ خود بھی نگرانی پر تھا۔ دشوار گزار علاقہ کے باوجود شاہی فوجوں نے جلد ہی بندھیلوں کی بیخ کنی کر دی اور وہ پسپا ہو کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ آخر جھجر گونڈوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

خان جہان لودھی جہانگیر کی فوج کا سالار اعلیٰ تھا اس نے خانخانان کا لقب پایا اور دکن کی صوبیداری پر فائز رہا۔ شاہجہان نے جب اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تو دکن میں پناہ ڈھونڈی تو خان جہان لودھی نے سلطنت کے ایک وفادار عہدہ دار کی حیثیت سے شاہ جہان کی کوئی مدد نہ کی۔ جہانگیر جب مرا اور تخت نشینی کے لیے جدوجہد شروع ہوئی۔ تو خان جہان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آیا۔ اسے معلوم تھا کہ شاہجہان بادشاہ بن گیا تو اس کی وہ قدر و منزلت نہیں رہے گی۔ جو دربار میں پہلے اسے حاصل تھی۔ اس نے احمد نگر کے نظام شاہ ثانی سے تعلقات پیدا کرنے چاہے اور برار کے جنوبی پہاڑی علاقے اس کے ہاتھ بیچ دیئے تاکہ اگر اسے برے دن دیکھنے پڑیں تو وہ احمد نگر میں سر چھپا سکے۔

شاہجہان ابھی مہابت خان اور آصف خان کی مدد سے اپنی تخت نشینی کے لیے راستہ صاف ہی کر رہا تھا کہ اس نے مہابت خانہ کو خان خانان کا لقب دیا اور اسے مغل افواج کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کر دیا۔ یہ بات خان جہان لودھی کو ناگوار گزری۔ جب تک شاہ جہان نے اپنی بادشاہت کا اعلان نہ کیا خان جہان نے اس سے کوئی ہمدردی ظاہر نہ کی۔ بعد میں وہ اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلانے آگرہ آیا۔ مگر شاہ جہان کی طرف سے اس کا دل خوف سے پُر تھا۔ شاہجہان نے اگرچہ اسے معاف بھی کر دیا مگر اس کے وسوسے زائل نہ ہوئے۔ درباریوں نے اسے بتایا کہ بادشاہ اسے حراست میں لینے کی سوچ رہا ہے۔ اس قسم کی اطلاعات نے اسے پریشان کر دیا۔ اور وہ ایک رات چپکے سے شہر چھوڑ بھاگا۔ شاہی حکم پر خواجہ ابوالحسن نے اس کا تعاقب کیا۔ دھولپور کے قریب لڑائی ہوئی۔ سخت مقابلہ کے بعد خان جہان بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ شاہی دستہ تھکاوٹ سے اس قدر چور ہو چکا تھا کہ باغیوں کا تعاقب نہ کر سکا۔ خان جہاں گونڈ دانہ اور برار ہوتا ہوا احمد نگر پہنچ گیا۔ احمد نگر کے سلطان مرتضیٰ نظام شاہ ثانی نے اس کا خیر مقدم گرمجوشی سے کیا اور اسے جاگیر عطا کی اس کے ساتھیوں کو بھی اعزاز بخشے گئے نظام خان جہان کی مدد سے

مغلوں کو احمد نگر کے حصوں سے باہر نکال دینا چاہتا تھا۔ جن پر انہوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مغلوں کے ساتھ افغانوں کی نسلی عداوت اور دشمنی خان جہان کے دل میں عود کر آئی۔ وہ جنوبی ہند کی تمام طاقتوں کا ایک وفاق مغلوں کے خلاف تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ شاہ جہاں نے حالات کی نزاکت کا اچھی طرح جائزہ لیا اور جنوب سے خطرہ کا جو سیلاب بڑھ رہا تھا اس کا سد باب کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ مغل سالاروں، اعظم خان، عبداللہ خان اور مظفر خان نے باغیوں کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آصف خان کو بھی دکن روانہ کر دیا گیا۔ شاہ جہان خود فوجوں کی نقل حرکت پر نگرانی کرانے کے لیے آگرہ سے نکل کر برہان پور آ ٹھہرا۔ مدثر کی بادشاہی میں مغل فوجوں نے اودھم مچا دیا اور خان جہان کو دکن چھوڑ کر بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ نظام شاہیوں سے بھی ان کی اَن بن ہو گئی تھی انہوں نے بھی خانجہان کے چلے جانے پر اطمینان کا سانس لیا۔ باغی سردار جا بجا مارا مارا پھرتا رہا۔ تین سال کی طویل مدت تک وہ مغلوں کے ہتھے نہ چڑھا۔ کمال بہادری اور بردباری سے اس نے مصائب کا سامنا کیا اور اپنے ساتھیوں اور بیٹوں کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے موت کے گھاٹ اترتے دیکھا۔ اسے اب بچ نکلنے کی کوئی راہ نظر نہ آ رہی تھی۔ کالنجر کے شمال میں اپنے بچے کھچے ساتھیوں سمیت وہ مغل فوج کے ایک برق رفتار دستہ میں جو اس کا تعاقب کر رہا تھا گھر گیا اور صبر و استقلال سے لڑتے ہوئے اپنی جان دے دی۔

1579ء کے لگ بھگ پرتگیزوں نے بنگال میں سات گاؤں کے قریب ہگلی کے مقام پر اپنے قدم جما لیے تھے۔ اکبر اور جہانگیر نے انہیں تجارت کی کچھ مراعات دی تھیں۔ مگر وہ لوٹ مار، بردہ فروشی اور لوگوں کو تنگ کرنے پر اتر آئے۔ بچوں کو پکڑ کر بیچ دیتے۔ انہیں زبردستی عیسائی بنا دیتے۔ لوگوں سے بھاری محصولات وصول کرتے۔ ان کی من مانی کارروائیاں چیرہ دستیاں حد سے باہر ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ شاہ جہان کی بیگم ملکہ تاج محل کی دو کنیزیں پکڑ لیں۔ اس پر مغلوں کی حکومت حرکت میں آئی۔ شاہی حکم سے بنگال کے مغل گورنر قاسم علی خان نے پرتگیزوں کی نو آبادی پر یلغار کی اور انہیں تاخت و تاراج کر دیا۔ وہ بڑی تعداد میں مرے ان کے قلعے اور کارخانے تباہ ہو گئے اور بہت سے پرتگیزوں کو قیدی بنا کر آگرہ میں حاضر کیا گیا۔ جہاں انہیں مناسب سزائیں ملیں۔

صوبہ بنگال کے نظم و نسق پر شاہ جہان نے خاصی توجہ دی۔ شہزادہ محمد شجاع کو بنگال کا

صوبے دار بنایا گیا۔ جو کم وبیش بیس سال تک وہاں حکمران رہا۔ شجاع اگر چہ بہت محتاط منتظم نہ تھا تاہم وہ شاہانہ ٹھاٹھ رکھتا تھا۔ فیاض اور فراخدل تھا۔ اس نے دارالحکومت راج محل کو عالیشان عمارتوں اور مرمریں محلات سے سجا دیا۔ اس کے دربار میں علماء و شعراء جمع رہتے تھے۔ فنون لطیفہ کی سرپرستی ہوتی تھی۔ فن موسیقی کو شجاع نے بنگال میں نئی تر و تازگی عطا کی۔ وہ شیعہ تھا۔ اس کے گرد ایرانی امراء اکٹھے رہتے۔ ایرانی تہذیب وتمدن کا مظاہرہ ہوتا۔ بنگالی معاشرہ اس سے اثر پذیر ہوا۔

شاہ جہاں کی تخت نشینی کے چوتھے سال دکن اور گجرات کے علاقوں میں ایک زبردست قحط پڑا۔ بادشاہ نے قحط کی سختیوں کو کم کرنے کی حتی الوسع کوشش کی مگر دبا اتنی خطرناک حد تک شدید تھی۔ کہ ہزاروں انسان بھوکے مر گئے۔ سڑکوں اور راستوں پر لاشوں کے انبار دکھائی دینے لگے۔ اور لوگ ایک دوسرے کا گوشت کھانے پر مجبور ہو گئے۔

قندھار اور کابل ہندوستان کی دو نہایت ہی اہم سرحدی چوکیاں تھیں۔ وسط ایشیا سے ہندوستان آنے کے لیے یہی دو راستے تھے۔ مغل بادشاہ اپنی سلطنت کے تحفظ کے لیے ان دو مقامات پر اپنا غلبہ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں ایرانیوں نے قندھار پر اچانک حملہ کر کے اپنے قدم جما لیے تھے۔ شاہ جہان اس وقت سیاسی مصلحتوں کی بنا پر بادشاہ کے حکم کے مطابق قندھار کی مہم پر روانہ نہ ہوا۔ مگر تخت پر بیٹھتے ہی وہ نہایت سنجیدگی سے اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوا۔ قندھار کا ایرانی گورنر علی مردان خان جو شاہ ایران کے طرزِ عمل پر خوش نہیں تھا اور اس کے خلاف کچھ ذاتی قسم کی شکایات رکھتا تھا شاہ جہان سے سیاسی گٹھ جوڑ کرنے لگا۔ شاہ جہان نے دانشمندی سے اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ علی مردان خان نے قندھار کی چابیاں مغلوں کے حوالے کر دیں۔ اور اس طرح بغیر کسی کشت وخون کے قندھار پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ علی مردان خان نے شاہ جہان کی ملازمت اختیار کی اور کشمیر کا صوبے دار مقرر کیا گیا۔ وہ ایک نہایت ہی قابل شخص تھا۔ قندھار کے ساتھ ایسے قابل سیاستدان کا ہاتھ آنا مغلوں کی دوسری کامیابی تھی۔

ایرانی اس واقع پر خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ شہنشاہِ ایران عباس اعظم ایک طاقتور فوج لے کر قندھار کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا۔ اور دسمبر 1648ء کو قلعہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ مغلوں کو امید نہ تھی کہ سردیوں کے موسم میں ایرانی حملہ کر دیں گے۔ سردی اس قدر شدید تھی کہ فوجوں کے لیے نقل وحرکت کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ شاہ عباس جانتا تھا کہ مغل فوج ایسے موسم میں قندھار

کے دفاع کا کوئی مؤثر انتظام نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس نے مغلوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قندھار پر چڑھائی کر دی تھی۔ قندھار میں مغل سردار دولت خان تھا۔ اس نے بزدلی دکھائی اور دشمنوں کا مقابلہ ڈٹ کر نہ کیا۔ قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ کسی فوج کے لیے بھی اس کا مسخر کرنا بڑا مشکل کام ہوتا مگر دولت خان کی ہمت جواب دے گئی۔ تین ماہ تک شاہ جہان اسے کوئی کمک نہ بھیج سکا۔ جب اسے اطلاع ملی تو اس نے فی الفور اورنگ زیب اور وزیر علی سعد اللہ خان کو ایک بڑی فوج دے کر روانہ کیا۔ اس سے پہلے ہی دولت خان قلعہ ایرانیوں کے حوالے کر چکا تھا۔ شہزادہ اورنگ زیب نے قندھار پر دوبارہ قبضہ کرنا چاہا مگر ایرانی اس وقت تک قلعہ بند ہو چکے تھے انہوں نے مغلوں کی کچھ پیش نہ چلنے دی۔ اور شاہی جرنیل ناکام واپس لوٹے۔ تین سال بعد شاہ جہان نے پھر انہی سرداروں کے تحت ایک بہترین فوج روانہ کی خود کابل آ رہا تا کہ وسط ایشیا میں پیدا شدہ صورت حال کے علاوہ قندھار کی مہم پر بھی اپنی نظر رکھ سکے۔ مغل فوج بڑی تندی سے قلعہ پر حملہ آور ہوئی مگر ہر دفعہ انہیں اہلِ قلعہ کی بے پناہ گولہ باری کے سامنے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان کے توپ خانے نے بھی ٹھیک طور پر کام نہ کیا۔ سردی کا موسم نزدیک آ رہا تھا۔ سامان رسد بھی کم ہو رہا تھا۔ مجبوراً مغلوں کو محاصرہ اُٹھا کر لوٹ جانا پڑا۔ اس پر شاہ جہاں کے سب سے بڑے اور چہیتے بیٹے داراشکوہ نے جسے بادشاہ سے شاہ بلند اقبال کا خطاب مل چکا تھا۔ قندھار کی تسخیر کا عزم کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ اس مہم سے ضرور کامیاب لوٹے گا۔ بڑی تیاری کے بعد ایک عظیم فوج لے کر شہزادہ داراشکوہ قندھار پر حملہ آور ہوا۔ مگر ایرانیوں کی مستقل مزاجی ہمت وشجاعت اور قلعہ کی مضبوطی نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ اگرچہ کھلے میدان میں ایرانیوں کے اکا دکا فوجی دستوں سے مٹھ بھیڑ میں مغل سپاہیوں نے اپنی برتری کا لوہا منوایا اور کئی دفعہ ان کے گشتی دستوں نے اپنے سے زیادہ تعداد رکھنے والے ایرانیوں کو مار بھگایا مگر قلعہ کی بلند و بالا ناقابل تسخیر دیواروں کے نیچے ان کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ اور لشکر کو پھر نامراد واپس لوٹنا پڑا۔ شاہ جہان نے اب قندھار کی فتح کا ارادہ ترک کر دیا اور یہ اہم سرحدی مقام ہمیشہ کے لیے مغلوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ قندھار پر ان متعدد مہمات کے اخراجات 12 کروڑ روپے کے لگ بھگ تھے۔ یہ رقم سلطنت کی سالانہ آمدنی کا نصف تھی۔ اس کثیر رقم کے علاوہ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔

شاہ جہاں کی تخت نشینی سے کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے اندرونی سیاسی خلفشار سے

فائدہ اٹھاتے ہوئے ازبکوں کے ایک جرنیل نذر محمد نے کابل پر چڑھائی کر دی۔ مگر مغل صوبے دار نے دلیری سے شہر کا دفاع کیا اور ازبکوں کو ناکام لوٹنا پڑا۔

شمال مغربی سرحدی علاقوں میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ افغانستان کے قبائلی لوگ ایک مذہبی تحریک کے زیرِ اثر عوام کی شخصی آزادیوں پر ڈاکہ ڈال رہے تھے اور حکومت کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ صوبائی حکومت کے لیے ان کا قلع قمع کرنا آسان نہ تھا۔ 1639ء میں شاہ جہاں خود ایک عظیم فوج لے کر کابل گیا اور تخریب پسند عناصر کی سرکوبی کی۔ اس کے علاوہ اس نے وسط ایشیا کے حالات کا جائزہ لیا مگر اس سمت کوئی قدم اٹھائے بغیر واپس ہندوستان لوٹ آیا۔

وسط ایشیا میں سیاسی ابتری کا دور دورہ تھا۔ نذر محمد نے اپنے بڑے بھائی کو ہٹا کر سمرقند اور بخارا پر خود قبضہ کر لیا تھا۔ مگر عوام اس کی حکومت سے نالاں تھے۔ اگرچہ اس نے اصلاحات کیں مگر لوگوں کو ان سے زیادہ اپنے پرانے رسم و رواج عزیز تھے۔ یہ اصلاحات امراء کے مفاد کے بھی خلاف تھیں۔ انہوں نے بغاوت کر دی۔ نذر محمد کے ایک بیٹے عبدالعزیز نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور اپنے باپ کے خلاف نبرد آزما ہو گیا۔ شاہ جہان بڑی توجہ سے ان حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ وسط ایشیا میں اپنے آباؤ اجداد کے کھوئے ہوئے علاقوں پر پھر قبضہ کر لے۔ عبدالحمید لاہور کے الفاظ میں اپنے عہد حکومت کے آغاز سے ہی شہنشاہ کا دل بلخ اور بدخشاں کے علاقے فتح کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یہ علاقے اس کے خاندان کی میراث تھے اور پھر اپنے عظیم جدامجد تیمور کے پایۂ تخت سمرقند کے حصول کے لیے بھی بلخ اور بدخشاں کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے وسائل کی غیر محدود وسعتوں نے شاہ جہان کو ان سہانے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے پر آمادہ کر دیا۔ وہ ابھی پَر تول ہی رہا تھا کہ نذر محمد نے اپنے دشمنوں کے خلاف شاہ جہان سے مدد چاہی۔ مغل افواج فی الفور حرکت میں آ گئیں۔ شہزادہ مراد اور علی مردان خان کی کمان میں ایک لشکر جرار وسط ایشیا کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا۔ پہلی ہی یلغار کا سیلاب قندر، بلخ اور بدخشاں پر چھا گیا۔ 1646ء میں مغلوں نے کمال جرأت و ہمت کا ثبوت دیا۔ قلعے تسخیر ہوئے، اہم فوجی مقامات پر قبضہ ہوا۔ خود شاہ جہان کابل میں بیٹھا مغل جرنیلوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ وسط ایشیا میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ نذر محمد بھی سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلا اور ایران میں جا پناہ لی۔ بلخ سے دہلی تک مغلوں نے جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کر دیں اور رسل و رسائل کا ایسا اعلیٰ انتظام کیا کہ

مواصلات کا سلسلہ منقطع ہونے کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ ابھی فتوحات کا آغاز ہی ہوا تھا کہ شاہ جہان اور سعد اللہ خان کی مرضی کے خلاف اور ان کے متعدد احکامات کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے شہزادہ مراد بلخ سے اپنی فوج لے کر واپس چلا آیا۔ شاہ جہان نے فی الفور وزیر اعلیٰ سعد اللہ خان اور اس کے بعد اورنگ زیب کو مہم پر روانہ کر دیا۔ تاکہ مقبوضات ضائع نہ ہو جائیں۔ اورنگ زیب نے میدان جنگ میں پہنچتے ہی دشمنوں کے خلاف اپنی کارروائی شروع کر دی۔ اس وقت تک استرخانیوں نے اپنی طاقت کو مجتمع کر لیا تھا اور مغلوں سے تین گنا زیادہ فوج لے کر مقابلہ کے لیے آ چکے تھے۔ وہ اکا دکا حملہ کرتے۔ گھاٹیوں اور پہاڑیوں کی مدد سے مخالف فوج کو نقصان پہنچاتے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ آمنے سامنے مغلوں سے لڑائی نہ کریں بلکہ گوریلا طریق جنگ سے ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیں۔ ان گوناگوں مشکلات کے باوجود پیش قدمی جاری رکھی۔ اور بلخ پر قبضہ کر لیا۔ بلخ کے شمال مغرب میں تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر ازبکوں نے ایک زبردست فوج اکٹھی کر رکھی تھی۔ اورنگ زیب بڑھا اور دشمنوں کی صفوں کو چیرتا ہوا تیمور آباد تک جا پہنچا۔ یہاں استرخانیوں نے تین اطراف سے شدید حملہ کر دیا مگر وہ ان کی پیش قدمی کو نہ روک سکے۔ پسپائی میں دشمن کے فوجی اڈہ پر بھی مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ مغل فوج بلخ چھوڑ کر بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ مفتوح علاقے کی حفاظت کا کام کافی مشکل تھا۔ پسپائی میں اورنگ زیب کو اطلاع ملی کہ سبحان قلی ایک طاقتور فوج لے کر بلخ کی طرف بڑھ رہا ہے استرخانیوں کا سردار عبدالعزیز بھی پیش قدمی کر رہا تھا۔ ان مشکلات میں مغل فوج نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ دشمن ہر مقام پر ان کا راستہ روکے کھڑے تھے مگر وہ ان مشکلات کے باوجود مرتے مارتے ہوئے بلخ پہنچ گئے اور وہاں جا کر اپنی فوج کو کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ استرخانی جنگ وجدل سے اکتا چکے تھے ان کا خزانہ خالی ہو گیا اور قحط کی دبا نے انہیں آ گھیرا اور دشمن بھی دشوار گزار گھاٹیوں میں ایک مدت تک مصروف پیکار رہنے کے بعد تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ان کا سامان رسد بالکل ختم ہو گیا۔ سپاہی ہندوستان واپس لوٹنا چاہتے تھے۔

شاہ جہان بھی زیادہ دیر کابل میں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ وسط ایشیا میں اس کی مہموں نے اسے عجب معاملے میں گرفتار کر دیا۔ نئے مقبوضہ علاقوں کو اپنے قبضہ میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ قندھار کی حفاظت بھی ضروری تھی ادھر دکن میں حالات مخدوش ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں

اورنگ زیب نے بلخ کے علاقے پر اپنا تسلط قائم رکھنا فضول سمجھا۔ اگرچہ اس کے دشمن بھی ہمت ہار چکے تھے۔ کسی میں اب اتنی سکت باقی نہ تھی کہ لڑائی کو جاری رکھتا اس موقع پر اگر مغل مستقل مزاجی اور ہمت کا ثبوت دیتے تو عین ممکن تھا کہ سمرقند تک ان کا قبضہ ہو جاتا۔ مگر بے شمار اخراجات اور مصائب کا سامنا کرنے کے باجود انہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ دو سال میں انہوں نے چار کروڑ روپیہ خرچ کیا اور وہ مفتوحہ علاقے سے صرف 2.5 لاکھ کا مالیہ وصول کر سکے۔ سارا ملک بدنظمی اور دیوالیہ پن کا شکار ہو رہا تھا۔ اورنگ زیب نے اب اسی میں خیریت سمجھی کہ ہندوستان واپس لوٹ جائے۔ عبدالعزیز اور نذر محمد پہلے ہی صلح کی درخواست کر چکے تھے۔ شاہ جہان کی ہدایت پر اورنگ زیب نے نذر محمد کو حاضر ہونے کا حکم دیا تاکہ مغل بادشاہ سے خود صلح کی شرائط طے کر لے۔ نذر محمد نے بجائے خود آنے کے اپنے پوتے قاسم خان کو بھیج دیا۔ اورنگ زیب نے اسی سے سمجھوتا کر کے بلخ اس کے حوالے کیا اور خود کابل روانہ ہو گیا اس طرح بلخ میں شاہ جہان کی جدوجہد اختتام پذیر ہوئی۔ اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس جنگ نے فریقین کا کافی نقصان کیا مگر کوئی تبدیلی ظہور میں نہ آئی۔

بہرحال ازبکوں کو اپنی طاقت پر جو گھمنڈ تھا وہ جاتا رہا۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ مغلوں سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ مغلوں نے انہیں ہر معرکہ میں شکست دی۔ گوریلا جنگ میں ازبکوں کا پلہ بھاری رہا۔ دونوں حریفوں کو ایک دوسرے کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کا صحیح احساس ہو گیا۔ مغلوں کو بھی اس بات کا پتہ چل گیا کہ وہ وسط ایشیا میں اپنے قدم نہیں جما سکتے۔ اس کے بعد انہوں نے شمال مغرب میں اپنی حدود کو وسعت دینے کے عزائم ترک کر دیئے۔ ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس سمت میں ان کی پیش قدمی خطرات سے خالی نہیں اور کسی ہندوستانی قوت کو اس پیچیدہ گتھی کے سلجھانے کا عزم نہیں کرنا چاہیے۔ تاریخ میں اس سے پہلے کسی ہندوستانی بادشاہ نے وسط ایشیائی ممالک کو تسخیر نہیں کیا تھا اور نہ ہی شاہ جہان کے بعد کسی نے ادھر کا رخ کیا۔ یہ مہم بہرحال اس کے وسائل کی غیر محدود وسعتوں اور اس کے عزائم کی بلندیوں اور اس کی شجاعت و ہمت کی دلیل ہے۔

اس مہم کے دوران شمالی مغربی سرحدی علاقہ اچھی طرح مطیع و فرمانبردار بن گیا۔ یوسف زئی اور دوسرے قبائل نے اکبر کے عہد میں وہاں کافی اودھم مچائے رکھا۔ روشنیا نامی مذہبی تحریک کے رہنما عبدالقادر نے بعد میں مغلیہ حکومت کے عہدہ داروں کو سخت تنگ کیا اور اپنی تخریبی

سرگرمیوں سے حکومت کے نظم ونسق میں روڑے اٹکائے۔شاہ جہان نے قیام کابل کے دوران اس فتنہ کا قلع قمع کیا اس کے جرنیل سید خان نے عبدالقادر کو اس کی والدہ سمیت گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔جس نے ان لوگوں کو دکن میں جاگیریں دیں اور وہ وہیں آباد ہو گئے۔شمالی ہندوستان کے دوسرے نامور فرمانرواؤں کی طرح شاہ جہان نے بھی دکن کی تسخیر کا عزم کیا۔ اکبر کے عہد میں کاندیش اور براد کے علاقے مغل سلطنت میں شامل کیے گئے تھے۔احمد نگر میں مغل افواج نے صرف ایک کاری ضرب ہی لگائی تھی اور اس سلطنت کا معمولی سا حصہ ان کے قبضہ میں آیا تھا۔جہانگیر نے اس طرف مزید پیش قدمی کرنا چاہی مگر احمد نگر کا قابل وزیر ملک عنبر بڑی کامیابی سے اس کی ہر کوشش ناکام بناتا رہا۔شاہ جہان اور مہابت خان کی بغاوتوں کی وجہ سے جہانگیر زیادہ دیر تک دکن کے معاملات میں اپنی توجہ قائم نہ رکھ سکا اور احمد نگر نے مغلوں سے اپنا علاقہ واپس لے لیا۔

خان جہان لودھی نے جب شاہ جہان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔تو احمد نگر کے نظام شاہی حکمران نے اس کی مدد کی۔شاہ جہان نے احمد نگر پر فوج کشی کرنے کا یہ بہانہ غنیمت جانا اور نہایت سنجیدگی سے اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوا۔وہ خود دکن کا گورنر رہ چکا تھا اور اس علاقہ میں اس کی عظمت وشجاعت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔احمد نگر کے اندرونی حالات بھی اس وقت دگرگوں ہو رہے تھے۔ملک عنبر کا نالائق بیٹا فتح خاں وزارتِ عظمٰی کے عہدے پر فائز تھا۔تخت سلطنت پر دس سال کا ایک لڑکا حسین شاہ متمکن تھا۔مغلوں نے بڑی آسانی سے دولت آباد کو فتح کرلیا۔اور اس فتح کے بعد احمد نگر ان کے رحم وکرم پر تھا نظام شاہیوں کے آخری بادشاہ کو قید کر دیا اور اس کی سلطنت کو اپنے علاقے میں شامل کرلیا۔

تین سال کے بعد شاہ جہان نے دکن کی طرف مزید توجہ کی۔وہ خود بنفس نفیس اپنی فوجوں کی رہنمائی کے لیے دکن میں آیا اور گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کو مغلیہ سلطنت کی سیادت قبول کرنے کے لیے لکھا۔

گولکنڈہ نے مغلوں کی سلطنت کی سیادت تسلیم کر لی۔سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا اور باجگواری قبول کی۔شاہ جہان کے نام کا سکہ جاری کیا اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔مگر جنوب میں بیجاپور کی ریاست نے شاہ جہان کے اس حکم نامے کی پرواہ نہ کی اور اپنی آزادی برقرار رکھنے کا عزم

راسخ کرلیا۔ مغل افواج کیل کانٹے سے لیس ہو کر تین اطراف سے بیجا پور پر ٹوٹ پڑیں۔ خان جہان، خان دوران اور خان زمان تین اطراف سے حملہ آور ہونے والی اس مغل فوج کی رہنمائی کر رہے تھے۔ بیجا پور کے سلطان محمد عادل شاہ نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا مگر مغل افواج نے اسے بُری طرح گھیرے میں لے رکھا تھا۔ رسد و رسائل کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ آخر اُس نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور صلح کا جھنڈا بلند کیا۔ 1636ء میں شاہ جہان نے بیجا پور کے سلطان سے ان شرائط پر صلح کی کہ وہ مغل بادشاہ کی سیادت کو تسلیم کرے گا۔ بھاری تاوان جنگ ادا کرے گا۔ اس کے علاوہ باجگوار کی حیثیت سے ہر سال خراج کی ایک مقررہ رقم مغل بادشاہ کو بھیجے گا۔ گولکنڈہ سے جنگ نہیں کرے گا اور اس علاقے پر دست درازی نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ شاہ جی کی مدد نہیں کرے گا۔ شاہ جی سیواجی کا باپ تھا اور مرہٹوں کا لیڈر تھا۔ احمد نگر میں نظام شاہیوں کے خاتمہ کے بعد وہ اس کوشش میں تھا کہ پرانے خاندان کے کسی شہزادے کو تخت پر بٹھا کر احمد نگر کو مغلوں سے آزاد کرایا جائے۔ احمد نگر میں 60 سے اوپر قلعے تھے اور ان قلعوں میں سے بعض قلعے مرہٹوں کے سردار شاہ جی کے قبضے میں تھے۔

آخر گولکنڈہ اور بیجا پور دونوں زیرِ نگیں آ چکے تھے۔ جادو ناتھ سرکار کے الفاظ ہیں۔

"اس طرح 45 سال کی جنگ و جدل کے بعد آخر کار دکن کا معاملہ طے ہوا۔ بادشاہ کی سیادت قطعی طور پر تسلیم کر لی گئی اس کی سلطنت کی حدود واضح ہو گئیں اور جنوبی ریاستوں پر اس کی برتری باقاعدہ ایک مسلم حقیقت بن گئی۔"

شاہ جہان نے شہزادہ اورنگ زیب کو دکن کا گورنر مقرر کیا۔ دکن کا علاقہ چار صوبوں میں منقسم تھا۔ خاندیش، براء، دولت آباد اور تلنگہ۔ کچھ عرصے بعد اورنگ زیب نے باگلانہ بھی فتح کر کے اپنے علاقہ میں شامل کر لیا۔

اورنگ زیب 1636ء سے 1644ء تک دکن کا ناظم رہا۔ اس دَور میں اُس نے نہایت تن دہی سے اندرونی نظم و نسق کی طرف توجہ دی۔ علاقہ آباد کیا امن و امان کو بحال کیا۔ شاہ جی مرہٹہ کی سرگرمیوں کی روک تھام کی۔ سلطنت کے استحکام اور لوگوں کی خوشی کے لیے اقدامات کیے۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں مغلوں کے لیے محبت پیدا ہو جائے۔ اورنگ زیب اس وقت اٹھارہ سال کا ایک کم عمر شہزادہ تھا مگر نظم و نسق میں جس مہارت اور پختگی کا ثبوت اس نے بہم پہنچایا۔ اس سے

جہاں سلطنت کے بڑے بڑے آفیسر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے۔ وہاں بعض عناصر کو اس کی کامیابی گراں بھی گزری۔ اس کے بڑے بھائی داراشکوہ کو اورنگ زیب کی بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی میں اپنے مستقبل کے لیے خطرہ نظر آیا دارا شاہ جہان کا چہیتا بیٹا تھا اور اسی کے پاس آگرہ میں رہتا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ آخر جب 1644ء میں اورنگ زیب اپنی بہن جہان آراء کی بیماری کے سلسلہ میں آگرہ آیا تو اپنے باپ کے رویہ سے سخت بددل ہوا۔ داراشکوہ بہر طور اسے درپۓ آزار نظر آیا۔ اپنی محنت اور دیانتداری کا یہ ثمر دیکھ کر اسے اتنی مایوسی ہوئی کہ اس نے نظامت دکن سے استعفیٰ دے دیا۔

بعض ہمعصر مؤرخین اورنگ زیب کے مستعفی ہونے کی عجیب وغریب وجوہات بیان کرتے ہیں۔ عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے بعض دوستوں کے مشورے پر تارک الدنیا ہونے کی ٹھان لی۔ اس دنیا کی شان وشوکت اسے کھوکھلی اور بے مقصد نظر آئی اور اس نے گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہونا چاہا اس لیے دکن کی گورنری سے دستکش ہوا۔ خافی خان لکھتا ہے کہ اپنے باپ سے خائف ہو کر کہ وہ اسے کوئی سنگین سزا نہ دے اورنگ زیب مستعفی ہوا اور کچھ عرصے کے لیے سیاست سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ رہا۔ معلوم نہیں وہ کون سے سنگین جرائم تھے جن پر اسے سنگین سزا کا اندیشہ تھا۔ سیاست سے کنارہ کشی کی صحیح وجہ اورنگ زیب نے خود ہی اپنے خطوط میں بتائی ہے اور وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔

دکن سے اورنگ زیب کی واپسی کے بعد کوئی قابل ذکر واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا سوائے اس کے کہ نااہل گورنروں کے ہاتھوں ملک کی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ نظم ونسق کی مشینری میں خرابیاں نمودار ہونے لگیں۔ زراعت تباہ ہوگئی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور نے خراج دینا بند کر دیا۔

اورنگ زیب کو کچھ عرصہ بعد گجرات کا ناظم مقرر کیا گیا۔ پھر اسے وسط ایشیا کی مہمات پر بھیج دیا گیا۔ بلخ بخارا اور بدخشاں کے میدانوں میں اورنگ زیب نے داد شجاعت دی مگر ان مہمات کا حشر ہم دیکھ چکے ہیں۔ دراصل شاہ جہان کا وسط ایشیا پر لشکر کشی کرنا محمد تغلق کی چین پر پیش قدمی کی یاد دلاتا ہے۔

شاہ جہان نے اورنگ زیب کو گجرات کے صوبہ کا نظم ونسق دیا اور پھر اسے وسط ایشیا کی مہم پر بھیجا۔ ان واقعات سے خافی خان کے بیان کی تردید ہوتی ہے۔ وسط ایشیا کی مہم پر اورنگ

زیب کا بھیجا جانا شاہ جہان کے اس پر اعتماد کی بین دلیل ہے شاہ جہان اس پر کسی قسم کی فرد جرم عائد نہیں کرنا چاہتا تھا نہ ہی اورنگ زیب سے کوئی اس قسم کا جرم سرزد ہوا تھا۔ صرف داراشکوہ کی سازشی سرگرمیوں کی وجہ سے شاہجہاں اورنگ زیب کی وہ قدر نہ کرتا جس کا وہ مستحق تھا۔ اور پھر بادشاہ کی طرف سے ایسی دخل اندازی ہوتی کہ اورنگ زیب کو اپنے ارادوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اس کی سکیمیں تکمیل کے مراحل میں ہی دم توڑ دیتیں۔ وسط ایشیا میں ہم اس کی مثال دیکھ چکے ہیں۔ ابھی اس قسم کے اور واقعات ہمارے سامنے آئیں گے دراصل داراشکوہ شاہ جہان کی کمزوری بن چکا تھا۔ اور ہر انسان کی طرح اسے اپنی کمزوری پر قابو نہ تھا۔ یہ بات جنگ تخت نشینی کے بیان میں ذرا زیادہ کھل کر سامنے آئے گی۔

دکن میں حالات اس قدر خراب ہو رہے تھے کہ شاہ جہان نے شہزادہ اورنگ زیب کو دوبارہ دکن بھیجنے میں ہی بھلائی دیکھی۔ 1653ء سے دکن میں اورنگ زیب کی دوسری گورنری کا آغاز ہوتا ہے اور یہ دور 1658ء میں شاہ جہان کی برطرفی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں دولت آباد یا اورنگ آباد نظامت دکن کا صدر مقام بنا۔

دکن میں اورنگ زیب کا یہ دوسرا عہدِ نظامت کئی اعتبارات سے اہم ہے۔ اس عہد میں زرعی اصلاحات کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس سلسلہ میں مرشد قلی خان شہزادہ کا مشیر تھا۔ اس نے راجہ ٹوڈرمل کا بندوبست اراضی دکن میں نافذ کیا زمین کی باقاعدہ پیائش کی گئی، مالیہ مقرر کیا گیا۔ کسانوں کو سہولتیں دی گئیں۔ زرعی قرضے جاری ہوئے۔ زمین کی پیائش میں جریب کا استعمال کیا گیا۔ بعض جگہوں پر جو بندوبست کیا گیا اسے بٹائی کہتے تھے۔ اس میں زمین لیاقت کے پیش نظر اور فصلوں کی پیداوار کے مطابق ہر سال کی پیداوار کسان اور حکومت کے درمیان بانٹ لی جاتی۔ ظاہر ہے اس صورت میں مالیہ جنس میں ادا ہوتا تھا۔ زرعی بندوبست کے لیے نظامت دکن کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پائیں گھاٹ اور بالا گھاٹ۔ پہلے حصے میں خاندیش اور برار کا کچھ علاقہ تھا۔ دوسرے حصے میں باقیماندہ۔ اورنگ زیب نے زرعی اصلاحات پر کچھ اس خصوصیت سے توجہ کی اور اس سلسلہ میں اتنا ٹھوس کام کیا کہ دکن کی زرعی تاریخ میں اسے ہمیشہ کے لیے ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا۔ جادو ناتھ سرکار اورنگ زیب کی ان زرعی اصلاحات کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے نسخہ دلکشا مصنفہ بھیم سین برہانپوری کا حوالہ دے کر لکھتا ہے کہ 1658ء میں اورنگ

آباد کے قرب و جوار میں زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہ تھا جو کاشت نہ ہونے کی وجہ سے ضائع جاتا ہو۔ گندم اور دال روپیہ کی ڈیڑھ من، جوار اور باجرہ ساڑھے تین من شکر کا شیرہ آدھ من اور گھی 4 سیر۔

زراعت کی ترقی کو چونکہ اورنگ زیب ملک کی اہم ترین ضرورت سمجھتا تھا اس لیے دکن پہنچتے ہی اس کی پہلی توجہ اسی مسئلہ پر صرف ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ملکی سیاست کو بھی الجھنوں سے پاک کرتا رہا۔ شاہ جی سے کئی قلعہ جات واپس لیے اور اس کی طاقت کا قلع قمع کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ مرہٹوں کی طاقت صحیح طور پر کچلنے کے لیے اورنگ زیب گولکنڈہ اور بیجاپور کا مستقل محدود الحاق ضروری سمجھتا تھا۔ خاص کر بیجاپور تو مرہٹوں کا مورچہ بنتا جا رہا تھا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور دو ایسی ریاستیں تھیں جن کا وجود مغل سلطنت کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتا تھا۔ ان ریاستوں کے ایران کے ساتھ تعلقات تھے اور ان میں ایرانی عناصر کا زور تھا۔ پھر یہ دونوں ریاستیں اپنے آپ کو مرہٹوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے میں بالکل ناکام ہو رہی تھیں۔ بیجاپور پر جنوب کی طرف سے پرتگیزوں کا دباؤ بھی پڑ رہا تھا۔ اور پرتگیزوں کو پیچھے ہٹانے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ دونوں ریاستوں کے اندرونی حالات بھی بگڑے ہوئے تھے۔ سیاسی شاطر طالع آزمائی میں مشغول تھے اور امن پسند عوام کے لیے زندگی کا قافیہ تنگ ہو رہا تھا۔

اورنگ زیب کی سیاسی بصیرت یہی فیصلہ دیتی تھی کہ بغیر کسی تامل کے ان ریاستوں کو مغل سلطنت اپنے سائے میں لے لے۔ اس طرح عوام کو جہاں بدنظمی اور لاقانونیت سے نجات ملے گی۔ وہاں مرہٹوں اور پرتگیزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا استیصال بھی ممکن ہو جائے۔

ان ریاستوں پر چڑھائی کرنے کے محرکات اورنگ زیب کے یہ خیالات ہی نہ تھے۔ کچھ واقعات بھی ایسے رونما ہوئے جن کی بناء پر یہ اقدام ناگزیر ہو گیا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور نے دکن سے اورنگ زیب کی غیر حاضری کے دوران سالانہ خراج کی ادائیگی بند کر دی تھی اور بھاری رقوم کے بقایا جات ان کے ذمہ تھے۔ یہ رقم وہ کسی طرح ادا نہیں کر رہے تھے۔ مغلوں کے وقار اور ان کی سیادت کا تقاضا یہی تھا کہ ان ریاستوں سے رقم وصول کی جائے یا بڑھ کر ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہی بین الاقوامی سیاست کے اصول بھی تھے۔

خراج کی عدم ادائیگی کے علاوہ ان ریاستوں کے اندرونی حالات اورنگ زیب کے

لیے تردد کا باعث بنے۔ گولکنڈہ کا ایک امیر، میر جملہ سلطان کے عتاب کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ میر جملہ یوں تو سلطنت گولکنڈہ کا ایک معزز عہدہ دار تھا مگر اس نے اپنی قابلیت اور لیاقت سے بڑی قوت حاصل کر لی تھی۔ کارناٹک میں اس نے کچھ علاقہ اپنے قبضہ میں رکھا تھا۔ جس سے اسے لاکھوں روپیہ کا سالانہ مالیہ وصول ہوتا تھا۔ اس نے اپنی فوج بھرتی کر رکھی تھی۔ اور نوابوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ گولکنڈہ کے سلطان کو میر جملہ کی اس روز افزوں قوت میں اپنے لیے چیلنج نظر آیا اور اس نے اس کے اقتدار کی بیخ کنی کرنے کی ٹھان لی۔ میر جملہ کے بیٹے اور اس کے اہل وعیال کو جیل میں ڈال دیا گیا اس رویہ سے گھبرا کر میر جملہ نے اورنگ زیب سے شکایت کی اس نے شاہجہان کے کانوں تک بھی اپنی آواز پہنچائی۔ ان بہت سی وجوہات کی بناء پر شاہ جہان نے اورنگ زیب کو گولکنڈہ پر چڑھائی کی اجازت دے دی۔ مغل فوجیں ایک سیلاب کی طرح بڑھیں اور گولکنڈہ کے قلعے کو گھیرے میں لے لیا۔ اسی اثنا میں والی گولکنڈہ نے شاہ جہان کے پاس آدمی دوڑائے۔ داراشکوہ نے بھی اپنے باپ پر زور دیا کہ گولکنڈہ کو معاف کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ اورنگ زیب قلعہ پر قبضہ کرتا اسے بادشاہ کے حکم سے محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ یہ بات اورنگ زیب کو بڑی ناگوار گزری مگر اس نے بادل ناخواستہ شاہی حکم پر سر تسلیم خم کیا۔ تاہم گولکنڈہ سے کچھ رقوم وصول کیں کچھ علاقہ پر قبضہ کیا اور میر جملہ کی خدمات ہمیشہ کے لیے حاصل کر لیں۔

1657ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور پر فوج کشی کی کہ اس نے بھی بھاری رقوم پر مشتمل بقایا جات ابھی ادا کرنے تھے اور خراج کی عدم ادائیگی کے سلسلہ میں اورنگ زیب کے احکامات کا کوئی معقول جواب نہیں دے رہی تھی اس کے علاوہ شاہ جی کو یہ ریاست کافی مدد دے رہی تھی اور یہ بات معاہدہ 1632ء کے منافی تھی۔ یہاں بھی داراشکوہ اور شاہ جہان کی عاقبت نااندیشی نے اورنگ زیب کو کچھ نہ کرنے دیا۔ بیدر اور کلیانی مسخر ہو چکے تھے اور بیجاپور فتح ہونے کے قریب تھا۔ کہ شاہی احکام پر اورنگ زیب کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اورنگ زیب بیجاپور پر بھی شاہ جہان کی اجازت سے حملہ آور ہوا تھا۔ اسے اس طرح پابند کر دینے سے دونوں ریاستوں کا الحاق معرض التوا میں پڑ گیا۔ اور اس التوا سے بعد میں مغل سلطنت پر بڑے برے اثرات مرتب ہوئے۔

ستمبر 1657ء میں یہ افواہ مشہور ہو گئی کہ شاہ جہان جو عرصہ سے ایک خطرناک بیماری

میں مبتلا تھا چل بسا ہے۔اس غلط افواہ کے پھیلنے کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ طویل علالت کے باعث ایک مدت سے جھروکہ درشن نہ دے سکا اور اس کے درباریوں اور عوام کی آنکھوں نے اسے نہ دیکھا۔جھروکہ درشن مغل بادشاہوں کا شیوہ بن چکا تھا۔اس طرح وہ اپنی رعایا کے سامنے جلوہ افروز ہوتے اور رعایا اپنی آنکھوں سے اپنے بادشاہ کا درشن کرتی۔یہ نازک سا تعلق جو نہایت اہم تھا شاہ جہان کی علالت کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔اس عرصہ میں حکومت کا کاروبار دارا شکوہ کے ہاتھ میں تھا۔شاہ جہان نے اسے شاہ بلند اقبال کا خطاب عطا کیا اور وہ عملی طور پر بادشاہ کی طرح سلطنت کا نظم ونسق چلا رہا تھا۔یہ بات واضح تھی کہ شاہ جہان اسے ہی اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔بادشاہ کے نظروں سے اوجھل ہونے پر لوگوں نے یہ جانا کہ شاہ جہان اب نہیں رہا اور دارا شکوہ اس راز کو چھپا رہا ہے تاکہ اس کے بھائیوں کو علم ہونے سے پہلے اپنی طاقت مضبوط کر لے اور تخت پر اپنا قبضہ اچھی طرح جما لے۔دارا شکوہ کے بھائیوں تک بھی یہ افواہ پہنچی۔معلوم نہیں انہیں شاہ جہان کی موت کا یقین ہوا یا نہیں بہر حال یہ بات ان سب نے محسوس کی کہ تخت شاہی حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کا یہی وقت ہے چنانچہ تینوں بھائی دارا شکوہ کے ساتھ تخت نشینی کی جنگ کرنے کو تیار ہونے لگے۔

تخت نشینی کا مسئلہ خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نازک ترین مسئلہ بن گیا۔ہر بادشاہ کی موت کے بعد تلوار ہی جانشینی کا فیصلہ کرتی۔اسلام نے کوئی ایسا قانون مقرر نہیں کیا ہے جس کی رو سے کسی بادشاہ کا بڑا بیٹا ہی تخت کا وارث ہو۔کیونکہ اس طرح کی شخصی آمریت قائم کرنا تو اس کے پیش نظر تھا ہی نہیں۔جب خلافت راشدہ کے ساتھ ہی انتخاب کا اصول بھی مسلمانوں کی ملکی سیاسیات سے جاتا رہا تو جانشینی کے وقت ہر دفعہ تلواروں کا میان سے نکلنا ایک قدرتی عمل تھا۔اس طرح جہاں ملک کا امن وامان غارت ہو جاتا، مسلمان مسلمانوں کا خون کرتے اور جانبین سے کئی قابل اشخاص موت کے گھاٹ اتر جاتے وہاں ایک فائدہ بھی ہوتا۔تخت نشینی کی جنگ کے بعد جو شہزادہ تخت حاصل کرتا وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قابل اور ہر دلعزیز ہوتا۔کیونکہ اپنی قابلیت اور عوام کی پشت پناہی ہی ایسی جنگوں میں کسی حریف کا سب سے بڑا ہتھیار ہو سکتا ہے۔

شاہ جہان کے چار بیٹے تھے۔دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد۔چاروں شہزادے

مختلف صوبوں کے ناظم تھے اور حکومت کے نظم و نسق کے ساتھ ساتھ فنونِ حرب سے بھی پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ البتہ ان کی قابلیت میں اختلاف موجود تھا۔ اور ہر شہزادہ کچھ مخصوص انفرادی خصوصیات کا حامل تھا۔ بہتر ہے کہ ان کی شخصیات کا ایک اجمالی جائزہ لے لیا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اس پس منظر میں انہوں نے جنگ تخت نشینی میں کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

داراشکوہ سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اور شاہ جہان کا چہیتا۔ وہ اگر چہ پنجاب کا گورنر تھا مگر آگرہ میں اپنے باپ کے پاس ہی رہتا تھا۔ دارا سے محبت بادشاہ کی کمزوری بن چکی تھی اسی وجہ سے وہ ناحق اورنگ زیب کا دل دکھاتا رہا اور اسی سبب سے جنگ تخت نشینی کے دوران شاہ جہاں سے کچھ ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی بناء پر اس کو زندگی کے بقیہ دن قید و بند میں گزارنے پڑے۔

داراشکوہ علم و ادب کا دلدادہ تھا اس کی وسیع المشربی علم دوستی اور مذہبی رواداری نے عوام کی ایک بڑی تعداد کو گرویدہ کر رکھا تھا۔ وہ مذہب میں اکبر کا پیرو تھا۔ اور اکبر کی آزاد خیالی اور متضاد مذاہب میں یگانگت اور انسانی فلاح کی تلاش اسے ورثہ میں ملی تھی۔ اس نے مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس سلسلہ میں گراں قدر تصنیفات چھوڑیں ایک مؤرخ کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں اگر کوئی شخص مطالعہ مذہب کا کام کرنا چاہے تو اسے یہ کام وہیں سے شروع کرنا پڑے گا جہاں سے دارا نے چھوڑا ہے۔ سفینۃ الاولیاء، حسنات العارفین، مجمع البحرین، قادری کے تخلص سے شاعری دیوان اور اپنشد کا فارسی میں ترجمہ شہزادے کے غیر فانی علمی و ادبی کارنامے ہیں۔ دارا ان آدمیوں میں سے تھا جو ہر مذہب کے پیرو ہوتے ہیں اور سب مذہبوں کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دارا خود سر خود رائے اور بعض دفعہ بدماغ بھی تھا۔ باپ کے پیار و محبت نے اسے آگرہ میں ہی رکھا۔ انتظام سلطنت اور جنگی فنون کا اسے وہ تجربہ نہ ہو سکا جو دوسرے بھائیوں نے خاصی مقدار میں حاصل کر لیا۔ دارا ایک کامیاب فلاسفر یا شاعر تو ہو سکتا تھا مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ ایک وسیع و عریض ملک کا منتظم بن سکتا۔ جہاں ثابت قدمی کی ضرورت ہوتی اس کے قدم متزلزل ہونے لگتے وہ ہر معاملہ میں اپنے آپ کو ماہر سمجھتا تھا۔ اور کسی دوسرے شخص کی رائے لینا اس کے لیے باعث ننگ تھا۔ تاہم عوام کا وہ طبقہ جو کٹر مذہبی نہیں تھا۔ اسے پسند کرتا تھا اور پھر بادشاہ نے بھی اسے ولی عہد تسلیم کیا ہوا تھا۔ اس وجہ سے بھی بہت سے لوگوں نے اس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھا۔ مگر اپنے سارے بھائیوں سے زیادہ وسائل کا مالک ہوتے ہوئے اور بہتر فوج

رکھنے کے باوجود وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔

شجاع بنگال کا ناظم تھا۔ وہ شجاعت کا پتلا اور تلوار کا دھنی تھا۔ مگر سیاسی بصیرت کا وافر حصہ اسے نہ ملا اس کا وقت زیادہ تر حرم کی رنگ رلیوں میں گزرتا۔ حسین دوشیزائیں اس کی سب سے بڑی کمزوری تھیں۔ وہ شراب و شعر میں بدمست رہتا۔ اور ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' اس کا نظریہ حیات تھا۔ اس کے کردار کے اس پہلو کی نشو ونما میں بنگال کی آب وہوا کا بھی ہاتھ تھا۔ اپنے جدامجد ہمایوں کی طرح میدانِ جنگ میں دادشجاعت کے بعد وہ محفل نشاط میں ڈوب جاتا۔ سیاست کی نزاکتوں کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے وہ فوراً اپنے عزائم کا اظہار کر دیتا چاہے ان کو عملی جامہ پہنانے کی اس میں ہمت نہ ہوتی۔

اورنگ زیب اپنے سب بھائیوں سے مختلف تھا وہ علم دوست ہونے کے علاوہ ایک صحیح متشرع مسلمان تھا۔ سادگی اور سنجیدگی اس کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ وہ ہمت اور شجاعت کا مجسمہ تھا۔ مشکلات سے اس کی جرأت اور چمکتی۔ مصائب سے نبرد آزما ہونا اس کے لیے ایک کھیل تھا۔ مخالفت کا کوئی پہاڑ اور رکاوٹ کی کوئی دیوار اس کے راستہ میں حائل نہ ہوسکتی۔ ملکی سیاسیات کو سمجھنے کا جو ملکہ خدا نے اسے عطا کیا تھا اس کے بھائیوں کے پاس اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ وہ سنی تھا اور ہندوستان کے سنی مسلمان جو اکثریت میں تھے اسے ہی تخت شاہی پر متمکن دیکھنا چاہتے تھے۔ دکن کی جنگوں اور وسط ایشیا کے معرکوں میں اپنی جنگی قابلیت کا لوہا منوا چکا تھا۔ باپ کی سرد مہری نے اس کے کردار کو اور پختہ کر دیا۔ امڈتے ہوئے طوفانوں اور بڑھتی ہوئی آندھیوں میں وہ صبر و استقلال سے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو جاتا اور کوئی آندھی اس کے چراغ کو گل نہ کر سکتی۔ انتظام سلطنت میں اسے جو مہارت حاصل تھی اس کا ثبوت وہ پہلے ہی دکن میں بہم پہنچا چکا تھا۔ اس کے سپاہیوں کو اس پر پورا پورا اعتماد تھا۔ وہ بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ لڑنا مرنا جانتا تھا۔ مگر جیسا کہ اس طرح کی عظیم شخصیتوں کے ساتھ عام طور پر ہوتا ہے وہ دنیا کو اپنے پیچھے لگانا تو جانتے ہیں ہوا کے رُخ کو بدلنے کی سعی تو کرتے ہیں۔ مگر ہوا کا رُخ پہچان کر اپنے مؤقف میں تبدیلی پیدا کرنا ان کے کردار عمل سے خارج ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بقول اقبال کے

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ مساز

کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور اِسی سبب سے ان کے مزاج میں ایک طرح کا اٹل پن پیدا ہو

جاتا ہے۔ جو بعض اوقات سختی اور درشتی میں ظاہر ہوتا ہے۔ اورنگ زیب میں یہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اس پہلو کا مزید جائزہ آگے اورنگ زیب کے حالات میں آتا ہے۔

مراد گجرات کا ناظم تھا۔ وہ فنون حرب پر قدرت کاملہ رکھتا تھا اور جنگی چالوں پر پوری طرح مطلع تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی خودسری میں دارا کا ہمسر تھا۔ منہ زور شجاعت و دلیری اور خود سری نے اس کے سوچنے اور سمجھنے کی قوتوں کو کسی حد تک ماؤف کر رکھا تھا۔ اسی بات کو بعض مؤرخوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ بے وقوف تھا۔ سیاسی چالوں اور شاطر بازیوں کو وہ نہ سمجھ سکتا۔ جنگ وجدل میں اگرچہ وہ شیر کی طرح جھپٹتا اور سربکف میدان کارزار میں کود پڑتا مگر اپنی فتح سے صحیح فائدہ اٹھانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

جب ستمبر 1657ء میں شاہ جہان موذی مرض میں مبتلا ہوا اور اُن کی موت کی افواہ پھیل گئی تو چاروں شہزادے حصول تخت کے لیے کمربستہ ہونے لگے۔ شجاع نے بنگال کے صدر مقام راج محل میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور فوج لے کر دارالخلافہ کی طرف روانہ ہوا۔ مراد نے بھی اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ کہلوانے میں دیر نہ کی۔ البتہ اورنگ زیب نے کوئی ایسا کام نہ کیا۔ صرف اپنے لاؤلشکر کے ساتھ آگرہ کا رُخ کیا۔ اِدھر گجرات سے مراد اپنے آدمیوں کو لے کر بڑھا۔ اورنگ زیب نے خط و کتابت کر کے پہلے ہی سے یہ طے کر لیا تھا کہ دونوں شہزادوں کی فوجیں متحد ہو کر دارا کا مقابلہ کریں۔ اس سلسلہ میں جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے (۱) مال غنیمت کا ایک تہائی مراد بخش اور دو تہائی اورنگ زیب کو ملنا قرار پایا (۲) فتح کی صورت میں پنجاب، افغانستان، کشمیر اور سندھ پر مراد بخش کا قبضہ ہوگا۔ اور وہ ان علاقوں میں اپنے نام سے حکومت کرے گا۔ اپنے نام سے سکہ جاری کرے گا۔ باقی ماندہ علاقہ پر اورنگ زیب کی حکومت ہوگی۔ مراد نے ان شرائط پر اورنگ زیب کا ساتھ دینا منظور کیا۔ ان دونوں کی افواج مالوہ کے قریب ایک دوسرے سے آکر ملیں اور وہاں سے انہوں نے آگرہ کی راہ لی۔

آگرہ میں دارا بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے شجاع، مراد، اورنگ زیب کی پیش قدمی کا سنتے ہی اپنے بیٹے سلیمان شکوہ اور راجہ سنگھ کو ایک فوج دے کر شجاع کی طرف روانہ کر دیا۔ دوسری فوج راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خان کی کمان میں جنوب کی طرف بڑھی کہ دارا اور اورنگ زیب کا سامنا کرے۔

بنارس کے قریب سلیمان شکوہ اور شجاع کی مٹھ بھیڑ ہوگئی اور شجاع کو شاہی افواج کے حملوں کے سامنے پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ بنگال کی طرف بھاگ گیا۔ قاسم خان اور جسونت سنگھ نے اجین کے قریب دھرمت کے مقام پر مراد اور اورنگ زیب کی افواج کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی شاہی لشکر بُری طرح پٹ گیا۔ میدان میں مالِ غنیمت اور لاشوں کے انبار چھوڑ کر قاسم خان آگرہ کو پسپا ہوا۔ راجہ جسونت سنگھ اپنی راجدھانی چھوڑ کر بھاگ گیا۔

شاہی افواج اگر کچھ عقلمندی سے کام لیتیں، اپنے رسل و رسائل کا سلسلہ اچھے طریقہ سے قائم رکھتیں اور دارا قاسم خان کو یہ ہدایت بھیجتا کہ سلیمان شکوہ کے زیرِ کمان فتح مند لشکر کا انتظار کرے اور اسے اپنے ساتھ ملا کر اورنگ زیب و مراد کا مقابلہ کرے تو شاید دھرمت کی لڑائی کا نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ قاسم خان اور راجہ جسونت سنگھ نے سلیمان شکوہ کی فتح کا سن لیا تھا وہ خود بھی ایک ایسی ہی فتح حاصل کرنے کے شوق میں بلا تامل آگے بڑھے اور حریفوں کی فوج پر چڑھ دوڑے۔ یہ سوچا کہ اورنگ زیب و مراد کے زیرِ کمان جو فوج ہے وہ ان کی فوج سے بدرجہا بہتر ہے۔ جنگی بصیرت کے فقدان کی وجہ سے سلیمان شکوہ کو ساتھ ملانے کا خیال کس کو نہ آیا ایسی ہی غلطیاں آخر دارا کے زوال کا باعث بنیں۔

دھرمت کی فتح سے اورنگ زیب کو بے انداز فائدہ ہوا اس کی برتری کی دھاک بیٹھ گئی اور شاہی افواج کی شہرت کو سخت صدمہ پہنچا۔ دھرمت سے فتح وظفر کے جھنڈے لہراتے ہوئے مراد اور اورنگ زیب آگے بڑھے اور قلعہ آگرہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر مشرق کی طرف ساموگڑھ کے میدان میں آکر پڑاؤ ڈالا۔ دارا شکوہ 50,000 کا لاؤ لشکر لے کر مقابلہ کو نکلا۔ 29 مئی 1658ء کو ساموگڑھ کے مقام پر گھمسان کا رَن پڑا۔ اورنگ زیب نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ کہ تیروں کی بارش سے گھبرا کر پیچھے نہ ہٹ سکے۔ دونوں اطراف سے سپاہی جان توڑ کر لڑ رہے تھے مگر دارا کے آدمیوں کو اس پر زیادہ اعتماد نہ تھا جتنا اورنگ زیب کے سپاہیوں کو اپنے کمانڈر پر تھا اس کے علاوہ دارا کی فوج تعداد میں تو ایک بڑی فوج نظر آتی تھی۔ مگر دراصل اس میں ہر طرح کے لوگ بغیر کسی تنظیم کے شامل تھے۔ یگانگت اور یک جہتی کا وہ عنصر جو مخالفوں کی فوج میں بدرجہ اتم موجود تھا دارا شکوہ کی فوج میں برائے نام ہی تھا۔ اورنگ زیب کی طرف سے مراد بخش بھی جان توڑ کر لڑا۔ اس نے اپنے جانبازوں سمیت خوب دادِ شجاعت دی اس کے کچھ زخم بھی آئے۔

دارا شکوہ ہاتھی پر سوار تھا اس کا ہاتھی تیروں کی بارش میں بُری طرح زخمی ہو گیا۔ اس نے چند مشیروں کے کہنے پر ہاتھی کو گھوڑے سے تبدیل کر لیا۔ سمتھ کے الفاظ میں اس عمل نے لڑائی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ دارا کے آدمیوں نے ہاتھی خالی دیکھ کر یہ سمجھا کہ وہ جنگ میں کام آ چکا ہے۔ ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بدحواس ہو کر میدان جنگ سے بھاگ اُٹھے۔ دارا شکوہ پر خوف و ہراس کا ایسا عالم طاری ہوا کہ وہ اپنی توپیں خیمہ و خرگاہ میدان میں چھوڑ کر دہلی بھاگ گیا۔

❀............❀............❀

سلطان شہاب الدین محمد غوری

فاتح سندھ غازی محمد بن قاسم کے بعد یزید بن ابی کبشہ نے سندھ پر بڑی کامیابی سے حکومت کی مگر امیر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں اسلام دشمن عناصر جو زیرِ زمین چلے گئے تھے ان میں اکثر تخریب کاروں نے سندھ جیسے دور دراز ملک کی طرف بھاگنا شروع کر دیا اور اس حد تک طاقت حاصل کر لی کہ ہندوستان کے ہندو راجاؤں سے مل کر مسلمانوں کی حکومت کو سخت نقصان پہنچایا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے بہت پہلے شیعوں کی ایک شاخ جو اب باطنیوں کے نام سے موسوم ہو چکی تھی ان کے باقیات السیات میں سے ہی ابوالفتح داؤد نے ملتان کو اپنا دارالحکومت بنا کر مسلمانوں کو چن چن کر ختم کر دیا۔ ہندوستان میں مستقل سلطنت اسلامیہ کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے سلطان شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں رکھی۔

محمد غوری کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک صاحب عزم انسان تھا۔ اس نے خود کو پنجاب کے علاقے کا جو دولت غزنویہ کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا وارث خیال کیا۔ علاوہ بریں تحفظ مملکت بھی مقتضی تھا کہ وہ پنجاب کے والی خسرو ملک اور ملتان کے قرامطیوں کو شکست دے۔ مسلمان ہونے کے باعث اس کی خواہش تھی کہ وہ ہندوستان پر چڑھائی کرے اور وہاں اسلام کی اشاعت کرے۔

1175ء میں محمد غوری نے ملتان پر حملہ کرنے کے لیے ہندوستان پر یلغار کی۔ ملتان کے زندیق کو باسانی شکست دے دی گئی اور ملتان پر قبضہ ہو گیا اور ایک راسخ عقیدہ مسلمان کو ملتان کا والی مقرر کیا گیا۔

سلطان محمد غوری نے گجرات میں واگیل خاندان کے راجہ بھیم ثانی کی حکومت کے صدر

مقام انہلواڑہ پاپلن پر بھی حملہ کیا تاہم اسے شکست ہوئی اور اسے پسپا ہونا پڑا۔اس پسپائی سے عساکر سلطانی کو اس قدر نقصان پہنچا کہ پیش قدمی کی محنت اس کے سامنے گرد ہوکر رہ گئی اور غزنی پہنچنے والی فوج اصل فوج کا عشر عشیر بھی نہ تھی۔محمد غوری خوش نصیب تھا کہ اپنی شکست خوردہ فوج کو سلامت لے کر غزنی پہنچ گیا۔

1179ء میں اس نے پشاور پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔

1185ء میں محمد غوری نے پنجاب پر دوبارہ حملہ کیا۔

1186ء میں محمد غوری نے ایک بار پھر پنجاب کا قصد کیا اور لاہور کا محاصرہ کر لیا یہ درست ہے کہ محمد غوری پنجاب ملتان اور سندھ پر قابض ہو چکا تھا جہاں تک ہندوستان کی فرمانروائی کا تعلق ہے ہنوز دلی دوراست والا معاملہ تھا۔

پرتھوی راج چوہان، رائے پتھورا اور دہلی اور اجمیر کے راجاؤں نے طے کیا کہ وہ محمد غوری کی پیش قدمی میں مزاحم ہوں گے۔چنانچہ پرتھوی راج نے محمد غوری کے خلاف لشکر کشی کی۔ 1191ء میں تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر ترائن کے مقام پر دونوں لشکروں کی مٹھ بھیڑ ہوئی۔محمد غوری کے بازو پر گہرا زخم آیا۔اس زخم کی تاب نہ لا کر سلطان پلٹا اور اس کا خون تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اس کی قوت جواب دینے لگی اور قریب تھا کہ وہ گھوڑے کی پیٹھ سے گر جائے عین اس وقت ایک خلجی سپاہی نے سلطان کو سہارا دیا اور اسے میدان کارزار سے بسلامت نکال لے گیا مسلمان فوج مختلف سمتوں میں منتشر ہو گئی چالیس میل تک اس کا تعاقب کیا گیا اور اس کے بعد اس کا تعاقب ختم کیا گیا۔محمد غوری غزنی لوٹ گیا۔محمد غوری غزنی پہنچا تو اس نے ان تمام سرداروں اور سپاہیوں کو کڑی سزائیں دیں جو میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے تھے ان کی سرعام بے عزتی کی گئی اور انہیں شہر میں پھرا پھرا کر ذلیل کیا گیا ترائن میں ہزیمت اٹھانے کے بعد محمد غوری سوتا تو بے چین رہتا اور جاگتا تو سراپا اضطراب رہتا بعض مؤرخین کے قول کے مطابق وہ اس عرصہ میں نہ حرم گیا اور نہ چارپائی پر سویا۔بھاگنے والے تمام چیدہ سرداروں کے منہ پر بھوسے بھرے ہوئے توبڑے چڑھا کر انہیں شہر میں گھمایا۔آخر ایک سرد و گرم چشیدہ بزرگ نے کہا انہیں معاف کیجیے اور ان کی حوصلہ افزائی کیجیے۔سلطان محمد غوری نے اس بزرگ کے مشورہ پر عمل کر کے سب کو معاف کر دیا اور ان کو اپنے اپنے عہدوں پر بحال کر دیا۔1192ء میں اس نے غزنی سے کوچ کیا

اور یلغار کرتا ہوا ترائن کے قریب ڈیرے ڈال دیئے گھمسان کا رن پڑا۔ پرتھوی راج کی کمان میں کم وبیش ایک سو پچاس شہزادے مصروف پیکار تھے۔

محمد غوری نے بارہ ہزار گھڑ سواروں کی مدد سے ہندوؤں کی فوجوں پر جان پر کھیل کر یلغار کر دی اور ہندوؤں کے لشکر میں موت اور تباہی کے بگولے ناچنے لگے۔ گووندرائے نے میدانِ جنگ میں جان ہار دی۔ کھانڈارائے جس نے 1191ء میں سلطان کو میدانِ جنگ میں زخمی کیا تھا وہ بھی کھیت رہا۔ پرتھوی راج کا دل ٹوٹ گیا۔ اپنے ہاتھی سے اترا اور بھاگنے کی کوشش کی مگر موضع سرسوتی کے قریب گرفتار ہو گیا۔

ترائن کی دوسری لڑائی ہندوستان کی تاریخ میں ایک عہد آفرین واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے اس سے محمد غوری کی ہندوستانی ریاستوں پر قطعی کامیابی یقینی ہو گئی۔

اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمان اس قابل ہو گئے کہ سرسوتی صاحانہ کہرام اور بانسی پر بہت زیادہ دشواری اٹھائے بغیر قابض ہو گئے۔

پرتھوی راج کے ایک بیٹے کو اجمیر کا والی مقرر کیا گیا اور اس نے خراج دینا منظور کر لیا۔ ہندوستانی مقبوضات کو قطب الدین کی علمداری میں چھوڑ کر سلطان غزنی لوٹ گیا۔ مختصر سے عرصہ میں قطب الدین ایبک نے میرٹھ، کول اور دہلی کو فتح کر لیا۔ 1194ء میں سلطان محمد غوری نے قنوج پر لشکر کشی کی اور راٹھور حکمران نے بھی چوہان راجہ کی طرح شکست کھائی۔ جب دونوں لشکر مقابل میں آئے تو گھمسان کا رن پڑا۔ کفار اپنے لشکر کی کثرت اور مسلمان اپنی عالی حوصلگی کے باعث میدان میں جمے رہے۔ آخر کفار بھاگ نکلے اور فتح نے مومنین کے قدم چومے۔ ہندوؤں کا قتل عام وسیع پیمانے پر ہوا۔ سوائے عورتوں اور بچوں کے کسی کی جان بخشی نہ ہوئی۔

چھندواڑہ کی لڑائی میں جے چندر کی آنکھ میں تیر لگا جو اس کی جان لے کر ٹلا اور وہ ہاتھی سے مردہ ہو کر گر پڑا۔ سلطان نے اب آنسی کے قلعہ پر چڑھائی کی آنسی زیرِ نگیں آ گیا اور خزائن پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔

1197-98ء میں ایبک نے بدایوں پر قبضہ کر لیا۔

قنوج اور چھندواڑہ بھی دوبارہ زیرِ نگیں لائے گئے اس نے مالوہ کو بھی روند ڈالا۔

1202-03ء میں ایبک نے کالنجر پر چڑھائی کر دی اس طرح کالنجر، مہوبا اور کھجوراہو پر قبضہ

ہو گیا۔

ہندوستان میں جب اس طرح کے حالات کا دور دورہ تھا، محمد غوری کے ملک پر ترکوں نے ہلہ بول دیا۔ 1204ء میں آندخوند کے مقام پر اس کے قائم مقام کو وہ شکست ہوئی جس سے ہندوستان میں اس کی عسکری ساکھ برباد ہو کر رہ گئی۔ ہندوستان میں محمد غوری کے قتل ہو جانے کی افواہیں اڑ گئیں۔

1205ء کے اواخر میں محمد غوری اور ایبک کی مشترکہ فوجوں نے کھوکھروں کو دریائے جہلم اور دریائے چناب کے درمیان شکست فاش دی۔ کثیر تعداد میں کھوکھروں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس سے بھی زیادہ کو جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ جنگی قیدیوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ایک دینار کے بدلے پانچ قیدی بیچ ڈالے گئے۔ فروری 1202ء میں محمد غوری لاہور پہنچا اور غزنی مراجعت کرنے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تاکہ وہاں ترکوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھ سکے۔ بدقسمتی سے دوران سفر دھمیک ضلع جہلم کے مقام پر بعض شیعہ باغیوں اور کھوکھروں نے اسے مورخہ 15 مارچ 1206ء کو خفیہ طور پر قتل کر دیا۔ سلطان کی نعش کو غزنی لے جایا گیا جہاں اسے دفن کر دیا گیا۔ سر ڈبلیو ہنٹر کے بقول سلطان محمود غزنوی کی طرح محمد غوری کو اسلام کا بازوئے شمشیر زن تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ وہ عملی فاتح ضرور تھا اس کی دور دراز کی مہمات کی غایت مندر نہیں بلکہ دارالحکومت ہوتے تھے۔

محمد غوری کے زمانے سے لے کر 1857ء کی آفت تک دہلی کے تخت پر ہمیشہ مسلمان تاجدار ہی جلوہ افروز رہے۔ ہندوستان میں سلطنت اسلامیہ کا بانی ایک عظیم مسلمان فوجی جرنیل فاتح تھا۔ جس کے دم قدم کی برکت سے ساڑھے چھ سو سال سے زیادہ عرصہ مسلمان پورے برصغیر کے حکمران رہے۔ آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے۔ حالات کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ برصغیر میں سلطنت اسلامیہ کا بانی باطنی شیعوں کے ہاتھوں قتل ہوا اور برصغیر کا آخری مجاہد سلطان ٹیپو شہید بھی شیعہ سازشیوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔

❀..........❀..........❀

شیر شاہ سوری

شیر شاہ سُوری خاندان کا بانی تھا۔ شاندار فتوحات اور انتظامات کے لحاظ سے اُس کا شمار ہندوستان کے نامور بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اُس کا اصلی نام فرید خاں تھا۔

فرید خاں کا والد حسن خاں پٹھان سہسرام کا جاگیر دار تھا۔ وہ عین جوانی میں سوتیلی ماں کی زیادتیوں کے باعث باپ سے ناراض ہو کر جون پور چلا گیا۔ وہاں کا بادشاہ جمال خاں تھا۔ اُس نے اُسے اپنی خدمت میں لے لیا۔ فرید خاں کو علم کا از حد شوق تھا۔ چنانچہ وہ لکھائی پڑھائی میں مصروف ہو گیا اور تھوڑے سے عرصے ہی میں عربی، فارسی اور تاریخ میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔

حسن خاں بیٹے کے پیچھے جون پور گیا۔ جمال خاں نے باپ بیٹے میں صلح کرا دی۔ باپ نے ہونہار بیٹے کو اپنی جاگیر کا مختار بنا دیا۔ اُس نے جاگیر کا انتظام نہایت عمدگی سے سرانجام دیا اور باپ کی وفات پر خود مالک بن گیا۔

بہار کا والی سلطان محمود تھا۔ کچھ عرصے لیے فرید خاں نے اس کی ملازمت اختیار کر لی۔ ایک دن وہ بادشاہ کے ہمراہ شکار کھیلنے گیا۔ شکار گاہ میں ایک شیر نمودار ہوا۔ فرید خاں نے اُسے تلوار کے ایک ہی وار میں مار گرایا۔ سلطان محمود بے حد خوش ہوا۔ اُس نے اُسی وقت اُسے شیر خاں کا خطاب دے دیا۔

شیر خاں نے بہار سے واپس آ کر جنید برلاس کی نوکری کر لی۔ جنید برلاس مغلیہ خاندان کے بانی بابر بادشاہ کا ایک بڑا سردار تھا۔ مغلوں کے طور طریقے دیکھ کر شیر خاں اپنے دوستوں سے اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ مغل عیش میں ڈوبے پڑے ہیں اور آج کا کام کل پر ڈالنے کے عادی ہیں۔ اگر

پٹھان میرا ساتھ دیں تو میں مغلوں کو ہندوستان سے یوں نکال دوں جیسے مکھن سے بال۔

ایک روز بابر بادشاہ کے ہاں دعوت تھی۔ جنید برلاس کے ساتھ فرید خاں بھی کھانا کھانے گیا۔ وہاں کھانے کی کسی چیز کو کاٹنے کے لیے چھری کی ضرورت پڑی۔ دوسرے مہمان بھی چھری کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن شیر خاں نے اپنی تلوار ہی سے چھری کا کام لے لیا۔ بابر اُس کی اِس حرکت سے کھٹک گیا اور جنید برلاس سے ترکی زبان میں کہنے لگا۔ کہ مجھے یہ پٹھان خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ مَیں اُسے قید کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن جنید نے اُسے خلاف مصلحت سمجھ کر ہاں میں ہاں نہ ملائی اور اُس وقت بات آئی گئی ہو گئی شیر خاں ترکی زبان نہیں جانتا تھا۔ لیکن بابر کے چہرے مہرے سے تاڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے اور اُس کا بابر کے دربار میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ وہ راتوں رات بھاگ کر سہسرام پہنچ گیا اور وہاں سے بہار چلا گیا۔

شیر خاں نے بہار کے انتظامی کاروبار میں اتنا عمل دخل حاصل کر لیا۔ کہ جب سلطان محمود مرا تو وہ خود تخت پر قابض ہو گیا۔ سلطان محمود کے بیٹے جلال خاں نے بنگال کے بادشاہ نصرت شاہ سے امداد طلب کی۔ شیر خاں نے اُسے شکست دے کر بنگال پر بھی قبضہ کر لیا اور بنگال و بہار دونوں ملکوں کا خود مختار بادشاہ بن گیا۔ اس دوران میں بابر مر چکا تھا اور اُس کا بیٹا ہمایوں دہلی اور آگرہ کا بادشاہ تھا۔

بنگال اور بہار میں اچھی طرح قدم جما لینے کے بعد شیر خاں مغلیہ علاقوں پر چھاپے مارنے لگا۔ ہمایوں نے اُسے نیچا دکھانے کے لیے بنگال پر چڑھائی کی۔ لیکن دریائے گنگا کے کنارے شکست کھائی اور دریا میں کود کر جان بچائی۔ ایک سال بھی نہ گزرا تھا۔ کہ ہمایوں پھر بھاری فوجیں لے کر شیر خاں کے مقابلے کو نکلا۔ قنوج کے قریب لڑائی ہوئی۔ قسمت میں پھر شکست تھی۔ شیر خاں کو فتح نصیب ہوئی۔ ہمایوں ایران کی طرف بھاگ گیا۔ دہلی آگرہ اور پنجاب پر شیر خاں کا قبضہ ہو گیا۔ اُس نے دہلی کے تخت پر بیٹھ کر شیر شاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ اور اپنے شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا۔ پھر تین سال کے اندر اندر مالوہ اور مارواڑ کو بھی سَر کر لیا۔

آخر میں شیر شاہ نے کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ ایک دن قلعہ پر گولے برسائے جا رہے تھے ایک گولہ فصیل سے ٹکرا کر بارودی گولوں کے ایک ڈھیر میں واپس آپڑا۔ تمام گولے ایک دم بھڑک اُٹھے۔ قریب ہی شیر شاہ کھڑا تھا۔ اُس کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ وہ جھلس گیا اور بے

ہوش گیا۔ جب ہوش میں آتا تو لڑائی کا حال پوچھتا، آخر اِدھر قلعہ فتح ہوا۔ اُدھر شیر شاہ نے کہا کہ خداوند! تیرا شکر ہے اور دم توڑ دیا۔ اُس نے بہتر برس کی عمر پائی اور صرف پانچ سال سلطنت کی۔ اُس کا مقبرہ سہسرام میں ہے اور ہندوستان کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔

شیر شاہ محنت مشقت کا عادی تھا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ کام سے بھی اُسے عار نہ تھا۔ مہموں پر جاتے وقت ہر پڑاؤ پر وہ اپنے عارضی کیمپ کے اردگرد کچی چاردیواری ضرور بنوالیتا تھا۔ ایسے کچے قلعے بنانے میں وہ خود بھی عام سپاہیوں کے ساتھ پھاوڑا اور کدال چلاتا اور گارا مٹی ڈھوتا تھا۔

شیر شاہ کا عدل بہت مشہور ہے۔ اُس نے ملک میں جابجا کچہریاں بنائی ہوئی تھیں اور دیانت دار جج مقرر کیے ہوئے تھے۔ اُسے خود بھی انصاف کا بڑا خیال تھا۔ جب کوئی مظلوم دربار میں آجاتا تھا تو فوراً اُس کی فریاد سنتا اور ظالم کو سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتا تھا۔ انصاف کے معاملے میں وہ کسی کی رورعایت نہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گاؤں میں ایک قتل ہو گیا۔ پولیس نے تحقیقات میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن قاتل کا سراغ نہ لگا ہوتے ہوتے شیر شاہ کو بھی خبر ہوگئی اُس نے مقامِ واردات کے پاس پڑوس کے چودھریوں اور نمبرداروں کو بلا کر ڈانٹ بتائی کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ تمہارے علاقے میں دن دہاڑے قتل ہو جائے اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔ اگر قاتل کو پیش نہ کرو گے تو تمہارا زن و بچہ کولہو میں پلوا دیا جائے گا۔ چنانچہ بڑی دوڑ دھوپ اور چھان بین کے بعد گاؤں والوں نے اصل مجرم کو گرفتار کر کے سرکار کے حوالے کر دیا اور ظالم کو ظلم کی سزا مل گئی۔

شیر شاہ کو زراعت کی ترقی اور حفاظت کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ سلطنت کی تمام زمین کی ہر سال پیائش ہوتی تھی اور اُس کے مطابق زمینداروں سے لگان وصول کیا جاتا تھا۔ ساری سلطنت کو پرگنوں میں تقسیم کیا ہوا تھا اور ہر ایک پرگنے میں ایک قانون گو مقرر تھا۔ وہ سارے پرگنے کے زراعتی حساب کتاب کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اگر ضرورت سے مجبور ہو کر شاہی فوج کو بوئے ہوئے کھیتوں میں گزرنا پڑتا تھا تو کسانوں کو فصل کی قیمت ادا کر دی جاتی تھی۔ ورنہ زراعت کو نقصان پہنچانے والے کو سخت سزا ملتی تھی۔ ایک دفعہ کسی سپاہی نے ایک کھیت میں سے تھوڑا سا غلہ کاٹ لیا۔ شیر شاہ کو پتہ لگ گیا۔ اُس نے سپاہی کی ناک چھدوا دی۔ پھر کاٹا ہوا غلہ باندھ کر اُس کی چھدی ہوئی ناک میں لٹکا دیا اور دوسروں کی عبرت کے لیے اُسے سارے لشکر میں پھرایا۔

شیر شاہ کی طرف سے مناسب مقامات پر لنگر خانے جاری تھے۔ جہاں فقیروں، محتاجوں کو پکا پکایا کھانا مفت ملتا تھا۔ اندھوں، لنجوں، لنگڑوں، بے کس بوڑھوں اور بیواؤں کے روز ینے اور مہینے لگے ہوئے تھے اور طالب علموں کو سرکاری وظیفے ملتے تھے۔

لوگوں کی آمد و رفت کی سہولت کے واسطے شیر شاہ نے کئی سڑکیں بنوائی تھیں۔ اُن کے دونوں طرف سایہ دار درخت تھے۔ دو دو کوس پر سرکاری سرائیں تھیں۔ اُن میں ہندو مسلمانوں کے لیے الگ الگ مکان اور پانی کی سبیلیں تھیں۔ ہر سرائے میں ایک نقارہ اور دو ڈاک لے جانے والے گھوڑے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ جس وقت بادشاہ کھانا کھانے بیٹھتا تو نقارے پر چوٹ پڑتی۔ اُس کی آواز سے قریب کی سراؤں کے نقارچیوں کو اطلاع ہو جاتی تھی۔ وہ بھی نقارے بجا دیتے تھے اور اُس طرح تمام سراؤں میں نقارے بجتے چلے جاتے تھے اور شاہی حکم کے مطابق آدمیوں کو کھانا اور جانوروں کو دانہ مل جاتا تھا۔ غرض شیر شاہ نے اپنے تھوڑے سے زمانے میں بہت سے قابلِ یادکام کیے۔ اگر موت اُسے مہلت دیتی تو خدا جانے اور کیا کیا کر جاتا۔ وہ خود کہا کرتا تھا۔ کہ افسوس! مجھے شام یعنی بڑھاپے کے وقت بادشاہی ملی۔

❀............❀............❀

صدام حسین

اگر 1990ء کے اواخر اور 1991ء میں تا دمِ تحریر دنیا کے سب سے مقبول اور "رسوا" شخص کا نام پوچھا جائے تو جواب ایک ہی ہوگا۔ صدام حسین۔ عراق کے صدر۔

صدر صدام حسین کی زندگی اور شخصیت پر ان دنوں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ ذیل میں صدر صدام کی سوانح اور ذات کے بعض ایسے گوشوں کو بھی سامنے لایا جا رہا ہے جو اس سے پہلے سامنے نہیں آسکے۔

صدام حسین 28 اپریل 1937ء کو ایک انتہائی نادار، قلاش اور بے زمین کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ بغداد سے شمال کی طرف سو میل کے لگ بھگ فاصلے پر دریائے دجلہ کے پاس تیکری قصبہ واقع ہے جس کے ایک گاؤں العوبہ میں صدام حسین نے جنم لیا۔ تیکری کا یہ قصبہ سُنی اقلیت میں ہے۔ انیسویں صدی میں تیکری کا قصبہ ایک خوشحال قصبہ تھا جہاں مویشیوں کی کھالوں سے مشکیزے تیار کیے جاتے تھے۔ کشتیوں میں کام آنے والے چمڑے کے سامان کو بھی یہاں ہنر مند تیار کرتے تھے اور ان کی خاصی مانگ تھی، لیکن بدلتے زمانوں میں جہاں ان چیزوں کی مانگ کم ہوتی چلی گئی تو اس قصبے کی خوشحالی بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ جس زمانے میں صدام حسین نے اس علاقے میں آنکھ کھولی اس وقت یہ علاقہ ناداری اور مفلسی کا گڑھ بن چکا تھا۔

قصبے سے باہر بسنے والی دنیا کے ساتھ مواصلاتی ربط بہت دشوار اور مشکل ہو چکا تھا۔ وہ سڑک جو کبھی اس علاقے میں تعمیر ہوئی تھی اس کی حالت خستہ اور ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ راستے کچے تھے۔ لوگ جن گھروں میں رہتے تھے وہ گھر نہیں جھونپڑے تھے جو گارے اور سرکنڈوں سے تیار

کیے جاتے تھے، اور صدام حسین بھی ایسے ہی گارے اور سرکنڈوں کے بنے ہوئے جھونپڑے میں رہتے تھے۔ کھانا پکانے کا ایندھن مویشیوں کا گوبر تھا۔ العوبہ گاؤں یا قصبے تکریی میں کسی گھر میں بجلی تھی نہ تازہ پانی یا کوئی پانی کا نل۔ بغداد کی مرکزی حکومت دُور افتادہ تھی اور اقتدار و حکومت کی یہاں صرف ایک علامت دکھائی دیتی تھی۔ کچھ مقامی پولیس کے سپاہی جو علاقے کے دوسرے لوگوں کی طرح ہی خستہ حال تھے۔

صدام کی زندگی کے اوائلی دَور یعنی بچپن کے بارے میں زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں۔ سرکاری سوانح نگاروں کی فراہم کردہ معلومات پر زیادہ انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ صدام حسین کے والد کا انتقال یا تو صدام حسین کی پیدائش سے پہلے یا پیدائش سے چند ماہ کے بعد ہوا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صدام حسین کے والد نے اپنے کم سن بچوں اور بیوی کو چھوڑ دیا تھا اور کہیں غائب ہو گیا تھا۔ بہرحال سچائی کیا ہے اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال صدام حسین کے والد کے بعد اس کی والدہ نے ابراہیم حسین نامی ایک شخص سے شادی کر لی۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور صدام حسین کی والدہ سے شادی کرنے سے پہلے اس نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا تھا۔

صدام حسین کا یہ سوتیلا والد ایک کھردرا، ظالم اور چٹا اَن پڑھ شخص تھا۔ جو صدام حسین کو شدید ناپسند کرتا تھا اور ہر وقت اسے ڈانٹتا کوستا اور گالیاں دیتا رہتا تھا۔ بہت سالوں کے بعد خود صدام حسین نے ان دنوں کی تلخ یادوں کو دہراتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اسے صبح سویرے گھسیٹ کر بستر سے اُٹھا دیتا۔ اسے گالیاں دیتا اور بھیڑوں کی نگرانی کے لیے بھیج دیتا۔ ابراہیم حسین کی اپنی دوسری بیوی صدام حسین کی والدہ سے صدام حسین کی وجہ سے اکثر لڑائی اور تلخ کلامی کرتی رہتی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ وہ کتے کا بچہ ہے۔ مَیں اسے بالکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ سوتیلا باپ صدام حسین سے عجیب وغریب کام کرواتا تھا۔ وہ صدام حسین کو مجبور کر دیتا کہ وہ پڑوسیوں اور دوسرے لوگوں کی مرغیاں اور بھیڑیں چوری کر کے لائے جنہیں وہ سستی قیمت پر بیچ دیا کرتا تھا۔ جب صدام کا کزن عدنان خیراللہ سکول جانے لگا تو صدام حسین نے بھی ضد شروع کر دی کہ اُسے سکول بھیجا جائے۔ لیکن اس کا سوتیلا باپ صدام حسین کو تعلیم دلوانے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صدام ساری عمر بھیڑیں چراتا رہے، لیکن صدام حسین کے مضبوط ارادے، قوتِ برداشت اور حالات کا مقابلہ

کرنے کا پہلا ثبوت اس کامیابی سے ملتا ہے جو اُسے 1947ء میں حاصل ہوئی۔ جب اس کی عمر دس سال تھی اور اُس نے اپنے سوتیلے باپ کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے تعلیم حاصل کرنے دے۔

عدنان خیر اللہ کا باپ صدام حسین کی والدہ کا بھائی اور صدام حسین کا ماموں تھا۔ وہ بغداد کے ایک سکول میں ٹیچر تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے صدام حسین کو اپنے ماموں خیر اللہ کے پاس بغداد جانا پڑا اور اس نے اس کے پاس ہی قیام کیا۔

خیر اللہ خود ایک دلچسپ کردار تھا کئی برس پہلے اُسے عراقی فوج سے اس الزام میں نکال دیا گیا تھا کہ اس نے نازیوں کے حق میں کی جانے والی 1941ء کی فوجی بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ برطانیہ نے اس بغاوت کو کچل دیا تھا لیکن خیر اللہ کے دل کو ہمیشہ کے لیے برطانیہ کے خلاف نفرت کی آماجگاہ بنا دیا۔ یہ خیر اللہ بعد میں بغداد کا میئر بنا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صدام حسین اپنے ماموں سے بہت متاثر تھا اور اُس کے افکار و نظریات کے اثرات صدام حسین پر ہمیشہ بھرپور رہے۔

سولہ برس کی عمر میں صدام حسین نے ثانوی درجے کے سکول کی تعلیم مکمل کر لی۔ اپنے ماموں کی طرح صدام حسین بھی ایک فوجی افسر بننے کا خواہاں تھا لیکن امتحان میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی وہ نمبروں کے اعتبار سے بغداد ملٹری اکیڈمی کے معیار سے بہت کم تھی اس لیے صدام حسین کو فوجی اکیڈمی میں داخلہ نہ مل سکا۔

عراق پر پچاس کے عشرے کے بعد جو لوگ حکمران ہوئے وہ سب فوجی تھے، سوائے صدام حسین کے۔ تاہم صدام حسین نے کم عمری میں ہی اپنے طور پر نشانہ بازی میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ 1976ء میں صدام حسین نے اپنے آپ کو لیفٹیننٹ جنرل کا عہدہ دیا تھا۔ جو چیف آف سٹاف کے عہدے کے برابر تھا، اور جب 1979ء میں صدام حسین عراق کا صدر بنا تو اُس نے اپنے آپ کو ترقی دے کر فیلڈ مارشل کے عہدے تک پہنچا دیا۔ یہ حقیقت پوری دنیا پر آشکار ہے کہ ایران کے خلاف جنگ میں صدام حسین نے خود کمان سنبھالی اور امریکی اور اس کے حلیفوں کے خلاف لڑائی بھی براہِ راست اپنی کمان کے ذریعے لڑی۔

بغداد میں صدام حسین کا قیام اپنے ماموں خیر اللہ کے اس معمولی سے گھر میں رہا جو دریائے دجلہ کے مغربی کنارے کے قریب واقع تھا اور یہاں کی آبادی نچلے طبقے کے افراد پر

مشتمل تھی۔

طالب علمی کے زمانے میں صدام حسین کو عرب دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کا علم ہوا۔ 1952ء میں جمال الناصر نے مصر میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ اُلٹا۔ 1956ء میں نہر سویز کو قومیا لیا گیا اور فرانس، برطانیہ اور اسرائیل نے مصر پر چڑھائی کر دی۔ ناصر فاتح رہا اور عرب قوم پرستی کا جو بیج بویا گیا تھا وہ پروان چڑھنے لگا۔ صدام حسین اپنے نصاب سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لینے لگا۔ عراق میں بادشاہت کے خلاف جو مظاہرے ہوئے صدام حسین نے بھی ان میں حصہ لیا۔ صدام حسین کی عمر بیس برس تھی جب وہ بعث پارٹی کے رُکن بنے اور یہ ان کی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ بعث پارٹی ایک انقلابی قوم پرستوں کی جماعت تھی جو عرب دنیا میں تیزی سے منظم ہو رہی تھی، البتہ عراق میں ابھی یہ بہت چھوٹی جماعت تھی جس کے اُس وقت صرف تین سو ارکان تھے۔

1957ء میں جنرل عبدالکریم قاسم نے عراق میں شاہ فیصل دوئم کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ عبدالکریم قاسم کا بعث پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاہی حکومت کے خاتمے کے بعد عراق کی متصادم سیاسی جماعتوں میں اقتدار کے حصول کے لیے سازشوں اور کشمکش کا آغاز ہوا۔ بعث پارٹی نے مشین گنوں کے ذریعے جنرل عبدالکریم قاسم کو قتل کر کے اقتدار پر قبضے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ وہ ٹیم جس نے عبدالکریم قاسم کو قتل کرنے کے لیے گولیاں برسائیں ان میں صدام حسین بھی شامل تھا۔ یہ کوشش ناکام رہی۔

کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے صدام حسین نے ایسی ہی ایک واردات میں ایک شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ جو خود صدام حسین کا بہنوئی تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا بہنوئی کمیونسٹ تھا اور عراق کے نئے فوجی صدر عبدالکریم قاسم کا حمایتی تھا۔ سیاسی بحث میں وہ صدام کے ماموں خیر اللہ سے اُلجھ گیا۔ خیر اللہ نے صدام کو اکسایا کہ وہ اسے قتل کر دے۔ صدام نے اپنے ماموں کی ہدایت پر عمل کیا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس واردات کی وجہ سے صدام اور خیر اللہ کو گرفتار بھی کیا گیا لیکن بعد میں کسی مقدمے بازی کے بغیر چھوڑ دیا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جنرل عبدالکریم قاسم کو قتل کرنے کی کوشش میں جوابی کارروائی کے نتیجے میں صدام حسین شدید زخمی ہوا۔ اس کی ٹانگ میں ایک گولی لگی۔ صدام حسین نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ وہ بلیڈ سے ٹانگ چیر کر گولی نکال دے۔ ساتھی نے اس مشورے پر عمل کیا صدام حسین

آپریشن کے دوران بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد صدام حسین نے بہروپ بھرا اور ایک بدو قبائلی بن کر دریائے دجلہ کو عبور کیا۔ ایک گدھا چوری کیا اور شام کے صحرا میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری صورت میں وہ پکڑا جا سکتا تھا اور سخت سزا کا مستوجب ٹھہرتا۔

کچھ حلقوں کا دعویٰ ہے کہ صدام حسین معمولی زخمی ہوا تھا اور وہ ملک سے کسی دقت کے بغیر فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ بہروپ وغیرہ بھرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شام سے صدام حسین نے قاہرہ (مصر) کا رُخ کیا۔ جہاں وہ چار برس ٹھہرا رہا۔ مصری حکومت اس کے اخراجات برداشت کرتی تھی۔ صدام حسین کی سیاسی سرگرمیاں مصر میں بھی جاری رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی سرگرمیوں کے نتیجے میں وہ قاہرہ میں دو بار گرفتار بھی کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار صدام حسین سیاسی اختلاف کی بناء پر اپنے ایک طالب علم ساتھی کے تعاقب میں مصر کے بازاروں تک جا نکلا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ وہ ساتھی کسی طرح بچ گیا اور بعد میں اُردن کا وزیرِ اطلاعات بھی بنا۔

صدام حسین نے مصر پہنچ کر قاہرہ یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں داخلہ لے لیا تھا۔ لیکن وہ قانون کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں 1970ء میں بغداد یونیورسٹی نے اسے اعزازی طور پر قانون کی اعزازی ڈگری سے نوازا تھا۔

قاہرہ میں ہی صدام حسین کی شادی ہوئی۔ 1963ء میں اس نے اپنے ماموں خیر اللہ کی بیٹی ساجدہ کو اپنا شریکِ حیات بنا لیا۔ صدام کو مصر میں اپنی تعلیمی مصروفیات کو یکدم ختم کرنا پڑا کیونکہ عراق میں جنرل قاسم کو بعث پارٹی نے قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ صدام تیزی سے عراق پہنچا۔ اب وہ انقلاب میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اس وقت صدام کی عمر چھبیس برس تھی۔ نئی حکومت نے انہیں فوراً ایک اہم عہدہ سونپ دیا۔ قصر النہایہ میں ایک تفتیشی مرکز کھولا گیا تھا۔ صدام حسین کو تفتیشی افسر کا عہدہ سونپا گیا۔ نو ماہ بعد نومبر 1963ء میں بعث پارٹی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ بعث پارٹی میں بھی دھڑے بندی شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت صدام حسین نے بڑی ذہانت کا مظاہرہ کیا اور اپنے آپ کو ہر طرح کے نقصان سے بچائے رکھا۔

عراق۔۔۔فوجی طاقت

7 جون 1981ء کو جب اسرائیلی طیاروں نے عراق کے ایٹمی ری ایکٹر پر بمباری کی

اور یہ ''مشن'' اسرائیلی طیاروں نے سعودی عرب کے فضائی راستے سے گزر کر مکمل کیا تو عراق کے صدر صدام حسین کو کئی اہم فیصلے کرنے پڑے۔ عراق ایران جنگ جاری تھی جب اسرائیل کے وزیرِ اعظم بیگن نے بغداد کے قریب واقع عراقی ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کر کے فخر و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''جیسے سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں بالکل صحیح کام کرتی ہیں یہ مشن بھی اسی طرح پوری صحت کے ساتھ مکمل ہوا۔

اسرائیل کا عراق ایٹمی ری ایکٹر پر حملہ

عراق کے ایٹمی ری ایکٹر پر اسرائیلی طیاروں کی بمباری نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ امریکہ کو بھی اسرائیل کے اس اقدام کی مذمت کرنی پڑی۔ اقوامِ متحدہ میں اسرائیل کے خلاف قراردادیں منظور ہوئیں۔ فرانس بطور خاص بہت مشتعل ہوا کیونکہ اس کا ایک انجینئر اس حملے میں مارا گیا تھا۔ لیکن فرانس کا یہ احتجاج اور اشتعال دراصل ایک ڈرامہ تھا، کیونکہ اسرائیل نے اپنے اس مشن کے بارے میں اگر کسی ملک کو اعتماد میں لے لیا تھا تو وہ صرف فرانس تھا۔ فرانس کے سوشلسٹ صدر متراں کو پیشگی اس حملے کی اطلاع دی گئی تھی اور صدر متراں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

اسرائیلی حملہ کے بعد صدام کا عزم

صدر صدام حسین نے اسرائیلی مشن اور عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ وقتی طور پر وہ یہ ذلت برداشت کر گئے لیکن مستقبل کے لیے انہوں نے تیزی سے منصوبہ بندی کی اور عراق کو ایک بڑی فوجی طاقت بنانے کا پختہ عزم کر لیا۔

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی کے بعد سعودی عرب نے شاید اپنی خفت مٹانے کے لیے یہ پیش کش کی کہ سعودی عرب ایٹمی ری ایکٹر کی مرمت اور تعمیر کے لیے عراق کو مالی امداد فراہم کرے گا لیکن سعودی عرب کی حکومت نے اپنا یہ وعدہ کبھی ایفا نہ کیا۔

صدر صدام حسین نے اُس زمانے میں ایک فیصلہ کیا کہ اب عراق اپنی فوجی تنصیبات کے تحفظ کے لیے کسی غیر ملک پر انحصار نہیں کرے گا۔ بڑی فوجی طاقت بنے گا اور اپنے بل بوتے

پر بنے گا۔ عراق نے اپنی کیمیاوی اور بیالوجیکل اور دوسرے ہتھیاروں کے تحفظات کے لیے خود انتظام کیے کہ اب انہیں دنیا کی کوئی فوج تباہ نہ کر سکے۔ صدر صدام حسین نے ایک طویل المیعاد منصوبے پر عمل کا آغاز کیا جس کا مقصد نہ صرف ہتھیار حاصل کرنا تھا بلکہ ایسے میٹریل اور ٹیکنالوجی کا حصول بھی تھا جن سے عراق خود تباہ کن ہتھیاروں کو تیار کر سکے۔ ڈمی کارپوریشنیں اور مصنوعی برائے نام ٹریڈنگ ایجنسیاں قائم کی گئیں۔ خفیہ ترین طریقے سے کام شروع ہوا۔ عراق ایران جنگ کے زمانے میں بھی عراق بڑی تندہی سے اپنے اس خفیہ منصوبے کی تکمیل میں مصروف رہا۔

1981ء کے اسرائیلی حملے کے بعد سے دس سال سے بھی کم عرصے میں عراق اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچنے میں بہت حد تک کامیاب ہو گیا۔ سٹاک ہام انٹرنیشنل پیس ٹیوٹ کی اطلاع کے مطابق عراق نے 1984ء میں اسلحے اور ہتھیاروں وغیرہ کی خریداری پر 14 بلین ڈالر خرچ کیے۔ ایک ماہر انتھونی ایچ کورڈسمن کی اطلاع کے مطابق 1982ء سے 1989ء تک عراق نے 27.3 بلین ڈالر کا اسلحہ اور ہتھیار خریدے جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے علاوہ بھی عراق نے اسلحہ اور ہتھیار، ٹیکنالوجی اور میٹیریل حاصل کیا، جس کی لاگت کا کسی کو اندازہ نہیں ہے۔

ایران عراق جنگ جو اگست 1988ء میں ختم ہوئی، اس کے بعد بھی عراق اسلحے اور ہتھیاروں کی خریداری میں مصروف رہا۔ ایک اندازے کے مطابق گزشتہ پانچ برسوں میں عراق اسلحہ امپورٹ کرنے والے ملکوں میں سرفہرست تھا۔ یہ اسلحہ عراق نے روس، چین اور مغربی یورپ کے مختلف ملکوں سے خریدا۔ فرانس نے 1988ء تک عراق کو 12 بلین ڈالر کا فوجی سامان فراہم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عراق ایران جنگ کے خاتمے کے بعد عراق فوجی اعتبار سے مزید مستحکم اور طاقتور ہوا۔ عراق نے صرف اسلحہ اور ہتھیار ہی نہیں خریدے بلکہ ٹیکنالوجی کے حصول کے بعد اُس نے بہت سے ایسے ہتھیار جو خریدے تھے ان میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ ان کی کارکردگی زیادہ بہتر اور مؤثر ہو گئی۔

سوویت سکڈ میزائل میں ترمیم و اضافے کے بعد عراق نے ''العباس'' نامی میزائل تیار کیے۔ 1987ء میں ''الحسین'' کے نام سے ایک اور سکڈ میزائل کا تجربہ کیا گیا جو چار سو میل کے ہدف تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دسمبر 1989ء میں عراق نے ایک اور نئے میزائل بُوسٹر کا تجربہ کیا جس کا نام ''العابد'' رکھا گیا تھا۔

اسرائیلی انٹیلی جنس نے عراق کے ان تجربوں کی نوعیت کو وقت پر بھانپ لیا تھا۔حتیٰ کہ کویت پر عراقی حملے سے پہلے اسرائیلی وزیرِ دفاع موشے آرمینز نے امریکی وزیرِ دفاع رچرڈ چینی کو ان ساری معلومات سے آگاہ کیا تھا۔اسرائیل سمجھتا تھا کہ یہ ساری تیاریاں عراق اس کے خلاف کررہا ہے۔کویت پر حملے کا خیال ابھی اسرائیلی انٹیلی جنس کو بھی نہیں آیا تھا۔

صدر صدام حسین جانتا تھا کہ اگرچہ عالمی منڈیوں سے اسلحہ اور ہتھیار، مطلوبہ ٹیکنالوجی اور میٹیریل کا حصول بہت دشوار ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس ٹیکنالوجی کے مختلف حصے اور ان کے اجزاء اگر پیسے اور عقل ہو تو سرمایہ دار ملکوں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں، جو پیسے اور منافع کے لیے ہر اصول کو توڑ سکتے ہیں۔اسلحے کو مزید مؤثر بنانے اور مزید اسلحے کی پیداوار کے لیے صدر صدام نے اسلحہ ساز پلانٹ قائم کیے۔موصل کا پلانٹ 200 ملین ڈالر سے بھی زیادہ اخراجات سے مکمل ہوا۔عراقی سائنسدانوں نے کیمیاوی ہتھیار اور اسلحہ بھی تیار کرنا شروع کردیا۔بہت سے یورپی ملکوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عراق ایٹم بم بنانے کے لیے بھی بہت حد تک کامیاب پیش رفت کرچکا ہے۔

عراق میں اسلحہ سازی کے سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی اس سلسلے میں ایک برطانوی انجینئر کرسٹوفر کرالی کا بیان بہت اہم ہے۔(برطانیہ میں اس انجینئر کے خلاف مقدمہ بھی چل رہا ہے کہ اس نے اسلحہ سازی کے لیے عراق کے ساتھ تعاون کیوں کیا تھا)۔

”عراق میں اسلحے وغیرہ کی تیاری کے لیے جو پلانٹ تعمیر ہوئے اور تحقیقی امور کے لیے جو سہولتیں فراہم کی گئیں اس کی مثال یورپ کے ملک بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔“

عراق میں صدام حسین نے کئی انجینئرنگ ورکشاپس قائم کیں۔راکٹ پلانٹ بنایا۔ ان کاموں پر ایک اندازے کے مطابق لگ بھگ 400 بلین ڈالر خرچ ہوئے۔کیمیاوی ہتھیاروں اور اسلحے کے تجربات سے بھی مغربی دنیا بخوبی آگاہ ہے۔امریکی سی آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل نے بھی تصدیق کی کہ عراق پلاسٹک میزائل خود تیار کررہا ہے۔ایک اور امریکی ماہر نے اپنی رپورٹ میں بتایا تھا کہ ”عراق کیمیاوی ہتھیاروں اور اسلحے کی تیاری کے لیے جس پروگرام پر عمل کر رہا ہے، تیسری دنیا میں یہ سب سے بڑا اور موثر پروگرام ہے۔“

امریکی ماہر کورڈسمین کا تجزیہ ہے کہ ”عراق نے یہ ٹیکنالوجی مختلف اجزاء کی صورت میں

مغربی جرمنی، سوئٹرز لینڈ، فرانس، ڈنمارک، بیلجیئم اور اٹلی کی تجارتی فرموں سے حاصل کی۔"

امریکی اور مغربی ملکوں کے فوجی ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ کیمیاوی ہتھیاروں اور اسلحے کی صورت میں عراق جتنی استعداد اور قوت کا مالک بن گیا ہے اسے فضائی حملوں کی صورت میں بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

بیالوجیکل اسلحے اور ہتھیاروں کے سلسلے میں بھی عراق بہت کام کر چکا ہے۔ ان ہتھیاروں اور اسلحے کے ذریعے مخالف اور دشمن ملکوں پر مختلف مہلک جراثیم اور بیماریاں مسلط کر کے انہیں تباہ کیا جا سکتا ہے۔ انتہائی مصدقہ ذرائع کا کہنا ہے کہ ایسے ہتھیاروں کی تیاری کے لیے عراق نے بہت تگ و دو کی اور امریکہ سے بھی ضروری میٹیریل اور ٹیکنالوجی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ عراق یہ سب کچھ کرنے پر اس لیے مجبور ہوا کہ اسرائیل نے اس کا ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر کے اسے شکست و ذلت سے دوچار کیا تھا۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ عراق ہر حال میں اسرائیل کے مقابلے میں کمتر رہنا نہیں چاہتا جبکہ اسرائیل بھی مہلک کیمیاوی ہتھیاروں اور اسلحے کی تیاری میں بڑی کامیابیاں حاصل کر چکا ہے اور اسے امریکہ کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔

صدر صدام حسین نے اپنے مقاصد کی تکمیل اور عراق کی فوجی برتری کے لیے طویل المیعاد منصوبہ بندی کی اور اپنے ہدف کے حصول کے لیے کسی قسم کی کوتاہی یا غفلت کو برداشت نہیں کیا۔ دنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں ڈمی کمپنیوں اور کارپوریشنوں کے ذریعے کاروبار ہوا۔ بین الاقوامی تجارتی قوانین کو بھرپور انداز میں استعمال کیا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ عراق ایران جنگ کے باوجود صدر صدام حسین کی حکمت عملی کی وجہ سے عراق مضبوط ترین فوجی قوت بنتا گیا۔

لیکن مشرق وسطیٰ میں سامراج کے خلاف ایک توانا آواز کو پھانسی کے ذریعے خاموش کر دیا گیا، لیکن اس کی گونج تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی۔ صدام کا وجود تو قبر میں اتر چکا ہے لیکن وہ استحصالی قوتوں کے خلاف علامت کے طور پر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ صدام حسین کی شہادت کے بعد اب تک ہمارا میڈیا ادھورے سچ اور مکمل جھوٹ کی شکل میں بہت کچھ چھاپ چکا ہے جس کو پڑھنے کے بعد عام قاری کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ سرمایے کے مفادات سے جڑی ہوئی صحافت کا سب سے بڑا روگ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ قارئین کو روزانہ کثیر تعداد میں اخبارات

فراہم کرتی ہے۔قارئین پڑھتے ہیں اور سر ٹکراتے ہیں لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔یوں ان کا پیسہ اور وقت دونوں برباد کیے جاتے ہیں لیکن اس کے بدلے انہیں کوئی ویژن، نظریہ یا سوچ نہیں ملتی بلکہ صحافت اور ادب کے نام پر معلومات کی بھول بھلیوں میں پھنسائے رکھا جاتا ہے۔حالانکہ دنیا میں وقوع پذیر تبدیلیوں کے تناظر میں قوم کو درست نظریے اور لائحۂ عمل تک پہنچانے میں اخبارات اہم کردار ادا کرتے ہیں جو ہمارے ہاں کبھی نہیں ہوا۔1990ء سے لے کر 2006ء صدام حسین کی شہادت تک ہمارے عوام تو صدام حسین کی جرأت، بہادری اور شجاعت کی داد دیتے رہے ہیں لیکن سیاسی و مذہبی جماعتوں کے قائدین نے ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کیے رکھی ہے کہ کہیں امریکہ بہادر اور اس کے اتحادی بُرا نہ مان جائیں۔عراق کے لیے صدام حسین کی شہادت اور مشرقِ وسطیٰ میں موجود بے چینی کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک مندرجہ ذیل حقائق کی تہہ تک نہ پہنچا جائے:

i) مشرقِ وسطیٰ سے برطانوی استعمار کے انخلا کا پس منظر
ii) مشرقِ وسطیٰ کے تیل پر للچائی ہوئی سامراجی نظریں
iii) بعث پارٹی کی تاریخ
iv) صدام حسین کی شخصیت، طرزِ فکر اور خیالات
v) مشرقِ وسطیٰ میں عالمی طاقتوں کے مفادات اور سازشیں

کسی بھی قوم کی ترقی اور تنزل دنوں میں وقوع پذیر نہیں ہوتے بلکہ اس پر کئی سالوں کی تاریخ اور خطے کے معاشی اور سماجی حالات اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں۔عراق دنیا کی سب سے قدیم اور عظیم الشان تہذیب کا مخزن اور منبع ہے۔ جہاں سب سے پہلے انسانی تہذیب نے جنم لیا تھا۔ چھ ہزار برس قبل آج کے بغداد کے جنوبی پہلو میں بسنے والی سمیری تہذیب نے دنیا میں پہلی بار فنِ تحریر کو وجود بخشا، انسانیت کو پہلا شہری کلچر دیا اور انتظامیہ کے ذریعے منظم نظامِ سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی۔

دنیا بھر کی قومی تحریکات نے جب برطانوی استعمار کو اپنا بوریا بستر لپیٹنے پر مجبور کر دیا تو اس نے اپنے اقتدار کی بساط لپیٹتے لپیٹتے دنیا کے طبعی جغرافیے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ یہ جغرافیائی تبدیلیاں اس نے اپنی آئندہ حکمت عملی کے تناظر میں کی تھیں کہ اسے کس خطے میں کیا کام کرنے

ہیں، کس طرح دنیا کے وسائل سے فائدہ اٹھانا ہے، کس ملک میں کن خاندانوں کو مسندِ اقتدار پر بٹھانا اور آئندہ کی جنگیں دشمنوں سے کیسے لڑنی ہیں۔ جغرافیے کی اِن تبدیلیوں میں انہوں نے مذہب، قانون، اخلاق اور ان ملکوں کے قومی مفادات کا قتلِ عام کیا اور صرف مستقبل کے اپنے سامراجی مفادات کو ہی پیشِ نظر رکھا۔ استعمار کی اس گھناؤنی سازش کا شکار مشرقِ وسطیٰ کا جغرافیہ بھی ہوا۔ اِسی تناظر میں ہم صدام حسین کے عدالتی قتل اور عراق کی موجودہ صورتِ حال کا درست تجزیہ کر سکتے ہیں۔

موجودہ عراق کی سرحدوں کا تعین رسوائے زمانہ سائیکس پیکوٹ معاہدہ 1914ء کے تحت کیا گیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ پر انگلستان اور فرانس نے مفتوحہ علاقوں کی بندر بانٹ اسی معاہدے کے ذریعے کی تھی۔ جنگِ عظیم کے بعد عثمانی حکومت کے تین صوبوں بغداد، بصرہ، اور شمالی حصے میں واقع موصل کو ملا کر عراق کی موجودہ شکل قائم کی گئی۔ عراق کے ساتھ ایران کے سوا باقی تمام سرحدیں مصنوعی ہیں۔ ایران عراق سرحد گزشتہ ڈھائی سو سال سے قائم ہے۔ ایران اور سلطنتِ عثمانیہ کے درمیان بھی یہی سرحد تھی جبکہ عراق کے گردونواح میں دوسری سرحدیں جو کویت، سعودی عرب، اُردن اور شام سے ملتی ہیں وہ محض ریت پر کھینچی ہوئی سامراجی لکیریں ہیں، جو انہوں نے اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کھینچی ہیں، جنہوں نے خطے میں بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے اور اس کی وجہ سے لگنے والی آگ میں آج مشرقِ وسطیٰ جل رہا ہے اور سامراج اس سے گرمیِ بدن کا سامان پیدا کر رہا ہے۔

عراق میں 1917ء تک سلطنتِ عثمانیہ کے اقتدار کا مکمل خاتمہ ہو گیا تھا۔ جنگِ عظیم کے خاتمہ تک پورے عراق پر برطانیہ کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ 1920ء میں اتحادی طاقتوں کا اٹلی میں ایک اجلاس ہوا جس میں مفتوحہ علاقوں کی بندر بانٹ کو عملی شکل دی گئی۔ جب یہ اعلان ہوا کہ عراق برطانوی تولیت میں دیا جائے گا تو عراق میں سخت ردِ عمل کی تحریک شروع ہو گئی۔ مقامی شیعہ سُنی آبادی نے مل کر جدوجہد کرنا شروع کر دی۔ اس تحریکِ آزادی کو برطانیہ نے اپنی فوجی طاقت سے کچل کر سعودی عرب کے کٹھ پتلی حکمران شریفِ مکہ (جسے انگریزوں نے ترکی کے خلاف استعمال کیا) کے بیٹے امیر فیصل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ 1963ء میں بعث پارٹی نے عراق میں انقلاب برپا کیا اور اسے امریکہ کے اثر سے نکال کر ایک آزاد اور خود مختار ملک کا تشخص دیا۔ بعث

پارٹی کے انقلاب سے پہلے عراق امریکہ کے تابع تھا۔ 1954ء میں عراق نے امریکی امداد قبول کی تھی اور فروری 1955ء میں بغداد پیکٹ میں شامل ہوا تھا، جس کا خالق امریکہ تھا۔ اس معاہدے کے تحت ترکی، ایران، پاکستان اور امریکہ کے درمیان مشترکہ دفاع اور تعاون کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ لیکن بعث پارٹی نے عراق کو امریکہ کے اثر سے نکال کر آزاد ملکوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

مشرقِ وسطیٰ میں سامراجی اثر و نفوذ کی بڑی وجہ یہاں پایا جانے والا تیل ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس بات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ کویت، سعودی عرب اور عراق ان تینوں ملکوں میں دنیا کے تیل کے چالیس فیصد ذخائر موجود ہیں۔ یورپ اور امریکہ سمجھتے ہیں کہ اگر تیل پیدا کرنے والے علاقوں پر ان کی گرفت نہ رہی تو ان کی ترقی کا عمل رُک سکتا ہے کیونکہ یورپ اور امریکہ کی ساری صنعتی ترقی تیل کی خوراک پر زندہ ہے۔ اس لیے عالمی سامراجی طاقتوں کی رالیں ہمیشہ تیل پر ٹپکتی رہی ہیں۔ 1927ء میں عراق سے تیل نکلنا شروع ہوا جس کی مقدار ایک لاکھ بیرل تھی۔ 1929ء میں برطانیہ نے عراق سے تیل نکالنے والی کمپنی پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ اس کے بعد امریکن اور برطانوی کمپنیوں کے درمیان تیل کی کشمکش رہی اور مشرقِ وسطیٰ ان کی سامراجی سازشوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ جب ایران سے برطانوی کمپنی کی تیل پر اجارہ داری ختم ہوئی تو دوسری سامراجی طاقتوں یعنی امریکہ وغیرہ کے کان کھڑے ہو گئے کہ اگر برطانیہ کو نکالا جا سکتا ہے تو دوسرے ملک بھی تیل کو قومی تحویل میں لے سکتے ہیں لہٰذا جنوری 1953ء کو امریکی قومی سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں اس مسئلے پر غور و فکر کیا گیا۔ جو امور طے ہوئے وہ یہ تھے کہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو مغربی اور امریکی طاقتوں کا مطیع ہونا چاہیے۔ تیل کی پیداوار اور قیمتوں کے تعین پر بھی انہی ملکوں کی گرفت ہونی چاہیے اور دوسری اہم حکمتِ عملی یہ طے پائی کہ ان ملکوں کی سیاسی وفاداریاں بھی امریکہ اور مغربی ملکوں کے ساتھ گہری اور مستحکم ہونی چاہئیں۔ امریکہ میں یہ پالیسی بنائی گئی کہ تیل اور امریکہ دونوں کے درمیان ربط و تعلق گہرا، قریبی اور مستحکم ہونا چاہیے۔ تیل کی کمپنیوں کو آلۂ کار بنایا جائے تاکہ وہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے تحت کام کریں۔ یہ بھی طے پایا کہ امریکہ کے مفاد کے لیے بہترین تحفظ یہ ہے کہ یہ کمپنیاں مختلف کمپنیوں کا گروپ ہوں تاکہ امریکی مفادات کے لیے انہیں بہ آسانی تیار اور رضا مند کیا جاتا رہے۔ 1960ء میں

اوپیک (Opec) کا قیام عمل میں آیا یعنی ان ملکوں کی تنظیم جو تیل ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ ان کمپنیوں نے دونوں ہاتھوں سے مشرقِ وسطیٰ اور خلیج کے ملکوں کی دولت لوٹی۔

24 جنوری 2007ء کو بش کا ایک خطاب ملاحظہ کیجیے۔ بش نے سٹیٹ آف دی یونین کے سالانہ خطاب میں کہا ہے کہ امریکہ کو کسی قیمت پر عراق میں ناکام نہیں ہونا چاہیے۔ صدر بش کے ایجنڈے کا ایک اہم ترین نکتہ توانائی کی پالیسی تھا جس میں امریکی صدر نے 2017ء تک پٹرول کے استعمال میں 20 فی صد کمی کا مطالبہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ تیل کے لیے دوسروں پر انحصار کرتا ہے جس کی وجہ سے اسے ظالم حکومتوں اور دہشت گردوں سے خطرہ رہتا ہے، جو تیل کی ترسیل میں رکاوٹ ڈال کر امریکی معیشت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہوں نے سٹریٹیجک پٹرولیم ذخائر دوگنا کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ کانگریس سے کہیں گے کہ توانائی کے متبادل ذرائع تلاش کرنے کی تحقیق کو فنڈ کرنے کے لیے ایک اعشاریہ چھ ارب بلین ڈالر فراہم کرے۔ 1953ء کے اجلاس کی کارروائی اور 2007ء کے بش کے خطاب کے سرے ایک دوسرے سے کتنے ملتے ہیں۔ حالات یہ بتاتے ہیں کہ امریکہ اور عالمی سامراجی طاقتیں تیل کے علاقوں پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرنا چاہتیں۔

عربی میں "بعث" "نشاۃ ثانیہ" کو کہتے ہیں۔ اس پارٹی کی بنیاد شام میں رکھی گئی۔ اسے شام اور عراق میں کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ پارٹی برطانیہ اور فرانس کے ساتھ دیگر استحصالی قوتوں کے خلاف جدوجہد کرتی ہوئی آگے بڑھی ہے اس کے نظریات عرب نیشنل ازم، سیکولرازم (رواداری)، معاشی انصاف کے ساتھ سامراج مخالف جدوجہد سے عبارت ہیں۔ سامراج کے ہاں قومی وحدت، سیکولرازم اور معاشی انصاف کی حامل پارٹیاں ہمیشہ معتوب رہی ہیں۔ صدام نے بھی عراق کی سرزمین سے ایک ایسی ہی پارٹی کے پلیٹ فارم سے سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا تھا جو عرب نیشنل ازم کے نظریہ کے تحت تمام عرب قومیت کو سامراج کے خلاف متحد کرنا چاہتی تھی اور یہ سامراج کے لیے ناقابلِ قبول تھا کیونکہ عرب اسرائیل کشمکش میں عربوں کے خلاف اسرائیل کی پشت پر ہمیشہ سامراجی طاقتیں رہی ہیں اور انہوں نے عربوں کے سینے پر اسرائیل کا ناسور کاشت کر کے ہی دم لیا۔ اب وہ عربوں کے مقابلہ میں اسے ایک ایٹمی طاقت بھی بنا چکے ہیں اور عربوں کو اس کے مقابلے میں کسی بھی ایسی طاقت کے حصول میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے جس سے

اسرائیل کو کوئی گزند پہنچے۔ امریکہ نے اسرائیل کے ذریعے صدام حسین کو اقتدار سے الگ کرنے اور انہیں قتل کرنے کی بارہا کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ امریکہ کی انٹیلی جنس عراق کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر تھک گئی۔ صدام حسین کی مضبوط تنظیم اور باشعور انٹیلی جنس نے امریکیوں کو ہمیشہ شکست دی۔ واحد صدام حسین تھا جو عربوں کو اسرائیل کے مقابلہ میں نیشنل ازم کی طاقت سے کھڑا کرنا چاہتا تھا اور فلسطینیوں کو کسی حالت میں نظر انداز کرنے کا قائل نہ تھا اور وہ اسرائیل کے مقابلہ میں ایٹمی قوت حاصل کر کے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کی طاقت کا توازن قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن اسرائیل نے 1981ء میں عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کر کے نہ صرف عراق یا صدام کو ایٹمی قوت بننے سے محروم کیا بلکہ تمام عربوں کی شہ رگ کاٹ دی تھی۔

صدام حسین کی پھانسی پر سب سے زیادہ خوشیاں اسرائیل میں منائی گئیں۔ صدام کی شہادت پر اسرائیلی میڈیا نے بیک زبان کہا کہ آج اسرائیل ایک خطرناک دشمن سے محفوظ ہو گیا۔ فلسطین کے بے سہارا خاندانوں نے محسوس کیا کہ ان کا سرپرست ان سے چھین لیا گیا۔ یاد رہے کہ صدام حسین فلسطینی بے سہارا خاندانوں کو ماہانہ کئی ہزار ڈالر دیتے تھے۔

سامراج اس خطے میں ہمیشہ بڑی گہری اور خطرناک چالیں چلتا رہا ہے۔ لیکن بعث پارٹی نے اس کے مقابلہ کی حکمت عملی اپنائی اور 1972ء میں اس کی قیادت نے ماسکو جا کر روس عراق دوستی کا معاہدہ کرنے کے بعد جون 1972ء میں عراق کی پٹرولیم کمپنی کو قومیا لیا۔ یہ فیصلہ عراق کی خودمختاری کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اب عراق سامراج کے مقابلہ میں آگے بڑھ رہا تھا اور اس نئے عراق کا معمار صدام حسین تھا۔ صدام کے اس فیصلے کے بعد عراق کے تیل کی آمدنی میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔ حالانکہ 1972ء میں جب بعث پارٹی نے پٹرولیم کمپنی کو قومیایا تھا تو بیرونی ملکوں نے اس پر بہت سی پابندیاں بھی عائد کر دی تھیں لیکن پھر بھی حالات عراق کے حق میں تھے۔ عرب حکمرانوں میں صدام حسین کی بعث پارٹی واحد جماعت تھی جس نے آئل کمپنیوں کو قومیانے کے بعد ان کی تمام آمدنی کو قومی ترقی کے لیے خرچ کیا۔ عراق میں تعلیم، صحت، روزگار اور بنیادی حقوق کا ایک مضبوط اور منظم نیٹ ورک قائم کیا۔ صدام حکومت نے صحت، تعلیم اور بنیادی حقوق کو عام فرد تک پہنچانے کی کامیاب کوششوں پر اقوامِ متحدہ سے کئی ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ یہ بات مغربی میڈیا نے بھی تسلیم کی ہے کہ صدام حسین نے اپنے ملک میں ٹیلی فون مفت، تعلیم اسّی فی صد،

کسانوں کو بجلی آدھی قیمت پر اور پٹرول فری مہیا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ عراق کی سڑکیں بین الاقوامی معیار کی تھیں، عراق متحد تھا۔ شیعہ سُنی جھگڑے نہ تھے۔ عراق کے شیعہ عوام ہمیشہ صدام کے حامی رہے۔ 2003ء کے امریکی حملے کے بعد سب سے پہلے صدام نے ایک شیعہ بستی میں ہی پناہ لی تھی۔ جب صدام کے گارڈز نے کہا یہ شیعوں کی بستی ہے تو صدام نے کہا یہ کہو یہ عراقیوں کی بستی ہے۔ عراق کی شیعہ آبادی ایئرفورس سے لے کر عراق آرمی تک میں شامل رہی ہے۔ 1980ء کی ایران عراق جنگ میں عراق کے شیعوں نے یہ جنگ قومی جنگ سمجھ کر لڑی اور صدام کا بھرپور ساتھ دیا۔ ہاں البتہ عراق کے بیرونی شیعہ صدام کے مخالف رہے۔ صدام کی شہادت پر ان کی اہلیہ اور بیٹی کا کہنا ہے کہ صدام کی شہادت پر سب سے زیادہ عراق کے شیعہ روئے ہیں اور انہیں جو تعزیتی پیغامات موصول ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑی تعداد شیعوں کی تھی۔

صدام حسین ایک قومی حکمران تھا۔ اس کے خیالات میں فرقہ وارانہ تصورات کا کبھی گزر بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہمیشہ عراقیوں کو متحد رہنے کی بات کی ہے۔ یہاں صدام حسین کے تمام خیالات کا احاطہ ممکن نہیں تاہم اس کا آخری خط لائق مطالعہ ہے یہ خط انہوں نے اپنے وکلاء کو اس وقت لکھ کر دیا جب انہیں عدالت میں اپنا مؤقف پیش کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

صدام حسین نے اپنے اس خط میں لکھا کہ عراق کی موجودہ صورت حال عراقی عوام کے لیے ایک نئی آزمائش ہے اور یہ انہیں نیا سبق بھی دیتی ہے۔ اس آزمائشی دور میں ہی تاریخی کامیابی کی بنیاد رکھی جائے گی۔ ان کا دل اپنے عوام اور قوم کی محبت سے معمور ہے۔ وہ کبھی مشکلات اور آزمائشوں سے نہیں گھبرائے اور اللہ نے چاہا تو اپنی جان کی قربانی دیں گے اور ان کی روح شہداء کے ساتھ جنت میں ہوگی۔ عراقی عوام کو صبر سے کام لینا چاہیے۔ ہمیں غیر منصفانہ اور جابر ممالک کے ساتھ مقابلے میں اللہ پر ہی انحصار کرنا ہوگا۔ ہمیں اور عراق کو انقلاب سے پہلے اور بعد میں جن طوفانوں اور مشکلات سے گزرنا پڑا ہے ان کے دوران اللہ تعالیٰ ہی نے ہمیں زندگی عطا کیے رکھی ہے اور اَب تک اس کی حفاظت کی ہے اگر اللہ تعالیٰ اس مرتبہ اپنی عطا کردہ جان واپس لینا چاہتا ہے تو وہ اس کی منشاء کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ وہی ہمارا خالق ہے اور اُسی نے اَب تک ہماری حفاظت کی۔ صدام حسین نے خط میں لکھا کہ وہ شہادت کا رتبہ پا کر اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں میں شامل ہو جائیں گے۔ شہادت کے واقعے پر چلنے والے وہ پہلے شخص نہیں۔ ان

سے بھی کم عمر ایسی ہزاروں روحیں اس راستے پر چل چکی ہیں وہ شہادت کا رتبہ ملنے پر اللہ تعالیٰ کے شکرگزار ہیں۔ صدام حسین نے اپنے خط میں عراقی عوام کو متحد رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا ہے کہ حملہ آور دشمنوں کے راستے میں عراقیوں کا اتحاد ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لیے یہ دشمن عراقی عوام کے درمیان منافرت کے نئے بیج بونے میں مصروف ہیں۔ صدام حسین نے مزید لکھا ہے کہ انہوں نے یہ خط اس لیے تحریر کیا کہ ان کے وکلاء نے انہیں بتایا تھا کہ حملہ آوروں کی قائم کردہ نام نہاد عدالت انہیں آخری بات کرنے کی اجازت دے دی گی لیکن عدالت اور اس کے چیف جج نے ہمیں ایک لفظ بھی بولنے کا موقع نہیں دیا اور کوئی وضاحت کیے بغیر اپنا فیصلہ جاری کر دیا اور کوئی شہادت سامنے رکھے بغیر حملہ آوروں کی لکھوائی ہوئی سزا پڑھ کر سنا دی۔

صدام کا صرف اتنا قصور تھا کہ اس نے عربوں میں قومی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی، عرب شہزادوں کو ذاتی عیش و عشرت کی زندگی سے اٹھا کر عربوں کے لیے کام کرنے کی بات کی، عربوں کے ہاتھ میں تیل کے ہتھیار کو سامراجی قوتوں کے خلاف استعمال کرنے کی بات کی۔ اس کی صدام نے جو سزا پائی ہے وہ دنیا بھر کے سامنے ہے۔

جو لوگ صدام کو امریکی ایجنٹ کہتے ہیں کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ ایجنٹ بننے والے کبھی ایسے راستے کا انتخاب نہیں کرتے ہیں، جس میں حکومت، اقتدار، خاندان، اولاد سب کچھ قربان کرنا پڑے اور آخر میں اسے اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں اور وہ اس پر مطمئن اور پُر اعتماد بھی ہو اور کہے عراق تا ابد قائم رہے گا، فلسطین عربوں کا ہے، امریکہ مردہ باد، عراقیو ڈٹے رہنا اور متحد رہنا۔ صدام حسین نے کہا تھا کہ امریکہ میری زندگی کے بدلہ ایک بیان چاہتا ہے کہ میں ٹیلی ویژن پر آ کر یہ بیان دے دوں کہ عراقی ہتھیار پھینک دیں امریکہ سے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ لیکن میں نے امریکیوں سے کہا تھا تم مجھے جب بھی ٹی وی پر لاؤ گے میں اپنی قوم سے یہی کہوں گا کہ امریکیوں کے خلاف مزاحمت تیز کر دو، اپنے ملک کو آزاد کراؤ اور متحد رہو جس پر امریکیوں نے مجھ سے یہ مطالبہ کرنا چھوڑ دیا۔ اگر صدام چاہتا تو وہ تقریباً ربع صدی عراق کا حکمران رہنے کے بعد باقی عمر بھی ایوانِ اقتدار میں گزار سکتا تھا۔ اُسے صرف اتنا کرنا تھا کہ اپنا سر امریکہ کے دربار میں جھکا دیتا اور اس کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیتا کہ اقتدار کے فیصلے وائٹ ہاؤس میں ہوتے ہیں۔ امریکہ کے ہر حکم کو مان کر عراق کے نام نہاد وسیع تر مفاد کے لیے کام شروع کر دیتا، بغاوت شعار

اداؤں کو امریکی استعمار کی نذر کر دیتا اور امریکہ کے اشارۂ ابرو سے اگر ساڑھے چھ لاکھ عراقیوں کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیتا تو کسی سامراجی ملک اور ان کے اتحادیوں کی جبین پر شکن تک نہ آتی۔ وہ کبھی امریکہ جاتا تو وائٹ ہاؤس میں اس کا بڑا شاندار استقبال ہوتا۔ اس کے قدموں تلے قالین بچھائے جاتے۔ شاید کانگریس کے اجلاس سے خطاب کا موقع بھی مل جاتا اور اس کی سامراجی وفاداری سے ہال تالیوں سے گونج اٹھتا۔ امریکہ برطانیہ اسے خراجِ تحسین پیش کرتے اور وہ دنیا بھر کے غلاموں اور بے ضمیر حکمرانوں کی حمایت لے کر واپس عراق لوٹتا اور زندگی کے آخری سانس تک کرسی اقتدار پر براجمان رہتا اور پھر ایک دن اپنی طبعی موت مرتا تو سپر پاور کے ایوانِ اقتدار سے صدا بلند ہوتی کہ صدام کے مرنے سے دنیا میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو صدیوں پُر نہیں کیا جا سکے گا۔

لیکن اس نے تو سب کچھ قربان کر دیا۔ کیا کوئی آمر، ایجنٹ اور آلۂ کار حکمران ایسا کر سکتا ہے؟ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جن کے حوصلے بلند اور عزم آہنی ہوتے ہیں۔ 1857ء میں بہادر شاہ ظفر کے سامنے جب ان کے بیٹوں کے سر قلم کر کے پیش کیے گئے تو انہوں نے فرمایا تھا ''تیموری خاندان کے بیٹے اسی طرح سرخرو ہو کر باپ کی خدمت میں آیا کرتے ہیں۔'' صدام حسین کو جب علم ہوا کہ ان کے دونوں بیٹے اور پوتا مصطفیٰ امریکیوں نے شہید کر دیئے ہیں تو انہوں نے بھی کہا تھا:

''الحمد اللّٰہ علیٰ ما کتبہٗ لنا سبحانہٗ و شرفنا باستشھا دھما فی سبیلہٖ''

''اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہے اس پر ہم اس کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور وہ ذات پاک ہے جس نے ہمیں اپنی راہ میں دو بیٹوں کی شہادت سے نوازا۔''

صدام حسین نے آخری وقت تک رحم کی اپیل نہ کی۔ جب ان سے ان کے وکلاء نے کسی ملک یا کسی با اثر شخصیت سے اپیل کی درخواست کی تو انہوں نے کہا میں کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگنا چاہتا، میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ عرب اپنے اصولوں کی خاطر وقار سے مرتے ہیں۔

❀..........❀..........❀

74

سلطان صلاح الدین ایوبی

مصر میں قائم ہونے والی ایوبی حکومت کے بانی سلطان صلاح الدین ایوبی تھے۔آپ 1137ء میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد انجم الدین اور چچا شیر کوہ عراق کے حکمران نورالدین کے اعلیٰ افسر تھے۔

صلاح الدین نے ابتدائی تعلیم دمشق میں حاصل کی۔جب ذرا بڑے ہوئے تو باپ اور چچا کی طرح آپ بھی بادشاہ کے دربار میں کام کرنے لگے۔1164ء میں سلطان نورالدین کی طرف سے مصر بھیجی گئی مہم میں صلاح الدین ایوبی بھی اپنے چچا کے ہمراہ تھے۔مصر کی فتح کے بعد بادشاہ نے شیر کوہ کو مصر میں اپنا وزیر مقرر کر دیا۔شیر کوہ کے انتقال پر بادشاہ نے صلاح الدین ایوبی کو اپنا وزیر بنا لیا۔

سلطان نورالدین کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن وہ حالات کو قابو میں نہ رکھ سکا جس سے افراتفری پھیل گئی۔اس موقع پر صلاح الدین ایوبی نے سلطان کو معزول کر کے مصر میں اپنی حکومت قائم کر لی۔اس کے بعد انہوں نے شام، یمن اور حجاز وغیرہ کے علاقے فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے جس زمانے میں مصر میں اپنی حکومت قائم کی تھی وہ مسلمانوں کی سیاسی ابتری کا زمانہ تھا۔مسلمان حکمران آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے جس سے ان کی طاقت کمزور ہو گئی تھی۔اس سے ان کی ہمسایہ عیسائی حکومت کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔انہوں نے مسلمانوں کے کئی علاقوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا۔ان شہروں میں بیت المقدس بھی شامل تھا جو پانچ سو سال تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا تھا۔اس عیسائی حکومت کو سارے یورپ کی

عیسائی حکومتوں کی مدد حاصل تھی اس لیے اس نے ہر طرف لوٹ مار مچا رکھی تھی۔

صلاح الدین ایوبی نے یہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ اس عیسائی فتنے کو ختم کریں گے۔ بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرائیں گے اور مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت اور عزت کو دوبارہ بحال کریں گے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے سلطان کو متواتر 14 سال تک عیسائیوں سے لڑنا پڑا۔ صلاح الدین ایوبی اور عیسائیوں کے درمیان جو لڑائیاں لڑی گئیں وہ تاریخ میں ''صلیبی جنگوں'' کے نام سے مشہور ہیں۔ صلاح الدین ایوبی اور عیسائیوں کے درمیان پہلی صلیبی جنگ حیطین کے مقام پر لڑی گئی۔ صلاح الدین ایوبی نے عیسائی لشکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بے شمار عیسائی اس جنگ میں قتل ہوئے اور بہت سے قیدی بنے۔ قیدیوں میں بیت المقدس کا بادشاہ بھی شامل تھا۔

اس جنگ میں کامیابی کے بعد سلطان نے بیت المقدس کی طرف قدم بڑھائے۔ وہاں پہنچ کر سلطان نے عیسائیوں کے سامنے چند اچھی شرطیں پیش کیں لیکن عیسائیوں نے ان شرطوں کو نہ مانا۔ اُن کے انکار پر صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کے ایک ہفتے بعد اہل شہر نے رحم کی درخواست کی جسے سلطان نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اہلِ شہر کے ساتھ ایسا شاندار برتاؤ کیا جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔

بیت المقدس پر جب عیسائیوں نے قبضہ کیا تھا تو اُنہوں نے بے شمار مسلمان بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور کمزوروں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا تھا لیکن سلطان نے عیسائیوں کو پورے شہری حقوق دے کر اپنی سلطنت میں رہنے کی اجازت دی۔ عیسائی سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ چالیس روز کے اندر اپنے بال بچوں کے ساتھ وہاں سے نکل کر طرابلس چلے جائیں۔ سلطان نے اُن پر معمولی سا فدیہ عائد کیا تھا۔ لیکن دس ہزار سپاہی ایسے تھے جو فدیہ ادا کرنے کے قابل نہ تھے۔ سلطان نے ایسے غریب سپاہیوں اور ان کے بال بچوں کا فدیہ اپنے پاس سے ادا کر کے انہیں وہاں سے جانے کی اجازت دے دی اور ہزاروں کا فدیہ معاف کیا۔ اس طرح بیت المقدس کو بغیر کسی قتلِ عام اور لوٹ مار کے ایک بار پھر عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرایا۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضے سے سارے یورپ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عیسائی پادریوں نے عوام و خواص کو تیسری صلیبی جنگ کے لیے اُبھارنا شروع کر دیا اور بیت

المقدس پر قبضے کے لیے زبردست لشکر تیار کیا۔ اس لشکر میں یورپ کے تین بادشاہ انگلستان کے رچرڈ، فرانس کے فلپ اگسٹس اور جرمنی کے فریڈرک بھی شامل تھے۔

یہ عظیم عیسائی لشکر شام پر حملہ آور ہوا۔ ان کی برّی اور بحری افواج نے ہر طرف سے شہر ''عکہ'' کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان نے بڑی بہادری اور دلیری سے اس لشکر کا مقابلہ کیا اور کئی مرتبہ ان کو شکست بھی دی۔ سلطانؒ نے خلیفہ بغداد سے بھی امداد طلب کی لیکن کسی بھی مسلمان حکمران کی طرف سے سلطان کو مدد نہ مل سکی۔ وہ تنہا دو سال تک پورے یورپ کی افواج کا مقابلہ کرتے رہے۔ دو سال کے شدید محاصرہ کے بعد سلطان اس شرط پر ''عکہ'' شہر عیسائیوں کے حوالے کرنے پر رضامند ہوئے کہ عیسائی فدیہ لے کر تمام لوگوں کو امان دیں گے۔ عیسائی بعد میں وعدے سے پھر گئے اور شہنشاہ رچرڈ نے جو اُس مشترکہ لشکر کا کمانڈر تھا فدیہ کی ادائیگی میں تاخیر کا بہانا بنا کر ستر ہ سو مسلمانوں کو قتل کرا دیا۔

''عکہ'' کی فتح کے بعد صلیبی لشکر نے بیت المقدس کا رُخ کیا لیکن یہاں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ لشکر جب بیت المقدس کو فتح نہ کر سکا تو صلح کر کے واپس چلا گیا۔ اس جنگ کے خاتمہ کے تھوڑے عرصہ بعد سلطان صلاح الدین ایوبی کا انتقال ہو گیا۔ ان کو دمشق میں جامع مسجد ولید کے قریب دفن کیا گیا۔ آج بھی اُن کا مزار وہاں موجود ہے۔

سلطان بہت ہی اعلیٰ کردار و اخلاق کے مالک تھے۔ وہ ایک عظیم فاتح، بہادر اور نڈر سپاہی تھے۔ عدل وانصاف، رحمدلی، فیاضی اور علم دوستی میں بھی بے مثال تھے۔

صلیبی جنگوں کے زمانے میں ایک مرتبہ کوئی مسلمان سپاہی عیسائی فوج سے ایک دودھ پیتے بچے کو اٹھا لایا۔ بچے کی ماں روتی ہوئی سلطان کے پاس آئی اور اپنے بچے کی واپسی کے لیے درخواست کی۔ سلطان ایک بے قرار ماں کا حال دیکھ کر بے چین ہو گئے انہوں نے مسلمان لشکر میں بچے کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ تلاش کرنے کے دوران معلوم ہوا کہ اُس بچے کو لانے والے شخص نے بچے کو فروخت کر دیا ہے۔ سلطان نے رقم اپنے پاس سے ادا کر کے بچے کو واپس منگوا کر ماں کے سپرد کیا اور پھر اس عورت کو سوار کرا کے نہایت عزت سے رخصت کیا۔

سلطان خود بہت بہادر تھے اور بہادروں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جنگ کے دوران شاہ انگلستان رچرڈ کا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا۔ سلطان صلاح الدین نے یہ منظر دیکھ کر فوراً

اپنے خادم کے ہاتھ بہترین عربی نسل کا ایک گھوڑا رچرڈ کو بھیجا۔

ایک مرتبہ دورانِ جنگ رچرڈ اور جرمنی کا شہنشاہ فریڈرک بیمار ہو گئے۔ صلاح الدین ایوبی کو معلوم ہوا تو اس نے ان کے لیے برف اور تازہ پھولوں کے علاوہ کئی دوسری چیزیں ارسال کیں اور بیمار پُرسی کی۔

سلطان نہایت صابر اور ضبط و برداشت کرنے والے انسان تھے۔ اُن کے بیٹے اسماعیل کا انتقال ہوا تو نامہ براُس کی موت کی خبر کا خط لے کر آیا۔ سلطان نے جب خط کھول کر پڑھا تو پاس موجود لوگوں میں سے کوئی شخص بھی اُن کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے یہ نہ جان سکا کہ خط میں خوشی کی خبر تھی یا غم کی۔ بعد میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ خط میں سلطان کے بیٹے کے انتقال کی خبر تھی۔

فیاضی اور سخاوت میں بھی سلطان بے نظیر تھے۔ مصر پر قبضے میں فاطمیوں کا بے پناہ خزانہ اُن کے ہاتھ لگا۔ سلطان نے سارا خزانہ اُسی وقت تقسیم کر دیا۔ جب سلطان کا انتقال ہوا تو اُن کے ذاتی خزانے میں صرف ایک دینار اور 47 درہم موجود تھے۔

سلطان کا زیادہ تر وقت اگرچہ صلیبی جنگوں میں بسر ہوا لیکن وہ ان کی خبر گیری اور رفاہ عامہ کے کاموں سے کبھی غافل نہیں رہے۔ جنگ کے دنوں کے علاوہ وہ ہفتے میں دو بار کھلی عدالت لگاتے، عوام کی شکایات سنتے اور خود فیصلے کرتے۔ مجاہدین کا بہت زیادہ خیال رکھتے۔ اُن کو گھوڑے، ہتھیار اور خلعتیں دینے میں حد سے گزر جاتے۔

سلطان کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ نہایت سادہ لباس پہنتے، معمولی غذا کھاتے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین رکھتے تھے۔ نہایت عجز و انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے تھے۔

75

طارق بن زیاد

براعظم یورپ کے جنوب میں ایک ملک ہے اسپین، جسے مسلمان اندلس بھی کہتے ہیں۔ کوئی تین سو سال پہلے یہاں مسلمان حاکم تھے۔ انہوں نے اس ملک پر نہایت ٹھاٹھ اور شان و شوکت سے آٹھ سو برس تک حکومت کی۔ تاریخ کے صفحے اِن کے عظیم الشان کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ اسپین کے مسلمانوں کے یورپ پر بہت احسان ہیں۔ آج یورپ میں جو علمی اور ذہنی ترقی دکھائی دے رہی ہے۔ اس میں اسپین کے مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے۔

یہ ملک اپنی سرسبزی، شادابی، پیداوار اور دولت کے لحاظ سے یورپ کا ممتاز ترین ملک تھا۔ یہاں کئی سو سال سے گاتھ خاندان حکمران تھا۔ گاتھ بادشاہوں میں دستور تھا کہ ان کے امیر اور جاگیردار اپنی لڑکیاں اور لڑکے شاہی دربار میں پرورش پانے اور تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔ اصل مقصد یہ تھا کہ ان کی جان کے خوف سے ان کے والدین میں بغاوت اور سرکشی کا خیال پیدا نہ ہو سکے۔ اس دستور کے مطابق ایک یونانی سردار کاؤنٹ جولین حاکم سبتہ کی لڑکی بھی راڈرک کے محل میں تھی۔ راڈرک اس پر فریفتہ ہو گیا اور زبردستی اسے اپنے قابو میں لے آیا۔ جب کاؤنٹ جولین کو اس بے عزتی کی خبر ملی، تو وہ راڈرک کا دشمن ہو گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی حکومت کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دینا چاہیے۔ اِسی زمانہ میں موسیٰ بن نصیر شمالی افریقہ کو فتح کر چکے تھے۔ نقشہ دیکھنے سے پتہ چل سکتا ہے کہ شمالی افریقہ کے ساحل اور اسپین کے درمیان صرف ایک چھوٹی سی آبنائے ہے جس کا فاصلہ سات آٹھ میل سے زیادہ نہیں۔ کاؤنٹ جولین موسیٰ بن نصیر کے پاس آیا اور اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی تفصیلات بتائیں اور حملہ کرنے کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں ہر قسم کی مدد کرے گا۔

خلیفہ کی اجازت کے بغیر کسی نئے ملک پر حملہ نہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید سے اس کی اجازت چاہی۔ خلیفہ ولید نے لکھا کہ بغیر تجربہ کے مسلمانوں کو سمندر کے خطروں میں پھنسانا مناسب نہیں ہے۔ پہلے وہاں کے حالات معلوم کرو۔ موسیٰ بن نصیر نے جواب دیا کہ سمندر نہیں ہے۔ بلکہ معمولی خلیج ہے۔ اس پار سے اس پار کی چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ چنانچہ خلیفہ نے اجازت دے دی۔ موسیٰ بن نصیر نے محض احتیاط کے پیشِ نظر اپنے ایک معتبر غلام طریف کو ایک سو سوار اور تین سو پیادوں کے ساتھ حالات کا اندازہ لگانے کے لیے اسپین بھیجا۔ اس نے آبنائے کو پار کر کے بعض ساحلی شہروں پر حملہ کیا۔ اس کی واپسی پر اسپین کو فتح کرنے کا اصل کام شروع ہوا۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے حملہ کے لیے اپنے ایک معتبر نو مسلم غلام طارق بن زیادہ کو منتخب کیا۔ طارق افریقہ کا رہنے والا، بربری نسل سے اور موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھا۔ چونکہ اس لشکر میں زیادہ تر بربری سپاہی تھے۔ اس لیے سپہ سالاری کے لیے طارق سے زیادہ موزوں انتخاب اور کوئی نہ ہوسکتا تھا۔ طارق بن زیادہ بڑا بہادر اور فوجی قابلیت میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا۔ وہ سات ہزار سپاہیوں کو لے کر آبنائے کو پار کر کے جبل الطارق پر جا اُترا۔ یہی جبل الطارق جبرالٹر کہلاتا ہے۔ راہ میں طارق نے ایک خواب دیکھا کہ آنحضرت ﷺ مہاجرین اور انصار کے ساتھ تشریف رکھتے ہیں۔ صحابہؓ تلواریں لٹکائے اور کندھوں پر کمانیں چڑھائے ہیں۔ آپ ﷺ طارق سے فرما رہے ہیں۔ ''طارق اس شان سے قدم بڑھائے جاؤ۔'' پھر آپ ﷺ نے اس کو مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے اور وعدوں کو پورا کرنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد اس نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ صحابہؓ کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے، اور طارق اس مقدس جماعت کے پیچھے ہے۔ جب اُس نے یہ خواب اپنے ساتھیوں کو سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اس مہم میں وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

طارق، جبل الطارق کے قریب چند دن ٹھہرا رہا۔ سب سے پہلے اُس نے ان جہازوں کو جلا دیا، جن میں اس کی فوج آئی تھی، اور پھر ابتدائی انتظام مکمل کرنے کے بعد اُس نے فوجی نقل و حرکت شروع کی۔ جبل الطارق کے آس پاس جو چند شہر تھے، ان پر آسانی سے قبضہ ہوگیا طارق نے ان شہروں کی فصیل اور قلعوں کو درست کرایا۔ جہاں جہاں دیواروں کی مرمت کی ضرورت تھی، مرمت کرائی۔ اب وہ اندلس کے شاہی لشکر سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کے لیے بالکل

تیار تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ طارق نے چند شہر بڑی آسانی سے فتح کر لیے تھے۔ اس سے اس علاقہ میں ہلچل مچ گئی۔ تدمیر اس علاقہ کا گورنر تھا، وہ ان حملہ آوروں کو دیکھ کر گھبرا سا گیا مگر مقابلہ کی جرأت کی، اور اپنی فوج لے کر آگے بڑھا۔ جبرالٹر کے قریب ہی دونوں میں مقابلہ ہوا۔ جس میں تدمیر کو شکست ہوئی۔ وہ اس شکست سے اتنا گھبرایا اور پریشان ہوا کہ اس نے بادشاہ کو لکھا۔ ''ہمارے ملک پر ایسے آدمیوں نے حملہ کیا ہے، جن کا نہ مَیں نام جانتا ہوں اور نہ وطن اور اصلیت۔ مَیں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے آگئے ہیں۔ آیا آسمان سے گرے ہیں یا زمین سے نکل آئے ہیں۔ جب راڈرک کو یہ پیغام ملا۔ تو اس نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں تاکہ ملک کو حملہ آوروں سے بچایا جائے ملک میں ہر طرف سپاہی بھرتی کرنے کے لیے آدمی دوڑا دیئے گئے۔ اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک لاکھ فوج بادشاہ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔

اِدھر تو یہ ہو رہا تھا، اُدھر طارق صوبہ قادس کے شہر شذونہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے سپاہی دور دور تک کھانے پینے کا سامان لینے کے لیے جاتے اور ہر موقعہ پر کامیاب ہو کر واپس آتے۔ ان عربی سواروں کی تیزی اور بہادری سے اسپین کے باشندے سہمے جاتے تھے۔ طارق کے جاسوس راڈرک کے پایۂ تخت میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اس کے مقابلہ کے لیے جو تیاریاں ہو رہی تھیں، اُن کی خبریں لگاتار اُسے پہنچاتے رہتے تھے۔ طارق کو جب پتہ چلا کہ راڈرک نے ایک بڑا لشکر اکٹھا کر لیا ہے۔ تو اس نے موسیٰ سے امداد طلب کی۔ موسیٰ نے پانچ ہزار سپاہی اور روانہ کر دیئے۔ اس طرح اسپین میں مسلمانوں کی فوج کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔ گاتھ فوج کے مقابلے میں یہ مٹھی بھر سے زیادہ نہ تھے۔

جولائی 711ء کی ایک سہانی صبح کو اسپین کی تاریخ کا ورق اُلٹا اور ایک نیا باب شروع ہوا۔ دریائے والڈیٹ کے کنارے دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں۔ مسلمان لڑائی کے لیے بے صبر ہو رہے تھے۔ ان کے سروں پر سفید عمامے بندھے ہوئے تھے۔ وہ چمک دار زرہ بکتر پہنے، تلواریں لگائے اور نیزے ہاتھ میں لیے میدانِ جنگ میں آئے۔ اُن کے کندھوں پر کمانیں تھیں اور ترکشوں میں تیر۔ طارق نے سب سے پہلے نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں فتح کے لیے دعا مانگی۔ اس کے بعد اس نے مجاہدوں کے سامنے ایک پُر جوش تقریر کی۔ اُس نے

کہا۔ ''لوگو! میدانِ جنگ سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہے۔ آگے دشمن ہے اور پیچھے دریا۔ خدا کی قسم! صرف پامردی اور استقلال میں نجات ہے۔ یہی وہ فتح مند فوجیں ہیں جو مغلوب نہیں ہو سکتیں۔ اگر یہ دونوں باتیں موجود ہیں، تو تعداد کی قلت سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور بزدلی، کاہلی، سستی، نامردی، اختلاف اور غرور کے ساتھ تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔''

''لوگو! میری تقلید کرو۔ اگر میں حملہ کروں تو تم بھی حملہ آور ہو جاؤ اور جب میں رُک جاؤں، تو تم بھی رُک جاؤ۔ جنگ کے وقت سب مل کر ایک جسم بن جاؤ۔ میں اس سرکش (راڈرک) پر حملہ کر کے دست بدست مقابلہ کروں گا۔ اگر میں اس حملہ میں مارا جاؤں، تو تم رنج و غم نہ کرنا اور میرے بعد آپس میں لڑ جھگڑ نہ بیٹھنا۔ اس سے تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور تم دشمن کے مقابلے میں پیٹھ پھیر دو گے، اور قتل و گرفتار ہو کر برباد ہو جاؤ گے۔

''خبردار! ذِلت پر راضی نہ ہونا، اور اپنے کو دشمن کے حوالے نہ کرنا۔ خدا نے مشقت اور جفاکشی کے ذریعے دنیا میں تمہارے لیے جو عزت و شرف اور راحت اور آخرت میں شہادت کا جو ثواب مقدر کیا ہے، اس کی طرف بڑھو۔ خدا کی پناہ اور حمایت کے باوجود اگر تم ذلت پر راضی ہو گئے، تو بڑے گھاٹے میں رہو گے۔ دوسرے مسلمان الگ تم کو بُرے الفاظ سے یاد کریں گے۔ جیسے ہی میں حملہ کروں تم بھی حملہ آور ہو جاؤ۔''

اس پُر جوش تقریر کو سُن کر سپاہیوں کے دلوں میں جوش و خروش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ ان میں سے بعض نوجوان آگے بڑھے اور انہوں نے اپنی جوابی تقریر میں کہا۔ ''اگر اب سے پہلے ہمارے دلوں میں کوئی بات اس کے خلاف تھی جس کا آپ نے عزم فرمایا ہے، تو اب ہم نے اس کو اپنے دلوں سے دُور کر دیا۔ اب آپ قدم اٹھائیں ہم آپ کے ساتھ اور آپ کے تابع فرمان ہیں۔''

راڈرک بھی بڑی شان سے میدان میں آیا۔ وہ نہایت پُر تکلف ہاتھی دانت کی گاڑی میں سوار تھا۔ ایک طرف ہر طرح کے ہتھیاروں سے آراستہ ایک لاکھ فوج تھی اور دوسری طرف اپنے ملک سے دور بارہ ہزار پردیسی تھے جن کے لیے اسپین اجنبی مقام تھا۔ لڑائی ہوئی اور میدان طارق کے ہاتھ رہا۔ ہزاروں دشمن قتل ہوئے، اور ہزاروں گرفتار۔ راڈرک کا گھوڑا اس کے بیش قیمت سامان کے ساتھ طارق کے ہاتھ لگا۔ خود اس کا پتہ نہ لگا۔ اندازہ ہے کہ وہ دریا میں ڈوب کر مر گیا ہوگا۔ مسلمانوں کے ہاتھ اتنا مالِ غنیمت آیا۔ جس کی انتہا نہیں۔ جنگ وال ڈیٹ نہایت صحیح

طور پر دنیا کی فیصلہ کن لڑائیوں میں شمار کی گئی ہے۔ اس لڑائی سے سلطنت گاتھ کی عمارت ایسی گری کہ پھر نہ کھڑی ہو سکی۔ اس عظیم الشان فتح کی خبر جب موسیٰ بن نصیر کو پہنچی تو انہوں نے طارق کو لکھا کہ جب تک وہ اسپین نہ پہنچیں پیش قدمی روک دی جائے۔ لیکن طارق ایک تجربہ کار جرنیل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دشمنوں کو آرام کرنے اور اپنی حالت کو درست کر لینے کا موقع دینا سخت مضر ہے چنانچہ اس نے موسیٰ کے حکم کی تعمیل نہ کی اور اپنی فوج کے دستے دُور دُور تک پھیلا دیئے۔ اسپین کے عیسائی شکست کھا کر پایۂ تخت طلیطلہ میں جمع ہو گئے۔

اِس فتح کے بعد طارق نے اندلس کے جنوب مغربی علاقے کا رُخ کیا سب سے پہلے صوبہ قادس کے مشہور شہر شذونہ کا محاصرہ کیا۔ اہلِ شہر نے چند دنوں کے بعد اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد اس نے اشبیلیہ کی طرف قدم بڑھائے اور اندلس کا یہ تاریخی شہر آسانی سے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ راڈرک کی فوج کے شکست کھائے ہوئے سپاہی پاس ہی ایک شہر استجہ میں جمع ہیں۔ طارق نے اس شہر کا محاصرہ کیا۔ ان سپاہیوں نے شہر والوں سے مل کر مسلمانوں کا سخت مقابلہ کیا طارق نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مگر وہ فتح ہونے میں نہیں آتا تھا اتفاق دیکھیے، ایک دن شہر والوں میں سے ایک شخص اس دریا کے کنارے آیا جو شہر کے ایک طرف بہتا تھا۔ طارق نے اس کو دیکھا وہ دریا میں اتر چکا تھا طارق نے پانی میں کود کر اس کو دبوچ لیا اور دریا سے نکال کر اپنے خیمے میں لے آیا۔ شکل وشباہت سے وہ معزز شخص معلوم ہوتا تھا۔ طارق نے جب کرید کرید کر اس کے حالات پوچھے، تو پتہ چلا کہ وہ شہر کا حاکم ہے۔ اب کیا تھا۔ طارق نے جو شرطیں پیش کیں، اس نے منظور کر لیں اور مسلمان شہر میں داخل ہو گئے۔

کاؤنٹ جولین برابر طارق کے ساتھ ساتھ تھا، اور اسے مفید مشورے دے رہا تھا۔ استجہ کی فتح کے بعد اس نے طارق کو مشورہ دیا کہ اس وقت اسپین کے باشندوں پر مسلمانوں کا رُعب چھایا ہوا ہے۔ ان کے لیے کسی بڑی فوج کی ضرورت نہیں۔ فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے مختلف صوبوں میں بھیج دیئے جائیں، اور خود طارق طلیطلہ پر حملہ کرے تا کہ لوگ متحد ہو کر کسی قسم کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ طارق نے اس مشورے کو پسند کیا اور طلیطلہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ ایک فوج قرطبہ روانہ کر دی، اور دوسری مرسیہ کی طرف۔ طلیطلہ کے بعد قرطبہ سب سے مشہور شہر تھا۔ اگر چہ اس کی فصیل بڑی مستحکم تھی۔ مگر اس کے فتح کرنے میں مسلمانوں کو کچھ زیادہ مشکل پیش نہ

آئی۔ مرسیہ کے حاکم تدمیر نے البتہ بڑی شجاعت سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا لیکن آخر میں شکست کھائی اور صلح کرنے پر مجبور ہوا۔ چنانچہ صلح کی شرطیں طے پائیں اور یہ علاقہ تدمیر ہی کے قبضے میں رکھا گیا اور طارق نے بھی اس کو صوبہ مرسیہ کا حاکم تسلیم کرلیا۔

ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ طارق خود طلیطلہ پر حملہ کرنے روانہ ہوا تھا۔ وہ جس وقت وہاں پہنچا، تو شہر بالکل خالی تھا۔ مسلمانوں کے پہنچنے سے پہلے ہی لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ طلیطلہ کے قیمتی ذخیرے اگرچہ یہاں سے ہٹائے یا چھپائے جا چکے تھے، پھر بھی طارق کو مال و دولت کا اتنا انبار ملا۔ جو اس سے پہلے اس ملک میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس میں اسپین کے بادشاہوں کے چوبیس نہایت قیمتی تاج بھی تھے۔ طارق نے طلیطلہ میں مسلمانوں کی ایک چوکی قائم کر دی، اور دشمن کے تعاقب میں شمالی علاقہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہر جگہ ہر موقعہ پر یہ ہوا کہ جہاں اسپین کے سپاہی عمامہ باندھے ہوئے سواروں کا طوفان آتا ہوا دیکھتے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پہاڑوں میں بھاگ جاتے۔ طلیطلہ کی فتح طارق کا آخری کارنامہ ہے۔ کیونکہ اِس کے بعد موسیٰ بن نصیر کے اندلس آنے کی خبر ملی، اور اس وقت سے وہ اپنے آقا کے ماتحت کام کرنے لگا۔

اسپین کی فتح طارق بن زیادہ کا ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ یادرہے گا طارق وہ بہادر سپاہی تھا، جس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں بھی کم ملتی ہیں اور اس کا دنیا کے عظیم جرنیلوں میں شمار ہوتا ہے۔

76

ظہیر الدین محمد بابر

ہندوستان میں مغلیہ دور کا بانی ظہیر الدین محمد بابر دنیا بھر میں اپنے عہد کا ایک رفیع الشان بادشاہ تھا۔ اس کے حالات زندگی کسی رومانوی داستان کا ٹکڑا معلوم ہوتے ہیں۔ زمانہ وسطیٰ کی تاریخ میں تو ایسی شخصیتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی (Prof. Arnold Toynbee) بابر کو اپنے دور کی ایک نہایت ہی منفرد ہستی سمجھتا ہے۔ نسل و خون کے اعتبار سے بابر میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو اسے سکندر اعظم، شار لیمان، لوئیس چہاردہم، نپولین وغیرہ کی صف میں لا کھڑا کرتیں۔ ماں کی طرف سے چنگیز خاں اور باپ کی طرف سے تیمور اس کے جدامجد تھے۔ ٹائن بی کا خیال ہے کہ اگر بابر کے پاس وسائل ہوتے تو وہ ساری دنیا کو پائے زیرِ نگیں لانے کا عزم کرتا۔

بابر کی تزک خودنوشت سوانح عمری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مؤرخین نے اسے دنیا کی چند نہایت ہی عظیم خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کیا ہے۔ ارسکن کے خیال کے مطابق ایشیاء بھر میں یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔ پروفیسر ٹائن بی لکھتا ہے: "بابر علم وادب کا دلدادہ تھا۔ اس کی خود نوشت سوانح عمری ایک ایسی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ جو غیر معمولی طور پر ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر مشاہدہ کی بے پناہ قوتیں رکھتی ہو۔ ساری زندگی جنگ وجدل میں مصروف رہنے کے باوجود بابر علم اور ادب کے موتی رولتا رہا۔ تیموری خاندان کا چشم و چراغ ہونے وجہ سے اس کے پیچھے تہذیب وتمدن کی شاندار روایات تھیں۔ تیمور اور اس کے جانشینوں کے عہد میں سمرقند، بخارا، ہرات، مرو، استرآباد ایشیائی کلچر کے مراکز سمجھے جاتے تھے۔

علی شیر نوائی کے بعد بابر ترکی کا سب سے بڑا شاعر گردانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ

فارسی اور عربی میں بھی اسے خاصی مہارت حاصل تھی اور بے تکلف شعر کہتا تھا۔ فنِ خطاطی سے اسے دلچسپی تھی۔ اس نے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا جس کو خط بابری کہتے ہیں۔ وہ انداز تحریر اور خوش خط لکھنے پر خاص توجہ دیتا تھا، ہمایوں کو وہ ہمیشہ ہدایت کرتا کہ صاف لکھا کرو ایک دفعہ اس نے اسے کہا "کلام الملوک ملوک الکلام"۔

بابر کی فتوحات کی حیثیت عارضی تھی۔ اگر چہ یہ فتوحات ہی تھیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان کی وسیع سلطنت کا مالک بنا۔ اس کی وہ ہمت و شجاعت جس کا ڈنکا دور و نزدیک بجتا تھا اب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ ماضی کی گرد انہیں اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے مگر بابر کی خودنوشت سوانح عمری ابھی تک اس کی عظمت کی امین ہے۔

بابر کی فتوحات اسے ایک عظیم فاتح ایک لائق جرنیل اور ایک جانباز کشور کشا کی حیثیت میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ مگر بابر نامہ میں ہم ایک ایسے انسان سے متعارف ہوتے ہیں جو سرتاپا انسانی اقدار کا حامل ہے۔ جس میں کذب و افترا نام کو نہیں۔ جو صداقت کو بہر حال عزیز رکھتا ہے۔ جو سب سے بڑا انسان دوست ہے۔ وہ یہاں ایک بہادر جنگجو کے روپ میں ہی ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ہمیں ایک ایسی شخصیت کا احساس دلاتا ہے جس کے پہلو میں کسی شاعر کا دل دھڑکتا ہو۔ وہ فطرت کی رنگینیوں کا دلدادہ ہے۔ سرسبز و شاداب میدان، بہتے ہوئے دریا، ابلتے ہوئے چشمے، بہار کا حسن یہ سب چیزیں اس پر جادو کا حکم رکھتی ہیں اور وہ چند لمحوں کے لیے اپنی زندگی کی تلخیوں کو فراموش کر کے ان قدرتی نظاروں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے بے ساختہ شعر و ادب کے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔

بابر یاروں کا یار تھا۔ اپنے سپاہیوں سے اس کا سلوک پدرانہ تھا اور وہ اپنے آپ کو بالکل ان جیسا سمجھتا تھا۔ درّۂ زرین میں سے گزرتے ہوئے جب اس کے لشکر کو بادوباراں نے آگھیرا اور برف کے طوفانوں نے ان کا راستہ روک لیا تو بابر نے ایک چھوٹے سے غار میں جا کر پناہ لینا محض اس لیے گوارا نہ کیا کہ اس غار میں اس کے سارے آدمی نہیں آسکتے تھے۔ اس کے اسی سلوک نے لوگوں کا دل موہ لیا تھا اور وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں اس کی خوشنودی کے لیے مارے مارے پھرتے تھے۔

بابر صوفی منش آدمی تھا مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ دعا پر اس کا یقین تھا اور اپنی ساری

کامیابیوں کا سبب وہ نصرت خداوندی کو ٹھہراتا تھا۔ پانی پت کے میدان میں جب اسے فتح حاصل ہوئی تو وہ لکھتا ہے۔ ''خدا کے فضل وکرم سے یہ مشکل کام میرے لیے آسان ہوا اور دشمن فوج کے آدمی صرف نصف دن کے قلیل عرصہ میں خاک وخون میں تڑپتے نظر آئے۔'' کنواہہ کے مقام پر جب اس کے آدمی ہمت ہار بیٹھے تھے۔ تو اس نے ایک پرزور تقریر کی جو مذہبی جوش اور ولولے سے پُر تھی۔ شراب کے برتن توڑ ڈالے اور ہمیشہ کے لیے توبہ کرلی کہ پھر شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ اسی جگہ غرباء اور فقراء کے لیے ایک خیرات گھر تعمیر کیا گیا۔ بابر نے اپنے لشکر کو یہ کہہ کر لڑائی پر آمادہ کرلیا کہ ''موت کی صورت میں ہم شہید ہو جائیں گے اور اگر فتح وظفر نے ہمارے قدم چومے تو ہم غازی کہلائیں گے۔ اور دنیا و آخرت میں سرخرو ہوں گے۔'' یہ سب باتیں بابر کے مذہبی لگاؤ کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔

بابر فنِ جنگ سے پوری پوری مہارت رکھتا تھا۔ اس کے لڑکپن کا زمانہ جنگ وجدل میں گزرا۔ حوصلہ شکن مرحلوں کا سامنا اس نے کیا۔ آزمائشوں نے بارہا اس کی عظمت و ہمت کو للکارا۔ زندگی کے یہ سارے نشیب وفراز بابر کے لیے مفید ثابت ہوئے۔ مشکلات سے اس نے سبق سیکھا مصائب سے اس نے کسب کمال کیا۔ یہ سارے کٹھن مراحل اس کے سمند شوق کے لیے تازیانہ تھے۔

بابر گیارہ سال کی عمر میں جب فرغانہ کے تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے آپ کو چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا پایا۔ تاہم بابر نے سمرقند پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ ہر تیموری شہزادے کی طرح بابر کی خواہش تھی کہ وہ سمرقند پر قابض ہو اور تخت تیموری کا وارث بنے بابر اپنے اسلاف کی عظمت ازسرِ نو زندہ کرنا چاہتا تھا مگر اس راہ میں اسے مسلسل رکاوٹوں اور بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تیموری سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی اور اس میں اب سکت باقی نہ تھی کہ ازبکوں کا مقابلہ کرسکے۔ شیبانی خاں جہاندیدہ جرنیل تھا بابر جیسا کم سن بچہ بھلا اس کے مقابلے کی کیا تاب لاسکتا۔ بابر نے سلطان حسین مرزا کو مدد کے لیے پکارا اور دوسرے تیموری شہزادوں کو متحد کرنا چاہا مگر اسے اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی۔ دو دفعہ وہ سمرقند پر قابض بھی ہوا۔ مگر ہر دفعہ وہاں اس کا اقتدار عارضی ثابت ہوا۔ اس کے اپنے چچازاد بھائی اور دوسرے رشتہ دار اس کے خلاف برسرپیکار تھے۔ سمرقند میں اس کے سو دن نپولین کے مشہور سو دنوں کی یاد

دلاتے ہیں۔ پے بہ پے شکستوں کے باوجود اس کے پائے استقلال میں تزلزل پیدا نہ ہوا۔ وہ تخت یا تختہ کا قائل تھا اپنے مٹھی بھر جانبازوں کو ساتھ لیے ہوئے دشمنوں سے نبرد آزما رہا۔ بابر آہستہ آہستہ سلطنت کے رموز سے آشنا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کی شاطرانہ چالوں کو سمجھنے لگا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے فرغانہ میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے بغیر سمرقند پر حملے کی ٹھان لی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں سے اسے ہاتھ دھونے پڑے۔ وہ تزک میں لکھتا ہے کہ "نو نقد نہ تیرا اُدھار" کی صداقت اب مجھ پر واضح ہوگئی ہے۔

یہ حالات تھے کہ کابل کا حکمران جو اس کا چچا تھا فوت ہوا۔ ارغونوں نے وہاں کھلبلی مچا رکھی تھی بابر نے کابل کا رُخ کیا اور ارغونوں کے فتنہ کو فرد کر کے کابل پر قبضہ کر لیا یہ 1504ء کا واقعہ ہے۔ کابل پر قبضہ اس کی سیاسی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ مشرق کی طرف بابر کا پہلا قدم تھا اس سے پہلے بابر کی نگاہ صرف وسط ایشیاء کی طرف اٹھتی تھی۔ وہاں کی مسلسل ناکامیوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ مشرق کا رُخ کرے۔

کابل پر قبضہ کرنے کے بعد بابر نے یہاں اپنے قدم نہایت مضبوطی سے جمائے اور اس وقت تک سمرقند یا فرغانہ کی تسخیر کا عزم نہ کیا جب تک اس نے افغانستان میں اپنی حکومت مستحکم نہ کر لی۔

سمرقند سے بابر جب 1514ء میں کابل لوٹا تو وسط ایشیاء سے متعلق اپنے عزائم کو وہ ہمیشہ کے لیے ترک کر چکا تھا۔ اس نے اَب ہندوستان کی تسخیر کا ارادہ کیا۔ تزک بابری میں وہ لکھتا ہے "اس وقت سے کہ مَیں نے کابل پر قبضہ کیا، مَیں ہندوستان کی تسخیر کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔" مگر ہندوستان پر حملہ کا قطعی فیصلہ اس نے سمرقند میں اپنی آخری ناکامی کے بعد ہی کیا۔ وہ ہندوستان پر کل پانچ دفعہ حملہ آور ہوا۔ پہلی دفعہ اس نے سرحدی قبائل کو زیر کرنے کے لیے اور ہندوستان کے حاصل کرنے کے لیے ایک معمولی سی یلغار کی اور باجوڑ، سوات اور پشاور تک آیا۔ یوسف زئی قبیلہ سے اس نے تعلقات پیدا کیے اور اس قبیلہ کی ایک خاتون سے اس نے شادی کی۔ پھر اس نے بھیرہ، خوشاب اور سیالکوٹ کے قلعوں کو فتح کیا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات بابر کے لیے نہایت موزوں تھے۔

بابر کی فوج نے نومبر 1525ء میں ہندوستان کا رُخ کیا۔ 21 اپریل 1526ء کو پانی

پت کے میدان میں تاریخ کی ایک یادگار جنگ لڑی گئی۔ بابر کی فوج صرف 24000 تھی ابراہیم لودھی کے پاس ایک لاکھ سے اوپر آدمی تھے ایک ہزار جنگی ہاتھی بھی اس کے پاس موجود تھے۔ بابر نے جس ہوشیاری اور عقل مندی سے پانی پت کے میدان میں اپنی فوج کو صف آرا کیا وہ اس کی فوجی ذہانت کی دلیل ہے۔ بابر ایک مدافعانہ جنگ لڑنا چاہتا تھا تاکہ ابراہیم لودھی کا ٹڈی دل لشکر اس کی مٹھی بھر فوج کو گھیرے میں نہ لے لے۔

سب سے پہلے اس نے پانی پت پر قبضہ کر کے فوج کو اس طرح کھڑا کیا کہ اسکے دائیں جانب قصبہ ہو بائیں جانب خندق کھودی گئی اور درخت کاٹ کاٹ کر گرا دیئے گئے تاکہ دشمن فوج اس طرف سے حملہ آور نہ ہو۔ بہت سی بیل گاڑیاں چمڑے کی کھالوں سے باندھ کر لگا دی گئیں۔ تاکہ دشمن سامنے سے یک دم حملہ نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ مناسب جگہوں پر توپیں نصب کی گئیں۔ ابراہیم لودھی کی فوج کافی عرصہ تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ ترکوں پر کس طرح حملہ آور ہو۔ آخر جب ابراہیم لودھی نے حملہ کیا تو منہ کی کھائی۔ دونوں طرف سے بابر کے طوفانی دستوں نے دشمن کو گھیرے میں لے لیا۔ توپ خانے کی گولہ باری سے ہاتھی ہراساں ہو گئے۔ ابراہیم لودھی کی بھاری بھرکم فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ کھیت رہا۔

بابر کی اس فتح سے ہندوستان میں سلاطین دہلی کے عہد کا خاتمہ ہوا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا حرف آغاز تھا۔ مسلمان سلطانوں کے بعد اب مسلمان بادشاہوں کا دور شروع ہو رہا تھا۔ سلطان کی بجائے مغلیہ دور کے حکمران اپنے آپ کو بادشاہ کہلاتے ہیں۔ یہ تبدیلی کئی اعتبارات سے اہم ہے۔ بادشاہ کا لفظ سلطان سے زیادہ بارعب اور پُرعظمت ہے۔ یہ اس مرکزیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو ابراہیم لودھی کبھی قائم نہ کر سکا۔ طوائف الملوکی کا زمانہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔

رانا سانگا جس نے یہ سوچ کر بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی کہ اپنے جد امجد تیمور کی طرح یہ بھی لوٹ کھسوٹ کے بعد اپنے وطن واپس لوٹ جائے گا یہ دیکھ کر بڑا پریشان ہوا کہ بابر ہندوستان میں اپنے قدم جما رہا ہے۔ ہندو سلطنت کے قیام کے بارے میں اسکے سارے ارمان خاک میں مل رہے تھے۔ اس نے تمام راجپوت سرداروں کو اکٹھا کیا اور بابر کو مقابلہ کے لیے للکارا۔ وہ تمام افغان سردار بھی اس کی مدد پر تھے جو پانی پت سے زندہ بچ نکلے تھے یا جنہوں نے

بابر کے خلاف ابراہیم لودھی کی کوئی مدد نہ کی تھی یہ سب لوگ رانا سانگا کی طرح یہی امید لگائے بیٹھے تھے کہ بابر واپس چلا جائے گا اور انہیں اپنے ارادوں کی تکمیل کا موقع مل جائے گا۔

کنواہہ کے مقام پر رانا سانگا ایک لاکھ بیس ہزار جنگجو رسالے کے ساتھ بابر کے خلاف صف آراء ہوا۔ ایک سو بیس سردار اپنے اپنے دستوں کو لیے اس کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار کھڑے تھے۔ حسن خاں میواتی اور محمود لودھی جیسے افغان سردار اس کے ساتھ تھے۔ ابراہیم لودھی کی عبرتناک شکست نے ان سب کی آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ اس خطرے کو اب اچھی طرح محسوس کر رہے تھے جو شمال مغرب کی طرف سے ترکوں کی صورت میں ان پر نازل ہوا تھا۔ ہندوستان کے سبھی چھوٹے بڑے راجے اور سردار رانا سانگا کی کمان میں بابر سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ ان سب لوگوں کو مغلوں کی فتح کی صورت میں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ وہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔

رانا سانگا ایک مشہور جرنیل تھا۔ اس کے جسم پر اسّی زخموں کے نشانات تھے۔ اس کا ایک بازو ایک ٹانگ ایک آنکھ لڑائی کے میدان میں کام آ چکے تھے۔ اس کی شجاعت کی داستانیں زبان زد خلائق تھیں۔

بابر کو ازبکوں کے بعد اب تک اتنی منظم اور ٹھوس قوت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کے سپاہیوں کے پائے استقلال میں تزلزل پیدا ہو گیا۔ بابر لکھتا ہے "میری فوج کا کوئی جرنیل ایسا نہ تھا جس کی زبان سے دلیری کا کوئی کلمہ نکل رہا ہو۔" یہاں بابر کے جوہر کھلے اور اس نے اپنی غیر معمولی لیڈر شپ کا ثبوت دیا۔ ایک ولولہ انگیز تقریر سے اس نے اپنے آدمیوں کے دل بڑھائے اور وہ اپنے بادشاہ کے لیے مرنے مارنے پر تل گئے۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ میدان بابر کے ہاتھ رہا۔

یہ فتح پانی پت کی فتح سے زیادہ اہم تھی۔ پانی پت کے میدان میں بابر نے ہندوستان کے برائے نام سلطان کو شکست دی تھی مگر کنواہہ کی جنگ میں اسے ہندوستان کی صحیح طاقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس فتح کے بعد بابر اطمینان کا سانس لے سکتا تھا۔ کیوں کہ ہندوستان کی سلطنت اَب زخم خوردہ ہو کر اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ اس میں اب زیادہ مقابلہ کی تاب نہ تھی۔ پروفیسر رش بُروک ولیمز لکھتا ہے کہ "لڑائیاں ابھی باقی تھیں اور کافی تعداد میں، مگر اب ان کی نوعیت مختلف تھی۔ اس کی جنگیں اب توسیع سلطنت اور استحکام حکومت کے لیے تھیں حصول تخت کے لیے نہ تھیں۔"

کنواہہ کی شکست نے راجپوتوں کی کر ہمت توڑ دی۔ ہندو سلطنت کے احیاء کے خواب بکھر گئے۔ بچے کچھے راجپوت میدنی راؤ کے جھنڈے تلے جاجمع ہوئے۔ بابر چندیری کے مقام پر ان سے نبرد آزما ہوا اور انہیں شکست فاش دی۔

بہت سے افغان سرداروں نے بابر کی اطاعت قبول کر لی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ان میں سہسرام کا جاگیردار شیر خان بھی شامل تھا جو بعد میں شیر شاہ سوری بنا۔

بابر نے ان فتوحات کے ساتھ ساتھ عوام کو اپنے اعتماد میں لینے کا کام بھی جاری رکھا۔ لوگوں کو جان و مال کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں کو اپنی اپنی جاگیروں میں بحال رکھا گیا۔لوگ ابھی تک مغل لشکر سے خائف تھے۔بابر مسلسل ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرتا رہا۔ابھی وہ انتظام سلطنت کے سلسلے میں کوئی مؤثر قدم نہ اٹھا پایا تھا کہ موت نے اسے آلیا۔

بعض روایات کے مطابق ابراہیم لودھی کی ماں نے اسے زہر پلوادیا تھا جو آہستہ آہستہ اس پر اپنا اثر کرتا رہا۔اس کے قویٰ مضمحل ہورہے تھے۔صحت گر رہی تھی کہ ہمایوں کو بیماری نے آ گھیرا اس صدمے نے موت کو قریب تر کر دیا۔ ہمایوں کے بارے میں بابر نے دعا مانگی تھی کہ اس کی بیماری اُسے لگ جائے جب ہمایوں روبصحت ہونے لگا تو بابر کو یقین ہو گیا کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے اور اب ہمایوں کی بجائے میری جان جائے گی۔اس یقین نے بابر کی زندگی کے دن اور بھی کم کر دیئے۔آخر 26 دسمبر 1530ء کو وہ جاں بحق ہوا۔

❁..........❁..........❁

عبدالرحمٰن الداخل بن اُمیّہ

132ھ میں جب عباسیوں نے خلافت بنی اُمیہ ختم کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تو بنو اُمیہ اور اُن کے حامیوں کا قتل عام شروع ہوا۔ اُس وقت عبدالرحمٰن بن امیہ کی عمر بیس برس تھی۔ وہ اس وقت اپنی جاگیر کے گاؤں میں مقیم تھا۔ جب اُسے پتہ چلا کہ اس کے خاندان کے لوگوں کو چُن چُن کر قتل کیا جا رہا ہے، تو اسے اپنی جان کا خطرہ پڑ گیا اور وہ بھیس بدل کر چھپتا چھپاتا مصر سے ہوتا ہوا افریقہ پہنچا۔ اس صحرا نوردی میں اس کا وفادار غلام بدر بھی اس کے ساتھ تھا۔

گورنر افریقہ نے عبدالرحمٰن کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کیا۔ انعام کے لالچ میں جا بجا اُس کی تلاش ہونے لگی۔ عبدالرحمٰن کو سخت مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ وہ کئی روز تک بھوکا پیاسا رہا اور اسے صحرا میں کئی مہینے روپوش رہنا پڑا۔

آخر اُسے بربری قوم کے قبیلہ زنات کی ایک شاخ، بنونفوسا نے پناہ دی۔ وہ چار پانچ سال یہاں رہا تو اسے معلوم ہو گیا کہ وہ افریقہ میں اپنی حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہاں کا گورنر عباسیوں کا حامی تھا۔ اَندلُس میں اس کی کامیابی کے امکانات تھے۔ کیونکہ وہاں اس وقت خانہ جنگی ہو رہی تھی اور کوئی مضبوط حکمران موجود نہ تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگ وہاں بنواُمیہ کے ہمدرد اور بہی خواہ بھی تھے۔ چنانچہ اُس نے بدر کو ایک خط دے کر اُندلس روانہ کیا۔ اس نے وہاں پہنچ کر بنواُمیہ کے حامیوں کو جمع کیا تو وہ عبدالرحمٰن کی مدد پر آمادہ ہو گئے۔

عبدالرحمٰن اَندلُس کے ساحل پر اترا تو ہزاروں لوگ اس کے استقبال کو موجود تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک فوج تیار ہو گئی اور عبدالرحمٰن نے قرطبہ کے امیر یوسف فہری کو شکست دے کر اَندلُس کے اس اہم شہر پر قبضہ کر لیا۔

عبدالرحمٰن نے 756ء میں ''امیر'' کے لقب سے قرطبہ کی امارت سنبھالی تو کئی بغاوتوں کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ان میں سب سے خطرناک بغاوت سابق امیر اُندلس یوسف قبری کی تھی۔ جو قرطبہ سے فرار ہو کر طلیطلہ پہنچ گیا تھا اور اپنے گرد ایک بڑی فوج جمع کر لی تھی۔ یوسف قبری قرطبہ کی طرف بڑھا۔ مگر عبدالرحمٰن سے شکست کھائی۔ یوسف قبری بے سروسامانی کی حالت میں طلیطلہ کی جانب بھاگا۔ مگر خود اس کے سپاہیوں نے اسے ہلاک کر دیا، تاکہ بغاوت میں شرکت کی سزا انہیں نہ ملے۔

اُس نے اس مہم سے فارغ ہو کر ملک کے اندرونی انتظام کی طرف توجہ کی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے عباسی خلیفہ کا نام خطبے سے خارج کر دیا۔ اس وقت منصور عباسیوں کا خلیفہ تھا۔ اُس نے علا بن مغیث کو 761ء میں ایک سیاہ پرچم بھیجا اور کہا کہ اُندلیس پر چڑھائی کرے۔ لٰہذا کئی قبائل اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ یوسف قبری کے ایک رشتہ دار ہاشم الفہری نے طلیطلہ پر قبضہ کر کے علا بن مغیث کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ عبدالرحمٰن نے طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر علا بن مغیث اپنی فوج کے ساتھ اُندلس میں داخل ہو چکا تھا۔ عبدالرحمٰن کو یہ خبر ملی تو وہ طلیطلہ کا محاصرہ چھوڑ کر مقابلے کے لیے روانہ ہوا اور اسے کچھ ایسے حالات پیش آئے، کہ اُسے اشبیلیہ کے قریب قرمونا میں محصور ہونا پڑا۔ علا بن مغیث اور اس کے ساتھیوں نے قرمونا کو گھیرے میں لے لیا۔ عبدالرحمٰن دو ماہ تک قرمونا میں محصور رہا۔ سامان رسد ختم ہو گیا۔ لوگ بھوکے مرنے لگے تو عبدالرحمٰن نے اپنے ہمراہیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم لوگ موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیں۔''

عبدالرحمٰن کے ساتھیوں نے حلف اٹھایا کہ وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے اور اچانک قلعے کا دروازہ کھول کر محاصرین پر ٹوٹ پڑے۔ عبدالرحمٰن کے ساتھ اس وقت سات سپاہی تھے۔ جنہوں نے اپنے اچانک حملہ سے دشمن کے ہوش وحواس گم کر دیئے اور وہ قلعے کے سامنے ساٹھ ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

فتح کے بعد عبدالرحمٰن نے علا بن مغیث اور چند بڑے سرداروں کے سر کاٹ کر اور ہر ایک کے کان کاٹ کر انہیں صندوقوں میں بھروا کر خلیفہ منصور کے پاس بھیج دیا اور بڑی سختی سے باغیوں کا محاسبہ کیا۔

عبدالرحمٰن کے مخالفوں میں حسین بن عاصی بڑا زبردست شخص تھا۔ یہ شرقسطہ اور اس کے نواح کا حکمران تھا۔ اُس نے عباسی خلیفہ کے ذریعہ فرانس کے بادشاہ شارلیمان کو ترغیب دی کہ وہ اُندلس پر حملہ کرے۔ شارلیمان یلغار کرتا ہوا شرقسطہ پہنچا مگر وہاں کے باشندوں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اندلس میں عیسائی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے شہر شرقسطہ کے دروازے کھولنے سے انکار کر دیا۔ جب شارلیمان نے یہ دیکھا کہ سرقسطہ کے مسلمان اس کے ساتھ شامل ہونے کو تیار نہیں تو وہ فرانس لوٹ گیا۔ اتنے میں عبدالرحمٰن سرقسطہ پہنچ گیا۔ حسین بن عاصی نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔

یہاں سے عبدالرحمٰن نے فرانس کا رُخ کیا اور پہاڑی درّوں کو عبور کر کے فرانس کے میدان میں پہنچ گیا اور نصف جنوبی حصہ کو خوب تاخت وتاراج کیا اور واپس آ گیا۔ کیونکہ شارلیمان اس سے ڈر کر فرانس کی شمالی حدود کی طرف بھاگ گیا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد حسین بن عاصی نے پھر بغاوت کر دی تو عبدالرحمٰن نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔ شارلیمان کو عبدالرحمٰن کی طرف سے بڑا خطرہ تھا چنانچہ اس نے دربارِ قرطبہ میں صلح کی درخواست بھیجی اور اپنی بیٹی کی شادی بھی عبدالرحمٰن سے کرنی چاہی۔ عبدالرحمٰن نے صلح کی درخواست تو منظور کر لی، مگر شارلیمان کی بیٹی کو حرم میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔

اس وقت تک اُندلس میں عبدالرحمٰن کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ 172ھ بمطابق 788ء میں عبدالرحمٰن اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اُس کی طبیعت میں مروّت وفیاضی کا جوہر تھا، لیکن باغیوں اور غداروں نے اسے سختی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا طبعی میلان علم واَدب کی طرف تھا۔ مگر ضرورت نے اسے ایک تجربہ کار سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی دمشق کے شاہی محلات میں عیش عشرت سے گزری تھی مگر جب مصیبت آئی اور افلاس وغریبی سے پالا پڑا تو اس نے بلند ہمتی سے سب کچھ برداشت کیا۔

وہ بڑا حوصلہ مند اور ہوشیار حکمران تھا۔ اُس کا لقب ''صقر القریش'' (قریش کا باز) پڑ گیا۔ بہادری وشجاعت کے علاوہ عبدالرحمٰن میں اور بھی کئی خوبیاں تھیں۔ وہ علم وادب کا قدردان تھا۔ اسے عمارتیں تعمیر کرانے کا بہت شوق تھا۔ قرطبہ میں اس نے بڑی عالیشان مسجد بنائی۔ امور سلطنت کو وہ خود سرانجام دیتا تھا۔

78

عبدالرحمٰن

عباسیوں نے جب امویوں پر فتح پائی تو اُن کے خاندان کے سب لوگوں کو چن چن کر قتل کر ڈالا۔ اس خاندان کا صرف ایک شہزادہ عبدالرحمٰن جو خلیفہ ہشام کا پوتا تھا دشمنوں کے ہاتھ سے بچ نکلا۔ اُس کے بچنے کی وجہ بھی یہ ہوئی کہ جب اُس کے خاندان کے لوگ مارے گئے تو وہ دمشق میں نہیں تھا۔ بلکہ وہاں سے دُور دریائے فرات کے کنارے اپنے محل میں بیٹھا تھا۔ جب اُسے حکومت کے انقلاب کی خبر پہنچی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس کے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔ تو وہ بہت گھبرایا اور جان بچانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ لیکن عباسیوں کے سوار اس کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اُسے ڈھونڈ نکالا۔ اُس حالت میں عبدالرحمٰن سے اور تو کچھ نہ ہوسکا دریائے فرات میں کود پڑا اور ڈوبتا اُبھرتا کنارے جا پہنچا۔ پھر بھیس بدل دشمن کے جاسوسوں سے بچتا ہوا فلسطین پہنچا۔ یہاں اس کے باپ کا آزاد کیا ہوا غلام بدر اُس سے آملا اور اس کی بہن کے بہت سے زیور اور جواہرات بھی ساتھ لایا۔ لیکن فلسطین میں بھی اس خانماں برباد کو سر چھپانے کی جگہ نہ ملی اور اس نے افریقہ کا رُخ کیا۔

افریقہ کا گورنر ابھی تک دل سے بنی امیہ کا حامی تھا۔ اس خاندان کے بہت سے پرانے جاں نثار جنہیں کہیں اور پناہ نہ ملی تھی یہاں سر چھپائے پڑے تھے۔ انہیں عبدالرحمٰن کے آنے کی خبر ملی تو سب اُس کے پاس جمع ہو گئے اور اس ملک میں امویوں کی حکومت قائم کرنے کے منصوبے باندھنے لگے۔ افریقہ کے حاکم نے ابتدا میں اُن سے بڑا اچھا سلوک کیا تھا لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن افریقہ پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہے۔ تو اُس کی جان کالا گو ہو گیا۔ ناچار یہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔

عبدالرحمٰن قیروان سے نکل کر مدتوں صحراؤں اور جنگلوں میں مارا مارا پھرا۔ لیکن حاکم افریقہ کے آدمی پیچھے لگے تھے۔ اس لیے کہیں ایک جگہ جم کے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ بربری قبیلے عربوں کی طرح بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُسے اپنے ہاں جگہ دے کر حاکمِ وقت کو اپنا دشمن بنائے۔ ایک مرتبہ عبدالرحمٰن ایک بربری سردار کے خیمہ میں بیٹھا تھا کہ سواروں کا ایک دستہ جو اُس کی تلاش میں تھا آ پہنچا۔ اس وقت بربری سردار کی بیوی نے بڑی عقلمندی کی۔ یعنی عبدالرحمٰن کو کپڑوں کے ایک ڈھیر تلے چھپا دیا اور حاکم افریقہ کے آدمی اُسے تلاش کر کے واپس چلے گئے۔ غرض وہ اسی طرح برابر پانچ سال تک مصیبتیں اٹھاتا ان جنگلوں اور پہاڑوں میں سر ٹکراتا پھرا۔ ایک دن پھرتا پھراتا قبیلہ زناتہ کے لوگوں میں جا نکلا۔ اس قبیلہ میں اُس کی ننہال تھی۔ اس لیے بنی زناتہ نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور یہاں وہ اطمینان سے زندگی کے دن بسر کرنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد چند پرانے جان نثار جو اس کی طرح مارے مارے پھر رہے تھے، اِدھر آ نکلے۔ ساتھ ہی شام سے ایک قاصد پہنچا جو اسکے بعض دوستوں کی طرف سے تحفے تحائف اور کچھ قیمتی جواہرات لایا۔ عبدالرحمٰن اچھی طرح جان چکا تھا کہ افریقہ میں قدم جمانا مشکل ہے۔ اس لیے ہسپانیہ چل کر قسمت آزمانے کا ارادہ کیا۔ ساتھیوں نے بھی یہ تجویز پسند کی۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ پہلے بدر کو ہسپانیہ بھیجا جائے وہ وہاں اموی خاندان کے خیر خواہوں سے ملے۔ اگر اُن سے مدد اور جان نثاری کی امید ہو تو ہسپانیہ پر حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ بدر کو خط دے کر بھیجا گیا۔ وہاں کے سرکردہ لوگوں نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ مصری تو فوراً عبدالرحمٰن کی مدد پر آمادہ ہو گئے۔ یمنیوں نے بھی کسی قدر پس و پیش کے بعد حامی بھر لی۔ بدر خوش خوش لوٹا۔ یہاں پہلے ہی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ عبدالرحمٰن نے قبیلہ زناتہ کے کچھ بہادروں کو ساتھ لیا۔ اور جہاز پر سوار ہو کر ہسپانیہ کے ساحل پر جا اترا۔ اُس کے آنے کی خبر آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی اور اموی خاندان کے بہت سے جان نثار ہسپانیہ کے حاکم یوسف کو چھوڑ کر عبدالرحمٰن سے آ ملے۔

عبدالرحمٰن نے اپنا عمامہ نیزہ پر لپیٹ کر اُس کا عَلَم بنایا۔ اس عَلَم میں کچھ ایسی کشش تھی کہ لوگ جوق دَر جوق اس کے نیچے جمع ہونے لگے۔ یوسف نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سپہ گری کے جتنے داؤں پیچ یاد تھے سب صرف کر ڈالے۔ لیکن شکست کھا کے بھاگا اور مارا گیا۔ غرض

سال بھر کے اندر اندر ہسپانیہ سے عباسیوں کی سلطنت بالکل اُٹھ گئی اور عبدالرحمٰن نے سارے ملک پر قبضہ کرلیا۔

اُس زمانے میں منصور عباسی خلیفہ تھا۔ اُسے یہ خبریں پہنچیں تو افریقہ کے حاکم کو ہسپانیہ پر لشکر کشی کا حکم دیا۔ ابتدا میں عباسیوں نے ایسا زور باندھا کہ عبدالرحمٰن کا دربار ٹوٹنے لگا اور وہ تھوڑی سی فوج کے ساتھ ایک قلعہ میں گھر گیا۔ یہ حالت دیکھ کر اُس نے سات سو چیدہ سپاہی جن کی عمریں لڑتے بھڑتے اور تلواریں مارتے گزر گئی تھیں، جمع کیے۔ پھر ایک الاؤ روشن کرنے کا حکم دیا۔ جب آگ کے شعلے بھڑکنے لگے تو عبدالرحمٰن نے تلوار کھینچی اور اس کا قبضہ توڑ کر الاؤ میں پھینک دیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اُس کی پیروی کی پھر یہ سب بہادر تلواریں علم کیے، گھوڑے اڑاتے قلعہ سے نکلے اور دشمن کی فوج پر جاپڑے۔ یہ حملہ ایسا اچانک ہوا تھا کہ عباسی فوج کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ عبدالرحمٰن اور اُس کے سرفروش ساتھیوں نے طنابیں کاٹ کر دشمن کے خیمے گرا دیئے اور انہیں آگ لگا دی۔ پھر اس طرح جم کر لڑے کہ ہزاروں کا کھیت پڑ گیا۔ اس معرکہ میں عباسی فوج کے سارے سردار کام آئے۔ عبدالرحمٰن نے اُن کے سر کاٹ کر ایک تھیلے میں ڈال دیئے۔ ہر سردار کے کان میں ایک کاغذ تھا۔ جس پر اس کا نام اور عہدہ لکھا تھا۔ پھر یہ تھیلہ ایک تاجر کی معرفت بغداد بھجوا دیا۔ کہتے ہیں کہ جب خلیفہ منصور کے پاس اموی شہزادہ کا یہ عجیب تحفہ پہنچا تو وہ پکار اُٹھا۔ ''الٰہی تیرا شکر ہے، کہ میرے اور عبدالرحمٰن کے درمیان سمندر کی موجیں حائل ہیں۔''

کچھ دنوں کے بعد ایک اور آفت ہوئی۔ یعنی فرانس کا شہنشاہ شارلمین دو عرب سرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر ہسپانیہ پر چڑھ آیا۔ لیکن عبدارلرحمٰن سے مقابلہ کی نوبت ہی نہ آئی۔ شارلمین کی فوج ایک تنگ درّہ سے گزر رہی تھی کہ باسک قوم نے جو یورپ کی ایک وحشی قوم تھی اُس پر حملہ کر دیا۔ اس دھادے میں شارلمین کی بہت سی فوج کٹ گئی اور وہ ناکام واپس لوٹا۔

اس واقعہ کے بعد اگرچہ عبدالرحمٰن کو کسی بیرونی حملہ آور سے مقابلہ نہیں کرنا پڑا لیکن ملک میں برابر شورشیں ہوتی رہیں اور تو اور اس کے قریبی رشتہ داروں نے جو اُس کی مہربانی کے طفیل عزت اور رتبہ کو پہنچے تھے اُس کے خلاف سازش کی۔ لیکن ناکام ہوئے اور مارے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ عبدالرحمٰن نے ان بغاوتوں اور سازشوں کو دبانے کے لیے لوگوں پر سختیاں بھی کیں لیکن وقت اور ضرورت کا تقاضا یہی تھا۔ اگر عبدالرحمٰن ذرہ بھر غفلت کرتا تو اپنے ہی بھائی بندوں

کے ہاتھوں سے مارا جاتا۔ عربوں پر تو اُسے بالکل اعتبار نہیں رہا تھا۔ البتہ بربری اُس کے جاں نثار تھے۔ اُس نے اپنی حفاظت کے لیے چالیس ہزار بربریوں کی ایک فوج مقرر کر رکھی تھی اور اصل میں اُس کی حکومت انہیں دلاوروں کی تلواروں کے سہارے قائم تھی۔

عبدالرحمٰن نے 33 سال حکومت کر کے 173ھ میں انتقال کیا۔ موت کے وقت اُس کی عمر 58 سال کی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے ہشام کو اپنا جانشین مقرر کر گیا تھا۔ اس لیے اُس کے بعد وہی ہسپانیہ کا فرمانروا مقرر ہوا۔

عبدالرحمٰن بڑا مستقل مزاج، شجاع اور فیاض حاکم تھا۔ اُس نے بڑے چاؤ چونچلے سے پرورش پائی تھی لیکن جوانی میں ایسی سختیوں کا سامنا ہوا جنہوں نے اُسے جفاکش اور مصیبت پسند بنا دیا۔ پھر دوستوں اور عزیزوں سے ایسی بے وفائیاں دیکھیں جنہوں نے اس کے دل کو بہت سخت کر دیا۔ ابتدا میں وہ راتوں کو بھیس بدل کر قرطبہ میں پھرا کرتا تھا۔ شادی غمی کی تقریبوں میں عام مسلمانوں سے ملتا، کبھی کبھی خود جمعہ کی نماز پڑھاتا۔ لیکن جب اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں تو اُس نے تنہا محل سے نکلنا چھوڑ دیا۔

عبدالرحمٰن نے ہسپانیہ کو چھ صوبوں میں تقسیم کیا۔ ہر صوبے میں ایک سپہ سالار مقرر تھا جس کے ماتحت دو والی اور چھ وزیر ہوتے تھے۔ اُن کی مدد کے لیے بہت سے قاضی مقرر تھے۔ اس انتظام کے علاوہ اس نے بہت سے نئے دستور اور قانون باندھے جن سے رعایا کی خوشحالی اور ملک کے امن و امان کو بہت فائدہ پہنچا۔ پرانے زمانے کی جو سڑکیں ٹوٹی پھوٹی پڑی تھیں۔ اُن کی مرمت کرائی، نئی سڑکیں بنوائیں۔ ڈاک کا بہت اچھا انتظام کیا جس کی وجہ سے ملک کے تمام حصوں کی خبریں آسانی سے قرطبہ پہنچنے لگیں۔ ڈاکوؤں اور لیٹروں کو سخت سزائیں دیں۔ اسے عمارتیں بنوانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ قرطبہ میں کئی محل اور مسجدیں بنوائیں باغ لگوائے۔ قرطبہ کی جامع مسجد بھی اسی عالی مرتبہ حکمران کی یادگار ہے۔ اس مسجد کا نقشہ خود عبدالرحمٰن نے بنایا۔ اُس کا سنگِ بنیاد بھی اپنے ہاتھ سے رکھا۔ دُور دُور سے اُس کے لیے مسالہ منگوایا خود ہر روز ایک گھنٹہ آ کر ادنیٰ مزدوروں کی طرح کام کرتا تھا۔ اُس کی آرزو تھی کہ یہ مسجد اُس کی زندگی میں تعمیر ہو جائے لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ جب اُس نے دیکھا کہ زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں تو ایک جمعہ کو مسجد کے صحن میں تھوڑی سی جگہ صاف کرائی۔ ایک شامیانہ تانا گیا۔ محل سے پردے لا کر لٹکا دیئے

گئے اور عبدالرحمٰن نے سفید کپڑے پہن کر خطبہ پڑھا۔ چند دنوں کے بعد اسی جگہ عبدالرحمٰن کا تابوت پڑا تھا اور وہ لوگ نمازِ جنازہ پڑھ رہے تھے۔

اگرچہ قرطبہ میں خدائی بھر کے سامان جمع تھے لیکن دمشق کی یاد کبھی کبھی عبدالرحمٰن کو سخت بے چین کر دیتی تھی۔ اُس نے یہاں جو محل تعمیر کرائے وہ سب دمشق کے محلوں کے نمونے پر تھے۔ شہر سے باہر ایک باغ بنوایا جس کا نام اپنے دادا ہشام بن عبدالمالک کے باغ کے نام پر رصافہ رکھا۔ کھجور کا درخت ہسپانیہ میں نہیں ہوتا۔ عبدالرحمٰن نے شام سے کھجور کا ایک درخت منگوا کے اپنے محل کے درمیان لگوایا۔ عبدالرحمٰن بہت اچھے شعر کہتا تھا۔ چنانچہ عربی کی کتابوں میں اُس کے اکثر شعر ملتے ہیں۔

❁..........❁..........❁

امیر سیّد عبدالقادر حسنی الجزائری

عثمانی حکومت نے الجزائر کے ساحلی علاقوں میں ایک طاقتور بحری بیڑہ تیار کیا تھا جو عرصہ تک بحیرہ روم پر بلاشرکت غیرے حکمرانی کرتا رہا۔ جب بھی باب عالی (ترکی) کو جہاد کے لیے بحری بیڑے کی ضرورت ہوتی الجزائر کا بحری اڈہ فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس بحری قوت نے الجزائر سے متصل یورپی ساحلوں تک اپنے اثر ونفوذ کا دائرہ بڑھالیا تھا، لیکن جوں جوں عثمانی حکومت کمزور ہوتی گئی اس بحری بیڑے اور مغرب اقصیٰ کے علاقوں پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس بحری بیڑے نے جہاد کی بجائے بحری قزاقی شروع کر دی۔ الجزائر پر حکمران ترک حُکام نہ صرف اس قزاقی سے چشم پوشی کرتے بلکہ مال غنیمت میں سے بھی حصہ لیتے۔ اس صورتِ حال سے مجبور ہو کر فرانس نے 1659ء سے 1686ء تک مسلسل بحری حملوں کے ذریعے الجزائر کے بحری بیڑے کی قوت توڑ کر رکھ دی۔ اس کے بعد ہی برطانوی اور فرانسیسی تجارتی جہاز آزادی کے ساتھ نقل وحرکت کرنے لگے، جب کہ ڈنمارک اور ہالینڈ الجزائر کے بحری بیڑے کو حفاظتی ٹیکس ادا کرنے کے بعد ہی سمندر میں نقل وحرکت کر سکتے تھے، اس لیے کہ ان دونوں ملکوں کے پاس اتنی بڑی طاقت نہیں تھی جو ان کی حفاظت کر سکتی۔

1827ء میں جب الجزائر کے حکمران حسین والی اور فرانسیسی کونسلر جنرل کے درمیان تجارتی راہداری کے مسئلہ پر اختلافات نے سنگین صورت اختیار کر لی تو فرانس نے 5 ستمبر 1830ء میں الجزائر پر قبضہ کر لیا یہ کارلوس دہم کا زمانہ تھا اور ابھی فرانس جمہوری انقلاب سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو فرانس کا ارادہ یہی تھا کہ الجزائر کے ساحلی علاقوں ہی پر وہ اپنا قبضہ رکھے گا اور اندرونی حکومت کے متعلق الجزائر کے باشندوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کر لے گا اس لیے کہ پورے ملک پر

قبضہ کرنے کی صورت میں بھاری اخراجات ہوں گے لیکن ایک کمیٹی نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پورے الجزائر پر فرانسیسی تسلط ضروری ہے خواہ اس راہ میں کتنی ہی مالی قربانیوں سے گزرنا پڑے، اس فیصلہ پر عمل کیا گیا اور آہستہ آہستہ پورے ملک پر فرانسیسی اقتدار مسلط ہو گیا۔ بہت سے شہروں میں فرانسیسی فوج کو شکست سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ الجزائر کے مغربی علاقے نے امیر عبدالقادر الجزائری کی قیادت میں پندرہ سال تک فرانس کی طاقتور اور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس فوج کے چھکے چھڑا دیے، حالانکہ امیر کے پاس فوجی طاقت چند ہزار سے زیادہ نہ تھی جب کہ فرانس نے اس مٹھی بھر جماعت کے مقابلہ کے لیے ایک لاکھ آٹھ ہزار فوج بھیج دی تھی جسے الجزائر کو سرنگوں کرنے میں پندرہ سال لگ گئے۔

جب فرانسیسی فوج الجزائر کے بعض ساحلی شہروں اور صحرائی علاقوں پر قبضہ کر رہی تھی تو مغربی علاقہ کے قبائل نے ان فوجوں کو ذلت آمیز شکست دی۔ ان کی اس جنگی یورش اور کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان قبائل نے اپنا ایک امیر بنا لیا تھا جو سادات حسنی کے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔

امیر عبدالقادر کا تعلق ایسے سادات حسنی کے گھرانے سے تھا جو مغرب اقصیٰ سے ہجرت کر کے الجزائر کے مرکزی شہر دہران آ گیا تھا۔ اس خاندان کے حضرات پورے مغرب اقصیٰ میں اپنے زہد و تقویٰ، اخلاص وللّٰہیت، تواضع و بے نفسی، مجاہدے، ایثار و قربانی اور غیرت ایمانی کے لیے مشہور تھے، ان میں ممتاز صفات اور دینی فہم و فراست کی بناء پر مغرب اقصیٰ کے قبائل ان کے گرویدہ اور عاشق تھے۔ ان نمایاں اور ممتاز لوگوں میں امیر عبدالقادر کے والد ماجد سیّد محی الدین بھی تھے جنہوں نے فرانسیسی استعمار کی آمد سے قبل ایک دینی مسئلہ کو لے کر الجزائر کے ترک حکام کے خلاف شورش میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ حج کی تیاری کر رہے تھے کہ دہران کے گورنر نے ان کو گرفتار کر لیا، لیکن تحقیق و تفتیش کے بعد ان کو رہا کر دیا اور حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اپنے صاحبزادہ امیر عبدالقادر اور ممتاز علماء وفضلاء کی ایک جماعت کے ساتھ حجاز کے لیے روانہ ہو گئے، دو سال کے عرصہ میں ان حضرات نے حرمین شریفین کے علاوہ عراق، شام اور مصر کا بھی دورہ کیا، جب یہ وفد الجزائر پہنچا تو الجزائر کے ترک حکام اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، کہا جاتا ہے کہ امیر عبدالقادر نے اپنے والد کو اس جنگ میں شرکت سے روکا،

ترکوں اور فرانسیسیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی، باب عالی سے فوجی مدد نہیں مل سکی کہ اس کی پالیسی سفارتی ذرائع سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی تھی۔ چنانچہ مجبوراً ترک حُکام نے شہر کو فرانسیسی فوج کے حوالے کر دیا۔ لیکن اس کے بعد الجزائری عوام اور فرانسیسی فوج کے درمیان خون ریز جنگ ہوئی، اس کی قیادت سید محی الدین نے کی۔ امیر عبدالقادر کی جنگی حکمت عملی، سیاسی سوجھ بوجھ، غیر معمولی شجاعت اور جرأت و ہمت نے عوام وخواص دونوں کے دلوں میں جگہ بنالی اور سب ہی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ لیکن چونکہ ان کے والد موجود تھے اس لیے ممتاز قبائل ''ہاشم''، ''غربہ'' اور ''بنو عامر'' نے سیّد محی الدین حسنی سے باقاعدہ امارت قبول کرنے کی درخواست کی تا کہ ایک خود مختار حکومت کی تشکیل ہو جائے اور اس کی قیادت میں فرانسیسی استعمار سے جنگ کی جائے، باب عالی سے کسی امداد کی توقع بیکار تھی، سیّد محی الدین حسنی نے امارت قبول کرنے سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، البتہ انہوں نے اپنے صاحبزادہ امیر عبدالقادر کی غیر معمولی قائدانہ صلاحیت کی تعریف کی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ چنانچہ 1832ء میں امیر کے ہاتھ پر تینوں ممتاز قبائل نے بیعت کر لی، اس وقت امیر کی عمر صرف 24 سال کی تھی۔ امیر کی پیدائش 1808ء مطابق 1223ھ کی ہے۔

امیر عبدالقادر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور دوسرے ممتاز اساتذہ سے حاصل کی۔ ویسے تو پورا گھرانہ علم وتقویٰ کے ساتھ جنگی فنون میں ماہر تھا، لیکن عبدالقادر کو بچپن ہی سے حصولِ علم کا غیر معمولی شوق تھا۔ اَدب، فقہ اور توحید میں غیر معمولی تفوق اور امتیاز رکھتے تھے۔ طالب علمی کے دور ہی میں فنون سپہ گری، گھڑ سواری، نشانہ بازی میں بھی مہارت حاصل کر لی، علمی اور دینی موضوعات پر ان کا قلم رواں اور تحریر شگفتہ ہوتی تھی، اس طرح اپنے سادات خانوادے کی خصوصیات سیف وقلم، جامِ شریعت اور سندانِ عشق کی جامعیت کے وہ علمبردار وداعی تھے۔

2 نومبر 1832ء کو جب ان کی بیعت مکمل ہو گئی تو ان سے درخواست کی گئی کہ اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لقب استعمال کریں، لیکن انہوں نے اس سے معذرت کی اور کہا کہ ہم مراکش کے سلطان کے مطیع وفرماں بردار ہیں اس لیے امیر المومنین کا لقب زیادہ مناسب ہے۔

امیر عبدالقادر نے قیادت سنبھالتے ہی سب سے پہلے العسکر نامی شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا، چونکہ مصر کے سفر میں وہ محمد علی پاشا کی فوج اور ادارتی اصلاحات کو دیکھ چکے تھے اس لیے

اسی طرز پر انہوں نے اپنی فوج کی جدید تنظیم کی۔ جدید طرز کے اسلحہ کی تیاری کے لیے متعدد شہروں میں کارخانے قائم کیے، یہاں تک کہ فوجی یونیفارم کے لیے بھی انہوں نے گھر قائم کیا۔ دوسری طرف الجزائر اور مراکش کے صحرائی اور پہاڑی علاقوں میں پھیلے ہوئے قبائل میں دینی شعور بیدار کرنے کا ایک ٹھوس منصوبہ بنایا، اس منصوبے میں بچوں، بچیوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کی تعلیم کے مراکز، شبینہ، صباحی مکاتب کا نظام، زراعت اور تجارت کی بھرپور تنظیم، بنیادی ضرورتوں کے لیے صنعتی کارخانے، اسی کے ساتھ مساجد کے ذریعہ دینی شعور کو بیدار کرنے اور تصوف کے حلقوں کے ذریعہ جہاد کی روح پھونکنے کا پروگرام شامل تھا۔ فاس اور ازہر کے علماء سے فتادے حاصل کر کے تمام مسلمانوں کو صدقات وزکوٰۃ اور عشر ادا کرنے کے احکامات جاری کیے، شرعی احکام کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرنے اور ان فیصلوں کی تنفید کے لیے قاضی مقرر کیے۔ امیر نے یہ بھی فرمان جاری کیا کہ جو قبائل فرانس کے زیرِ تسلط علاقوں میں بستے ہیں ان کا دینی فرض ہے کہ وہ دارالکفر کے ان علاقوں سے ہجرت کر کے دارالسلام آجائیں اس لیے کہ یہ مقبوضہ علاقے ہیں اور عیسائیوں کے زیرِ نگیں ہو کر رہنا شرعی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

امیر نے گیارہ ممتاز علماء پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ کی تشکیل کی تاکہ حکومت کا نظام باقاعدہ چلایا جاسکے۔ اس مجلس کے علاوہ ایک سپریم کونسل بھی قائم کی جہاں سے فیصلوں کی آخری توثیق ہوتی تھی، وزراء کا کام صرف یہ تھا کہ وہ سپریم کونسل کے فیصلوں کی تنفید کریں۔ خارجی امور، ٹیکس اور اوقاف وغیرہ کے لیے وزراء مقرر کیے گئے۔ جنگی امور خود امیر براہِ راست دیکھتے تھے۔

امیر جس رقبہ پر حکومت کرتے تھے وہ سارے کے سارے قبائلی اثر و نفوذ کے علاقے تھے اس لیے ان ہی قبائل کے سرداران کا نظام کیا گیا۔ یہ لوگ خلیفہ کہلاتے تھے اور تمام امور میں وہ سپریم کونسل کے سامنے جوابدہ ہوا کرتے تھے۔ ان خلفاء کا کام یہ تھا کہ صدقات اور عشر و زکوٰۃ جمع کر کے امیر کے پاس پابندی سے روانہ کیا کریں، اگر مزید مالی امداد کی ضرورت ہو تو تحصیل و وصول کے بعد مرکز کو بھیج دیا کریں۔

شرعی احکام کی تنفید کی برکت جلد ہی کھل کر سامنے آگئی، کثرت سے صدقات وزکوٰۃ اور عشر کی رقمیں، نیز جہاد کے لیے مالی امداد امیر کے پاس آنے لگی۔ ان تمام رقوم کو وہ فوجی تنظیم، اسلحہ کارخانوں کے قیام، مساجد اور مدارس کے نظام تعلیم و تربیت پر صرف کرتے تھے۔ جدید طرز

کی فوجی تربیت کے لیے ترکی اور فرانس کے ریٹائرڈ فوجی افسروں کی خدمات حاصل کیں، اسی کے ساتھ کوہ اطلس کے غاروں، چوٹیوں اور صحراء کے حصوں میں فوجی ساز و سامان اور غذائی رسد کے محفوظ ذخائر اور قلعے تعمیر کیے، جو قدیم قلعے شکستہ ہو رہے تھے ان کی مرمت کرائی اور ان کو فوجیوں کے سپرد کر دیا۔ امیر کی انتھک محنت اور قبیلہ قبیلہ جا کر فرداً فرداً ملنے سے بہت سے قبائل ان کے ساتھ ہو گئے۔ خصوصاً بربری قبائل نے ان کی اعانت اور ہمدردی کا وعدہ کیا حالانکہ یہ قبائل دینی شعور کے فقدان کی وجہ سے فرانسیسیوں کے حملوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

امیر نے داخلی استحکام کے منصوبوں کی تکمیل کے ساتھ غیر ملکی طاقتوں سے بھی خط و کتابت کا آغاز کیا تا کہ ان سے تعلقات بہتر بنا کر فرانس پر سفارتی دباؤ ڈالا جا سکے۔ چونکہ دہران کے مغربی ساحل پر امیر کا قبضہ تھا اس لیے فرانس نے امیر کی سفارتی سرگرمیوں کو تاڑ لیا، اس نے مختلف عرب قبائل کے ذریعہ دھران کے ساحلی حصوں کو امیر کے قبضے سے نکالنے کی زبردست سازش کی جو آخر کار کامیاب ہو گئی، لیکن فرانسیسی فوج کے لیے سامان رسد کی سپلائی سنگین صورت اختیار کر گئی، اس لیے کہ امیر نے ایک عام فتویٰ جاری کر دیا تھا کہ جو شخص بھی فرانسیسی فوج کو کسی طرح کی مدد دے گا وہ مرتد قرار دیا جائے گا جس کی سزا قتل ہے۔ اس فتویٰ کی وجہ سے فرانسیسی حکام پریشان ہو گئے اور امیر کے ساتھ سلسلہ جنبانی کے بہانے تلاش کرنے لگے۔ امیر کے پاس موجود چار فرانسیسی اسیروں کے مسئلہ کو لے کر فرانسیسی گورنر ڈیمشیل نے خط و کتابت کا آغاز ستمبر 1833ء میں کیا۔

مسلسل تین خطوط کے جواب میں امیر نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا، چوتھے خط کا جواب بہت صاف اور کھرا تھا۔ لیکن ایک جملہ یہ بھی تھا کہ چونکہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے اس لیے ان اسیروں کو واپس کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس جواب پر ڈیمشیل نے قاصد بھیجا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان معاہدہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ آپ تیار ہوں۔ امیر کے سامنے فرانسیسی حکام نے معاہدے کی جو بنیادیں پیش کیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ فرانسیسی فوج اپنے مقبوضہ علاقوں سے سامان رسد ضرورت کے مطابق خرید سکتی ہے۔ دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کی حالت ختم کی جائے۔ امیر کے زیر تسلط علاقوں میں فرنچ تاجروں کی آمد و رفت کی اجازت دی جائے، فرانس کے زیر اقتدار علاقوں میں امیر کے یہاں کے لوگ مسافر اور سیاح کی صورت

میں پاسپورٹ اور راہداری کے کاغذات کے ساتھ آسکتے ہیں۔ ہماری طرف سے کوئی فوجی بھاگ کر امیر کے پاس چلا جائے تو اس کو واپس کر دیا جائے گا۔ امیر اس معاہدے میں ترمیم اور تبدیلی چاہتے تھے۔ لیکن فرنچ حُکام نے مزید گفتگو اور تبادلۂ خیال کا موقع نہیں دیا اور یک طرفہ طور پر معاہدے کا اعلان اس تصریح کے ساتھ کر دیا گیا کہ امیر نے اس معاہدے کی منظوری دے دی ہے ادھر امیر نے بھی اعلان کر دیا کہ ہم اس یک طرفہ طور پر معاہدے کے کسی طرح بھی پابند نہیں ہیں۔ اس معاہدے کی اطلاع جب پیرس پہنچی تو حکومت نے ہدایات جاری کر دیں کہ امیر عبدالقادر سے سالانہ جزیہ لیا جائے اسیروں کو بزور طاقت واپس لیا جائے، اگر امیر کو اسلحہ کی ضرورت ہو تو وہ فرانس سے خرید سکتے ہیں، لیکن نوعیت اور مقدار کا آخری فیصلہ فرنچ وزارت جنگ کرے گی۔

اگرچہ امیر نے اس نامعقول اور یک طرفہ معاہدے کو قبول نہیں کیا لیکن فرانس نے ایسا زبردست پروپیگنڈا کیا کہ تمام عرب قبائل میں امیر کے خلاف بدگمانیاں پھیل گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی حسد اور گروہی عصبیتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا، اور سرکشی و بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ ان قبائل نے ٹیکس دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جہاد کے لیے جو اضافی ٹیکس لگایا گیا تھا، حالتِ جنگ کے خاتمہ کے بعد اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ دوسری وجہ شورش کی یہ ہوئی کہ تھوڑے عرصہ میں امیر نے الجزائر سے لے کر مراکش اور تیونس تک میں جو غیر معمولی شہرت، اثر و رسوخ اور کامیابی حاصل کر لی تھی اس نے بعض قبائل کے قائدین میں حسد کی آگ بھڑکا دی۔ جس کا ایک سنگین نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی بار شورش پسندوں کے سرغنہ مصطفیٰ بن اسماعیل نے امیر کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ پھر جب ناکام ہو گیا تو بھاگ کر فرانسیسی حُکام سے مل گیا اور امیر کے خلاف ہر طرح کی مدد کرنے لگا۔ لیکن امیر نے بہت جلد ان شورشوں پر انتہائی دانشمندی اور حکمت عملی سے قابو پا لیا بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ ان کی فوجی گرفت ان علاقوں پر مضبوط ہو گئی، جس سے فرانسیسی اور بھی گھبرا گئے۔ اِدھر ان کی تشویش اس وقت اور بڑھ گئی جب دہران اور مستغانم کے ساتھ مرکزی شہر قسنطینہ بھی امیر کے قبضے میں آ گیا۔

اگر چہ یک طرفہ معاہدے میں جغرافیائی طور پر اس بات کی تحدید نہیں کی گئی تھی کہ کون سے علاقے امیر کے قبضے میں رہیں گے، لیکن اس کے باجود فرنچ گورنر نے امیر کے ان نئے قبضوں کے خلاف ایسا شدید احتجاجی مراسلہ بھیجا جیسے الجزائر فرانس کا ایک حصہ ہو، امیر نے اس

احتجاجی مراسلہ کونظر انداز کر کے کسی طرح کی گفتگو سے انکار کر دیا۔

چونکہ یک طرف معاہدے کے باوجود دونوں فریقوں کے درمیان مسلسل حالت جنگ چل رہی تھی اس لیے بعض انتہا پسند لیڈروں نے حکومت فرانس سے مطالبہ کر دیا کہ ڈیمشیل کو گورنری سے معزول کر کے ایسا فوجی گورنر بھیجا جائے جو وہاں اپنا فوجی تفوق اور برتری ثابت کر دے۔ اس مطالبہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مارسیلیا کے تاجروں نے شکایت کی تھی کہ ہماری مصنوعات پر الجزائر میں سخت پابندی ہے، امیر کے فتوؤں کی وجہ سے کوئی تاجر ہم سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اس کے برعکس الجزائر کی مصنوعات فرانس اور دوسرے ملکوں کی منڈیوں میں آزادی کے ساتھ پہنچ رہی ہیں۔ اس غیر معمولی مالی خسارے سے انہیں بچایا جائے۔ چنانچہ فرانس کی حکومت نے جنرل ٹریزل کو فوجی گورنر بنا کر الجزائر بھیج دیا۔

نئے فوجی جنرل نے دو مہینے تک الجزائر کے حالات کا بھرپور جائزہ لیا، اس کے بعد اس نے رشوت کے ذریعہ دو بڑے قبیلوں کو توڑ لیا، اور ایک بڑی فوجی طاقت کے ساتھ امیر عبدالقادر پر یورش بھی کر دی، اِدھر امیر بھی غافل نہیں تھے۔ انہوں نے گھات لگا کر اپنی مختصر فوجوں کی مدد سے ایسا اچانک بھرپور اور تیز حملہ کیا کہ فرانسیسی فوج کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا، 254 فوجی مارے گئے اور چار سو زخمی ہوئے۔ یہ شکست فرانس کی حکومت کے لیے بہت زبردست صدمے کا باعث بنی۔ اگرچہ ذرائع ابلاغ نے اس شکست کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کی، لیکن حکومت کے مخالفین نے مطالبہ کیا کہ الجزائر سے فوج واپس بلالی جائے کہ بجز جانی اور مالی نقصان کے کچھ ہاتھ نہیں آرہا ہے۔ فرانس کی حکومت نے جنرل ٹریزل کو واپس بلا کر ان کی جگہ جنرل کلوزیل کو مقرر کر دیا جس نے بھرپور طاقت کے ساتھ امیر کے دارالحکومت العسکر پر حملہ کر دیا، ادھر امیر کو اس حملہ کی سن گن پہلے سے مل گئی اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس بار مقابلہ ناممکن ہے اس لیے کہ دس ہزار کے درمیان کوئی تناسب نہیں۔ امیر نے پورا شہر چند گھنٹوں میں خالی کر دیا، لیکن جانے سے پہلے اہم تنصیبات کو برباد کر دیا تاکہ فرانسیسی فوج کے کچھ ہاتھ نہ لگ سکے۔ فرانسیسی فوج کو جب یہاں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو اس نے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوری کوچ کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا ان قبائل پر فوری اثر ہوا جو امیر کے دارالحکومت کے سقوط سے متاثر اور بددل ہو کر امیر سے الگ ہو چکے تھے، انہوں نے ازسرِ نو امیر کی اطاعت کا اقرار اور معاہدہ کیا۔ اس

طرح دارالحکومت کے سقوط سے امیر کی فوجی اور سیاسی قوت واستحکام پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑا، بلکہ فرانسیسی فوج نے دوسرے علاقوں میں جس درندگی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے ان قبائل کو اور بھی متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔

اِدھر جنرل کلوزیل نے 1832ء میں قسنطینہ کے ترک گورنر احمد بک سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے حملہ کر دیا۔ مستحکم جغرافیائی پوزیشن اور ترک فوجوں کی غیر معمولی شجاعت نے فرانسیسی فوجوں کے چھکے چھڑا دیئے اور وہ خاصے جانی و مالی نقصان کے بعد شکست کا داغ لے کر واپس ہونے پر مجبور ہو گئی اس درمیان شہر تلمسان میں امیر کی فوجوں نے فرانسیسی فوجوں کو محصور ہونے پر مجبور کر دیا، جس کی وجہ سے فرانسیسی حکومت نے ایک دوسرے تجربہ کار جنرل بیگو کو الجزائر بھیجا، اس نے امیر عبدالقادر کی فوجی حکمت عملی (چھاپہ مار جنگ) کا جواب چھاپہ مار جنگ سے دینے کا منصوبہ بنایا، اس مقصد میں اس کو دو معرکوں میں فوری طور سے کامیابی بھی مل گئی، لیکن فرنچ حُکام کو اندازہ ہو گیا کہ قسنطینہ اور دہران پر بیک وقت حملہ کرنے کے بجائے پہلے امیر عبدالقادر کی طرف سے اطمینان کر لیا جائے، چنانچہ قسنطینہ سے توجہ ہٹا کر جنرل بیگو نے امیر عبدالقادر سے صلح کی بات چیت کا ارادہ ظاہر کیا، اس زمانہ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ امیر برطانوی حکومت سے خط و کتابت کر رہے ہیں، اگرچہ برطانیہ نے امیر کے خطوط کا جواب نہیں دیا لیکن اس بات پر تیار ہو گیا کہ وہ فرانس کی توسیع پسندانہ پالیسی پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دے گا، ادھر امیر کے سفارت کاروں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ مراکش کے ذریعہ امیر کو برطانوی اسلحے ملنے والے ہیں۔ ان حالات میں امیر صلح کی بات چیت کے لیے اس لیے تیار ہو گئے کہ وہ حالت جنگ کو ختم کر کے اپنی حکومت کے اثر و رسوخ اور دائرہ کو مزید وسعت دینا چاہتے تھے، وہ فرانسیسیوں کی اس سازش کی تہ تک پہنچ سکے کہ اس معاہدہ کے ذریعہ فرنس حُکام امیر کو قسنطینہ کے معاملہ میں بے دست و پا کر کے اس پر قابض ہو جائیں گے۔

اگرچہ معاہدہ کی پابندی 31 مئی 1837ء سے 18 اکتوبر 1839ء تک صرف دو سال پانچ ماہ کی کی گئی، لیکن اس معاہدہ کو الجزائر کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن تاریخی موڑ کہا جا سکتا ہے۔

❁..........❁..........❁

عثمان

ارطغال کے بعد اس کا بیٹا عثمان قبیلہ کا سردار مقرر ہوا۔ اس خاندان میں سب سے پہلے اِسی شخص نے خودمختاری کا علم لہرایا۔ اسی لیے ترکی کے فرمانبردار اس کے نام پر عثمانی کہلاتے ہیں۔ عثمان کی زندگی کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں عسکی شہر کے پاس کسی گاؤں میں ایک نیک اور پرہیزگار شخص رہتا تھا۔ عثمان اکثر اس کے پاس جاتا اور اس کی باتیں سُنا کرتا تھا۔ اس شخص کی لڑکی مال خاتون جسے قمریہ بھی کہتے تھے بہت حسین تھی۔ عثمان کو اس لڑکی سے محبت ہوگئی۔ پہلے تو اس نے یہ راز چھپائے رکھا پھر ایک دن مال خاتون کے باپ سے ذکر کردیا۔ لیکن وہ عثمان سے اپنی بیٹی کا بیاہ کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔

ایک رات کو عثمان نے خواب میں دیکھا کہ وہ اور مال خاتون کا باپ دونوں زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ یکا یک بڈھے درویش کے سینے سے ایک چاند نکلا اور عثمان کے سینے میں سما گیا۔ تھوڑی دیر میں عثمان کی کمر سے ایک درخت اُگ آیا، جو آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ اس میں کونپلیں پھوٹیں، شاخیں نکلیں۔ پھر یہ شاخیں بڑھ کر خشکی اور تری پر پھیل گئیں۔

پھر دیکھا کہ اس درخت کے پتوں نے ایک شامیانے کی صورت اختیار کرلی ہے جسے چار پہاڑ کا کیشیا، اطلس، طاری اور بلقان سہارا دیئے ہوئے ہیں اور چار دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینیوب ان کے ساتھ ساتھ بہ رہے ہیں۔ دریاؤں میں کشتیاں اور جہاز چل رہے ہیں۔ میدانوں میں کھیتیاں لہلہا رہی ہیں۔ کہیں شمشاد اور صنوبر کے درخت ہیں، کہیں گلاب اور چنبیلی کے پودے۔ کہیں پھول اور پھل۔ پھر دیکھا شہروں کے مینار، قلعوں کے برج، گرجوں اور مسجدوں کے گنبد سر اٹھائے کھڑے ہیں اور اُن پر ہلال چمک رہا ہے۔ یکا یک بڑے زور کی ہوا چلی اور ہلال قسطنطنیہ کے تاج سے جا ٹکرایا۔ اس وقت عثمان کو قسطنطنیہ کا شہر دو سمندروں اور دو براعظموں کے درمیان اس

طرح کھڑا نظر آیا۔ گویا ایک بڑی انگشتری میں نیلم اور زمرد جڑے ہیں جن کے درمیان ہیرے کا ایک نگینہ آب وتاب دکھا رہا ہے۔ عثمان نے اس انگشتری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

صبح اٹھتے ہی اس نے یہ خواب مال خاتون کے باپ کو جا سنایا۔ خواب سنتے ہی بوڑھے درویش کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور اس نے عثمان کو تخت وتاج کی خوشی خبری سنا کے مال خاتون سے اس کا بیاہ کر دیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اُن کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام ارخان رکھا گیا۔ اسی سال ارطغال نے انتقال کیا اور عثمان اپنے قبیلہ کا سردار مقرر ہوا۔ یہ واقعہ 1288ء (687ھ) کا ہے۔ ترکوں کے عروج کا آغاز اسی تاریخ سے ہوتا ہے۔

ابھی عثمان کو سردار مقرر ہوئے سال بھر کا عرصہ ہوا تھا کہ سلجوق سلطان نے خوش ہو کر اسے قراجہ حصار کا علاقہ بخش دیا۔ اب عثمان نے اپنی قوت بڑھانی شروع کی۔ پہلے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے سرداروں کو اپنا مطیع بنایا۔ پھر ینی شہر کو فتح کر کے اسے اپنا صدر مقام بنایا اور عیسائیوں کے کئی قلعے فتح کر لیے۔

جس زمانے میں عثمان اس چھوٹے سے علاقے میں اپنے حریفوں سے لڑ بھڑ رہا تھا۔ سلجوقیوں کی حکومت پر زوال آیا اور ان کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دس چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گئی جن میں عثمان کی ریاست بھی شامل تھی۔ اب عثمان نے بالکل آزاد ہو کر روم کی عیسائی سلطنت کی طرف جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا، توجہ کی۔ اور کئی قلعے اور شہر فتح کر کے بزوصہ پر جا چڑھا۔ اس شہر کا فتح ہونا بڑا مشکل تھا۔ اس لیے اس نے بزوصہ کے سامنے دو قلعے بنائے اور ان میں بیٹھ کر اطمینان سے آس پاس کے علاقے فتح کرنے شروع کر دیئے۔ عثمانی ترک کبھی کبھی آبنائے باسفورس تک حملے کر جاتے تھے اور رومیوں سے کچھ بھی نہ بن پڑتا تھا۔ دس سال کے معرکوں کے بعد عثمان کے بیٹے اُرخان نے بزوصہ کی دیواروں پر عثمانی پرچم گاڑ دیا۔

جب بزوصہ فتح ہوا تو عثمان کی زندگی کے آخری دن تھے۔ اس فتح کے بعد وہ بہت تھوڑے دن جیا اور لائق بیٹے نے باپ کی لاش کو اس کی وصیت کے مطابق بزوصہ میں دفن کیا۔ عثمان کے زمانے تک ترکوں کی زندگی بہت سیدھی سادی تھی چنانچہ اس کی ساری کائنات بھیڑ بکریوں کے چند گلے، کچھ گھوڑے اور چند بیل تھے یا نمک کا ایک پیالہ ایک چمچہ ایک عمامہ اور ایک قبا۔ عثمان مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور گھٹنوں سے نیچے تک پہنچتے تھے۔ موت کے وقت اس کی عمر ستر سال کی تھی۔

عروج الدین باربروسا

1503ء میں امیر البحر عروج الدین باربروسا نے اپنے مختصر بیڑے کو لے کر ساحل بربر کے پاس ایک محفوظ بندرگاہ میں چھپا دیا۔ اور جب کبھی دشمن کا کوئی بیڑا اسپین کے مسلمانوں کو ستانے کے لیے پیچھا کرتا، امیر البحر عروج الدین باربروسا اس کا بڑی دلاوری سے مقابلہ کرتا۔ تونس کی بندرگاہ قدرتی طور پر بڑی مستحکم مضبوط اور چھپی ہوئی سی بندرگاہ تھی۔ حلق الوید کا چھوٹا سا قلعہ امیر البحر عروج کے مختصر بحری بیڑے کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ عروج نے اِسے اپنا بحری مرکز بنایا اور اسپین کے مسلمان جلاوطنوں کا خیر مقدم کرتا تھا اور ان کے آرام کے لیے ہر طرح کی کوشش کرتا تھا۔

عروج سلطان تونس کے دربار میں پہنچا اور ملازمت کی درخواست کی۔ سلطان نے اسے امیر البحر مقرر کرلیا۔ اس نے بحری بیڑے اور بندرگاہوں کی تنظیم کی۔ جلد ہی امیر البحر عروج نے بحرروم میں ایک تہلکہ مچا دیا، اور جنوبی یورپ کے عیسائی بحری بیڑے کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اور اسپین سے مقابلہ کرنے کے لیے زبردست تیاریاں کیں۔ جبرالٹر کے قریب دونوں بیڑوں کا مقابلہ ہوا۔ جس میں فتح عروج الدین باربروسا کی ہوئی۔ لیکن وہ اس معرکے میں زخمی ہو گیا۔ زخم کے علاج کے لیے تونس گیا۔ عروج کی بیماری کے زمانے میں اس کے بھائی خیرالدین باربروسا نے جنگی بیڑے کی کمان سنبھال لی۔

اِسی اثنا میں عیسائیوں کے ایک بحری بیڑے نے عیسائی امیر البحر ڈوریا کی کمان میں تونس کی بندرگاہ پر حملہ کیا اور اسے تباہ و برباد کر کے عیسائی بیڑا واپس چلا گیا۔ اس شکست نے خیرالدین باربروسا کو غیرت دلائی اور وہ اپنے بھائی عروج کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر سیدھا جزیرۂ جربہ میں پہنچا، اور وہاں نئے سرے سے بحری بیڑا ٹھیک کیا۔ اتنے میں امیر البحر عروج بھی

تندرست ہو کر چھوٹے بھائی خیر الدین سے آملا۔ انہوں نے بوجید کے قلعہ پر حملہ کیا۔ کئی دن کے بعد قلعے کے سر ہونے کی امید بندھ چلی تھی کہ ٹھیک اسی وقت اسپین والوں کو بحری کمک پہنچ گئی۔ امیر البحر عروج کی فوجوں کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ عروج نے جلدی میں اپنے باقی ماندہ زائد جہازوں کو آگ لگا کر ڈبو دیا، تا کہ دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

امیر البحر عروج اس ناکامی پر بہت شرمندہ ہوا۔ اُس نے تونس واپس جانے کی بجائے جبل بنی ہلال کی ایک پوشیدہ پہاڑی کھاڑی میں پناہ لی۔ اور جبل بنی ہلال پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کے باشندے بڑے سرکش تھے۔ اپنے سردار کی اطاعت قبول نہ کرتے تھے۔ لیکن امیر البحر عروج نے اسلامی اخوت کے برتاؤ سے ان کے دل موہ لیے۔ انہوں نے عروج کی اطاعت قبول کر لی۔

اُندلس کے سینکڑوں قبیلے جو غرناطہ، اشبیلیہ، قادس اور الیمامہ کے پر رونق شہروں سے جلاوطن ہو کر الجزائر کے ساحل پر خانہ بدوشوں کی طرح پڑے تھے، یہاں بھی اسپین والے انہیں ستاتے تھے۔ سلیم شاہ حاکمِ الجزائر کی برّی فوج تو زبردست تھی، لیکن بحری فوج بہت کمزور تھی۔ چنانچہ امیر البحر عروج سے بحری بیڑے کی مدد مانگی اور اسے بتایا کہ اسپین والوں کے ظلم سے مسلمانوں کو بچانا ہمارا فرض ہے۔

امیر البحر عروج بڑا پکا مسلمان تھا۔ اس نے سلیم شاہ کی تجویز مان لی۔ 1516ء میں ایک مختصر بحری بیڑا لے کر جس میں چھ ہزار جوان تھے، الجزائر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں شہر شرشیل پر قبضہ کر لیا۔ یہ شہر ایک ترک حاکم قرہ حسن نامی کے قبضہ میں تھا۔ قرہ حسن نے مقابلہ کیا، جس میں وہ مارا گیا۔ بحری فوجیں آگے بڑھیں اور الجزائر کے پاس ایک قلعے کا محاصرہ کر لیا اور اہلِ قلعہ کو کہلا بھیجا کہ:

"قلعہ خالی کر کے اسلامی فوجوں کے سپرد کر دو گے تو تمہیں کسی قسم کی اذیت نہ پہنچے گی۔"

قلعہ کے افسر نے جواب میں کہلا بھیجا:

"ہم ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والے نہیں، ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔

چنانچہ دوسرے دن محاصرہ شروع ہوا۔ جو بیس دن جاری رہا۔ عروج کے جانباز سپاہی مسلسل قلعے پر آگ برساتے رہے۔ اسی عرصے میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ اُندلس کے

جلاوطن مسلمان اور عروج کے سپاہی کسی بات پر آپس میں جھگڑ پڑے۔ اس جھگڑے نے بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔

اُندلسیوں نے عروج کی فوج کے خلاف خفیہ سازش کی۔ جو پکڑی گئی اور سازشیوں کو سزائے موت دی گئی۔ عیسائی فوجیں جو قلعے میں بند تھیں اس امید میں تھیں کہ بس بغاوت ہو جائے گی اور ہم محاصرہ سے نجات پالیں گے۔ لیکن اس بغاوت کی ناکامی پر ان پر مایوسی چھا گئی۔

اب انہوں نے اسپین کی حکومت سے فوجی مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ اسپین کے بحری محکمے نے ایک بحری بیڑا سات ہزار نوجوانوں کی مسلح جمعیت کے ساتھ ڈان ڈی گوڈی ویرا کی سرکردگی میں بھیجا۔ یہ امیر البحر بڑا پرانا تجربہ کار تھا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، جس میں امیر البحر ڈان ڈیگوڈی ویرا کو شکست فاش ہوئی اور اس کا ایک بھی جہاز نہ بچ سکا۔

اب عروج الدین باربروسا نے اپنے اقتدار کو بڑھانے کے لیے بری اور بحری فوج کی نئے سرے سے تنظیم کی اور تمام الجزائر کو فتح کر کے ایک مضبوط حکومت قائم کر لی۔

اِسی اثناء میں چارلس پنجم اسپین کے تخت پر بیٹھا۔ تو اس نے ایک خاص بحری بیڑا تیار کیا اور پندرہ ہزار بحری فوج اور بری فوج الجزائر پر حملہ کرنے کے لیے منظم کی اور حملہ کر دیا۔

عروج الدین باربروسا اس وقت الجزائر کے علاقہ میں بہت سی مختصر فوج کے ساتھ مقیم تھا۔ ہسپانوی فوج نے عروج کو علاقہ طلسمان میں گھیر لیا۔ عروج نے اپنے جانبازوں کے ساتھ دشمن کی فوجوں کا بڑی جرأت سے مقابلہ کیا۔

ایک یورپی مؤرخ لکھتا ہے کہ کہاں پندرہ سو کی جمعیت اور کہاں پچیس ہزار کی یورش۔ لیکن مسلمانوں نے بڑی جرأت سے مقابلہ کیا۔ ہر ایک شیر ببر کی طرح آخری دم تک لڑتا رہا اور سب کے سب شہید ہو گئے۔ ان شہیدوں میں عروج الدین باربروسا بھی تھا۔

عروج الدین کی شہادت پنتالیس برس کی عمر میں ہوئی۔ عروج درمیانے قد کا تھا، داڑھی اور سر کے بال سُرخ، آنکھیں روشن، ناک لمبی اور اونچی۔ امیر البحر عروج نے اپنے پیچھے وہ اولوالعزم اور بہادر شاگرد اور چھوٹا بھائی چھوڑا جس نے اسلام کی بحری تاریخ میں بڑا نام پایا۔ جس کو دنیا خیرالدین پاشا باربروسا کے نام سے یاد کرتی ہے۔

❁..........❁..........❁

علاؤالدین خلجی

علاؤالدین خلجی کا اصل نام محمد، اور ترکی عرف گرشاسپ تھا۔ وہ خلجی خاندان کے بانی سلطان جلال الدین فیروز شہنشاہ دہلی کا سگا بھتیجا اور داماد تھا۔ اس نے اسے اپنے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ بچپن ہی میں وہ بڑا انڈر اور دلیر تھا۔ جب جوان ہوا تو کئی لڑائیوں میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ جلال الدین نے خوش ہو کر اُسے کڑہ کا گورنر بنا دیا۔ اگرچہ علاؤالدین اَن پڑھ تھا مگر تھا بڑا منتظم اور عزم والا۔ اس کے سامنے کامیابیوں کے لیے کھلا میدان پڑا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ارادے تھے۔ اس کو روکنا مشکل تھا۔ سب سے پہلے اس نے سلطان سے اجازت لے کر بھیلسہ (مالوہ) پر حملہ کیا اور وہاں سے بہت سا مالِ غنیمت جمع کر کے دہلی بھیجا۔ سلطان نے خوش ہو کر کڑہ کے علاقہ اودھ کی گورنری بھی اس کے سپرد کر دی۔

جب علاؤالدین بھیلسہ میں تھا، تو اس نے وہاں سنا کہ قلعہ دیوگیر میں بے شمار دولت جمع ہے۔ اس نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ دیوگیر کو ضرور فتح کرے گا۔ مگر اس میں ایک بڑی دقت تھی۔ کڑہ سے دیوگیر (موجودہ دولت آباد) کا فاصلہ آٹھ سو میل تھا۔ راستے میں گھنے جنگل، بڑے بڑے پہاڑ اور بغیر پُلوں کے تیز بہنے والے دریا پڑتے تھے۔ وہاں تک پہنچنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ علاؤالدین کو یقین تھا، کہ سلطان اس کی اجازت نہیں دے گا۔ چنانچہ اس نے ایک چال چلی۔ اُس نے سلطان کو لکھا کہ وہ چندیری پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ چندیری اُس وقت بڑی راجدھانی تھی اور اس مقام کی جنگی اہمیت یہ تھی کہ مالوہ دکن کے راستے یہاں سے ہو کر جاتے تھے۔ جب سلطان نے ہاں کر لی تو علاؤالدین فوجی تیاریاں کرنے لگا۔ اس مہم کی ایک وجہ اور بھی بیان کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ علاؤالدین کی بیوی بڑی مغرور تھی۔ اُسے گھمنڈ تھا کہ وہ شہزادی ہے اس کی ساس اور زیادہ

بد دماغ خاتون تھی۔ علاؤالدین ان دونوں سے تنگ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں نکل بھاگے۔ اسی لیے جب اُس نے دیوگیر پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا، تو یہ پروانہ کی کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

جب تیاریاں مکمل ہوگئیں، تو علاؤالدین کٹرہ سے نکلا۔ یہ فوج کشی انتہائی دلیری اور جرأت کا کام تھا۔ وہ اگر ہار جاتا تو اس کا اور اس کی فوج کو اتنے دور دراز ملک سے بچ کر آنا ممکن نہ تھا۔ دہلی کے کسی بادشاہ نے اب تک دکن پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کی تھی۔ علاؤالدین کی فوج کی تعداد سات ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر فوج کا ایک ایک سپاہی تجربہ کار اور اپنے سردار پر جان نچھاور کرنے والا تھا۔ یہ پوچھے بغیر کہ کہاں جانا ہے اور کب واپس آنا ہے، سب اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ علاؤالدین نے ایک ہوشیاری یہ کی کہ ایسے راستے اختیار کیے جو غیر آباد تھے تاکہ اسے چھوٹی سے چھوٹی لڑائی بھی نہ لڑنی پڑے اور اس طرح نہ وقت ضائع ہو نہ فوج۔ دو مہینے کے سفر کے بعد علاؤالدین یکا یک گھٹی لاجورا کے میدان میں داخل ہوگیا۔ یہ مقام اب لاسور کہلاتا اور دیوگیر سے چودہ میل شمال مغرب میں ہے۔ جس وقت یہ فوج لاسور کے قریب پہنچی تو کسی سپاہی نے ایک تیر کمان میں رکھ کر بستی کی طرف چلا دیا۔ وہ نیچے گر کر آدھے سے زیادہ زمین میں دھنس گیا۔ ایک کسان یہ تیر لاسور کے حاکم کاہنا کے پاس لایا اور وہ دوڑا ہوا راجہ رام دیو کے سامنے دیوگیر لے گیا اور تیر دکھا کر کہا۔ ''ترکوں کی فوج ملک میں آ پہنچی۔ اب خیر نظر نہیں آتی۔'' تیر اتنا لمبا اور بھاری تھا کہ راجہ کو یقین نہ آیا۔

جس وقت یہ فوج وہاں پہنچی، تو دیوگیر کے بہت سے سپاہی راجہ کے بیٹے اور رانی کے ہمراہ تیرتھ یاترا کرنے گئے تھے۔ علاؤالدین نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ شہنشاہ دہلی کی اصلی فوج پیچھے آ رہی ہے۔ اُس نے سب سے پہلے شہر کو خوب لوٹا اور پھر قلعہ دیوگیر کا محاصرہ کرلیا۔ راجہ رام دیو نے سوچا کہ اصلی فوج آنے سے پہلے پہلے علاؤالدین سے صلح کر لینی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بالکل ہی مارے جائیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے چند معتبر آدمی اس کے پاس بھیجے۔ انہوں نے کہا۔ ''آپ کا یہاں آنا دُور اندیشی سے خالی ہے۔ آپ نے بے شک شہر پر قبضہ کرلیا ہے مگر اس کا سبب یہ تھا کہ وہاں کوئی فوج مقابلہ کے لیے موجود نہیں تھی۔ آپ کو اس پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ جلد ہی اس علاقے کے بڑے بڑے راجہ لشکر لے کر آئیں گے، اور آپ کو گھیر گھار کر مار ڈالیں گے۔ آپ کا ایک سپاہی بھی زندہ بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ پچاس من سونا، کئی من موتی اور قیمتی

سامان لے کر یہاں سے چلے جائیں۔"

علاؤالدین نے سوچا۔اس میں کیا حرج ہے۔اس نے راجہ رام دیو کی یہ پیش کش قبول کر لی۔اتنے میں کیا ہوا کہ راجہ کا لڑکا فوج لیے ہوئے دیوگیر پلٹا۔راجہ نے اپنے بیٹے کو کہا۔"قسمت میں جو لکھا تو وہ ہو کر رہا۔خدا کا شکر ہے ہم کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوئی۔رعایا کو کچھ نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کر دی جائے گی۔بہتر ہو گا کہ جنگ نہ ہو۔یہ مسلمان عجیب لوگ ہیں۔اِن سے لڑنا ٹھیک نہیں۔"

بیٹے نے جواب دیا۔"میری فوج دشمن سے دُگنی ہے اور آس پاس کے راجے میری مدد کو آرہے ہیں۔"

اور پھر طاقت کے نشہ میں سرشار علاؤالدین کو پیغام بھیجا کہ۔"اگر تم کو اپنی جان عزیز ہے تو جو کچھ لیا ہے وہ واپس کر دو اور اپنے وطن کی راہ لو۔"

یہ پیغام سُن کر علاؤالدین آگ بگولہ ہو گیا۔اپنے ایک سردار ملک نصرت کو قلعہ کا محاصرہ سپرد کیا اور خود اس نے رام دیو کے بیٹے کی فوج پر حملہ کر دیا۔بڑی سخت جنگ ہوئی۔ملک نصرت نے دُور سے دیکھا کہ مسلمان کی مُٹھی بھر فوج دشمن کے دل بادل میں گھر گئی ہے،تو وہ چکر دے کر ایک طرف سے دکنیوں پر جا پڑا۔وہ سمجھے کہ شہنشاہ دہلی کی خاص فوج آ گئی ہے بس کیا تھا، بھاگ نکلے اور علاؤالدین کو فتح ہوئی۔دیوگیر سے اُسے منوں سونا،چاندی،موتی اور جواہرات اتنی مقدار میں ملے کہ دہلی کے خزانے میں اس کا دسواں حصہ بھی موجود نہ تھا۔اس کے ساتھ ہی ساتھ ہاتھی اور سو بڑے بڑے اونٹ ہاتھ آئے۔انہیں پر یہ مال لاد کر کڑہ روانہ کیا گیا۔ایک حملہ میں اتنا مال اب تک کسی فاتح کے ہاتھ نہ لگا تھا۔

علاؤالدین کی واپسی اور فتح سے بڑھ کر بے اندازہ مالِ غنیمت لانے کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔بادشاہ نے اسے دہلی بُلوا بھیجا۔مگر اُس کے دل میں کچھ بدگمانی بیٹھ گئی تھی۔اس نے لکھا کہ بادشاہ خود کڑہ تشریف لے آئیں اور سارا مالِ غنیمت ان کی خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔اصل میں علاؤالدین خود بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔سلطان جلال الدین کشتی میں بیٹھ کر اپنے بھتیجے کی ملاقات کو آیا۔جب کشتی سے اُترا اور اُس سے بغل گیر ہوا،تو جیسا کہ سازش ہو چکی تھی،خونیوں نے گھات سے نکل کر بوڑھے مسلمان کو قتل کر دیا۔

اب علاؤالدین دہلی کا بادشاہ تھا۔مخالفوں کا منہ پیسے سے بند کر دیا گیا۔جو ذرا سخت تھے

اُنہیں مروا ڈالا یا قید کر دیا گیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اُسے مغلوں سے دو دو ہاتھ کرنا پڑے۔ مغل خراسان اور ترکستان سے اکثر ہندوستان پر حملے کرتے رہتے تھے۔ دہلی کی افراتفری سُن کر مغل چناب کے پار اُتر آئے تھے۔ شاہی فوجوں نے جالندھر سے آگے بڑھ کر انہیں روکا، اور لاہور کے قریب سخت شکست دی۔ دوسری دفعہ مغلوں کا ایک بڑا لشکر سیلاب کی طرح آیا، اور سیدھا دہلی تک آ پہنچا جمنا کا رُخ چھوڑ کر تین طرف سے شہر کو گھیر لیا۔ اردگرد دیہات کے ہزاروں لوگ شہر میں جمع ہو گئے۔ اجناس کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ شہری سخت پریشان ہو گئے۔ کسی نے علاؤالدین کو صلاح دی، کہ مغلوں کے ٹڈی دل کو نہ چھیڑا جائے اور انہیں کچھ مال و دولت دے کر ٹال دیا جائے۔ علاؤالدین نے کہا سلطنتِ دہلی پر حکومت کرنا اور لڑائی سے جی چرانا ایسا ہے جیسا کہ اونٹ چُرا کر جھاڑی میں چھپنا۔ اگر مَیں روپیہ پیسہ دے کر واپس کر دوں تو رعایا کے دل میں میرا کیا رُعب رہے گا؟" چنانچہ فوجی تیاریاں کر کے شہر سے باہر آیا۔ مہر دلی کے قریب زبردست جنگ ہوئی۔ اگرچہ مغلوں کی فوج بہت زیادہ تھی مگر وہ علاؤالدین کے حملوں کے آگے نہ ٹھہر سکے اور بھاگ نکلے۔ دہلی کی فوجوں نے ان کا پیچھا کیا۔ اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں مغل قتل ہوئے۔ علاؤالدین نے سوچا کہ مغل آئے دن حملے کرتے رہتے ہیں۔ ان کے حملوں کی ہمیشہ کے لیے روک تھام کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اُس نے نہ صرف فوج کی تنظیم کی، بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا۔ تمام قلعے دُرست اور مضبوط کیے۔ چھاؤنیوں میں زیادہ فوجیں رکھی گئیں۔ اس کے بعد مغلوں نے دو تین اور بھی حملے کیے۔ مگر ہر بار ایسی منہ کی کھائی پڑی کہ ایک زمانہ تک دہلی کی طرف رُخ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ یہ سلطان علاؤالدین کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اُس نے ہندوستان کے مسلمان کو مغلوں کی لوٹ مار سے بچا لیا تھا۔

سلطان علاؤالدین خلجی اب بڑی طاقت و قوت کا مالک تھا۔ وہ عجیب عجیب خواب دیکھنے لگا۔ اس نے ارادہ کیا کہ سکندرِ اعظم کی طرح اپنی سلطنت کسی وزیر کے سپرد کر کے ساری دنیا کی فتح کے لیے نکلے۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اسے اس کی بے وقوفی سے خبردار کرے۔ وزیروں امیروں کو چاروناچار ہاں میں ہاں ملانا پڑتی تھی۔ آخر اُس کے چچا علاؤالملک نے اُسے سمجھایا، اور کہا۔ "دنیا کی فتح کا خیال مناسب ہے مگر اس زمانے میں ایسا وفادار وزیر کون ملے گا۔ جو سلطان کی غیر موجودگی میں سلطنت کو سنبھالے۔ دنیا کی فتح کے مقابلے میں گجرات، مالوہ اور دکن فتح کیا جائے تا کہ اپنا ملک چھوڑ کر باہر جانے میں بادشاہ کو گھر کی فکر نہ رہے۔" علاؤالدین یہ سُن کر

بہت خوش ہوا اور بولا۔ ”میں ایسا ہی کروں گا۔“

چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس نے اپنے دو سرداروں الغ خاں اور نصرت خاں کو رنتھمبور کی فتح کے لیے بھیجا۔ محاصرہ کے دوران میں نصرت خاں مر گیا۔ الغ خاں نے قلعہ پر قبضہ کرنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ آخر علاؤ الدین خود اس طرف روانہ ہوا۔ اُس نے جاتے ہی حکم دیا کہ خندق میں ریت کی بوریاں ڈالی جائیں، اور اس وقت تک ڈالی جائیں کہ وہ بھرتے بھرتے اصلی فصیل کے برابر اونچی ہو جائیں۔ اس کام میں قلعے کے سپاہی آگ اور تیروں کی بوچھاڑ کرتے رہے۔ مگر دہلی کے سپاہیوں نے کوئی پروانہ کی۔ علاؤ الدین خود آ کر اُن کا دل بڑھاتا تھا۔ آخر اس کے سپاہی جان پر کھیل کر ریت کے پشتے سے کُود کُود کر قلعہ میں گھس گئے۔ راجہ مارا گیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔

رنتھمبور کے محاصرہ کے دوران میں علاؤ الدین پر دو قاتلانہ حملے ہوئے تھے اور تین چار بغاوتیں ہوئی تھیں۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ اس لیے کہ علاؤ الدین یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ان بغاوتوں کی وجہ کیا ہے، اور ان کے خاتمے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنے امیروں وزیروں سے مشورہ کیا۔ پتہ چلا کہ بغاوتوں کے چار سبب ہیں: (1) بادشاہ ملکی معاملات سے بے خبر ہے۔ (2) شراب کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ (3) امیروں کے آپس کے تعلقات، میل جول اور رشتے داریاں ہیں اور چوتھے مال و دولت کی کثرت ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو بغاوت کے منصوبے بنانے کی فرصت ملتی ہے۔ سلطان نے فوراً اس طرف توجہ کی۔ اُس نے بڑے سخت قانون بنائے۔ وہ جاگیریں اور انعام جو لوگوں کو دیئے گئے تھے واپس لے لیے گئے۔ جوا کھیلنے اور شراب پینے کی ممانعت کر دی گئی۔ سلطان نے سب سے پہلے خود شراب پینے سے توبہ کی۔ شراب کے جتنے برتن تھے، سب تڑوا دیئے۔ خفیہ پولیس کا نہایت وسیع محکمہ بنا اور یہ حکم جاری ہوا، کہ امیر وزیر بادشاہ کی اجازت کے بغیر باہم شادی بیاہ نہ کریں۔ اور آپس میں زیادہ میل جول نہ رکھیں۔ دیہات میں سرکاری مال گزاری وصول کرنے والے چودھری اور نمبردار جتنا روپیہ سرکار کے خزانے میں داخل کرتے اسی کے برابر فریب سے روپیہ لے کر اپنے گھر بھرتے تھے۔ محکمہ کے سرکاری عہدے داروں کو رشوتوں اور نذرانوں کی عادتیں پڑ گئی تھیں یہ سب باتیں سختی سے ختم کی گئیں۔ دوآ، مالوہ اور پنجاب کے تمام ضلعوں کی پھر سے پیمائش اور مال گزاری تشخیص کرائی گئی۔ مگر

ان سے بھی زیادہ سلطان علاؤ الدین نے جو کارنامہ انجام دیا، وہ یہ تھا کہ مختلف جنسوں کی قیمتیں مقرر کر دیں۔ تا کہ سرکاری ملازموں کی جو تنخواہیں مقرر ہوں، ان میں وہ آسانی سے گزارہ کر سکیں۔ بازار میں بکنے والی کوئی چیز مشکل سے ایسی ہوگی، جس کی قیمت مقرر نہ کی گئی ہو۔ گوشت، سبزی، دھنیا، پودینا تک کی قیمت معین کی گئی تھی۔ سوئی، کنگھی، جوتی اور برتنوں میں مٹی کا مٹکا اور ٹھلیا تک نہیں چھٹے تھے، اِسی طرح حلوائی کی مٹھائیوں اور نانبائی کی تافتان سے لے کر سُوکھی روٹی تک کے دام مقرر تھے۔ علاؤ الدین کے جیتے جی ان قیمتوں اور نرخوں میں فرق نہیں آیا، اور یہ اس کی اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت کا ثبوت ہے۔

فوجی تنظیم کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔ نئے قلعے بنوائے گئے اور پُرانے قلعوں کی مرمت کروائی گئی۔ اسلحہ بنانے کے کارخانے کھولے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں چار لاکھ 75 ہزار سواروں کی جرار فوج مرتب ہوگئی۔ اِن سواروں کی اتنی تنخواہیں مقرر کی گئیں، جن میں بڑے آرام سے ان کی گزر اوقات ہو جاتی تھی۔ دکن کی لڑائیوں کے لیے الگ فوج تیار ہوئی۔ ساری فوج پوری طرح مسلح اور کیل کانٹے سے لیس تھی۔ اس کے سپہ سالار ایسے لوگ مقرر کیے جو تجربہ کار اور بہادر تھے۔

سلطان علاؤ الدین تخت پر بیٹھا، تو مارواڑ، جھالاواڑ اور انہل واڑ کی ریاستیں دہلی کے ماتحت تھیں۔ لیکن جب موقع ملتا آزادی کا دم بھرنے لگتی تھیں۔ سلطان نے اپنے دو سپہ سالاروں کو ان کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا۔ اس کے علاوہ جزیرہ نما گجرات پر فوج کشی کی۔ وہاں کا بڑا راجہ کرن اپنی ریاست کے ساتھ رانی کنول دیوی کو بھی چھوڑ کر بھاگ گیا اور بگلانہ کے پہاڑی علاقہ میں چھپ گیا۔ بگلانہ صوبہ بمبئی میں ہے۔ راجہ کرن کے بھاگ جانے کے بعد بھی گجرات کے چھوٹے چھوٹے راجہ اور رئیس مقابلہ کرتے رہے اور کئی سال تک قابو میں نہ آئے۔ ان کو قابو میں لانے کے لیے یہاں کافی فوج رکھنی پڑی۔ اس کے ساتھ ہی راجپوتانہ کی طرف سے پورا اطمینان ضروری تھا۔ رنتھمبور کی فتح کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ سلطان نے خود چتوڑ پر چڑھائی کی اور وہاں کا محاصرہ کر لیا۔ آٹھ مہینے کی کوشش کے بعد چتوڑ فتح ہوا۔ وہاں کے راجہ کے بھتیجے رتن سین نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ سلطان کا وفادار رہے گا۔ چنانچہ یہ عہد اُس نے سلطان کی زندگی تک نبھایا۔ اسی دوران میں گجرات فتح ہوا اور بہت سا خزانہ شاہی فوج کے ہاتھ آیا۔ اس کے ساتھ ہی

مالوہ پر قبضہ کر کے اسے دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ مانڈو، اجین، اور چندیری بھی فتح ہوئے۔ ان کے راجاؤں نے اطاعت قبول کر لی۔ ان کی گدی پر انہیں برقرار رکھا گیا۔

دیو گیر کی مہم میں علاؤالدین کو دکن کی دولت اور اندرونی خرابی کا اچھی طرح پتہ چل گیا تھا۔ راجپوتانہ اور مالوہ کی فتح کے بعد اُسے وہاں کا خیال آیا۔ چنانچہ ایک لاکھ سواروں کا لشکر تیار کیا گیا، اور اس کی سپہ سالاری ملک کافور کے سپرد کی گئی۔ راستے میں جو جو علاقے پڑتے تھے، ان کے گورنروں اور حاکموں کو حکم بھیجا گیا کہ ملک کافور کی ہدایتوں پر بے چون و چرا عمل کریں اور اس کی ہر طرح سے امداد کریں۔ ملک کافور نے دیو گیر کا رُخ کیا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، دیو گیر کا راجہ ایک بار پہلے علاؤالدین سے ہار چکا تھا۔ وہ بھلا کیا مقابلہ کرتا پہلے ہی حملہ کے بعد ہار مان گیا۔ قلعہ سے باہر نکل کر ملک کافور کا استقبال کیا۔ بڑے قیمتی تحفے پیش کیے۔ پھر خود دہلی گیا اور سلطان کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ علاؤالدین نے خوش ہو کر اُسے رائے رایان کا خطاب اور سفید چتر دیا اور اس کی ریاست برقرار رکھی۔ راجہ پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ واقعی سلطان کا بندۂ بے دام بن گیا۔ اس کے بعد جنوبی دکن میں سلطان نے جو فوجیں روانہ کیں راجہ نے ان کی بہت مدد کی۔

تین سال کے بعد کافور کو دکن میں درنگل کی فتح کے لیے بھیجا گیا۔ روانگی پر علاؤالدین نے اسے تاکید کی اگر راجہ مال و دولت پیش کرے اور پابندی سے خراج دینے کا وعدہ کرے تو قبول کر لینا۔ اس سے معاملہ کرنے میں سختی نہ کرنا۔ اور اس بات پر زور نہ دینا کہ وہ ضرور تمہارے پاس آئے۔ ملک کافور کے آنے کی خبر سنتے ہی وہاں کا راجہ رائے لار دیو اور آس پاس کے حاکم قلعہ میں داخل ہو گئے۔ یہ قلعہ مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک اور مضبوط قلعہ تھا۔ ملک کافور نے محاصرہ کر لیا راجہ رام دیو نے بھی پوری پوری مدد کی، اور دہلی کی فوجوں کو غلہ، چارہ اور دیگر ضروری سامان دیا۔ کئی مہینے کے محاصرے کے بعد بیرونی قلعہ فتح ہوا۔ یہ دیکھ کر درنگل کے راجہ نے اطاعت قبول کر لی۔ اس نے بہت سامال، جواہرات، ہاتھی اور گھوڑے پیش کیے اور وعدہ کیا کہ ہر سال پابندی سے خراج ادا کرتا رہے گا۔ ملک کافور یہ مالِ غنیمت لے کر دہلی واپس ہوا۔

اگلے سال سلطان کے حکم سے ملک کافور ریواڑی اور دیو گیر کے راستہ سے جنوبی دکن پہنچا۔ پہلے ہی وہاں کا مشہور شہر دوار سمدر زد میں آیا۔ وہاں کے راجہ ویر بلال نے مقابلہ کیا مگر شکست

کھائی اور اطاعت قبول کر لی۔ یہاں سے سونے، چاندی اور جواہرات کی بڑی مقدار ہاتھ آئی۔ اس کے بعد کافور نے دوسری بڑی ریاست معبر کا رُخ کیا اور بڑی آسانی سے وہاں کی راجدھانی مدورا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اور کئی شہروں کو فتح کیا۔ اس مہم میں کافور کو جو مالِ غنیمت ملا وہ کبھی نہ ملا تھا بس یوں سمجھیے کہ اس میں پانچ سو ہاتھی، پانچ ہزار گھوڑے اور سو من جواہرات بھی شامل تھے۔

ملک کافور دہلی پہنچا ہی تھا کہ خبر آئی۔ راجہ رام دیو مر گیا ہے۔ اس کا لڑکا شنکر دیو تخت پر بیٹھا اس نے دہلی کو سالانہ خراج بھیجنا بند کر دیا۔ ملک کافور کو فوراً وہاں بھیجا گیا تا کہ اس بدعہدی کی اُسے سزا دی جائے۔ اس سلسلہ میں اُس نے سارا مہاراشٹر پامال کر ڈالا، اور شنکر دیو گرفتار ہو کر مارا گیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ تمام فتوحات سپہ سالار کافور کی ہمت اور ذہانت اور سپاہیوں کی دلیری اور بہادری کے طفیل حاصل ہوئیں۔ مگر ان سب کی تہ میں سلطان علاؤ الدین کا عزم، حوصلہ اور نئے ملک فتح کرنے کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اگر وہ ان میں خود دلچسپی نہ لیتا اور ان کا باقاعدہ انتظام نہ کرتا تو یہ سب کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک کام بڑی سمجھداری کا کیا جس کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ اس نے دکن کے علاقوں کو فتح کر کے انہیں سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ بلکہ وہاں کے راجاؤں سے اطاعت اور باجگواری کا عہد لے کر ان کی گدیوں پر برقرار رکھا۔ دکن دہلی سے دُور تھا۔ درمیان کے علاقے دشوار گزار تھے اور وہاں مسلمانوں کی کوئی آبادی بھی نہ تھی جو اپنی حکومت کی مدد کر سکتی۔ ایسی حالت میں وہاں سارا انتظام کرنا بھاری ذمہ داری کا کام تھا۔

اتنی عظیم الشان فتوحات اور اتنی زبردست طاقت حاصل کر کے سلطان علاؤ الدین خلجی نے 1316ء میں وفات پائی۔

سلطان علاؤ الدین کا شمار مسلمانوں کے بڑے بڑے بادشاہوں اور فاتحوں میں ہوتا ہے۔ اس نے غیر معمولی حالات میں حکومت کی، اور ان حالات پر قابو پانے کے لیے غیر معمولی طریقے اختیار کیے۔ اُس نے فوج کی ایسی اچھی تنظیم کی کہ مغلوں کو پیچھے دھکیل دیا، بلکہ ان پر ایسا خوف طاری کیا کہ ایک عرصہ تک انہوں نے دہلی کا رُخ نہ کیا۔ پھر اس نے اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کر کے کہیں سے کہیں تک پہنچا دیا۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ تاریخ میں وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے قریب قریب تمام پاکستان، ہندوستان اور دکن میں اپنا خطبہ پڑھوایا اور اپنی بادشاہی کا سکہ چلایا۔ وہ خود بڑا دلیر اور حوصلہ مند انسان تھا۔ خطروں کی پروا نہیں کرتا تھا اور اُسے لڑنے لڑانے میں

بڑی مہارت تھی۔

اُس نے قیمت بندی کا ایسا اچھا انتظام کیا، جس کی مثال نہیں مل سکتی پھر اس کی ذہانت دیکھیے کہ دوسرے بادشاہوں نے بغاوتوں کو ختم کرنے کے لیے فوجی قوت سے کام لیا۔ مگر علاؤالدین نے بغاوتوں کے بنیادی اسباب معلوم کیے، اوران کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کرنے کی کوشش کی۔

اگرچہ سلطان علاؤالدین اَن پڑھ تھا اور ظاہر ہے کہ اُسے اَدب اور شاعری وغیرہ سے کیا لگاؤ ہوسکتا تھا مگر پھر بھی اس کا عہد دہلی کی سلطنت کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جن میں تہذیب وتمدن اور علوم وفنون ترقی کرتے ہیں۔ اس کی بے دار مغزی کے سبب ملک میں ہر طرف امن وامان تھا۔ باہر سے بھی حملہ کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ چیزیں سستی تھیں۔ جن لوگوں کو علم واَدب کا شوق تھا وہ چین سے اپنا شوق پورا کرتے تھے۔ اِس کے عہد میں دہلی میں کئی باکمال جمع ہو گئے تھے۔ اِن میں سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور امیر خسروؒ بہت مشہور بزرگ ہوئے ہیں۔

❀............❀............❀

83

علی رئیس پاشا

سترھویں صدی کے وسط میں سیدی علی رئیس نامی ایک مشہور امیر البحر گزرا ہے جو بحری جنگ اور جہاز رانی میں خیرالدین باربروسا کا ہم پلہ تھا۔ یہ ایک نومسلم کپتان کا بیٹا تھا۔ جو یورپ کے ایک مشہور عیسائی خاندان سے تھا۔

علی رئیس کو بحری جنگی تربیت اور جہاز رانی کا تجربہ اپنے باپ سے حاصل ہوا۔ پھر اس نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے 14 جہازوں کا ایک بیڑا تیار کر لیا، اور قسطنطنیہ جا کر دولت عثمانیہ کے بحری محکمے میں ملازمت کر لی۔ سلطان نے اس کی شہرت اور تجربہ کاری کی بناء پر اسے امیر البحر بنا دیا۔

1638ء میں علی رئیس نے ترکی بیڑا لیا اور مشرقی ساحل پر حملہ کر دیا اور صوبہ اپولیا کے اس حصے کو جو نکوٹرا کہلاتا ہے لوٹ لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ بحر ایڈریاٹک میں داخل ہوا۔ خلیج کیٹرو کے پاس اسپین کے ایک بحری بیڑے پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔

جب اس کی خبر وینس پہنچی، تو وہاں کے عیسائی شہنشاہ نے ایک زبردست بیڑا علی رئیس کی سرکوبی کے لیے میر البحر کیپلو کی سرکردگی میں بھیجا۔ اس نے علی رئیس پر حملہ کیا تو علی رئیس نے وینس کے بیڑے سے بچ کر البانیہ کے ویلونا می ترکی قلعے میں پناہ لی۔ امیر البحر کیپلو نے ترکی بحری بیڑے پر سخت حملہ کیا اور ترکی کے جہازوں کو بری طرح تباہ کر دیا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے ایک طاقت ور ترکی بیڑا قسطنطنیہ سے امیر البحر علی رئیس کی مدد کو پہنچا۔ جس نے امیر البحر کیپلو کو سخت شکست دی۔

اس بحری لڑائی میں علی رئیس کے بیڑے کا بہت بڑا حصہ تباہ و برباد ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں دولت عثمانیہ نے اس کے لیے ایک نیا بحری بیڑا تیار کیا۔ جس میں پینسٹھ جہاز تھے۔ ان جہازوں پر تیس ہزار بحری فوج تھی۔

اس بیڑے کی بدولت اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ تمام بحیرۂ روم میں یورپی، امیر البحر علی رئیس کے نام سے ڈرتے تھے۔ جنوبی یورپ میں تو اس نے ترکی بیڑے کا سکہ جمادیا۔

علی رئیس کو اپنی بحری فوج کی بہتری اور بہبودی کا خاص خیال رہتا تھا۔ چنانچہ بحیرۂ روم کی تمام بندرگاہوں کے قریب صحت افزا مقامات پر بحری سپاہیوں کی تفریح کے لیے ''خان'' بنائے تھے۔ جن کے چاروں طرف سیب کے درخت ہوتے تھے۔

علی رئیس بڑا بہادر، نڈر، اولوالعزم سپہ سالار تھا۔ اس نے چھپن سال کی عمر میں وفات پائی۔

❀............❀............❀

عمادالدین زنگی

عمادالدین زنگی مشہور بادشاہ، ملک شاہ سلجوقی کے ایک چوکیدار کا بیٹا تھا۔ ابھی اُس کی عمر صرف دس برس کی تھی کہ وہ یتیم ہوگیا۔ مگر اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ جنگ وجدال کا اسے بڑا شوق تھا۔ وہ بڑا بہادر اور جری تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں ہی فن سپاہ گری میں ماہر ہوگیا۔ موصل کے حاکم نے اسے سواروں کے ایک دستہ کا سردار بنادیا اور وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے اپنی بہادری اور دانش مندی سے شاہ محمود سلجوقی کے حلقہ معتمدین میں شامل ہوگیا۔

شاہ محمود نے عمادالدین کے اوصاف دیکھے تو وہ بہت متاثر ہوا اور اسے بصرہ کا والی مقرر کردیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب حاکم موصل کا انتقال ہوا تو 1127ء میں عمادالدین کو موصل اور شمالی ورق کی حکومت اور ''اتابک'' کا خطاب عطا ہوا اور اس نے موصل کا انتظام کچھ ایسے طریقے سے کیا کہ سارا علاقہ سرسبز ہوگیا اور وہاں کے لوگ خوشحال ہوگئے۔

محمود شاہ سلجوقی کا انتقال ہوا تو اس کے جانشینوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر عمادالدین نے موصل میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس زمانے میں عیسائی نہ صرف یروشلم کے حاکم تھے بلکہ شام کے کئی شہروں اور قلعوں پر بھی ان کا قبضہ تھا اور انہوں نے بڑی طاقت پیدا کرلی تھی۔ شام کے مسلمانوں کے لیے وہ ایک بہت بڑا خطرہ تھی۔ ان عیسائیوں میں اتنی جرأت اور بے باکی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ جب چاہتے دمشق اور حلب کی چراہ گاہوں میں گھس آتے اور لوٹ مار کرکے واپس چلے جاتے۔ اگرچہ دمشق اور حلب کے فرمانروا مسلمان تھے مگر اُن میں اتنی سکت نہ تھی کہ عیسائیوں کی زیادتیوں کو روک سکتے۔

522ھ میں حلب کے مسلمانوں کا ایک وفد عمادالدین کے دربار میں آیا اور اس کے

اراکین نے عیسائیوں کی زیادتی اور مسلمانوں کی بے کسی تفصیل سے بیان کی۔ زنگی بہت متاثر ہوا اور بغیر وقت ضائع کیے ایک فوج کے ساتھ حلب کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب یروشلم کے بادشاہ کو اس کی خبر ملی تو وہ اس کے مقابلے کو بڑھا۔ حلب کے قریب مقابلہ ہوا جس میں عیسائیوں کو شکست ہوئی۔ حلب میں عمادالدین ایک سال مقیم رہا اور عیسائی حملوں سے اردگرد کے علاقہ کو بالکل محفوظ کر دیا۔ 532ھ میں وہ موصل واپس آیا اور اگلے سال پھر حلب کا رُخ کیا۔

حصن الاشارب عیسائیوں کا ایک مستحکم سرحدی قلعہ تھا۔ وہاں کئی ہزار مسلح عیسائی فوج رہتی تھی۔ عمادالدین زنگی اس قلعہ کی طرف بڑھا۔ قلعے کی فوج نے باہر نکل کر اس کا مقابلہ کرنا چاہا مگر مسلمانوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور بھاگ کر پھر قلعہ بند ہوگئی۔ عمادالدین زندگی نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ یروشلم کے عیسائی بادشاہ بالڈون نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں یہ فیصلہ ہوا کہ ایک لشکر ارجرار عمادالدین کا مقابلہ کرنے کے لیے حصن الاشارب روانہ کیا جائے۔

جب عمادالدین زنگی کے سپاہیوں کو اس کی خبریں ملیں تو وہ بہت ہراساں ہوئے انہوں نے زنگی کو مشورہ دیا کہ لڑنے کی بجائے واپس ہو جانا چاہیے مگر زنگی نے یہ مشورہ ماننے سے صاف انکار کر دیا اور انہیں سمجھایا کہ انہیں اپنی قومی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس نے انہیں یاد دلایا کہ ان کے آباؤ اجداد ایک بار نہیں کئی بار، تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ بڑی بڑی فوجوں کے سرخم کر چکے ہیں۔ اس نے یہ واقعات کچھ اس طرح بیان کیے کہ سپاہیوں کے دل بڑھ گئے اور ان میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا عزم پیدا ہوگیا۔

یہ تاریخی معرکہ حصن الاشارب سے تھوڑے فاصلہ پر ہوا۔ بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے سپاہی بڑی بہادری سے لڑے۔ مگر زنگی نے اپنے سپاہیوں میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا تھا۔ وہ خود بھی لڑنے میں پیش پیش تھا اور اپنی فوج کو بڑی دانش مندی سے لڑا رہا تھا۔ آخر عیسائیوں کو شکست ہوئی۔ عمادالدین زنگی قلعہ حصن الاشارب کی فصلیں توڑ کر اندر داخل ہوگیا۔ حصن الاشارب کی جنگ بڑی یادگار جنگ ہے۔ مگر افسوس کہ دمشق کے معین الدین آز نے مسلمانوں سے غداری کی۔ اُس نے بالڈون کو اپنا حکمران تسلیم کر کے دمشق کا شہر اس کی حفاظت میں دے دیا۔

عمادالدین زنگی کو اس کا بے حد رنج ہوا۔ مگر اس نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ اُس نے عیسائیوں کا ایک اور قلعہ حارب فتح کرلیا۔ اس اثناء میں عیسائی فوجیں دمشق کے سامنے پہنچ چکی

تھیں۔ معین الدین آز کی فوج بھی ان کے ساتھ مل گئی۔ مسلمانوں کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ عمادالدین زنگی دشمن کے ساتھ مقابلے کے لیے بڑھا۔ لڑائی شروع ہوئی تو اتنے میں اسے خبر ملی کہ موصل میں بدامنی اور شورش کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اسے مجبوراً واپس ہونا پڑا۔ اسے موصل کے حالات سدھارنے میں چار سال لگ گئے۔ مگر اس نے عیسائیوں کو فراموش نہیں کیا تھا۔ چار سال کے بعد اسے فرصت ملی تو اُس نے ایک عیسائی قلعہ بصرینی کا رُخ کیا۔ یہاں اُس نے عیسائیوں کو خوفناک شکست دی۔ جب اس شکست کی اطلاع یورپ پہنچی تو وہاں گھر گھر صفِ ماتم بچھ گئی۔ شہنشاہ روم نے لاکھوں سپاہیوں کی ایک فوج جمع کی اور شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ مقصد تھا کہ زنگی سے بصرینی کی شکست کا انتقام لیا جائے۔

شہنشاہ روم نے شام میں داخل ہونے کے لیے جو راستہ اختیار کیا، وہ قلعہ شیرز سے گزرتا تھا۔ اس وقت وہاں کا حاکم اسامہ تھا۔ اُس نے عمادالدین زنگی سے امداد کی درخواست کی جسے زنگی نے بخوشی قبول کر لیا۔

عیسائی فوج نے شیرز کا محاصرہ کر لیا۔ انہیں یقین تھا کہ چند ہی روز میں وہ اسے فتح کر کے آگے بڑھیں گے۔ زنگی وہاں آیا اور اس نے دریائے عامی کے کنارے خیمے ڈال دیئے۔ شہنشاہِ روم کو پیغام بھیجا کہ میدان میں آؤ۔ مگر اس پر زنگی کا ایسا خوف طاری تھا کہ اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور پہاڑوں کے اوپر ہی اوپر سے پیچھے کی طرف جانے کی تدبیر کر لی۔ زنگی بھی اس کی اس چال کو سمجھ گیا تھا۔ وہ بھی پہاڑ پر چڑھا۔ عیسائیوں نے یہ دیکھا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ ایسے حواس باختہ ہوئے کہ اپنا سارا ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ زنگی نے ان کا تعاقب کیا اور جب تک وہ کشتیوں اور جہازوں پر بیٹھ کر فرار نہیں ہو گئے، اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

عمادالدین زنگی کا یہ بڑا عظیم کارنامہ تھا۔ اگر وہ اپنی شجاعت کے جوہر نہ دکھاتا، تو عیسائیوں کی یورش کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اُس وقت دریائے فرات پر عیسائیوں کے قلعے تھے۔ یہاں کا حکمران جوسلن تھا جو مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ عمادالدین زنگی اب اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جوسلن کے پایۂ تخت اسرع کی طرف بڑھا اس پیش قدمی کی خبر سُن کر جوسلن تو فرار ہو گیا البتہ قلعہ میں مقابلے کے لیے فوج موجود تھی۔ زنگی نے اس کا محاصرہ کر لیا اور کوئی ایک مہینے میں قلعے پر قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے دوسرے قلعے فتح کیے اور اس طرح عراق میں

عیسائیوں کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ زنگی کا یہ کارنامہ بھی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

اس کے بعد عماد الدین زنگی کا ارادہ دمشق اور پھر یروشلم پر قبضہ کرنے کا تھا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ 541ھ بمطابق 1146ء میں چند غلاموں نے اچانک حملہ کر کے اسے شہید کر دیا۔ اگرچہ وہ اپنے ارادے میں پوری طرح سے کامیاب نہ ہو سکا مگر اپنے جانشینوں سلطان نور الدین اور سلطان صلاح الدین کے لیے راستہ صاف کر گیا۔

سلطان عماد الدین زنگی بہت عادل، ہمدرد اور خدا ترس حکمران تھا۔ وہ بہت فیاض تھا اور رعایا پر بہت مہربان تھا۔ رعایا اُس سے بڑی محبت کرتی تھی اور سپاہی اس پر اپنی جان نثار کرتے تھے۔

❋............❋............❋

قتیبہ بن مسلم

خاندانِ بنواُمیہ کا پانچواں خلیفہ ولید اوّل بن عبدالملک بڑا کامیاب خلیفہ تھا۔اس کے عہد میں مسلمانوں کو بڑی فتوحات حاصل ہوئیں۔ ولید کی خوش قسمتی سے اس کو کئی نامور جرنیل اور فاتح ایسے مل گئے جنہوں نے اسلامی حکومت کے ڈانڈے چین سے یورپ تک ملا دیئے۔ان میں سے قتیبہ بن مسلم فاتح ترکستان تھا۔

ترکستان یعنی ترکوں کا ملک۔ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کا یہی اصلی وطن تھا۔ یہاں کے باشندے بڑے طاقتور اور چست و چالاک تھے۔جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اُس وقت یہاں کی بیشتر آبادی اسلام نہیں لائی تھی۔ اس کے ایک حصہ پر اگرچہ بہت پہلے مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا، اور وہاں کے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں نے خلیفہ کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن وہ اکثر باغی ہو جاتے تھے اور بہت مصیبت کا باعث بنتے تھے۔ جب ولید تختِ خلافت پر بیٹھا تو بخارا اور سمرقند کے آس پاس کے بادشاہ سرکشی دکھا رہے تھے۔اس کے علاوہ بعض علاقے ابھی تک اسلامی حکومت کے ماتحت نہ آئے تھے۔اس لیے خلیفہ ولید ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو دلیر اور جری بھی ہو اور سیاست دان بھی۔ چنانچہ مشرقی صوبوں کے گورنر حجاج کے مشورے سے اس کی نگاہِ انتخاب قتیبہ بن مسلم پر پڑی اور وہ خراسان کا گورنر مقرر ہوا۔اُسے حکم دیا گیا کہ نہ صرف باغیوں کی سرکوبی کرے بلکہ ترکستان کے باقی علاقہ کو بھی اسلامی حکومت کے ماتحت لے آئے۔ قتیبہ خراسان پہنچا۔حالات کو دیکھا اور ضروری انتظامات کرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ترکستان پر فوج کشی کر دی اتفاق سے یہاں کے بادشاہ ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے۔اس سے قتیبہ نے پورا فائدہ اُٹھایا۔ جب وہ دریائے جیحون کے پار پہنچا تو چوغیان کے بادشاہ نے جوشومان کے

بادشاہ کے خلاف تھا، اطاعت قبول کر لی۔ قتیبہ کی خدمت میں کئی تحفے پیش کیے، اور اسے اپنا مہمان بھی بنایا۔

یہاں سے قتیبہ نے شومان کا رُخ کیا۔ شومان اور کفیان کے بادشاہوں نے جب دیکھا کہ ان میں مقابلہ کی تاب نہیں ہے تو انہوں نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ یہ کام کرنے کے بعد قتیبہ نے اپنے بھائی صالح کو نائب مقرر کیا، اور خود مرو واپس آ گیا۔ اِس کی واپسی کے بعد صالح نے قریب کے اور کوئی شہروں کو فتح کر لیا۔ ان معرکوں میں ایک بہادر نصر بن بسیار نے بڑے کارنامے دکھائے۔

ترکستان کا ایک علاقہ باوریس کہلاتا ہے۔ اس وقت یہاں کا بادشاہ نیزک نامی تھا۔ اس نے کچھ مسلمان قید کر رکھے تھے۔ مرو واپس آنے کے بعد قتیبہ نے اسے لکھا کہ مسلمان قیدی رہا کر دیئے جائیں ورنہ اُس کی بُری طرح خیر لی جائے گی۔ نیزک نے مارے ڈر کے نہ صرف انہیں رہا کر دیا۔ بلکہ اس شرط پر صلح بھی کر لی، کہ اس کا علاقہ محفوظ رکھا جائے گا۔ اُس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ ہر بڑی لڑائی میں قتیبہ کی مدد کرے گا۔

کوئی ایک سال کے بعد قیتبہ نے بُخارا کے شہر بیکند پر حملہ کیا۔ اہلِ بیکند نے اِردگرد کی قوموں سے مدد طلب کی۔ چنانچہ وہ بڑی تعداد میں وہاں پہنچے، اور اُنہوں نے تمام راستوں کو بند کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قیتبہ کا کوئی قاصد کسی مقام پر نہ پہنچ سکا۔ دو مہینے تک یہاں کی حالت کی خبر نہ جا سکی۔ حجاج کو بھی کوئی اطلاع نہ ملی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ساری فوج ہلاک نہ ہو گئی ہو۔ چنانچہ اُس نے مسجدوں میں دُعا کرنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ اِدھر روزانہ جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ قتیبہ کا ایک عجمی جاسوس تھا جس کا نام تندر تھا۔ بیکند والوں نے اسے رشوت دی۔ کہ اگر وہ سمجھا بجھا کر قتیبہ کو واپس کر دے گا تو اسے بے انتہا انعام دیا جائے گا۔ تندر ایک دن قتیبہ کے پاس آیا اور کہا "اُسے خفیہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ نے حجاج کو معزول کر دیا ہے۔" قتیبہ نے فوراً اُسے مروا ڈالا۔ اُسے خوف تھا، کہ اگر یہ خبر عام ہو گئی، تو اس کے سپاہیوں کو یہیں ہلاکت کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ دوسرے ہی دن اُس نے اپنی فوج کے سپاہیوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور اُنہیں حملہ کا حکم دے دیا۔ بخارا کی فوجوں نے مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھا کر شہر میں قلعہ بند ہو گئیں۔ قتیبہ نے حکم دیا کہ شہر پناہ توڑ دی جائے۔ جب وہاں کے باشندوں نے دیکھا، کہ شہر پر قبضہ ہو جانے سے

اُن کو زیادہ نقصان اُٹھانا پڑے گا، تو صلح کے طالب ہوئے جسے قبول کرلیا گیا۔ قتیبہ نے یہاں ایک مسلمان حاکم کو مقرر کیا اور واپس روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور گیا تھا کہ اہلِ شہر نے مسلمان حاکم کو قتل کر دیا۔ یہ خبر سُن کر قتیبہ راستے سے لوٹ آیا۔ اہلِ شہر پھر محصور ہو گئے اور پھر صلح کرنی چاہی۔ لیکن وہ ایک مرتبہ بدعہدی کر کے اپنا اعتبار کھو چکے تھے۔ اِس لیے قتیبہ نے صلح کی درخواست نامنظور کر دی۔ اس نے شہر پناہ توڑ ڈالی اور شہر پر قبضہ کرلیا۔ جتنے سپاہی تھے سب قتل ہوئے۔ مسلمانوں کو بے شمار ہتھیار اور سونے چاندی کے برتن ملے۔

اگلے سال قتیبہ کئی شہروں کو فتح کرتا ہوا امشنہ پہنچا۔ یہاں کے باشندوں نے صلح کر لی۔ جب قتیبہ واپس جا رہا تھا، تو راستے میں چین کے بادشاہ کا بھتیجا ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ملا۔ قتیبہ کی فوج بہت کم تھی۔ کئی سرداروں نے رائے دی کہ جنگ کے بغیر نکل جانا چاہیے۔ مگر قتیبہ فولاد کا بنا ہوا تھا، اُس نے اپنی تھوڑی سی فوج کے ساتھ اس لشکرِ جرار پر حملہ کر دیا اور اُسے شکستِ فاش دی۔ اسی سال قتیبہ نے خاص بخارا پر فوج کشی کی۔ ترکوں نے بڑی بہادری سے اسلامی فوج کا مقابلہ کیا۔ لیکن مسلمانوں نے ایک بار اس زور کا ہلہ بولا، کہ ترکوں کو دھکیل کر دریا کے پار پہنچا دیا۔ کئی سو مسلمان بھی پار پہنچ گئے، اور شہر پر قبضہ کرلیا۔ اس جنگ میں خاقان اور اُس کا لڑکا دونوں زخمی ہوئے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، بادریس کے بادشاہ نیزک نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کی مدد کرتا رہے گا۔ کچھ عرصہ تک وہ اس وعدہ پر قائم رہا۔ لیکن پھر ترکستان میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر اسے خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ اس کا ملک بھی اُس سے نہ چھین لے۔ مگر یہ خوف بلا وجہ تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ جب مسلمان ایک دفعہ کسی بات کا وعدہ کر لیتے ہیں تو اُس پر قائم رہتے ہیں۔

بہر حال اس نے بلخ، مرو، الروز، طالقان، فاریاب، جوز جان کے بادشاہوں کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا اور ساتھ ہی طخارستان سے مسلمان حاکم کو بھی باہر نکال دیا۔ قتیبہ کو جب یہ اطلاع ملی، تو اُسے بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے بھائی عبدالرحمان کو طخارستان روانہ کیا اور خود دوسرے باغی بادشاہوں کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے اس نے طالقان فتح کر کے یہاں کے باشندوں سے ان کی بغاوت کا بدلہ لیا۔ پھر فاریاب کی باری آئی۔ یہاں کے بادشاہ نے

اطاعت قبول کر لی اور قتیبہ نے اسے معاف کر دیا۔ یہاں سے وہ جوز جان پہنچا۔ جوز جان کا بادشاہ بھاگ گیا اور وہاں کے باشندوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہاں سے قتیبہ بلخ گیا، اور وہاں ایک دن ٹھہر کر نیزک کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ قتیبہ کا بھائی عبدالرحمٰن طخارستان کو فتح کر کے پہلے سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ نیزک ایک پہاڑ کی پُر پیچ اور دُشوار گھاٹی میں گھس گیا تھا اور اس کے دہانے کے قلعہ پر فوج کا ایک دستہ حفاظت کے لیے متعین کر دیا تھا۔ قلعہ تک کا راستہ بہت تنگ اور دشوار گزار تھا، اور وہاں تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ کئی دنوں تک معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر ایک روز مسلمانوں نے ایک واقف کار کی مدد سے قلعہ کے پیچھے سے جا کر حملہ کر دیا۔ قلعہ والوں کو اس کا گمان بھی نہ تھا۔ وہ اس اچانک حملہ کی تاب نہ لا سکے۔ بہت سے مارے گئے، جو زندہ بچے وہ بھاگ گئے۔ لیکن نیزک ہاتھ نہ آیا۔ اس نے بھاگ کر ایک گھاٹی میں پناہ لی۔ قتیبہ بھی پیچھے پیچھے پہنچا۔ لیکن یہ گھاٹی بھی بہت محفوظ تھی راستہ اتنا دشوار گزار تھا، کہ فوج عبور نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے قتیبہ نے گھاٹی کا محاصرہ کر لیا اور کامل دو مہینے تک محاصرہ قائم رہا۔ آخر نیزک کا کل سامان ختم ہو گیا، اور اسے مجبوراً قتیبہ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا نیزک کا جُرم نہایت سنگین تھا۔ اس نے نہ صرف خود مسلمانوں کی مخالفت کی تھی، بلکہ اپنے ساتھ بہت سے بادشاہوں کو بھی باغی بنا لیا تھا جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ اس لیے اس کے قتل کا فیصلہ ہوا، اور قتیبہ نے اسے قتل کروا دیا۔

نیزک کے بعد قتیبہ دوسرے باغی بادشاہوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان پر حملہ کرنے سے پہلے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ شومان کے بادشاہ کے پاس جس نے اپنے یہاں سے مسلمان حاکم کو نکال دیا تھا۔ کہلا بھیجا کہ اگر وہ اب بھی توبہ کر لے، تو اس کا قصور معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن اسے اپنی قوت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ اس نے مسلمانوں کے قاصد کو قتل کر دیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مجھ کو قتیبہ سے کیا ڈر؟ مَیں خود بہت بڑا بادشاہ ہوں قتیبہ نے آگے بڑھ کر اس کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، اور پتھر برسا کر قلعہ کی دیواریں توڑ ڈالیں۔ اب بادشاہ کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے سارا قیمتی ساز و سامان جمع کر کے قلعہ کے ایک گہرے کنوئیں میں پھینکوا دیا۔ قلعہ کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور مسلمانوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد قتیبہ نے دوسرے باغیوں کی سرکوبی بھی کی۔

دو سال بعد خوارزم کے بادشاہ خوارزم شاہ نے قتیبہ کی اطاعت قبول کر لی۔ بات یہ تھی کہ خوارزم شاہ بہت کم زور تھا، اور اس کا بھائی اسے معطل کر کے سلطنت پر قابض ہو گیا تھا۔ وہ رعایا پر بڑے ظلم کرتا تھا۔ کسی کی عزت اور مال و دولت اس کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ خوارزم شاہ اس کے سامنے بالکل مجبور اور بے بس تھا۔ جب ترکستان میں قتیبہ نے قوت اور طاقت حاصل کر لی، تو خوارزم شاہ نے اس کے پاس خفیہ پیغام بھیجا، کہ اگر وہ اس کے بھائی کے ہاتھوں سے اس کو نجات دلا دے۔ تو وہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لے گا۔ قتیبہ نے یہ شرط تسلیم کر لی اور خوارزم پر حملہ کر کے خوارزم شاہ کے ظالم بھائی کو قتل کر دیا، اور سلطنت خوارزم شاہ کے حوالے کر دی۔

اہلِ سمرقند اور مسلمانوں میں یہ عہد تھا، کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ لیکن ترکستان کی لڑائیوں میں انہوں نے اپنا عہد توڑ کر مسلمانوں کے خلاف ترکستان کے بادشاہوں کی امداد کی تھی۔ اس لیے خوارزم کی مہم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد قتیبہ نے سمرقند پر فوج کشی کر دی۔ اپنے بھائی صالح کو ایک فوج کے ساتھ اُدھر روانہ کیا اور خود بھی چند دنوں کے بعد ایک اور فوج کے ساتھ اُس طرف بڑھا۔ اہل سمرقند قلعہ بند ہو گئے۔ قتیبہ نے محاصرہ کر لیا۔ سمرقند والے ایک مہینہ تک مدافعت کرتے رہے۔ آخر انہوں نے فرغانہ اور شاش کے بادشاہوں کو لکھا، کہ اگر آج مسلمان ہمارے مقابلے میں کامیاب ہو گئے تو کل تم کو بھی یہی دن دیکھنا پڑے گا۔ اس لیے ہماری نہیں بلکہ اپنی حفاظت کے لیے ہماری مدد کرو۔

فرغانہ اور شاش پہلے ہی مسلمانوں کی فتوحات کو خوف کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے وہ اہلِ سمرقند کی مدد کو تیار ہو گئے۔ ایک بڑی فوج اکٹھی کی۔ جس میں بڑے بڑے نامور امیر، وزیر اور بہادر شامل تھے۔ چین کے بادشاہ کے لڑکے کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔

قتیبہ کو جب یہ خبر ملی، تو اس نے صالح کو چند سو مجاہدوں کے ساتھ امدادی فوج کا راستہ روکنے کے لیے بھیج دیا۔ صالح نے کچھ دور جا کر راستے میں دونوں جانب تھوڑی تھوڑی فوج چھپا دی۔ رات کو جیسے ہی دشمن کی فوج اِدھر سے گزری، تو صالح نے اس پر حملہ کر دیا مسلمان سپاہی کمین گاہوں سے نکل کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن آخر میں بُری طرح شکست کھائی۔ اس کے متعدد نامور سپاہی مارے گئے، بہت سے قید ہوئے جن میں بڑے بڑے امیر، وزیر، شہزادے بھی شامل تھے۔ مسلمانوں کو بہت سا اسلحہ اور قیمتی سامان بھی ملا۔ جو لوگ

اس جنگ میں شریک تھے، اُن کا بیان ہے کہ ایسے سخت اور جری سپاہی اب تک اُن کے مقابلے میں نہ آئے تھے۔

اس شکست کی خبر سمرقند پہنچی تو شہریوں کی ہمت پست ہوگئی۔ ایک سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ قتیبہ نے محاصرہ اور بھی سخت کر دیا، اور بھاری پتھر برسا کر شہر پناہ کی دیواریں توڑ دیں۔ مگر اہلِ سمرقند نے بھی اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ قتیبہ نے مسلمانوں کو للکارا کہ آگے بڑھو، اور ان روزنوں تک پہنچ جاؤ، جو دیواروں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اس للکار پر مسلمان آگے بڑھے۔ شہری اوپر سے تیروں کا مینہ برسا رہے تھے۔ لیکن انہوں نے کوئی پروانہ کی اور اپنے چہروں کو ڈھالوں سے بچاتے ہوئے روزنوں تک پہنچ گئے۔ قتیبہ سب سے آگے تھا۔ اب اہلِ سمرقند کے لیے مصالحت کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہ گئی تھی۔ چنانچہ دوسرے دن انہوں نے ان چار شرطوں پر صلح کر لی کہ:

1) اہلِ سمرقند بارہ لاکھ سالانہ خراج دیا کریں گے۔

2) اس سال تیس ہزار سوار دیں گے۔

3) مسلمان شہر میں فاتحانہ داخل ہوں گے اور ان کے داخلے کے وقت مسلح آبادی شہر خالی کر دے گی۔

4) مسلمان شہر میں مسجد بنا کر نماز پڑھیں گے اور خطبہ دیں گے۔

دوسرے دن مسلمان شہر میں داخل ہوئے۔ مسجد تعمیر کر کے نماز پڑھی اور خطبہ دیا اور عام اعلان کر دیا کہ صلح کی رقم کے علاوہ مسلمان کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں گے جس جس کا مال ہو وہ آ کر اپنا مال لے لے۔ سمرقند کی فتح پر ایک شاعر نے قتیبہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا، جس میں ایک شعر یہ بھی تھا کہ:

> ''ہر روز قتیبہ مالِ غنیمت جمع کرتا ہے اور نئے اموال کا اضافہ کرتا ہے۔ وہ باہلی قبیلہ کا ایسا تاجدار ہے جس کی دہشت سے دشمنوں کی سیاہ مانگیں بھی سفید ہو گئی ہیں۔''

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ شاش اور فرغانہ کے بادشاہوں نے اہلِ سمرقند کی مدد کے لیے فوج روانہ کی تھی۔ سمرقند کی فتح کے بعد قتیبہ نے ان دونوں شہروں پر قبضہ کر لیا، اور وہاں سے بڑھتا بڑھتا چین کی سرحد تک پہنچ گیا۔ اور دیکھ بھال کے بعد واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ہی قتیبہ کو خبر ملی

کہ حجاج کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ اس خبر سے بہت پریشان اور فکر مند ہوا۔ مگر چند روز بعد ہی اسے خلیفہ ولید کا خط ملا جس سے اس کی پریشانی اور فکرمندی دُور ہو گئی۔ خلیفہ نے خط میں لکھا تھا کہ:

''امیر المؤمنین تمہاری محنت، حسنِ خدمت، اسلام کے دشمنوں کے مقابلے میں تمہاری بلیغ کوشش غرض تمام باتوں سے خوب واقف ہیں۔ تم کو وہ ایسا مرتبہ دیں گے جو تمہارے لیے خوب مناسب ہوگا۔ اب تم اپنی جنگوں کے کام کو پُورا کرو اور خدا کی رحمت کے متوقع رہو۔ اپنے حالات سے مجھے برابر مطلع کرتے رہو تا کہ مَیں تمہاری کوششوں کا اندازہ لگا سکوں، اور یہ معلوم ہو کہ مَیں تمہارے ساتھ سرحد پر موجود ہوں۔''

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خلیفہ ولید کے دل میں قتیبہ کی کتنی قدر تھی۔

یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ چین کے بادشاہ نے بھی اہلِ سمرقند کی مدد کی تھی۔ اور اس کا بیٹا امدادی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس لیے قتیبہ نے چین پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پھر فرغانہ سے کاشغر تک راستہ دُرست کرایا، اور جب انتظامات مکمل ہو گئے، تو ایک لشکر چین روانہ کر دیا۔ یہ لشکر کاشغر کو فتح کرتا ہوا چین کے اندر تک بڑھتا چلا گیا۔

چین کا بادشاہ مسلمانوں کی بہادری اور فتوحات کے قصے سُن چکا تھا۔ اس لیے اُس نے بات چیت کرنے کے لیے اُن کا ایک وفد طلب کیا۔ قتیبہ نے دس مسلمان سرداروں کو چین بھیجا، اور انہیں ہدایت کر دی کہ وہ چین کے بادشاہ کو اس کا یقین دلا دیں کہ قتیبہ نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تمہارے ملک کو اپنے پیروں سے پامال کر کے خراج وصول نہ کر لے گا، اُس وقت تک واپس نہ جائے گا۔ اس وفد میں خوبرو بھی تھے اور فصیح اللسان بھی، صاحبِ عقل و دانش بھی تھے اور اربابِ حل و عقد بھی۔ جب وفد منزلِ مقصود پر پہنچا، تو بادشاہ نے اسے ملاقات کے لیے بُلایا۔ ان لوگوں نے پہلے زرہیں پہنیں اور اس پر سفید کپڑے پہنے۔ کپڑوں میں عطر لگایا، پاؤں میں چپل پہنے، کاندھوں پر چادریں ڈالیں اور اس انداز سے دربارِ شاہی میں پہنچے۔ اس وقت دربار میں رؤساء، اُمراء اور وزراء بادشاہ کے داہنی جانب بیٹھے تھے۔ جب یہ لوگ بیٹھ گئے تو بادشاہ نے اُن سے کسی قسم کی بات نہ کی۔ دونوں طرف خاموشی رہی۔ اِسی حالت میں وفد کے اراکین اٹھ کر واپس آ گئے۔ جب وہ چلے گئے تو بادشاہ نے اپنے وزراء سے پوچھا کہ ان لوگوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ ''حضور! ہماری نظروں میں تو ان میں بالکل زنانہ پن ہے۔ اِن کے

خوشبودار عطروں سے ہم پریشان ہو گئے ہیں۔'' دوسرے دن بادشاہ نے اُنہیں پھر بُلا بھیجا۔ اب وہ دربار میں آئے تو اُن کے سروں پر ریشمی عمامے تھے اور جسم پر رنگ برنگ کپڑے۔ بادشاہ نے اب کے بھی بغیر بات کیے چلے جانے کا اِشارہ کیا۔ پھر حاضرین سے پوچھا ''اب کیا رائے ہے؟'' وہ بولے کہ ''اس لباس سے کچھ مردانہ پن ٹپکتا ہے۔'' تیسرے دن انہیں پھر طلب کیا۔ آج وہ ہتھیار لگائے، سروں پر خود رکھے، زرہیں پہنے، شمشیر و نیزہ اور تیر کمان ساتھ لیے گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے جب وہ قریب پہنچے، تو نیزوں کو زمین میں گاڑ دیا۔ اور بہت مستعدی کے ساتھ دربار میں داخل ہوئے۔ بادشاہ نے پھر جانے کا حکم دے دیا۔ یہ گھوڑوں پر سوار ایسے روانہ ہوئے جیسے کسی پر حملہ کر رہے ہیں بادشاہ نے پھر اپنے ہم نشینوں کا خیال دریافت کیا۔ انہوں نے کہا۔ یہ عجیب قوم ہے۔ ایسی قوم تو اب تک ہماری نظروں سے نہیں گزری؟''

جب شام ہوئی، تو بادشاہ نے صرف وفد کے سردار کو بُلا بھیجا، چنانچہ وہ آیا۔ بادشاہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم نے ہماری جنگی طاقت کا اندازہ لگایا ہو گا۔ اب جب تک تم ہمارے قبضہ میں ہو کوئی سلطنت تم کو نہیں بچا سکتی۔ مَیں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں اگر سچ سچ نہ بتاؤ گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔''

وفد کے سردار نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے وہ؟''

بادشاہ نے کہا۔ ''تم پہلے، دوسرے اور تیسرے دن لباس تبدیل کر کے کیوں آئے؟ اس سے تمہاری غرض کیا تھی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جو کپڑے ہم پہلے دن پہن کر آئے تھے وہ ہمارے روزمرّہ کے استعمال میں رہتے ہیں اور ان کو ہم عموماً گھروں میں پہنتے ہیں۔ جو لباس ہم دوسرے دن پہن کر آئے تھے، وہ اُس وقت پہنتے ہیں جب اُمراء اور رؤساء کے پاس جاتے ہیں۔ تیسرے دن کی پوشاک دشمنوں کے مقابلہ کے وقت پہنی جاتی ہے۔''

بادشاہ بولا۔ ''تم نے اپنے زمانے کا پورا تجربہ کیا ہے۔ اچھا اَب اپنے سپہ سالار سے کہہ دو کہ وہ یہاں سے واپس چلا جائے۔ تم بہت تھوڑی تعداد میں ہو۔ مَیں تم کو پیس ڈالوں گا۔ مَیں تمہارے مقابلے میں ایسی فوج بھیجوں گا جو تم کو تباہ و برباد کر دے گی۔''

اس کے جواب میں وفد کے سردار نے کہا کہ ''تم اس قوم کی تعداد کا کیا اندازہ لگا سکتے

ہو، جس کا ایک سرا تمہارے ملک میں ہے اور دوسرا شام میں۔ ہم لوگ موت سے نہیں ڈرتے۔ ہمارے سردار نے قسم کھالی ہے کہ جب تک وہ اپنے پیروں سے تمہارے ملک کو پامال کر کے جزیہ وصول نہ کر لے، اُس وقت تک واپس نہ جائے گا۔"

چین کے بادشاہ کو مسلمانوں کی قوت کا پہلے سے اندازہ تھا۔ ترکستان کا حشر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ مسلمانوں سے لڑائی مول نہ لینا چاہتا تھا اور محض ان کو آزمارہا تھا۔ اِس لیے اُس نے جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ قتیبہ کے پاس بہت سے بیش قیمت تحفے بھیجے۔ قتیبہ کا ارادہ بھی ابھی چین فتح کرنے کا نہ تھا۔ اس نے جزیہ قبول کرلیا اور واپس چلا گیا۔

❁............❁............❁

86

کمال اتاترک

مصطفیٰ کے والد چاہتے تھے کہ لڑکا ڈاکٹر یا تاجر بنے اور والدہ کی تمنا تھی کہ علم دین حاصل کرے بچہ سن تعلیم کو پہنچا تو والدہ کی رائے کے مطابق اسے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک دینی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ جو قریب کی مسجد میں واقع تھا۔ رسم بسم اللہ کے دن زبیدہ نے دعا کی کہ:

"اے خدا مصطفیٰ کو عمر دراز عطا فرما اور اسے خدمت اسلام کی وہ توفیق عطا کر جس پر ترک قوم ہمیشہ نازاں رہے۔"

مصطفیٰ نے دینی مدرسہ میں ایک سال تک تعلیم حاصل کی تھی کہ اسے مغربی طرز کے ایک مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ جو شمس آفندی کے نام سے منسوب تھا۔

مصطفیٰ ابھی دنیا کے سرد و گرم سے واقف نہ ہوا تھا کہ یکا یک باپ کا سایہ عاطفت سر سے اُٹھ گیا۔ زبیدہ کے دل پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کچا ساتھ خالی ہاتھ۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ آخر اس مصیبت میں مذہب نے تسلی دی اور ایمان نے ڈھارس بندھائی۔ مرحوم شوہر نے زرِ نقد تو چھوڑا نہ تھا کہ اس سے کام چلتا ناچار لکڑی کے اس تمام ذخیرہ کو سستے داموں میں فروخت کر دیا گیا جو علی رضا مرحوم نے منافع کی امید پر خرید کر جمع کیا تھا۔ سالونیکا میں زبیدہ کا کوئی ہمدرد نہ تھا پردہ کی سخت پابندی کے باعث نہ خود گھر کی چاردیواری سے باہر نکل سکتی تھی نہ مصطفیٰ ابھی اس لائق تھا کہ بازار سے سودا سلف خرید لاتا اور ماں کو امور خانہ داری کے سرانجام دینے میں مدد دیتا۔ ان حالات میں زبیدہ نے موضع لازاسان میں منتقل ہو جانا بہتر سمجھا۔ جہاں ان کا ایک بھائی کھیتی باڑی کرتا تھا۔ لازاسان کی سکونت کا زمانہ مصطفیٰ کے لیے تعطل اور جمود کا زمانہ تھا۔ اس کا اکثر

وقت جنگل میں گزرتا اور گھر آتا تو در و دیوار کو نامانوس نظروں سے دیکھتا۔ زبیدہ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر اندیشہ ہوا مبادا اس کی تعلیم و تربیت ناقص و نا تمام نہ رہ جائے۔ انہوں نے اپنے بھائی سے مشورہ کرنے کے بعد مصطفیٰ کو سالونیکا کے ایک مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ اب اس کی عمر گیارہ سال کے قریب تھی۔

مصطفیٰ مدرسہ میں داخل تو ہو گیا لیکن کسی طالب علم سے اس کی نہ بنتی تھی۔ سب سے الگ تھلگ رہتا۔ اس کی طبیعت زود آمیزی اور رسمی گرم جوشی سے سخت متنفر تھی۔ وہ گاؤں کی آزاد فضا میں رہنے کے بعد مدرسہ کے قواعد کی پابندی کو وبال جان سمجھتا۔ لڑکوں میں ہر دلعزیز نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بات بات پر تکرار ہونے لگی۔ ایک دن کسی لڑکے سے بحث ہو گئی بات نے طول کھینچا۔ آخر دونوں دست و گریباں ہو گئے۔ استاد سے شکایت کی گئی۔ اس نے مصطفیٰ کو قصوروار ٹھہرا کر جسمانی سزا تجویز کی۔ مصطفیٰ نے سزا کو برداشت تو کر لیا لیکن اس کے بعد پھر کبھی اس مدرسہ میں قدم نہ رکھا۔ زبیدہ کی رائے تھی کہ مصطفیٰ کو کسی اور مدرسہ میں داخل کرا دیا جائے۔ لیکن اب فیس کا کچھ انتظام نہ تھا۔ مصطفیٰ نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں دوبارہ اس مدرسہ میں جانا نہیں چاہتا۔ گھر میں ہر روز اسی مسئلہ پر بحث رہتی۔ زبیدہ کو بھائی کی یہ رائے پسند نہ تھی کہ مصطفیٰ کو سالونیکا کے فوجی مدرسہ میں داخل کرا دیا جائے ابھی اس مسئلہ کا اطمینان بخش فیصلہ نہ ہوا تھا کہ مصطفیٰ نے اپنے والد کے ایک دوست سے جو فوج میں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز رہ چکے تھے درخواست کی کہ مجھے فوجی مدرسہ میں داخل کر دیجیے۔ زبیدہ کو چند روز بعد معلوم ہوا کہ مصطفیٰ نے فوجی مدرسہ میں داخلہ کا امتحان دیا ہے اور اس میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ مخالفت کو بے سود سمجھ کر خاموش ہو رہیں۔

مصطفیٰ کے مزاج میں اب بھی وہی اکل کھرا پن تھا۔ نہ کسی کھیل میں شریک ہوتا۔ نہ کسی جلسہ میں جاتا۔ جس نے اس کے کام میں دخل دیا اس کی شامت آ گئی۔ اس کی کسی بات پر اعتراض کرنا نزاع کو دعوت دینا تھا۔ معمولی نکتہ چینی سے مشتعل ہو جاتا۔ طول کلام سے جھنجھلا جاتا، فضول باتوں سے اسے نفرت تھی یہاں تک کہ طلبا کے عام استفسارات کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طالبِ علم نے کہا۔ فرمایئے جناب کیا ہو رہا ہے؟ اس نے بگڑ کر جواب دیا۔

”معاف کیجیے۔ میرا نصب العین آپ سے مختلف ہے میں آدمی بننا چاہتا ہوں۔“

فوجی مدرسہ میں مصطفیٰ نے پہلا سال اسی خلوت پسندی اور یکسوئی میں گزارا۔ نہ کسی کا دوست بنا نہ کوئی اسے دوست بنا سکا۔ علم حساب سے اسے خاص شغف تھا۔ دوسرے طلباء اس امتیازی وصف کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کپتان مصطفیٰ نے جو اس مدرسہ میں پروفیسر تھے ایک دن خوش ہو کر کہا کہ ''یہ ہونہار لڑکا کمال پیدا کرے گا'' اس دن سے مدرسہ میں تمام پروفیسر اور طلبا مصطفیٰ کو مصطفیٰ کمال کہنے لگے۔ یہ روایت کہ پروفیسر مصطفیٰ کے مصطفیٰ کو اپنی ذات سے ممیز کرنے کے لیے کمال کے نام سے موسوم کیا تھا صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اقلیدس اور دیگر مضامین میں مصطفیٰ کمال نے وہ بے نظیر قابلیت پیدا کر لی کہ اسے جماعت مین مانیٹر بنا دیا گیا سترہ سال کی عمر میں ابتدائی فوجی تعلیم سے فراغت پانے کے بعد وہ مناستر کے اعلیٰ فوجی مدرسہ میں داخل ہو گیا۔

اس اثنا میں زبیدہ نے ایک ممتاز ترک تاجر سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ گھر کی مالی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ مصطفیٰ کمال مناستر کے فوجی مدرسہ میں داخل ہونے کے بعد والدہ سے ملنے کے لیے گیا اور چند روز قیام کر کے واپس چلا آیا۔

قیام سالونیکا کے زمانہ میں مصطفیٰ کمال نے فرانسیسی زبان میں قدرے مہارت بہم پہنچائی تھی اور اِسی زمانہ میں اسے مقدونیہ کے ایک آزاد خیال نوجوان فتحی سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ فتحی فرانسیسی زبان میں خاصی دستگاہ رکھتا تھا اور مصطفیٰ کمال سے اصلاح وطن کے موضوع پر گفتگو کیا کرتا تھا۔ بظاہر فتحی کی ملاقات ایک معمولی واقعہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن اس نے نوجوان مصطفیٰ کمال کی زندگی پر زبردست اثر ڈالا اور وطن کے متعلق اس کے دل میں وہ تڑپ پیدا کر دی جس سے دوسرے طلبا کے سینے خالی تھے والٹیر اور روسو کے مطالعہ سے نہ صرف اس کی نظر وسیع ہو گئی بلکہ قلب بھی ان جذبات سے لبریز ہو گیا جو کسی محب وطن کو حصولِ مقصد کے بغیر چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ شاعر انقلاب نامق کمال کی تصنیفات نے مصطفیٰ کمال کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا اس زمانہ میں اس کی تقریروں کا موضوع اکثر یہ ہوتا کہ ''ترکی ترکوں کے لیے ہے۔''

تقریر کی مشق کے بعد مصطفیٰ کمال نے ''آزادی'' کے موضوع پر سلسلہ تصنیف شروع کیا۔ متعدد رسالے لکھے اور مضامین شائع کیے۔ مناستر میں بھی اس نے امتیازی شان سے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ پروفیسروں نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو انتہائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے

دارالخلافت کے حربی کالج میں داخل ہو سکتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ یونان نے جزیرہ کریٹ پر غاصبانہ طور پر قبضہ کرنے کے لیے فوجیں بھیج دی تھیں۔ اور تمام مغربی طاقتیں بھی اس کے اس جارحانہ اقدام کی حمایت کر رہی تھیں۔ ترکی میں یونان کی اس جارحیت بے جا پر سخت غضب کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ فوجی طبقے خصوصاً نوجوان بہت مشتعل تھے۔ مناستر اور دوسرے فوجی مرکزوں میں ترکی افواج جمع ہو رہی تھیں۔ ہر طرف ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی فوجی مدرسہ میں بھی پروفیسروں اور طلبا کے درمیان جنگ کے موضوع پر تبادلۂ افکار ہوتا رہتا تھا۔ بعض اوقات دورانِ گفتگو مصطفیٰ کمال کی اصابت رائے سے تجربہ کار پروفیسر بھی حیران رہ جاتے۔ جنگ یونان کے ایک معرکہ میں مناستر کے مدرسہ سے چند طلبا کو مشاہدہ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مصطفیٰ کمال بھی ان میں شامل تھے۔ یہ جنگ 1897ء میں ترکوں کی فتح پر منتج ہوئی۔ مناستر کی فضا نے مصطفیٰ کمال کے مزاج میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی۔ اسے پروفیسروں کے طرزِ تربیت کا مفید نتیجہ سمجھیے یا گرد و پیش کے حالات اور وسعت مطالعہ کا اثر کہ وہی شعلہ مزاج طالب علم جو ہم سبقوں سے مسکرا کر ملنا پسند نہ کرتا تھا اب اپنی جماعت میں ہر دل عزیز تھا اور عام جلسوں سے احتراز کرنے کے باوجود طلباء اسے اپنا رہنما سمجھتے اور تعظیم سے پیش آتے تھے اس کی روش مین سنجیدگی کا عنصر اب بھی نمایاں تھا لیکن طبیعت میں وہ چڑچڑاپن نہیں رہا تھا اور زود رنجی کی جگہ بُردباری آ گئی تھی۔

مصطفیٰ کمال فنِ جنگ کی انتہائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے قسطنطنیہ کے حربی کالج میں داخل ہوئے اور دورانِ تعلیم پروفیسروں سے اپنے جوہر ذاتی اور خداداد ذہانت کی بناء پر خراجِ تحسین حاصل کرتے رہے۔ اِسی زمانہ میں انہیں ایک بار سلطان المعظم کی خدمت میں شرف باریابی بھی حاصل ہوا۔ حربی کالج کا نصاب پورا کرنے کے بعد حکومت نے انہیں لیفٹیننٹ کا عہدہ دے کر فوج میں بھرتی کر لیا۔

جنگ بلقان کے خاتمہ پر مصطفیٰ کمال کو فتحی بے سفیر ترکی متعینہ صوفیہ کا ملٹری اتاشی مقرر کیا گیا۔ مصطفیٰ کمال کو یہ عہدہ اس لیے زیادہ پسند تھا کہ فتحی بے ان کے قدیم دوست تھے۔ فتحی بے کی رفاقت سے جو خوشگوار امیدیں مصطفیٰ کمال نے وابستہ کی تھیں وہ بعد کے واقعوں سے بالکل درست ثابت ہوئیں فتحی بے جوہر شناس آدمی تھے۔ مصطفیٰ کمال کا ذکر کرتے ہوئے اکثر وثوق کے

ساتھ یہ پیشنگوئی کرتے کہ مصطفےٰ کمال ملک میں انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک دن نجات دہندۂ وطن ثابت ہوگیا۔

جنگ عظیم کے اسباب وعلل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بلقان کے اختتام پر روس کو یہ توقع ہوگئی تھی کہ ترکی سلطنت مستقبل قریب میں پارہ پارہ ہو جائے گی اور قسطنطنیہ اور درّہ دانیال پر اس کی قبضہ کرنے کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی۔ اِسی بنا پر روسی حکمراں یہ چاہتے تھے کہ ترک از سرِ نو اپنی طاقت اور حکومت کو منظم و مستحکم کرنے کی فرصت نہ پائیں۔ اس کے علاوہ مشرق ادنیٰ میں سیاسی اور اقتصادی اقتدار قائم کرنے کے لیے سلافی اور غیر سلافی اقوام کے درمیان مسابقت کی دوڑ جاری تھی ترکی سلطنت پر ان کی کشمکش کا اثر براہِ راست پڑتا تھا۔ ترک رہنما حریفوں کی اس آویزش سے فائدہ اُٹھا کر اپنی عسکری اور ملی حالت سدھارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس زمانہ میں مارشل عزت پاشا وزیر جنگ کے منصب پر فائز تھے اور ان کی تمام تر توجہ ترکی فوج کو از سرِ نو منظم کرنے پر مرکوز تھی۔ لیکن اپنے تقرر کے چند ماہ بعد انہوں نے محسوس کیا کہ مَیں اس عہدہ پر فائز رہ کر ملک اور قوم کی بہتر خدمت نہیں کر سکتا۔ اِسی بناء پر سلطان المعظم کے حضور میں استعفا پیش کر دیا۔ سلطان المعظم نے ان کی جگہ انور بے کو جواب پاشا کے لقب سے ملقب ہو چکے تھے۔ وزیر جنگ مقرر کر دیا۔ وزارت کی اس تبدیلی کے باعث ملک کی عنانِ حکومت انور، جمال اور طلعت کے ہاتھوں میں آگئی۔ سالخوردہ افسروں کی جگہ نوجوان ترک مامور کیے گئے اور فوج میں جرمنی کا اثر و رسوخ بتدریج بڑھنے لگا۔ اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ انور پاشا کی شجاعت حد تہور کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ کسی مسئلہ پر زیادہ دیر تک غور و خوض نہیں کرتے تھے اور خطرناک سے خطرناک مہم کے لیے فوراً آمادہ ہو جاتے تھے۔ ان کی طبیعت کو بھڑکنے والے شعلہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جو تر و خشک کو جلانے کے لیے تیار ہوتا ہے اور خود آسانی سے بجھنا نہیں چاہتا۔ نوجوان ترک انہیں پیکر شجاعت سمجھتے تھے اور بدترین دشمن بھی ان کے ایثار اور اخلاص کا اعتراف کرتے تھے۔ مبدا فیاض نے انہیں حسن سیرت و صورت سے نوازا تھا اور اس وجاہت اور ذہانت کے باعث عوام میں وہ خاصہ اثر و رسوخ رکھتے تھے جو دوسرے قائدین کو نصیب نہ تھا۔

طلعت کے مزاج میں سادگی اور سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔ نمود و نمائش سے انہیں سخت

نفرت تھی۔ ملک اور قوم کی خدمت کو زندگی کا نصب العین سمجھتے اور معمولی کاموں میں بھی اپنے دوستوں سے مشورہ کر لیتے۔ وطن کو سربلند اور قوم کو ممتاز اور سرفراز دیکھنے کی تمنا میں انہوں نے زندگی کی تمام راحتیں اور آسائشیں قربان کر دی تھیں۔ شہر کے ایک تنگ و تاریک کوچہ میں ایک معمولی مکان کے اندر قیام تھا اور اکثر وہیں سلطنت کے اہم ترین امور کا فیصلہ ہوتا تھا۔ جمال پاشا نے بھی جوشیلی طبیعت پائی تھی لیکن جوش کی فراوانی کے ساتھ ہی معاملہ فہمی کا جوہر بھی رکھتے تھے۔ سیاسی مسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ورثہ میں کثیر دولت ملی تھی اور طلعت کے برعکس امیرانہ شان سے زندگی بسر کرتے تھے۔

1915ء کے موسمِ بہار میں روسیوں کو سخت مشکلات پیش آئیں۔ جرمن فوج نے ہر معرکہ میں انہیں ایسی حوصلہ فرسا شکست دی کہ سنبھلنا محال ہو گیا۔ سپاہیوں میں بددلی اور افسروں میں مایوسی پھیل گئی۔ قریب تھا کہ عام پسپائی شروع ہو جائے۔ فوری اندیشہ یہ تھا کہ سامان حرب جلد نہ بھیجا گیا تو اتحادیوں کا دست راست ہمیشہ کے لیے شل ہو جائے گا۔ برطانیہ کو ملکۂ بحر ہونے کی حیثیت سے اپنی بحری طاقت پر بڑا ناز تھا۔ فرانس بھی اپنے بیڑے کو فتح کا ضامن سمجھتا تھا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح ممکن ہو۔ بحر اسود کی راہ سے روس کو سامان حرب پہنچایا جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ جنگ بلقان نے ''یورپ کے مردِ بیمار'' کو ادھ موا کر دیا ہے۔ ہمارے جہاز نہایت آسانی کے ساتھ خفیف سی مزاحمتوں کو دُور کرتے ہوئے درۂ دانیال سے گزر کر باسفورس پہنچ جائیں گے اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے بعد اڈیسہ اور دوسری بندرگاہوں میں سامان حرب پہنچا دیں گے۔ اس خیال خام کے پیشِ نظر برطانیہ اور فرانس کا متحدہ بحری بیڑہ درۂ دانیال کی طرف بھیج دیا گیا۔ حملہ آور جانتے تھے کہ ترکوں کے پاس گنی کی زنگ خوردہ اور فرسودہ توپیں ہیں۔ جن کے گولے ہمارے آہن پوش کوہ پیکر جہازوں پر بارش کے قطروں سے زیادہ اثر نہیں کر سکتے۔ انہیں یقین تھا کہ ترکی قلعوں کی حیثیت ریت کی ان دیواروں سے زیادہ نہیں جو ساحل پر کھیلنے والے بچے بنالیا کرتے ہیں۔ بہر حال فرانس اور برطانیہ کے مشہور اور منتخب بحری جہاز ایک زبردست اقدام کے لیے درۂ دانیال میں جمع ہو گئے۔ لیکن ابھی انہوں نے بہت تھوڑی مسافت طے کی تھی کہ ترکی توپ خانے آگ برسانے لگے اور گولے پس و پیش پھٹ پھٹ کر پیغام ہلاکت سنانے لگے۔ بڑے بڑے جہاز یکے بعد دیگرے تہ نشین ہو گئے اور جو باقی رہے انہیں سخت نقصان پہنچا۔ ترکی

کی یہ آتش بازی اتنی سخت اور غیر متوقع تھی کہ اتحادی بیڑہ نے خیریت اسی میں سمجھی کہ ایک پُر وقار انداز کے ساتھ واپس ہو جائے۔ سمندر کا راستہ مسدود سمجھ کر بحری فوج کو بہت جلد واپس آنے کا حکم دے دیا گیا۔ سمندری راہ مسدود پا کر اتحادیوں نے گیلی پولی میں فوج اتارنے کی تجویز سوچی اور یہ فرض کر لیا کہ ترک اس فوج کی پیش قدمی میں مزاحم نہ ہو سکیں گے۔ برطانیہ کی بہترین فوج جو سکاٹ لینڈ، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے سرفروش سپاہیوں پر مشتمل تھی اس مہم کو سر کرنے کے لیے بھیجی گئی۔ فرانس کی ایک جنگ آزما فوج بھی اس کے ساتھ تھی۔ اتحادیوں کی ان خفیہ سرگرمیوں سے ترک بھی بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے مورچے بنا کر اپنی افواج ان کے پیچھے جمع کر رکھی تھیں۔ اتحادی فوج تیاریاں مکمل کرنے کے بعد اپریل کے مہینہ میں ایک رات چپ چاپ درۂ دانیال کے ایشیائی ساحل پر جہازوں سے اُتری۔ اور دو مقامات پر قابض ہو گئی لیکن تیسرے مقام پر اسے سخت دشواری پیش آئی۔

آری برون میں ایک ترکی رجمنٹ حملہ آوروں کی مزاحمت کے لیے متعین تھی۔ لیکن وہ ''اتحادی فوج'' کے زبردست حملہ کی تاب نہ لا کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ برطانوی فوج کو تھوڑے تھوڑے وقفہ بعد جہازوں سے مزید کمک پہنچ رہی تھی۔ جنگ رات بھر انتہائی شدت سے جاری رہی صبح کے وقت حملہ آور اس علاقہ کی بلند ترین چوٹی پر قابض ہو گئے۔ اِسی صبح کو حسنِ اتفاق سے مصطفٰے کمال آری برون کے قریب فوج کی پریڈ کا معائنہ کر رہے تھے۔ میدان میں کئی رجمنٹیں جمع تھیں۔ اِسی حالت میں ایک سپاہی نہایت پریشانی کی حالت میں ان کے پاس آیا۔ مصطفٰے کمال نے اس کی گھبراہٹ سے متاثر ہو کر پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟''

سپاہی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ آ رہے ہیں۔ وہ آ رہے ہیں۔''

مصطفٰے کمال۔ ''کون آ رہے ہیں۔''

سپاہی۔ انگریز۔ انگریز!

مصطفٰے کمال نے ایک افسر سے دریافت کیا۔

''فوج کے پاس گولیوں کے کارتوس ہیں؟''

افسر نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔

مصطفےٰ کمال۔ ''اچھا بڑھو اور ان پر حملہ کر دو۔''

ترک اتحادی افواج پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہی حملہ میں میدان صاف کر دیا۔ شب تار کے پردہ میں انگریزی فوج نے فتح مندی کا جو علم نصب کیا تھا۔ صبح کی تجلی نے اسے تار تار کر دیا۔ حملہ آوروں کو ان تمام مقامات سے پسپا کر دیا گیا جہاں انہوں نے اندھیرے میں قدم جما لیے تھے۔ البتہ آری برون کی چند چوٹیاں بدستور ان کے قبضہ میں رہیں۔ ترکی فوج کی اس فتح عظیم کی خبر دارالخلافتہ میں پہنچی لیکن وزارتِ جنگ اور وزیرِ حرب کی طرف سے اس پر کسی خاص مسرت کا اظہار اور ڈویژنل کمانڈر مصطفےٰ کمال کی خدمات کا کوئی اعتراف نہیں کیا گیا۔ انور پاشا اسی اثنا میں افواج متعینہ گیلی پولی کے معائنہ کے لیے آئے بھی تو مصطفےٰ کمال کی ڈویژن کا معائنہ نہ کیا۔ مصطفےٰ کمال انور پاشا کی اس بے التفاتی سے برافروختہ ہو کر اپنے عہدہ سے دستبردار ہونا چاہتے تھے لیکن جرمن جنرل لیمان فان سانڈرس نے انہیں باصرار بلیغ اس سے باز رکھا۔

انقرہ میں ادھر اتحادی فوج پیش قدمی کی بجائے مورچے اور خندقیں بنانے پر اپنی تمام ہمت اور طاقت صرف کر رہی تھی۔ اور ادھر ترکی فوج بھی طویل جنگ میں تھک کر چور ہو گئی تھی۔ بظاہر فریقین نے مزید حملوں کا ارادہ ترک کر دیا تھا اس وقت اتحادی افواج صرف ایک بلند چوٹی پر قابض تھیں جو اپنے محل وقوع کے لحاظ سے قدرے اہم تھی۔ اس کی تسخیر کے لیے ترکوں کے کئی حملے ناکام ہو چکے تھے اور سپاہی اس قدر تھک گئے تھے کہ ان سے کسی زبردست اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مصطفےٰ کمال فوج کی حالت اور سپاہیوں کی ذہنیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ حقیقت ان سے پوشیدہ نہ تھی کہ فوج وقفہ راحت کی اشد ضرورت محسوس کر رہی ہے بہرحال ایک روز خندقوں کے قریب پہنچے اور سپاہیوں سے کہا ''یہ اضطراب اور عجلت کیوں ہے وقت مناسب پر میں خود تمہیں آگے بڑھنے کا حکم دوں گا۔ حکم ملتے ہی حملہ کر دینا۔'' اگلے دن انہیں مضمحل اور تھکان زدہ ترکوں نے خندقوں سے نکل کر اس جوش و خروش سے حملہ کیا کہ اتحادی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شام کے وقت اس چوٹی پر ترکی علم لہرا رہا تھا۔

❀..........❀..........❀

محمد احمد (مہدی سوڈانی)

افریقہ کی شاہ رگ نیل کے تیسرے آبشار کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں ''جنگ'' میں 1848ء میں غریب والدین کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ والد کا نام عبداللہ اور ماں کا نام آمنہ تھا۔ عبداللہ نے بچے کا نام محمد احمد رکھا۔ عبداللہ موروثی ترکھان تھا اور نیل میں تیرنے والے چھوٹے بجرے اور کشتیاں بنایا کرتا تھا اور اس کی بسر اوقات اِسی مزدوری پر ہوتی۔ عبداللہ کوئی زیادہ مرفع الحال نہ تھا۔ مگر مذہب کا پرستار تھا اور شرعی امور کی بجا آوری میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کرتا۔

محمد احمد کی عمر ساڑھے چار برس کی تھی کہ اس کے والدین اپنے موضع سے ترکِ مکانی کر کے جزیرہ آبا کو چلے گئے۔ یہ جزیرۂ نیل ابیض پر واقع ہے اور خرطوم سے شمال میں واقع ہے۔ ابتداً عبداللہ خود محمد احمد کو قرآن کریم اور دیگر مذہبی کتب کا درس دیتا رہا۔ بعد میں اُس نے آیا کے مقتدر عالم سالم مقامی کے پاس بٹھلا دیا۔ بارہ برس کی عمر میں محمد احمد نے قرآنِ کریم حفظ کر لیا۔

اب عبداللہ نے اپنے بھائی شریف الدین کے پاس محمد احمد کو بھجوا دیا۔ شریف الدین جزیرہ شکبہ میں مقیم تھا اور کشتی بنانے کا کام وسیع پیمانے پر کرتا تھا۔ چچا شریف الدین مزاج کا سخت تھا۔ بات بات پر محمد احمد کو جھڑکتا۔ ایک دن عالمِ غیض میں شریف الدین نے محمد احمد کو پیٹ ڈالا۔ محمد احمد اب چودہ سالہ نوجوان تھا۔ اس وقت تو مارے لحاظ سے خاموش رہا مگر اُسی دن رات کو اک کشتی کھول کر اس میں خرطوم کی طرف بھاگ گیا۔ شریف الدین نے دوسرے دن تلاش کی مگر سراغ نہ پا کر خاموش ہو رہا۔

محمد احمد جب خرطوم میں داخل ہوا تو اتفاقاً پہلے ہی اک مدرسہ پر نظر پڑی۔ یہ مدرسہ خوجلی تھا۔ اس کا مدرس خود ایک زمانے میں محمد احمد کی طرح گھر سے بھاگا ہوا تھا۔ اُس نے محمد احمد پر

ترس کھایا اور اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ دو سال تک محمد احمد وہاں پڑھتا رہا۔ وہاں سے بربر نامی قریبی قصبے میں جا کر علوم دینیہ کی تکمیل کی۔

اب محمد احمد نے علوم ظاہری کی تکمیل کر لی تھی۔ اب سلسلۂ حال کے لیے کسی پیر طریقت کی تلاش تھی۔ بَربَر سے محمد احمد ارداب پہنچا۔ وہاں وقت کے مشہور عالم و پیر شیخ نور الدائیم مقیم تھے۔ محمد احمد انہی کا مرید بنا اور وہاں حال کے متعلق علوم حاصل کیے۔

محمد احمد ارداب سے پھر خرطوم لوٹا اور وہاں پہنچ کر ایک اور شیخ محمد شریف کے طریقہ میں داخل ہو کر فیضان پانے لگا۔ شیخ محمد شریف طریقہ سمانیہ کے علمبردار تھے۔ محمد احمد کافی عرصہ یہاں مقیم رہا اور شیخ کے پیروؤں کے ساتھ ذکر وفکر کی محفلوں میں شریک رہا۔ انہی دنوں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے محمد احمد کی زندگی کا دھارا بدل دیا اور وہ عملی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک دن شیخ محمد شریف کے بچوں کی رسم ختنہ ہو رہی تھی۔ شیخ محمد شریف کے شاگردوں اور حلقہ بگوشوں نے ایک جلسہ کیا۔ چونکہ خوشی کا موقعہ تھا اس لیے رقص وسرود سے انہوں نے خوشی منائی۔ لوگ کافی جمع تھے۔ ایسے میں محمد احمد اُٹھ کھڑا ہوا اور لوگوں کو اس خلاف شرع تفریح سے منع کیا۔ محمد احمد نے کہا کہ شریعت ناجائز کاموں کو جائز قرار نہیں دے سکتی اور شیخ محمد شریف شریعت کے کسی ممنوع کام کو جائز نہیں قرار دے سکتا۔

اِدھر شیخ محمد شریف کو کسی شاگرد نے اس امر کی اطلاع دے دی۔ شیخ نے غضبناک ہو کر محمد احمد کو بلایا۔ محمد احمد خدمت شیخ میں حاضر ہوا اور عذر خواہی چاہی۔ شیخ نے معافی نہ دی اور بُرا بھلا کہنے کے بعد اس کا نام ''طریقہ سمانیہ'' سے نکال دیا اور خانقاہ سے خارج کر دیا۔ محمد احمد وہاں سے نکل کر پھر اپنے آبائی وطن جزیرہ آبا کو چلا آیا مگر محمد احمد کی حق پرستی وحق گوئی اور اعلائے کلمۃ الحق نے عوام الناس کو بہت متاثر کیا۔ سوڈان بھر میں محمد احمد کا نام مشہور ہو گیا۔ جزیرہ آبا میں ایک غار تلاش کر کے محمد احمد اس میں جا بیٹھا وہاں مختلف خوشبوئیں وغیرہ جلا کر خدا کی عبادت میں مستغرق رہا۔ رفتہ رفتہ اس کے زہد واتقا واستغنا کا سکہ لوگوں پر جم گیا۔ اطراف وامسار سے لوگ جوق در جوق آ آ کر مرید ہونے لگے۔ مہدی سوڈانی قطعاً لاپرواہی سے لوگوں سے برتاؤ کرتا۔ مگر لوگ مہدی کی اسی ادائے ماعرفنا پر پھڑک اُٹھے اس کی عظمت کا سکہ ہر کس وناکس پر جم گیا۔ بڑے بڑے عالم، زہاد، راہ نما اور اصحاب آ آ کر مرید ہونے لگے۔ علاقے بھر میں محمد احمد کے نام کا غلغلہ ہو گیا حتیٰ کہ

بڑے بڑے شیوخ بڑی منت سے اپنی اپنی بیٹیاں محمد احمد کے حبالۂ عقد میں دینے کی تمنا کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ محمد احمد کے پیروؤں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو کے لاکھوں تک جا پہنچی۔

جب محمد احمد کے پیروؤں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ تو محمد احمد نے اپنی طاقت کا جائزہ لیا۔ رفتہ رفتہ اس مذہبی گروہ پر سیاسی رنگ غالب آنے لگا۔ محمد احمد نے اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ ہی تبلیغ جہاد بھی شروع کر دی۔ محمد احمد اپنے مریدوں کو کہتا کہ ہم کو چاہیے کہ ہم موت کو اتنا ہی عزیز جانیں جتنا کہ عروسِ نو کو۔ محمد احمد کی اس تبلیغ میں جادوئی اثر تھا۔ لوگ جوق در جوق اس کے پاس آتے اور جہاد کے لیے اس کے ہاتھوں پر بیعت کرتے۔ رفتہ رفتہ اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ ملک گیری بھی شروع ہوئی۔ اسلحہ جنگ روز بروز جمع ہونے لگا اور اب محمد احمد نے علاقے بھر میں لوگوں کو جہاد پر آمادہ کر لیا تھا۔

محمد احمد نے ملک سوڈان کے تمام ممتاز علماء افراد اور لوگوں کو خطوط بھیجنے شروع کیے۔ ان مراسلات کا متن یہ ہوتا کہ آنحضرت ﷺ نے جس مہدی کے آنے کی پیش گوئی کی تھی اور معتبر احادیث میں جن کا حوالہ دیا ہوا ہے وہ مہدی موعود میں ہی ہوں۔ مجھے خداوند قدوس نے اس امر کے لیے مقرر کیا ہے کہ میں خطۂ ارضی کو کفار سے یکسر پاک کر دوں اور چونکہ ہم سوڈان کے باسی ہیں اس لیے ابتداء سوڈان سے کریں گے۔ دنیا کو میں عدل و انصاف سے معمور کر دوں گا اور ہر اس خرابی کا علاج کروں گا جو کہ دینِ قیم میں اعداء نے کی ہیں۔ مجھے خداوند عالم کی طرف سے القاء ہوا ہے کہ مَیں تمام عالم میں ایک دین، ایک مذہب، ایک شریعت اور ایک بیت المال قائم کروں۔

1881ء کے وسط میں محمد احمد نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں سوڈان، مصر اور تمام افریقہ میں اس کی مہدویت کا چرچا ہونے لگا۔ قصرِ حکومت میں زلزلہ سا آ گیا۔ رؤف پاشا نے جو کہ خدیو مصر کی طرف سے سوڈان کا حاکم تھا اپنے اک معتمد علیہ محمد ابوالسعود کو چند علماء کے ہمراہ مہدی کے پاس بھیجا۔ غرض یہ تھی کہ مہدی کو کسی نہ کسی طرح خرطوم حاضر کریں۔ ابوالسعود ایک جنگی کشتی میں چند ملازمین اور علماء کے ہمراہ دریائے نیل سے ہوتا ہوا جزیرہ آبا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر مہدی سے ابوالسعود ملاقی ہوا اور اُس سے اُس کے دعویٰ مہدویت کے متعلق پوچھا۔ مہدی نے جواباً کہا۔ مجھے خداوند قدوس نے اس غرض سے یہاں بھیجا کہ میں روئے زمین سے کفر کا بیج تک ختم کر دوں اور شرک کو بیخ و بُن سے اُکھیڑ پھینکوں۔ کفر سرنگوں ہو اور اسلام کا بول

بالا ہواور تمام دنیا پر اسلام کی حکومت ہواور صرف خداوند تعالیٰ کا قانون یعنی (قرآن) رائج ہو۔

ابوالسعود نے مہدی کو کہا کہ سوڈان کا حاکم بھی تو مسلمان ہے۔ محمد احمد نے جواباً کہا: ہاں اگر چہ حاکم سوڈان مسلمان ہے مگر در حقیقت طاقت کا سر چشمہ نصاریٰ کے ہاتھوں میں ہے وہ ملک بھر میں اپنے رسوم ورواج کو رائج کر رہے ہیں۔ جا بجا گرجے قائم کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی براہِ راست اور بالواسطہ کوششوں میں مصروف ہیں۔ حاکم سوڈان اُن کے بس میں ہے اور ان کی مرضی کے خلاف ایک تنکا بھی نہیں ہلا سکتا۔

جب ابوالسعود لاجواب ہوا تو اس نے مہدی کو کہا کہ تم اکیلے حاکم سوڈان خدیو مصر اور برٹش گورنمنٹ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم میرے ساتھ چل کر خرطوم میں رؤف پاشا حاکمِ سوڈان سے معافی مانگ لو اور اَب تک تم نے جو گستاخی کی ہے وہ مَیں معاف کرادوں گا۔ تمہارے گزارے کے لیے میں کوشش کر کے معقول وظیفہ بھی مقرر کرادوں گا۔ مہدی یہ سُن کر نہایت متانت سے کہنے لگا۔ مجھے دنیاوی دولت کی کوئی پرواہ نہیں میں دولت وحکومت کے لیے یہ سب کچھ نہیں کر رہا۔ میرا فرض مجھے پکار پکار کر اعلائے کلمتہ الحق ونہی عن المنکر کے لیے قربانی کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔

السعود نے غصے کے لہجے میں کہا۔ تم یہ چاہتے ہو کہ سرکاری توپ خانہ اور جنگی جہاز گولہ باری کر کے تمہارے اس جزیرۂ آبا کا نام تک صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ محمد احمد نے جواباً کہا کہ کس بدبخت ازلی کی شامت آئی ہے جو میری طرف آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھ سکے۔ اَب محمد احمد برافروختہ ہو گیا اس نے ابوالسعود سے کہا تم مہمان ہو اور ہم اپنی پرانی روایتوں کے امین ہیں۔ تم پر ہم ہاتھ نہیں اٹھائیں گے مگر اگر صرف آدھ گھنٹے کے بعد تم یا تمہارے ساتھیوں میں سے کوئی اس جزیرہ پر نظر آیا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔

اس تمام کارروائی کے وقت محمد احمد ساحل کے قریب اپنی ایک رہائش گاہ پر مقیم تھا اور اس کے قریب وجوار میں دس پندرہ سے زیادہ مرید (درویش) موجود نہ تھے۔ ابوالسعود نے تمام واقعات کنکھیوں سے بھانپ لیے اور اسنے یہ بھی دیکھ لیا کہ جزیرۂ آبا میں کوئی بھی جنگی استحکامات نہیں مگر وہ محمد احمد کے تیور دیکھ کر گھبرایا۔ علی اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے تیزی سے کشتی میں بیٹھ کر خرطوم کی طرف روانہ ہوا۔

رؤف پاشا حاکم سوڈان کے سامنے محمد ابوالسعود نے تمام واقعات سنائے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ڈینگ ماری کہ اگر مجھے پچاس مسلح سپاہی ملیں تو میں اس خانہ ساز مہدی کو پکڑ لاتا ہوں۔ جب ابوالسعود یہ بات کہہ رہا تھا تو تقدیر سرہانے کھڑی ہنس رہی تھی اُسے یا رؤف پاشا کو کیا پتہ تھا کہ جس شخص کو پچاس آدمی پکڑنے کے لیے جارہے ہیں وہ آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکے گا۔ چند ہی برس میں سارا سوڈان اس کے زیرِ قدم ہوگا اور مشرق ومغرب پر حکومت کرنے والے انگریز جن کی علمداری میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، بھی اس کے سامنے مقابلہ میں نہ آسکیں گے اور سوڈان کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اپنی بے بضاعتی کا اظہار کریں گے۔

بہرحال رؤف پاشا نے ابوالسعود کو پچاس عسکری ساتھ لے کر جانے کی اجازت دے دی۔ ابوالسعود خود اِک کشتی میں بیٹھا رہا اور فوجیوں کو حکم دیا کہ جزیرے پر اُتر کر محمد احمد کو گرفتار کر لائیں۔ اتنے میں محمد احمد کو بھی اس لشکر کشی کا پتہ چلا۔ اس نے اپنے مریدوں (درویشوں) کا ایک گروہ بھیج دیا۔ ان درویشوں نے پچاس سپاہیوں کو گھیر کر سب کو ختم کر دیا۔ ابوالسعود بمشکل بچ کر بھاگ نکلا۔ جب اس واقعے کی اطلاع رؤف پاشا کو ملی تو وہ بہت سٹ پٹایا اور اُس نے حکومت مصر کو اس تمام واقعے کی اطلاع دے دی۔

اُدھر سوڈان بھر میں محمد احمد کی اس کامیابی کی اطلاع بجلی کی طرح پھیل گئی۔ اُس کی قوت میں اب معتد بہ اضافہ ہو رہا تھا اور سنجیدہ لوگ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کہیں سچ مچ یہ مہدی موعود تو نہیں؟

مصری حکومت کی عاجزی

جب پہلی مہم اس طرح سے ناکام رہی تو رؤف پاشا کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے مگر وہ محض ایک گورنر تھا اور ایسے معاملات میں حکومت کی اجازت کے بغیر وہ مزید کوئی کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ رؤف پاشا نے خدیو مصر کو تمام معاملے کے متعلق اطلاع دی اور اجازت مانگی کہ تین سو سپاہیوں کا ایک مضبوط دستہ اور تین عدد چھوٹی توپیں مہدی کو کچلنے کے لیے بھیجی جائیں۔ خدیو مصر نے اجازت دے دی اور یہ دستہ فوج توپیں لے کر چھوٹے مگر مضبوط جنگی جہاز میں جزیرۂ آبا کی طرف روانہ ہوا۔ اس دستہ فوج کی قیادت سوڈان میں مصری فوج کا مشہور جرنیل علی آفندی

کررہا تھا۔

جزیرہ آبا کے ایک ویران سے ساحل پر علی آفندی نے اپنے جہاز کو لنگر انداز کیا اور توپیں بھی اُتار دیں۔ ایک جانب سے ایک غول درویشوں کا نمودار ہوا۔ یہ اپنے حلقے میں ایک مقدس و متشرع سے شخص کو لیے ہوئے تھا۔ علی آفندی نے یہی سمجھ لیا کہ یہ مہدی ہے اور باقی کے درویش اُس کے ساتھی ہیں اور وہ بہت خوش ہوا کہ مَیں نے پالا مار لیا۔ وہ بندوق لیے آگے بڑھا اور بغیر کوئی بات کیے اُس شخص کو گولی مار دی۔

درحقیقت وہ مہدی نہ تھا بلکہ مہدی کا نائب احمد علی تھا۔ اُس کے ساتھی درویشوں نے جب یہ معاملہ دیکھا تو انہوں نے ایک ہی ہلے میں تمام دستے کا صفایا کر دیا اور ایک بھی متنفس بچ نہ سکا توپ خانے کا آفیسر ابوالسعود تھا۔ اُس نے توپ خانے والوں کو حکم دیا کہ فی الفور مہدیوں پر آتش بازی کی جائے۔ مگر توپ خانے والوں نے جب مہدیوں کی متشرع صورتیں دیکھیں تو وہ متاثر ہوئے اور انہوں نے ہوا میں گولے چلانے شروع کر دیے۔

مہدی کے ہمراہ جو پیرو تھے وہ اتنے آگے بڑھ آئے کہ توپوں کے گولوں کے مؤثر یا غیر مؤثر ہونے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ابوالسعود کے ہمراہی فوجی جنگی جہاز پر چڑھے اور انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور سیدھے خرطوم پہنچے۔ اس شکست سے رؤف پاشا سمجھ گیا کہ مہدی لقمہ تر نہیں جو آسانی سے شکست کھا سکے۔ اُدھر سوڈان بھر میں ایک لہر سی دوڑ گئی اور مہدی کے ہمراہیوں کی تعداد یوماً فیوماً بڑھنے لگی۔ مہدی سوڈانی نے ایک مجلس شوریٰ قائم کی۔ اس میں مہدی نے یہ دانش مندانہ فیصلہ کیا کہ اپنا مستقر کسی پہاڑی علاقے میں قائم کیا جائے۔ کیونکہ جزیرہ آبا خشکی اور تری کی شاہراہوں پر واقع ہے اور حکومت سوڈان اور حکومت مصر نہایت آسانی سے فوجیں وہاں بھیج سکتی ہیں اور اپنے رسل و رسائل کے سلسلے کو برقرار رکھ سکتی ہیں جس کا نتیجہ اس کے حق میں بہتر نہ ہوگا۔ اگر مرکز ایسے مقام پر ہو جو کہ دشوار گزار بھی ہو اور مرکزِ سوڈان سے ورے بھی تو جنگی نقطۂ نظر سے یہ ایک بہترین عمل ہوگا۔

چنانچہ مہدی سوڈانی نے جزیرہ آبا پر اپنے ایک معتمد احمد مکاشف سلیمی کو مقرر کیا اور تھوڑے سے جانباز وہاں متعین کر دیئے اور خود کو کردوفان کے گردونواح میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔ پہاڑی سلسلوں میں بڑے بڑے غار بنوائے جن میں ہزاروں افراد چھپ سکتے تھے۔ پہاڑی

دروں پر مورچے قائم کیے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پتھروں کے ڈھیر جمع کر دیئے تاکہ اگر باہر سے بڑی سے بڑی فوج بھی حملہ آور ہو تو اس کو تہس نہس کیا جاسکے۔

جب مہدی سوڈانی اپنے دفاعی امور کی طرف سے بے فکر ہوا تو پھر اس نے اپنے گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ انہی دنوں جزیرہ آبا سے پچاس میل دور کاوا کے مقام پر ڈیڑھ ہزار مصری فوج پڑی تھی۔ اسکی کمان مشہور مصری جنرل محمد سعید پاشا کر رہا تھا۔ مہدی نے اپنے لشکر کو حرکت دی۔ اپنے باقی لشکر کو پہاڑوں میں چھپا لیا اور ایک دو چھوٹے سے دستوں کو مصریوں پر حملہ کرنے کو کہا۔ سعید پاشا سپاہ لے کر آگے بڑھا اور ان دستوں کا مقابلہ کر کے ان کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ یہ درویش پہاڑوں میں گم ہو گئے اور اپنے بڑے لشکر میں مل گئے۔ سعید پاشا کی فوج پہاڑوں میں ٹکراتی پھری مگر بے سود، مہدی کو پکڑنے اور شکست دینے کا شوق جو کہ ان کو ان پہاڑوں میں لے آیا تھا اب اُن کی موت کا سامان بن رہا تھا۔ مہدویوں نے آہستہ آہستہ رسد و کمک کے راستے اُن پر بند کر دیئے۔ سعید پاشا کے ساتھی اب بھوکوں مر رہے تھے۔ مہدی نے موقعہ بہ موقعہ اپنے لشکری متعین کر رکھے تھے جو وقتاً فوقتاً حملہ آور ہو کر مصری سپاہ کے پرخچے اڑا رہے تھے۔ دو ماہ کے قلیل عرصے میں یہ لشکر پارہ پارہ ہو گیا۔ چند افراد نے اطاعت قبول کر لی اور مہدویت اختیار کی۔ باقی کے کھیت رہے۔ سعید پاشا بھاگ نکلا اور بعد بصد خرابی خرطوم پہنچا۔ اس کے بعد رؤف پاشا نے تین ہزار کا ایک لشکر محمود عالی پاشا کی زیر سرکردگی بھیجا مگر یہ لشکر بھی کوکردوفان کی گھاٹیوں میں تباہ کر دیا گیا اور اس لشکر سے ایک متنفس بھی زندہ نہ بچ سکا۔

تین ماہ بعد حاکم منشور رشید بے سات ہزار کا لشکر لے کر مہدی کو کچلنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ اس کے پاس بیس چھوٹی توپیں تھیں مگر مہدی نے اس لشکر کو دریائے نیل کے کنارے گھیر لیا اور مہدی کے ہمراہ صرف پندرہ سو نیزہ بردار مہدویوں نے اس لشکر کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ رشید بے بھی وہیں کھیت رہا۔ مہدوی، مصری سپاہ پر یوں جھپٹے جیسے شہباز ایک مُمولے پر، مصری لڑنا تک بھول گئے اور مارے گئے۔ مہدی کے ہاتھ بے شمار اسلحہ لگا۔

اِسی سال رؤف پاشا اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا اور اب سوڈان کا حاکم عبدالقادر پاشا مقرر ہوا۔

اس کے بعد مہدی سوڈانی نے یکے بعد دیگرے چھوٹی چھوٹی مہمات چاروں طرف بھیج دیں جن میں اسے کامیابی ہوئی اور اب سنار کا سارا صوبہ مہدی سوڈانی کی عملداری میں شامل تھا۔ چار ماہ بعد عبدالقادر پاشا نے مشہور جنگجو شلالی پاشا کو چھ ہزار منتخب سواروں کے ہمراہ مہدی کے خلاف بھیجا۔ اس فوج نے پہلے فتودہ فتح کیا اور پھر رفتہ رفتہ کوہ کو کردو فان کی طرف بڑھی۔ مہدی سوڈانی تاک میں تھا جونہی یہ فوج اس کی زد پر آئی۔ دونہی وہ جھپٹا۔ چاروں طرف سے شلالی پاشا کی فوج کو گھیر لیا اور سوائے دوسو افراد کے باقی سب کو وہیں ڈھیر کر دیا مہدی کے لشکر نے سرکاری فوج کو سنبھلنے کا موقع تک نہ دیا۔ اور مہدی کی فتح کا سب سے بڑا یہی راز تھا کہ وہ بے جگری سے حملہ کر دیتا اور فتح حاصل ہونے تک مردانہ وار، موت کی پرواہ کیے بغیر مصروف پیکار رہتا۔ مہدی کے ساتھ اڑھائی ہزار درویش تھے جو اس جنگ میں مصروف پیکار تھے۔

جب مہدی نے اتنے کم افراد کے ہمراہ اپنے سے تین گنا بڑی فوج کو شکست فاش دی تو سوڈان بھر کا اعتقاد اُس پر راسخ ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ واقعی مہدی میں ضرور کوئی ایسی ایمانی قوت ہے جس کی مدد سے وہ اتنے بڑے بڑے لشکروں کو تہس نہس کر رہا ہے۔

اُدھر عبدالقادر پاشا حاکم سوڈان بھی جان گیا کہ مہدی کچھ لقمہ تر نہیں۔ وہ خرطوم میں وسیع پیمانے پر جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ عبدالقادر پاشا نے سوڈان کے طول و عرض میں اعلان کروا دیا تھا کہ ایک درویش کا سر لانے والے کو دو پونڈ اور درویشوں کے افسر کا سر لانے والے کو بیس پونڈ انعام ملیں گے اور اس کے علاوہ جو شخص مہدی کو قتل کر کے اس کا سر حاضر کرے گا۔ اُسے سرزمین سنار کا حاکم بنایا جائے گا۔ مگر اس اعلان کا مہدی کی شہرت یا طاقت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ اُلٹا عوام کا عقیدہ اس پر اور بھی راسخ ہونے لگا۔

اب مہدی جنوبی سوڈان کے لوگوں کی آنکھوں کا تارا تھا وہ ان کا مذہبی و سیاسی راہنما تھا اور اس کے ادنیٰ سے اشارے پر عوام عموماً اور درویش خصوصاً جان فدا کرنے پر تیار تھے۔ مہدی کی ہمت بہت بڑھ گئی تھی اور وہ اپنے دیرینہ خواب کو پورا کرنے کا متمنی تھا۔ اس کی ہمت عالی اس کی رفیق اعلیٰ تھی اور اس کا مسلسل عمل اُس کا ساتھی۔

فتح ابیض

عبدالقادر پاشا، گورنر سوڈان، زبانی باتوں یا اعلانات تک ہی نہ رُکا رہا بلکہ اس نے عملی طور پر حصول قوت کی کوشش کر دی۔ اس نے عام بھرتی شروع کر دی اور سرکاری خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ سوڈان جیسے غریب ملک میں جہاں لوگوں کو قوت لایموت حاصل کرنے کی بڑی کوششیں اور تردّد کرنا پڑتا ہے وہاں سرکاری ملازمت خصوصاً فوجی ملازمت بہت بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ قبائل کے غول در غول افراد روزانہ خرطوم کی جانب رواں نظر آنے لگے۔ خصوصاً شمالی سوڈان میں جہاں کہ مہدی کے اثرات زیادہ گہرے نہ تھے کافی لوگ سرکاری لشکر میں بھرتی ہوئے۔ عبدالقادر پاشا نے ایک فوج کثیر مرتب کی۔ اب ایک ماہر جنرل کی طرح اس نے سوڈان کے نقشے کو سامنے رکھا اور نقشہ جنگ مرتب کیا کہ کس طریقے سے مہدی کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ختم کیا جائے۔

اس لشکر کا ایک حصہ عبدالقادر پاشا نے کردوفان کے مرکزی مقام ابیض کی حفاظت کے لیے روانہ کیا اور باقی ماندہ لشکر کے ہمراہ وہ خرطوم میں بیٹھا بڑی دانشمندی سے مہدی کی نقل و حرکت دیکھنے لگا۔

محمد احمد مہدی سوڈانی ایک گرگ باراں دیدہ کی طرح یہ تمام جال جو کہ اس کے لیے پھیلایا جا رہا تھا، دیکھ رہا تھا۔ ابیض اس کے اقتدار پر ایک طنز تھا۔ ابیض حاصل کیے بغیر مہدی جنوبی سوڈان میں دلجمعی کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ اُس نے پہلے ابیض کی فتح کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ مہدی درویشوں کا ایک لشکر لے کر آگے بڑھا اور ابیض کے قریب پہنچا۔ ابیض کا حاکم اس وقت سعید پاشا تھا۔

مہدی نے سب سے پہلے ایک سفارت بھیجی تا کہ اتمام حجت ہو سکے۔ سعید پاشا کافی ذخیرہ رسد جمع کر چکا تھا اور ایک قواعد دان فوج اس کے زیرِ کمان تھی۔ وہ خود بھی ایک جوشیلا حاکم تھا۔ کسی صورت بھی اس نے اطاعت کی بات نہ مانی اور مہدی کی سفارت کو واپس کر دیا۔

مہدی سوڈانی کے کئی پیرو، تاجر اور سپاہی چھپ کر سعید پاشا کے لشکر کی طرف روانہ ہوئے اور انہوں نے قلعے کی اندرونی کمزوریاں مہدی کو بتلا دیں۔

اب اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مہدی نے ایک صبح قلعے پر حملہ کر دیا۔ درویشوں کے غول کے غول داڑھیاں منہ میں دبائے ہاتھوں میں اعلیٰ مصری بندوقیں، نیزے اور تلواریں لیے فصیل کی جانب بڑھے۔ شہر پناہ نہایت مستحکم و بلند تھی۔ مہدی کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ یہاں پر بھی اُس نے وہی طریقۂ جنگ اختیار کیا جو کہ اس سے قبل وہ دوسری لڑائیوں میں کر چکا تھا۔ یعنی پورے جوش و خروش کے ساتھ دشمن پر حملہ کر کے ایک سیل کی مانند مخالف لشکر کو بہا لے جائے مگر یہاں مقابل میں لشکر تو تھا پر سنگی حصار کے پیچھے تھا۔ سعید پاشا حاکم ابیض نے نہایت دانش مندی سے کام لے کر اپنا نصف لشکر شہر پناہ کی فصیلوں پر چڑھا دیا اور یہ سب تیر انداز تھے۔ سعید پاشا نے فصیل پر ڈھیروں پتھر بھی جمع کر دیئے تھے۔

جب درویشوں کا لشکر شہر پناہ کے قریب پہنچا تو محصورین نے تیر اندازی شروع کی اور تاک تاک کے نشانے لگائے۔ مہدوی صبح سے دوپہر تک بڑی جاں فشانی سے لڑتے رہے۔ اپنی طرف سے مہدوی بھی تیر اندازی کرتے رہے مگر یہ کھلے میدان میں تھے اور محصورین شہر پناہ کی سنگی آڑ میں۔

سہ پہر کے وقت مہدویوں کو شکست ہو گئی اور تقریباً دس ہزار مہدوی کھیت رہے۔ محصورین کے صرف تین سو سپاہی ہلاک ہوئے۔

مہدی سوڈانی نصف میل پیچھے ہٹا۔ اپنی فوجیں نئے سرے سے ترتیب دے کر اس نے شہر پناہ کے چاروں طرف لشکر پھیلا دیا۔ اس نے مزید کمک کے لیے ہرکارے دوڑا دیئے۔

اب مہدی کے ذہن میں یہ بات آئی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ کے لیے کسی بھی قلعے یا شہر پناہ پر براہِ راست حملہ نہیں کرے گا۔ بلکہ محصورین کو تڑپا تڑپا کے بھوکا مارے گا اور انہیں اس طرح سے مجبور کرے گا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔

چند ہی دنوں میں مہدی کو کمک پہنچ گئی۔ اس نے سختی کے ساتھ ابیض کے گرد گھیرا ڈال دیا اور اتنی سختی سے محاصرہ کیا کہ پرندہ بھی پر نہیں مار نہ سکتا تھا۔ چار ماہ تک محاصرہ جاری رہا بالآخر جب رسد ختم ہو گئی تو مجبور ہو کر محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سعید پاشا حاکم ابیض اور دوسرے بڑے بڑے عمال اپنے ہاتھ باندھ کر مہدی کے سامنے پیش ہوئے۔ مہدی نے اُن کے ہاتھ کھلوائے اور عزت کا سلوک کیا۔

ابیض کی فتح کے بعد عملاً تمام کردوفان مہدی کے تسلط میں آ گیا اور مہدی نے اپنے عمال جابجا مقرر کیے۔ جو کہ مہدی کے نام پر حکومت چلانے لگے۔

اب عبدالقادر پاشا کو سوڈان کی گورنری ڈولتی ہوئی نظر آئی۔ وہ جان چکا تھا کہ مہدی کو شکست دینا آسان امر نہیں تھا۔

نظامِ حکومت

محمد احمد مہدی سوڈانی نے کردوفان کے علاقے پر مکمل قبضہ ہونے کے بعد انتظامِ حکومت کی طرف توجہ دی۔ انتظامی امور کی آسانی کے لیے چار سمتوں کی مناسبت سے اُس نے اپنی مملکت کے چار حصص کیے۔ ہر حصے پر ایک نائب مقرر کیا۔ مرکز میں تین صیغے انتظامی امور کی بجا آوری کے لیے قائم کیے۔

(1) قضا (2) مال (3) سپاہ

محکمہ قضا احمد بن علی کے ہاتھ میں تھا جو کہ بذاتِ خود ایک جید عالم تھا۔ پہلے پہل احمد بن علی دارفور میں قاضی تھا۔ احمد بن علی کو اب قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ احمد بن علی نے ہر بڑے شہر و قصبے میں نائب قاضی مقرر کیے۔ یہ قاضی سیاسی اثرات سے بالاتر ہوتے اور کسی بھی عنوان نہ جھک سکتے۔ محکمہ مال کے انتظام کو درست کیا اور ایک بیت المال (خزانے) کی بنیاد رکھی گئی۔ اس بیت المال میں ہر قسم کی آمدنی از قسم عشر، زکوٰۃ، خمس، فطرہ، مالِ غنیمت اور جرمانے وصول کر کے رکھے جاتے۔ اِسی بیت المال سے رعایا کی فلاح کے کاموں پر رقم خرچ کی جاتی اور عمالِ حکومت کو تنخواہیں دی جاتیں۔

جرمانے اُن لوگوں سے وصول کیے جاتے جو کہ شرعی قوانین کے خلاف عمل کرتے۔ ایسے افراد پر حد قائم کی جاتی۔ کسی فرد کی مجال نہ رہی کہ کسی بھی دوسرے شخص پر کوئی سختی کر سکے۔ رعایا مہدی کے اس انتظام سے از حد خوش تھی۔ ہر طرف راحت و سکون تھا اور لوگ بے غم ہو کر اپنے کاموں میں مصروف رہتے۔ عمالِ حکومت میں سے کوئی ایک پائی بھی ناجائز کسی سے وصول نہ کر سکتا۔

خود مہدی کی رہائش، لباس اور خوراک وغیرہ از حد سادہ تھی۔ وہ شروع کی طرح اب

بھی زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔شریعت اسلامی اس نے اپنے ملک میں رائج کر دی تھی اور ہر وہ حد جاری کر دی جو کہ شریعت نے کی تھی۔ وہ اپنے ہر خطبہ میں دنیا کے مال واموال سے نفرت، حُب اُخروی اور مسلکِ شرعیہ پر زور دیتا۔اس کے احکامات مذہبی نصائح سے پُر ہوتے۔ وہ لوگوں کو دنیاوی لذائذ میں پڑنے سے روکتا اور آخرت کے عذاب الیم سے ڈراتا۔لوگوں کو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کو کہتا۔اُس کے احکامات اور ہدایات کچھ اس قسم کی تھیں۔"اے لوگو تم پر جہاد فرض ہے۔ خدا کے راستے میں ایک گھنٹہ تلوار چلانا ستر برس کی عبادت سے کہیں بہتر ہے۔دنیا کی آسائشوں کو ٹھکرانا۔اُن کو قبول کرنے سے بدر جہا بہتر ہے۔خدا کے سچے بندوں کا ساتھ دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ایک انساں کی بہترین زندگی وہ ہے جو کہ عالمِ جہاد میں بسر ہو۔عورتوں پر بھی خدا کی راہ میں جہاد فرض ہے اور عورتیں اپنے آپ کو اسلام کے اس عظیم فریضے سے مستثنیٰ نہ سمجھیں۔جو عورتیں ہاتھ پاؤں کی مضبوط ہوں وہ بے شک خدا کی راہ میں جہاد کریں۔خدا کی راہ میں لڑ کر شہید ہونا بدرجہ بہتر ہے عورتوں کے لیے بہ نسبت اس ذلت کی زندگی کے جب کہ وہ غیروں کی لونڈی بن کر زندگی گزاریں۔کمزور اور جوان عورتوں کے لیے یہی جہاد ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور اپنی اولاد کو ایک صالح، نڈر اور بے باک مومن بنا کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔پردہ نشین عورتیں اپنے نفس اور نفسانی خواہشات سے جہاد میں مصروف رہیں۔عورتوں کا گھر سے بلا ضرورت باہر نکلنا گناہ اور زنا کی دعوت دینے کے مترادف ہے۔"

مہدی سوڈانی نے عورتوں کو بلند آواز میں گفتگو تک کرنے سے منع کر دیا تھا۔مہدی عورتوں کی نیم برہنگی کے سخت خلاف تھا۔اس نے حکم دے دیا تھا کہ جو عورت اپنے سر کھولے اور اس عالم میں کسی نامحرم کو نظر آئے تو اس عورت کو ستائیس کوڑے مارے جائیں۔اِسی طرح کوئی شخص نامحرم یا لاتعلق عورت سے گفتگو کرتے پایا گیا اُسے بھی ستائیں کوڑوں کی سزا ملے گی جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کتا، سُور، کافر، نصرانی، زانی، چور، ملعون، خائن یا لوطی کہے اُسے اَسّی کوڑوں کی سزا دینی قرار پائی۔کسی حرام فعل پر قسم کھانا یا جھوٹی قسم کھانا بھی ستائیس کوڑوں کی سزا کا مستحق قرار دی گئی۔شراب خور کو اَسّی کوڑوں کی سزا مقرر ہوئی۔اسی طریق سے یا اخفائے جرم کی سزا بھی اَسّی کوڑے طے پائی۔

یہ تمام سزائیں مجمع عام میں دی جاتیں۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں جرم و

گناہ کا نام تک جنوبی سوڈان سے مٹ گیا۔ مہدی کے نزدیک اپنے نفس باطلہ کو دبانا اور جہاد کرنا، جہاد بالسیف سے یقیناً بہتر و برتر ہے۔ ترک نماز بھی جرم قرار پایا اور اس کا اخفا بھی یکساں جرم تھا۔

کوئی عورت کسی بھی غیر مرد کے ہمراہ پائی جائے یا اس کے پاس رہتی ہو۔ چاہے اس سے اس کی منگنی بھی ہو چکی ہو تو اس مرد کو قتل کر کے اُس کا مال و جائیداد بحق سرکار ضبط ہو جائے گا۔ مہدی کے نزدیک تمام گناہِ کبیر و صغیرہ حُب دنیا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اِسی لیے وہ ترکِ دنیا ترکِ خواہشات اور سادہ زندگی بسر کرنے پر خاص زُور دیتا۔ مشکل وقت پر وہ خدا کی مدد پر تکیہ رکھتا اور بھلے اوقات میں خدا کا شکرادا کرتا۔ صبر و استقامت ایک مومن کے خاص جوہر ہیں۔

جب کبھی کوئی قتل ہوتا تو مہدی وارثوں کو قصاص یا دیت پیش کرتا جو بھی وارث قبول کریں اُسی طرح فیصلہ کیا جاتا۔ باقی کے تمام اُمور میں مہدی قرآن وسنت کا اتباع کرتا۔ وہ کہتا کہ قرآن احکام خداوندی کا مجموعہ ہے اور اس میں تحریف و تبدل کا شک تک دل میں لانا کفرِ عظیم کے مترادف ہے۔ اپنے احکامات شرع اور مذہب کی روشنی میں مرتب کرتا اور لوگوں کو سختی سے اُن پر عمل کرنے کو کہتا۔

مہدی عورتوں کے مہر بڑھا کر باندھنے کے سخت خلاف تھا اور اس کے خلاف کرنے والوں پر حدِ شرع جاری کرتا اور اَسّی کوڑوں کی سزا دیتا۔

الغرض مہدی سوڈانی نے مدتوں کا بھولا ہوا سبق سوڈانیوں کو یاد کرایا اور کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے مرتب کردہ شرعی قوانین کے مطابق اُس نے انتظامِ حکومت استوار کیا۔ راسخ العقیدہ مسلمان اس کے ساتھ تھے کیونکہ اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا تھا جو کہ قرآن و سنت کے بنیادی عقائد کے خلاف ہوتا۔

مہدی نے ایک خاص محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ اس کے ذمہ تبلیغ مذہب، اشاعت اسلام اور ذکر جہاد ہوتا۔ سوڈان اور وسطی افریقہ میں جا بجا مہدوی مبلغ تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں لگے ہوئے تھے۔

جنرل ہکس ہو یا جنرل بیکر

یوں تو مہدی کے تمام مبلغوں نے قرارِ واقعی کارنامے سرانجام دیئے مگر مشرقی سوڈان

میں عثمان وغنہ نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ عثمان وغنہ نے مہدی کی تعلیمات اور احکامات کا خلاصہ شائع کیا اور تمام قبائل میں مہدی کی تبلیغ عام کر دی۔ مشرقی سوڈان کے تمام قبائل مہدی کی پے در پے کامیابیوں کو اُس کی علو ہمتی سے زیادہ اس کے دعوائے مہدویت پر منتج کر رہے تھے اور جاہل افراد و قبائل میں یہ خیال عام ہو گیا کہ واقعی محمد احمد سوڈانی ہی وہ مہدی موعود ہے جس کے درود کا ذکر مختلف احادیث نبوی اور مذہبی کتب میں کیا گیا ہے۔

ادھر عبدالقادر پاشا حاکم سوڈان نے خدیو مصر کو اطلاع گزاری کہ جتنا علاقہ سوڈان میرے قبضے میں ہے۔ وہ بھی مہدی کی سرگرمیوں کی زد میں ہے اور قریب ہے کہ تمام سوڈان مہدوی چھین لیں۔ سرکاری مہمات کی پے در پے ناکامیوں سے سرکاری حلقوں، مصری دربار اور خود انگلستان میں مایوسی کی ایک لہر سی چھا چکی تھی۔ مصری حکومت گو نام نہاد خدیو محمد علی پاشا اور خدیو اسمٰعیل پاشا کے زیرِ اقتدار تھی مگر درحقیقت نہر سویز کے حصص انگلستان کو منتقل کرنے کے بعد سے مصر پر عملاً انگریز حکمران تھے۔ سویز میں اپنے نوخرید حصص کی حفاظت کے لیے ایک زبردست انگریزی فوج مصر میں مقیم تھی اور چونکہ سوڈان مصر کے زیرِ سیادت تھا۔ اس لیے سوڈان بھی انگریزوں کے زیرِ نگین تصور ہونے لگا۔

قاہرہ اور لندن کے سیاست دانوں نے سر جوڑے، قرار پایا کہ ایک زبردست قواعد دان فوج مہدی کی سرکوبی کے لیے سوڈان بھیجی جائے اور اس فوج کے ہمراہ ایک زبردست توپ خانہ بھی ہو۔ وقت کے بہترین انگریز جنگجو اس فوج کے ہمراہ تھے۔ اس فوج کی کمان جنرل ہکس (Hex) کے تجربہ کار ہاتھوں میں تھی۔ جنرل ہکس مصری فوجی معاملات میں خاصا تجربہ کار تھا اور سکاٹ لینڈ کا رہنے والا یہ جنرل بہت نڈر تھا۔

عبدالقادر پاشا کو سوڈان کی گورنری سے ہٹا دیا گیا اور اب اس کی جگہ ایک خرانٹ کہنہ مشق سیاست دان علاؤالدین پاشا خرطوم کی گورنری پر متمکن کر دیا گیا۔ پہلی مہمات کی ناکامیوں سے سبق اٹھاتے ہوئے صحرا کی اس لڑی جانے والی جنگ کے لیے چار ہزار اونٹوں کا بندوبست کیا گیا۔ کیونکہ صحرائی جنگ میں گھوڑوں سے کہیں زیادہ اونٹ مفید پائے گئے تھے۔ نیل ارزق کے گردونواح میں آباد قبائل کو اُن کی سب سے قیمتی متاع یعنی اونٹوں سے محروم کر دیا گیا اور جب انہوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو ان کے سرداروں کا سر قلم کر دیا گیا۔ علاؤالدین

پاشا کی اس حرکت سے شمالی سوڈان کے قبائل کی اکثریت مصری حکومت سے برگشتہ ہوگئی۔اس فوج میں مصری دستے اور توپ خانے اور سواروں کی پلٹنیں شامل تھیں۔اس لشکر کی تعداد محتاط انداز کے مطابق بیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔مصر کے چار بہترین کمانڈار سیّد بک عبدالقادر، رجب بک صدیق، ابراہیم پاشا اور سلیم بک عدفی بھی اس لشکر کے ہمراہ تھے،سوڈانی فوج مشہور سپہ سالار احمد مختیار پاشا سوڈانی کے ماتحت تھی۔ساری فوج کا کماندارِ اعظم جنرل ہکس مقرر ہوئے۔اس لشکر کے ہمراہ نامہ نگار تھے۔تاکہ مہدویوں کی تباہی کی داستانوں کو زیبِ قرطاس بنا سکیں۔

یہ لشکر دوئم سے چل کر ابیض پر حملہ آور ہونے کے لیے ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ دوئم میں علاؤالدین پاشا ایک اور کمکی لشکر کے ہمراہ اِن سے آملا۔دوئم سے ابیض تقریباً ایک سو بیس میل جنوب میں واقع تھا۔

جنرل ہکس نے یہ تجویز کی کہ ہر بیس بائیس میل کے فاصلے پر ایک ایک پڑاؤ بنایا جائے۔جہاں ایک ایک دستہ فوج مقرر کیا گیا ہو۔تاکہ رَسد و کمک کے لیے راستہ ہر وقت کھلا رہے۔نیز اگر معاملہ برعکس نظر آئے تو واپسی کی راہ محفوظ و کھلی ہو۔

ابھی جنرل ہکس (Hex) ابیض سے تیس میل دُور ہی تھا کہ ایک سہ پہر مہدی نے اپنے عظیم لشکر کے ہمراہ ان کو آلیا۔مہدی کے جوشیلے درویشوں نے جن میں سے اکثر لمبی لمبی داڑھیاں لہرائے ہوئے تھے اور سیاہ لباس میں ملبوس تھے۔انتہائی جوش کے عالم میں مصریوں،سوڈانیوں اور انگریزوں کی منظم اور قواعد دان فوج پر حملہ کر دیا۔جس طرح ایک باز کبوتروں کے غول پر حملہ آور ہو کر اُن کو تتر بتر کر دیتا ہے۔بعینہٖ اُسی طرح مہدی سوڈانی کے پیروؤں نے اُس منظم اور قواعد دان فوج کو تباہ کر دیا۔لشکریوں کو اپنے پرائے کی کچھ تمیز نہ رہی اور آپس ہی میں لڑنے لگے۔توپیں، اونٹ اور قواعد سب دھری کی دھری رہ گئی۔سپہ سالاروں کو اپنی جنگی چالیں یکسر فراموش ہوگئیں۔ جنرل ہکس ششدر رہ گیا۔اس عظیم لشکر کو تہس نہس کر دیا گیا اور صرف دو سو کے قریب بوڑھے ضعیف اور زخمی بچ گئے باقی کے تمام سپاہی کھیت رہے۔اخباروں کے نامہ نگار، مصری جنرل، اور فخر انگلستان جنرل ہکس سب کے سب مہدی کی تلوار کی نذر ہوئے۔

مہدی کو یہ شاندار فتح نصیب ہوئی۔اب تمام سوڈان میں بجلی کی طرح اس کی شہرت مزید پھیل رہی تھی۔جن لوگوں کو اس کی راست گوئی اور مہدی برحق ہونے میں کچھ شبہ تھا بھی تو وہ

اب جوق در جوق اس کے مرید ہونے کے لیے آنے لگے۔ مصر کی فوج اور سوڈان کے لشکروں سے سپاہی بھاگ بھاگ کر حصولِ سعادت کے لیے مہدی کے پاس آنے لگے۔ ان فتوحات نے مہدی کو لاتعداد مالِ غنیمت دلایا اور اب مہدی کو شکست دینا یا اس کی طاقت کو توڑنا کوئی آسان اَمر نہ رہا تھا۔

لوگ محمد احمد کو مہدی برحق سمجھ کر بیعت کرنے جوق در جوق آ رہے تھے۔ افریقہ کے مسلمان اس خیال پر ایمان لانے لگے کہ مہدی کی طرف سے لڑ کر مرنے والے شہدائے بدر و اُحد کے ہمراہیوں میں شمار ہوں گے۔ احادیث کی رُو سے مہدی کا نام محمد اور والدہ، کا نام آمنہ اور والد کا نام عبداللہ ہوگا۔ چونکہ مہدی سوڈانی کے والدین کا نام بھی اتفاق سے یہی تھا اور مزید برآں جب لوگوں نے شاندار فتوحات دیکھیں تو سب کو یقین ہو گیا کہ یہی مہدی بَرحق ہے۔

دول یورپ گنگ ہو کے رہ گئیں جب انہوں نے دیکھا کہ مہدی کس شاندار طریق سے فتوحات حاصل کر رہا ہے۔ مایوسیوں کے دل بادل اُن پر چھا گئے۔ وہ تو مصر کے بعد سوڈان والوں کی گردن میں غلامی کا جوا ڈالنے کے درپے تھے۔ مگر مہدی نے اُن کے اس خواب پریشان کو پریشان ہی کر دیا۔

اُدھر سوڈان کے ساحلی علاقے میں جو کہ بحیرۂ قلزم کے کنارے واقع ہے اور سواکن کے نام سے مشہور ہے۔ مہدی کا مشہور مبلغ عثمان وغنہ مہدیوں کا لشکر جمع کر کے فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ عثمان وغنہ نے سنکات، توکر اور جاغار کی مصری فوجوں کو تاراج کر دیا اور ان مقامات پر مقیم مصری لشکریوں میں ایک متنفس بھی سلامت نہ بچا۔

سواکن کے مصری گورنر احمد رشید پاشا نے ایک لشکر محمد طاہر شاہ کی زیرِ کمان عثمان وغنہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ مصر میں انگریزوں کا نائب سفیر مسٹر ڈک مینکروف بھی اس لشکر کے ہمراہ تھا عثمان وغنہ نے صرف سوا سو افراد کے ہمراہ اس لشکر پر حملہ کر دیا اور بہت ہی کم افراد مہدویوں کے ہاتھوں جانیں سلامت سے جا سکے۔ اکثر مصری کھیت رہے۔

ان شکستوں کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ مصر سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ آخر اس کا مداوا کیا ہوگا۔ آخر کار جنرل ویلنٹائن بیکر نے مہدویوں کو شکست دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے ایک بڑا لشکر ہمراہ لیا اور اس عظیم لشکر کے ساتھ جس میں سوار پیدل اور توپ خانہ بھی شامل تھا جنرل بیکر

مغرب کی طرف چلا۔ مصری سپاہی اعلانیہ طور تو مہدوی لشکر کا مقابلہ کرنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مگر چھپ چھپ کر زار و قطار روتے تھے۔ اور جس کسی کو موقع ملتا تھا۔ وہ چھپ کر فرار ہو جاتا اور عثمان وغنہ کے لشکر سے جا کر مل جاتا۔ جس وقت یہ لشکر الطیب پہنچا تو عثمان وغنہ نے ایک ہزار درویشوں کے ہمراہ تیر اندازوں اور نیزہ برداروں کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج کو از سرِ نو ترتیب دی۔ سواروں کو پیچھے ہٹایا گیا اور پیدل فوج کو آگے کیا گیا۔ مگر مصری فوجیوں کے دلوں میں درویشوں کی اتنی دہشت طاری تھی کہ اُن کے ہاتھ تیر و سنان پر اُٹھ ہی نہ سکے۔

عثمان وغنہ کے لشکر نے آناً فاناً تباہی پھیلا دی۔ توپچیوں کو گولہ اندازی بھول گئی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گئے۔ مصری لشکر فرار ہوا مگر درویشوں نے بھاگتے ہوئے مصریوں کو تہِ تیغ کیا اور بہت کم افراد جان بچا کے بھاگ سکے۔ چار بڑی توپوں کے علاوہ بیس چھوٹی توپیں، لاتعداد کارتوس و گولے اور چھ ہزار اعلیٰ انگریزی بندوقیں عثمان وغنہ کے ہاتھ لگیں۔

جنرل بیکر بصد ذلت و دشواری، رسوائی کا سامان و باعث تضحیک بن کر معدودے چند افراد کے ہمراہ تباہ حالت میں سواکن لوٹ آیا۔ درویشوں نے آگے بڑھ کر سواکن کو گھیر لیا۔ اس وقت تک درویشوں نے چھ سو میل لمبا اور دو سو میل چوڑا علاقہ زیرِ نگین کر لیا تھا۔ تمام کردوفان، دارفر، سُنار، فرتیب اور سواکن تک کا علاقہ اب مہدی کے ماتحت تھا۔ اب مہدی کا اثر شمالی سوڈان کے علاقہ الفشیر تک جا پہنچا تھا۔ اُس وقت وہاں کا حاکم ایک انگریز سلاٹن تھا۔ عام سوڈانی اس کو معرب کر کے سلاتیں پاشا کہتے تھے۔ سلاتین پاشا بہت ہی سمجھ دار آفیسر تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ جنگ کر کے مہدی سے عہدہ برآ ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ اس لیے اس نے سوچا کہ مسلمان ہو کر مہدی کا ساتھی بن جانا چاہیے۔ ملک کا انتظام بھی گڑ بڑ نہ ہو گا اور کشت و خون کی نوبت بھی نہ آئے گی۔ کیونکہ سلاتین پاشا کو پتہ چل چکا تھا کہ اُس کے افسروں کی ایک غالب تعداد مہدویوں کی حامی ہے۔ اب سلاتین پاشا نے منافقانہ طریق سے اسلام قبول کر لیا اور مہدی کو ایک خط لکھا۔ اس میں جوشِ عقیدت سے مہدی کو کہا تھا کہ وہ اپنا علاقہ بطورِ عقیدت مہدی کے حوالے کرتا ہے۔ سلاتین پاشا کا خیال تھا کہ مہدی مروت سے کام لے گا اور خوش ہو کر اس کا علاقہ اس کے زیرِ انتظام رکھے گا مگر مہدی کچی گولیاں نہ کھیلا تھا۔ اس نے سلاتین پاشا کو لکھا کہ وہ العبید آ جائے وہاں پہنچ جانے پر مہدی نے سلاتین پاشا کا اسلامی نام عبدالقادر رکھا۔ مہدی سلاتین پاشا کو ہمراہ لے کر خرطوم کی

طرف روانہ ہوا۔ مہدی کی وفات کے بعد اس کے خلیفہ اول عبداللہ نے سلاتین پاشا کو اپنے باڈی گارڈ میں رکھا۔ ایک مرتبہ سلاتین پاشا نے سازش کی اور بھاگ کھڑا ہوا مگر گرفتار ہوا۔ اور ایک عرصے تک درویشوں کی قید میں رہا۔

انگلستان و مصر اب ایک درجن سے زائد مہمات میں لاکھوں افراد کی قربانی اور کروڑوں روپوں کے خرچ کے بعد بھی سوڈان میں کچھ نہ کر سکے تو صلاح ٹھہری کہ جنرل گارڈن کو سوڈان کا حاکم و مختار بنا کر بھیجا جائے۔ اور اس کو پورے اختیار دے کر روانہ کیا گیا۔ تاکہ وہ وہاں کے حالات کو جان کر موقع و محل کے مطابق عملی قدم اٹھائے۔ سب سے بڑا کام جنرل گارڈن کے ذمے یہ تھا کہ وہ جا بجا گھری ہوئی فوجوں کو بحفاظت سوڈان سے نکال لے اور پھر سوڈان کو سوڈانیوں کے حوالے کر آئے۔ اگلے صفحات ہمیں یہ بتلائیں گے کہ جنرل گارڈن اپنے کام میں کامیاب ہوا یا مہدی سوڈانی نے اُس کو بھی ناکام و محروم ہی رکھا۔

ملک الموت بضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں
سربسجدہ ہے مسیحا کہ میری بات رہے!

سقوط خرطوم اور جنرل گارڈن کا دمِ واپسیں

جنرل ارل گارڈن برطانوی سلطنت کا ایک قابلِ فخر فرزند شمار ہوتا تھا۔ بعض انگریز مؤرخین نے اُس کا مرتبہ ڈیوک آف ولنگٹن کے برابر رکھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ گارڈن ایک نڈر اور بہادر جرنیل تھا۔ انگریزی حکومت نے جنرل گارڈن کو سوڈان کا ہائی کمشنر اور مصری حکومت نے اپنی طرف سے گورنر سوڈان بنا کر بھیجا۔ انگریزوں کی افواج منتشر دستوں کی صورت میں سوڈان بھر میں جا بجا پھیلی ہوئی تھیں۔ گارڈن کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ ان تمام منتشر دستوں کو بہ حفاظت مصر پہنچا دے۔

جنرل گارڈن، جیسا کہ انگریز قوم کا دستور ہے، سوڈان پہنچا اور پہنچتے ہی سیاست کی چالوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے بربر کے مقام پر پہنچتے ہی اعلان کیا کہ سوڈان آئندہ سے آزاد مملکت تصور ہوگا اور مہدی سوڈانی کو اس نے وارفر کے علاقے کا سلطان تسلیم کر لیا۔ نیز عام سوڈانیوں پر محصول بقدر معاف کر دیے اور یہ بھی اعلان کیا کہ ماضی میں تمام سوڈانیوں سے جتنے

گناہ سرزد ہوئے ہیں وہ معاف کیے جاتے ہیں۔

اس اعلان کے بعد جنرل گارڈن نے چند قیمتی تحائف مہدی سوڈانی کی خدمت میں بھیجے۔ محمد احمد نے یہ تحائف یہ کہہ کے لوٹا دیئے کہ مَیں غاصبوں، ظالموں اور انسانوں کو غلام بنانے والوں سے کوئی چیز بطور تحفہ بخشش یا عطا نہیں لے سکتا۔

اَب محمد احمد نے جنرل گارڈن کو خط لکھا، ''کہ اے گارڈن تم ہماری پناہ میں آ جاؤ اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ پہلے تو مَیں تمہیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ تم اسلام قبول کر لو اور ہمارے بھائی بن جاؤ۔ تم نہ صرف دنیا بلکہ آخرت کی نجات کے بھی حق دار بن جاؤ گے۔ تم اور تمہارے سارے ساتھی ہمارے ساتھی بن جائیں گے۔ اگر اس کے برعکس ہوا تو یقین جانو موت کے پنجے سے تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو کوئی بھی دیوار، قلعہ، فصیل یا تدبیر نہیں بچا سکتی۔ ہلاکت تمہاری تلاش میں ہے۔''

اس خط کے جواب میں جنرل گارڈن نے لکھا۔ میں تُم سے مزید خط و کتابت نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے بعد جنرل گارڈن اپنے لاؤ لشکر کے ہمراہ خرطوم پہنچا۔ جب خرطوم کی سپاہ نے جنرل گارڈن کو وہاں پایا تو اُن میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اب خرطوم میں کوئی قابلِ ذکر کمانڈار باقی نہ رہا تھا اور تمام فوجیں اس انتظار میں تھیں کہ مہدی ذرا اور آگے بڑھے تو وہ خرطوم چھوڑ کر مصر کی جانب رواں ہوں۔ مگر اُن کی مایوسی اس وقت اور بھی بڑھ گئی تھی جب کہ مہدی نے خرطوم اور مصر کے درمیانی راستے کو فتح کر لیا۔ اور اب بچ نکلنے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی۔ اُنہی دنوں یہ غلغلہ تھا کہ مہدی خرطوم پر حملہ آور ہونے والا ہے اور خرطوم کے لوگ مہدی کی آمد سے لرزہ براندام تھے۔ جونہی جنرل گارڈن بمعہ اپنے لشکر خرطوم وارد ہوا تو لوگوں کے دل بندھ گئے تھے اور ایک ہلکی سی کرن امید کی جاگ اُٹھی تھی۔

اب دنیا بھر کی نگاہیں خرطوم، مہدی اور جنرل گارڈن پر تھیں۔ یہ ایک نقطہ موڑ تھا۔ اگر جنرل گارڈن افواجِ مہدویہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ تمام ہنگامہ ہی ختم تھا اور یا پھر مہدی خرطوم فتح کر لیتا تو سوڈان کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا۔

بہر حال مہدی کی افواج کا سلسلہ مجتمع ہوتا گیا۔ اور مہدی نے اپنی تمام قوت خرطوم کے گرد و نواح میں جمع کر لی۔ مصری اور انگریزی فوجوں سے چھینے ہوئے اسلحے سے لیس درویشوں

کے گروہ کے گروہ خرطوم کے گردونواح میں منڈلانے لگے۔ جنرل گارڈن کو اس روزِ سیاہ کا پہلے سے پتہ تھا۔ چنانچہ اُس نے سامان رَسد خوب جمع کرلیا تھا۔ ویسے بھی خرطوم کی جائے وقوع ایسی ہے کہ اس کا آسانی سے فتح کرنا ناممکن تھا۔ جنرل گارڈن نے احتیاطاً چار ماہ محصور رہنے کا بندوبست کرلیا تھا اور اس کو یقین کامل تھا کہ اس سے نصف ہی مدت میں مصر سے زبردست کمک پہنچ جائے گی۔ جس کی مدد سے وہ مہدی کی قوت کو پارہ پارہ کر سکے گا۔ جنرل گورڈن نے قلعہ بندیاں خوب مستحکم کرلیں تھیں۔ خرطوم شہر کے دو اطراف میں عظیم نیل بہہ رہا تھا اور باقی کی دو اطراف ایک مضبوط فصیل سے گھری ہوئی تھیں۔ فصیل سے پیوست باہر کی طرف ایک گہری خندق تھی۔ اس خندق میں دریائے نیل سے پانی لایا گیا تھا اور پیدل فوجوں یا سواروں کے لیے عملی طور پر ناممکن تھا کہ وہ خندق عبور کرسکیں۔ قاہرہ اور خرطوم کے درمیان جو تار کا سلسلہ تھا وہ مہدی نے کاٹ دیا۔

اَب مہدی نے مکمل طور پر خرطوم کا محاصرہ کرلیا۔ اور جنرل گارڈن کا سلسلۂ رسل و رسائل قاہرہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ قاہرہ والے جنرل گارڈن کے حال سے اب یکسر بے خبر تھے۔ اس کی وجہ سے مصر، قاہرہ اور لندن میں تشویش کی لہر سی دوڑ گئی۔ جنرل گارڈن نے موقع پا کر ایک دن کشتی میں ایک کرنل مسٹر سٹورٹ کے ہاتھوں قاہرہ ایک پیغام بھیجا۔ جس میں تمام واقعات مفصل طور پر مذکور تھے۔ بدقسمتی سے یہ کشتی راستے میں دریائے نیل کے کسی بھنور میں پھنس گئی اور ایک چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ کرنل سٹورٹ اور اس کے ساتھی تیر کر دریا کے کنارے پہنچے۔ مگر وہاں قریب کے اس گاؤں کے لوگوں نے ان کو کافر کہہ کر مار ڈالا۔ اس طرح سے جنرل گارڈن کے پیغامبر رستے ہی میں ختم ہو گئے اور گارڈن کا پیغامِ المدد قاہرہ نہ پہنچ سکا۔ کرنل سٹورٹ کے ہمراہ مصر و سوڈان میں برطانوی اور فرانسیسی سفیر مسٹر پادر اور موسیو ہرلن بھی تھے اور یہ بھی کرنل سٹورٹ کے ہمراہ ہی تہِ تیغ ہوئے۔

جب یہ خبر وحشت انگیز لندن پہنچی کہ کرنل سٹورٹ و برطانوی اور فرانسیسی سفیر بھی ہلاک ہو گئے اور جنرل گارڈن بمعہ ہزاروں برطانوی سپاہیوں کے خرطوم میں بُری طرح گھرا ہوا ہے۔ تو انگلستان کے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں بڑا اضطراب پھیلا۔ مسٹر گلیڈسٹون وزیرِاعظم برطانیہ نے جنرل ولزلی کو ایک زبردست فوج دے کر مصر بھیجا تا کہ وہ جنرل گارڈن اور گھری ہوئی برطانوی

افواج کو چھڑا لائے۔ حکومت نے جنرل ولزلی کو یہ بھی ہدایت کی کہ فوجوں کے بہ سلامت نکال لینے کے بعد مہدی سے کچھ تعرض نہ کیا جائے اور سوڈان اور مہدی کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ انگلستان کی رائے عامہ بہت بیدار تھی۔ انہوں نے پارلیمنٹ کے ایوانوں میں حکومت کا ناطقہ بند کر رکھا تھا کہ سوڈان میں لاکھوں برطانوی مروانے اور کروڑوں روپوں کے خرچ کرنے کے بعد بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر اس تمام مہم کا مقصد کیا؟ حالات یوماً فیوماً زوال پذیر تھے۔

لارڈ ولزلی بڑے طمطراق کے ساتھ لندن سے روانہ ہوا اور اسکندریہ پہنچا۔ مصر پہنچ کر تمام حالات سے اس نے آگاہی حاصل کی۔ مصر میں مقیم برطانوی فوجوں کے کمانڈر اعلیٰ جنرل ہربرٹ اسٹیفن سن نے ولزلے کو رائے دی کہ براہ سویز بحیرہ قلزم کے راستے سواکن تک جائے اور پھر وہاں سے خشکی کے راستے بربر سے ہوتے ہوئے خرطوم پہنچے۔ مگر لارڈ ولزلے ایک گرگِ باراں دیدہ تھا۔ وہ صحرا میں صحرانشینوں کے ساتھ جنگ کرنے میں صریحاً ہلاکت دیکھ رہا تھا۔ اس کے برعکس ولزلے نے یہ سکیم بنائی کہ براہِ رودِ نیل جہازوں کے ذریعے خرطوم براہِ راست جایا جائے۔ لارڈ ولزلے باقی انگریز سالاروں کی طرح سمندر کی جنگ کا دھنی تھا۔

لارڈ ولزلے کی یہ تجویز جو کہ اُس نے خرطوم پہنچنے کے متعلق بنائی تھی، گو اُس کے نزدیک دلائل پر مبنی تھی مگر اس تاخیر میں جو کہ نیل کی راہ سے اُس کو خرطوم جانے میں ہوئی، جنرل گارڈن کی موت نہاں تھی۔ کیونکہ براہ بحیرہ قلزم، سواکن اور بربر، خرطوم تک کا راستہ تقریباً پانچ صد میل تھا اور نیل کے راستے سولہ سو میل۔ برطانوی حکومت نے کلی طور پر فوجی اختیار لارڈ ولزلے کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔ چنانچہ لارڈ ولزلے بائیس بڑے جہازوں میں فوجیں لاد کر جن کے ساتھ ساتھ چھوٹی جنگی کشتیاں بھی تھیں، ایک شاہانہ سطوت کے ساتھ دریائے نیل کے بہاؤ کے خلاف چل پڑا۔ ولزلی کی رفتار بہت سُست تھی۔ دراصل ولزلی مہدی کے مقابلے پر آنے سے گھبراتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ گارڈن ہی مہدی کو شکست دینے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے مَیں دیر کر کے پہنچوں تا کہ اس اثناء میں گارڈن جنگ جیت چکا ہو۔

اِسی دوران ایک خط جنرل گارڈن کی جانب سے قاہرہ پہنچا جس میں درج تھا کہ ”یہاں پر بالکل خیریت ہے اور ہم دشمن کو کم از کم چار ماہ تک پَرے رکھ سکتے ہیں۔“ مگر اس خط پر تاریخ چار ماہ سے بھی پہلے کی تھی۔ اب یہ اور بھی فکر مند ہوئے۔

حکومتِ انگلستان نے لارڈ ولزلی کو تنبیہ کی کہ وہ کیوں سُست رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ولزلی نے جواب دیا کہ دشمن کا ملک ہے۔ لہٰذا اپنے رسل و رسائل کے سلسلے درست کر کے آگے بڑھنا پڑ رہا ہے۔ نیز خرطوم میں رسد ختم ہے اس لیے رسد کا بندوبست بھی وسیع پیمانے پر ساتھ ہی کر رہا ہوں۔ کیونکہ گردونواح کا سارا علاقہ اجاڑ ہو چکا ہے۔

ولزلی نے کورٹی نامی گاؤں پہنچتے ہی اپنے لشکر کے دو حصے کر دیئے تا کہ ایک خشکی کے راستے سے آگے بڑھ کر خرطوم پہنچے اور دوسرا حصہ جو کہ اس نے اپنے زیرِ قیادت رکھا تھا بدستور دریائے نیل کی راہ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ خشکی والا دستہ میجر جنرل سر ہربرٹ کے زیرِ کمان تھا۔ اِسی اثنا میں ایک پرزہ کاغذ لارڈ ولزلے کو ملا جس میں جنرل گارڈن کی طرف سے درج تھا کہ خرطوم میں سب طرح سے خیریت ہے۔ دراصل جنرل گارڈن کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ کاغذ دشمن کے ہاتھوں میں بھی پڑ گیا تو وہ دھوکہ کھا جائیں گے۔ درحقیقت زبانی پیغام قاصد کے ہاتھوں یہ بھیجا گیا تھا کہ خوراک ختم ہے۔ فوج اور عوام بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے مدد کی جائے۔ اگر جلد از جلد کمک ورسد نہ ملی تو خاتمہ قریب ہے۔

اُدھر خشکی کی راہ سے بڑھنے والی انگریزی فوج کو مہدوی لشکر نے ابوکلیہ کے قریب روکا۔ ایک گھمسان کا رَن پڑا۔ جنرل سر رابرٹ زخمی ہو کر گرے اور جان بحق ہوئے۔ اس کے بعد کرنل ولسن نے بہتری کوشش کی کہ کسی طرح کچھ فوج بچائی جا سکے۔ مگر بے سود، مہدیوں نے گولہ باری کر کے تمام مورچے مسمار کر دیئے اور انگریزی سپاہ کو ہلاک کر دیا۔ کئی لندنی اخبارات کے نامہ نگار بھی اس معرکہ میں کام آئے۔

اُدھر دریائے نیل کی راہ سے جانے والی فوج کو خرطوم سے آئے ہوئے چند خالی جہاز راستے میں ملے۔ رقعہ بدستور بخریت ہونے کا تھا مگر پیغام زبانی ہلاکت کا پیغام سُنا رہا تھا۔ جنرل گارڈن کا پیغام تھا کہ "مَیں نے بہتری کوشش کی مگر اب معاملہ میرے بس سے باہر ہو گیا۔ چاروں طرف سے ہلاکت و بھوک نے ہم کو گھیر لیا ہے۔ اگر خرطوم چلا گیا تو پھر سوڈان کا خدا حافظ۔ اگر دس دن کے اندر جہازوں میں رسد و کمک نہ ملی تو ہم اس صفحۂ ہستی سے نابود ہو چکے ہوں گے۔"

یہ خبر پاتے ہی جنرل ولزلے نے چھ جہاز رسد و کمک سے بھر کر خرطوم کی جانب روانہ کیے۔ مگر یہ جہاز سترہ دن کے بعد خرطوم پہنچے اور جب ان جہازوں کو خرطوم دکھائی دیا وہاں مہدی کا

علم لہرا رہا تھا۔

محاصرہ تقریباً چھ ماہ جاری رہا۔ اب محصورین کی حالت بہت ہی ابتر ہو چکی تھی۔ ادھر مہدی کے حامیوں نے جو کہ خرطوم کے اندر تھے۔ مہدی کو جواب بھیجا کہ بس اب حملے کے لیے موزوں ترین وقت آ گیا ہے۔ اہلِ خرطوم، جنرل گارڈن کی طرف سے نہایت برگشتہ ہو چکے تھے۔ چوں کہ عرصۂ دراز سے وہ تکالیف اٹھا رہے تھے۔ اہلِ خرطوم اعلانیہ جنرل گارڈن اور انگریزوں کو بُرا بھلا کہتے مگر جنرل گارڈن نے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ دراصل وہ کچھ کر ہی نہ سکتا تھا۔ کیوں کہ لوگ فاقے کرتے کرتے لاچار ہو چکے تھے اور جنرل گارڈن، گورنر جنرل ہاؤس میں بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ کھیل ختم ہو چکا کیوں کہ اس نے متعدد بار لوگوں کو اس امر کا یقین دلایا کہ کمک عنقریب ہی آ رہی ہے۔ جنرل گارڈن نے اپنے جرنیلوں کو کہلایا تھا کہ جتنے سپاہی مل سکیں وہ لے کر مہدویوں کو روکیں۔ جنرل گارڈن سخت بدحواس تھا اور شدتِ تفکرات کی وجہ سے اُس کے سر کے بال یکدم سفید ہو گئے۔

مہدی نے اپنی توپوں کو خرطوم پر گولہ باری کرنے کے لیے کہا۔ توپ خانے نے دھواں دھار گولے برسائے۔ اس سے خرطوم کی محصور فوج کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ جنرل گارڈن نے آخری مرتبہ ایک اور کوشش کی۔ مگر بے سود اور رات کے وقت مہدی کے لشکر نے خندق کو عبور کیا۔ مہدویوں نے سینکڑوں مشکیں مہیا کیں اور اُن کو پھلا کے اُن کے سہارے خندق عبور کرتے رہے فصیل سے جوابی فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ کیوں کہ مہدوی توپ خانہ گولہ باری کر رہا تھا۔ جب مہدویوں نے گولہ باری ختم کی۔ تو اُن کا پیدل لشکر سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھ رہا تھا۔ بھوک و پیاس سے لاچار، محصورین نے حتیٰ المقدور کوشش کی کہ درویشوں کو روکیں۔ مگر ایک بھی پیش نہ گئی اور مہدویوں کے دل بادل خرطوم پر چھا گئے۔

ہزاروں درویش جنرل گارڈن کی قیام گاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے مگر قیام گاہ کے اندر کوئی نہ گھسا۔ کسی نے افواہ اڑا دی تھی کہ مکان کے چاروں طرف سرنگیں لگی ہوئی ہیں۔ بالآخر چار بلند و بالا، قوی ہیکل درویش تلواریں اور نیزے لے کر آگے بڑھے۔ ان کو دیکھ کر سینکڑوں اور درویش بھی اندر داخل ہوئے۔ جنرل گارڈن اپنی نشست کے کمرے میں بیٹھا ہوا سگار پی رہا تھا۔

سب سے آگے درویش بڑھا اور اس نے کہا ”اے ملعون یقیناً آج تیری ہلاکت کا دن

ہے۔'' یہ کہتے ہی اس درویش نے ایک نیزہ گارڈن کو مارا۔ جنرل گارڈن نے منہ موڑ لیا۔ درویش نے ایک اور وار کیا۔ جس سے جنرل گارڈن کو ایک مہلک زخم آیا چند اور درویشوں نے بڑھ کر تلواروں کے وار کیے جن سے جنرل گارڈن ہلاک ہوگیا۔ ایک درویش نے آگے آ کر جنرل گارڈن کا سر قلم کر دیا اور وہ درویش یہ سر لے کر سلاتین پاشا کے پاس گیا جو کہ اس وقت مہدویوں کی قید میں تھا اور وہ سر سلاتین پاشا کو بتلایا'' کہ یہ تمہارے چچا کا سر ہے چونکہ وہ مہدی علیہ السلام پر ایمان نہ لایا۔ اس لیے اس کی یہ حالت ہوگئی۔ اب تمہارا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔'' جنرل گارڈن کا سر مہدی کے سامنے لایا گیا۔ جس نے بڑے احترام کے ساتھ اسے لاش کے ساتھ رکھ کر دفن کرا دیا۔

جنرل گارڈن کے قتل سے اور سقوطِ خرطوم سے سوڈان کی تاریخ کا ایک باب ختم ہوگیا۔ انگلستان کے اُفق سیاست پر غم و غصے کی گھٹا چھا گئی۔ حکومت پر لعنت و ملامت کا ایک طومار باندھا گیا کہ امدادی فوج کیوں نہ وقت پر بھیجی گئی۔

حکومت انگلستان نے سر چارلس سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ جب جہاز میرے پاس آئے تو اس وقت چند محاربات کی وجہ سے میری فوج کافی کمزور ہو چکی تھی اور ہرگز اس قابل نہ تھی کہ بطور کمکی فوج بھیجی جا سکے۔ نیز یہ بھی اطلاع مل چکی تھی کہ مہدی کی ایک بھاری جمعیت اُم درماں کی طرف آرہی ہے۔ نیز ایک کمک جہازوں میں روانہ کی بھی جاتی تو ہرگز وقت پر نہ پہنچ سکتی۔ کیوں کہ جہازوں کے پہنچنے سے تیسرے دن سقوطِ خرطوم ہوا۔ جب کہ جہاز پانچویں دن خرطوم پہنچے۔

خرطوم کی فتح ایک تمہید تھی کہ اب انگریز سوڈان میں چند دنوں کے مہمان ہیں۔ مصری اور انگریز انہی معنوں میں درحقیقت سوچ رہے تھے۔ جب کوئی قوم زندہ اور آزاد رہنے کا عزم بالجزم کرے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت اُسے محکوم و مجبور نہیں کر سکتی اور یہی قوموں کا فلسفۂ حیات ہے۔

ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے توپ و تفنگ

تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے

جنرل ارل اور سَر جان میک نیل کی ہزیمت

خرطوم کی فتح کے بعد اب انگریز مہدی کو شکست دینے سے زیادہ اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے درپے تھے اور ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے'' کے مصداق وہ اضطراری حرکات کر رہے تھے۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ بہترین فوجیں، عصر حاضر کے جدید ترین آلات حرب سے لیس کیوں کر مُٹھی بھر غیر مسلح درویشوں سے عہدہ برآ ہونے سے عاجز ہو رہی ہیں۔ انگریزوں کی ہر تدبیر فیل ہو چکی تھی۔ فرنگیوں کا ہر طلسم تار و پود کی طرح بکھیرا جا چکا تھا۔

جیسا کہ پچھلے باب میں بیان کیا گیا۔ خرطوم کو بچانے کے لیے امدادی فوج کا ایک تانتا باندھ دیا گیا تھا۔ مگر ان لشکروں کے خرطوم پہنچنے سے قبل ہی مہدی سوڈانی کے درویش جنرل گارڈن کو نابود کر چکے تھے اور اپنا پرچم اقبال خرطوم کے بام و در پر لہرا چکے تھے۔ انہی امدادی لشکروں میں سے ایک لشکر جنرل ارل کی زیر سرکردگی اپنے انجام سے بے خبر آگے بڑھ رہا تھا کہ مہدی کے لشکریوں نے بیکان کے مقام پر اس فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ مہدی کی یہ فوج صرف تین ہزار بے قاعدہ لشکریوں پر مشتمل تھی جب کہ جنرل ارل کے ہمراہ گیارہ ہزار باضابطہ قواعد دان اور تیس چھوٹی توپیں بھی تھیں۔ مگر انگریزی لشکر جس میں کناڈا، آسٹریلیا اور سکاٹ لینڈ کے جوان بھی شامل تھے۔ ہمتیں چھوڑ بیٹھا تھا اور مہدی کے جانباز درویشوں نے رگید رگید کر جنرل ارل کے لشکر کو تباہ کر ڈالا۔ صرف تین سو افراد جان بچا کر بھاگ سکے۔ جنرل اُرل بھی کھیت رہا۔

لارڈ ولزلے نے جو کہ مصر و سوڈان میں انگریزی فوجوں کا کمانڈر اعلیٰ تھا۔ یہ مناسب سمجھا کہ بَربَرا اور اس کے سواحل پر قبضہ کرنے کا ارادہ فسخ کر دیا جائے۔ مگر انگلستان کی حکومت نے اور کسی چیز سے اپنی کھوئی ہوئی شہرت و عزت کو کسی حد تک محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ بَربَر پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ حکومت انگلستان نے سَر جیرالڈ گراہم کو اس مہم کا نگران مقرر کیا اور اس کی امداد کے لیے جنرل اٹیکنسن اور جنرل ہڈسن کو بھی متعین کیا گیا۔ اس فوج میں پیادہ پلٹنیں، شتر سوار دستے اور گھڑ سوار رجمنٹیں شامل تھیں۔ سترہ ہزار کے اس عظیم لشکر میں ہندوستانی لشکری اور آسٹریلوی فوجی بکثرت تھے۔ چونکہ اس مہم کا اکثر حصہ صحرا میں لڑا جانے والا تھا۔ اس لیے اونٹ بھی کافی تعداد میں تھے۔

اس مہم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جنگل کو مہدی کے مشہور کمانڈار عثمان وغنہ کی فوج سے پاک کر دیا جائے تا کہ بربر تک ریل کی پٹڑی کی تعمیر ہو سکے۔ مہدی کے درویشوں نے غول درغول انگریزی لشکر پر حملہ کر دیا۔

ان محاربات میں درویشوں کی جرأت ایمانی کا پتہ چلتا ہے۔ پورے پورے بریگیڈ کو دو اڑھائی سو درویش یوں تتر بتر کر دیتے جس طرح کہ بھوسے کے ڈھیر کو ہلکی سی آندھی کے جھونکے پراگندہ کر دیتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر انگریز فوجیوں کے دلوں پر درویشوں کی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اور جونہی سیاہ و سبز علم تھامے، ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس، واڑھیاں منہ میں دبائے، تلواریں اور برچھے لہراتے درویش نمودار ہوتے۔ ہر فوجی نظم و ضبط کے برعکس اپنی ہی صفوں کو پراگندہ کرتے ہوئے بھاگنے میں پہل کرتا۔ اسی جنگ کے دوران میں عثمان وغنہ کے ایک سو بیس درویشوں نے انگریزوں کی دو ہزار قواعد دان فوج کو بغیر لڑے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

الغرض اس پوری مہم میں مہدی کے نائب عثمان وغنہ نے ایک پورے تجربہ کار جرنیل کی فراست سے کام لیتے ہوئے انگریزوں سے جنگ چپاول لڑی۔ کبھی وہ اپنا کیمپ خالی کر کے چند میل پیچھے ہٹ جاتا اور جب انگریز اس کے کیمپ پر قابض ہو کر یہ تصور کرتے کہ عثمان وغنہ کے درویش فرار ہو چکے ہیں تو عین آدھی رات کو درویش دھاوا کرتے اور انگریزوں کو ایک بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی انگریز ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے'' کے مصداق کسی گاؤں یا دور افتادہ دیہہ کی ساری پُرامن آبادی کو تہہ تیغ کر دیتے اور مکانات کو نذر آتش کر دیتے۔ مگر اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا ہی پڑتا اور ہاتھوں ہاتھ درویش انہیں ایک اور عبرتناک شکست سے دوچار کرا دیتے۔

جیرالڈ گراہم کے علاوہ سر جان میک نیل بھی اس مہم پر مامور تھا مگر اسے بھی سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ انگریز افواج جتنی بھی ریل کی پٹڑی تیار کرتے وہ درویش رات کو آن کر توڑ پھوڑ دیتے۔ لارڈ ولزلے خود محاذ پر پہنچا اور تمام حالات دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ مہم کا مزید جاری رکھنا ذلت ناکامی اور شرمندگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ لارڈ ولزلے نے حکومت برطانیہ کی صلاح اور اپنے جرنیلوں کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ سواکن، بربر ریلوے لائن کی تعمیر ختم کر دیجائے۔ تمام سامان برطانیہ واپس بھیج دیا جائے اور انگریزی افواج کو مصر کی سرحد تک ہٹا لیا جائے۔

چنانچہ اب بصد ذلت وخواری انگریز لشکری پسپا ہونے لگے۔ ریل بنانے کے سامان کے کاروان اونٹوں اور گھوڑوں کی قطاریں شمالی جانب رواں تھیں اور درویش جہاں کہیں بھی ان کا داؤ چلتا۔ وار کرنے سے نہ چُوکتے۔ سب سے آخری سامان کا قافلہ جب روانہ ہوا تو عثمان وغنہ نے بڑی حقارت سے ہوائی فائر کر کے ان کو الوداع کہا۔

یہ الوداعی فائر اس امر کا ثبوت تھے کہ چند فاقہ مست اور درویشاں خدا مست اپنا مقام پہچان چکے تھے۔ وہ نشۂ الست میں مست تھے۔ اور موت ان کی نظر میں ہیچ تھی۔ روئے زمین کی سب سے بڑی طاغوتی طاقت جو کہ وقت کے بہترین آلاتِ جنگ سے لیس تھی اور جس کی پشت پر دنیا بھر کی اقوام کمر بستہ تھیں۔ چند درویشوں کے مقابل میں عاجز آ گئی تھی اور ان درویشوں نے جنہیں صرف خدا کی مدد پر بھروسہ تھا، انگریزوں کو سوڈان سے نکال دیا تھا۔ اب سوڈان میں مہدی سوڈانی کا سکہ چلتا اور انگریز بیک بینی و دوگوش قلم روئے سوڈان سے خارج کر دیئے گئے تھے۔

مہدوی زیادہ تر نیزوں، تلواروں اور تیر کمانوں سے مسلح ہوتے۔ رفتہ رفتہ انگریزی فوجوں سے آلات حرب چھین چھین کر انہوں نے خود کو لیس کر لیا۔ مگر یہ امر حقیقت ہے کہ انگریزوں کی ہر ہزار فوج کے سامنے مہدویوں کے دو تین صد سے زائد لشکری کبھی بھی صف آرا نہیں ہوئے۔

وادئ نیل کا ایک ہزار میل لمبا قطعہ زمین جو کہ جھیل وکٹوریہ سے شروع ہو کر اسوان تک کا علاقہ تھا انگریزوں اور مصریوں کے مشترکہ تسلّط سے آزاد ہو چکا تھا۔ مشرق میں بحیرۂ قلزم اور اسی سینیا سے لے کر مغرب میں صحرائے اعظم کی حدود تک مہدی اب کوسِ لمن الملک الیوم کا ڈنکا بجا رہا تھا۔

انگریزوں نے مشرق ومغرب کے بہترین جرنیل آزما لیے تھے۔ مشرق ومغرب کی بہترین سپاہ جس میں آسٹریلیوی، ہندوستانی، نیپالی، کناڈی، سکاٹ اور خود انگریز (فاتحین عالم بزعم خود) موجود تھے۔ مہدویوں کے غیر تربیت یافتہ لشکروں کے سامنے کچھ نہ کر سکے اور درویشوں کے سامنے وہ کھلونے تھے۔ جن کو جب جی چاہا توڑ پھوڑ ڈالا۔

کیا بات ہے کہ اہلِ فقر کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رَے

تعلیماتِ مہدی

محمد احمد نے باوجود سوڈان بھر کو زیرِ نگین کرنے کے خود میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہ کی۔ اب وہ بوریہ نشین، کشتی والے کا بیٹا محمد احمد نہ تھا۔ بلکہ سوڈان کا آمر مطلق اور روحانی پیشوا تھا۔ اب بھی حسب سابق جزیرہ آبا میں اپنے اسی مکان میں وہ مصروف عبادت تھا۔ سوڈان بھر سے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ وہ ہر روز صبح اور شام دو دو گھنٹوں کے لیے وعظ کیا کرتا جن میں مخلوق خدا کو شعائر اسلام پر سختی سے عمل کرنے کو کہتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مہدی نہایت شدومد سے عمل درآمد کراتا۔ باوجود اتنی بڑی قلمرو کا واحد مختار ہونے کے اُس میں کوئی غرور یا تکبر نہ تھا۔ ہر شخص پر شرع کی حد جاری کر کے دُرے لگواتا۔ جو شخص بھی چوری کے الزام میں گرفتار ہو کر آتا اور یہ ثابت ہو جاتا کہ واقعی یہ چور ہے تو بلا تامل اس کا بایاں ہاتھ کٹوا دیا جاتا۔ احکامِ شرعیہ کی بجا آوری میں جنون کی حد تک پابند تھا۔

رمضان المبارک کا خاص احترام کرتا۔ بغیر کسی معقول عذر کے روزہ توڑنے کی سزا مدت تک ہوتی تمام سوڈان کے طول و عرض میں کسی قسم کے بھی فسق و فجور، عیاشی، بددیانتی، رشوت اور ظلم و ستم کا نام تک بھی سننے میں نہ آتا تھا۔ ملک بھر سے غیر اسلامی حرکات یکسر ختم ہو کے رہ گئیں۔ ہر طرح انصاف کا دور دورہ تھا۔ لوگ مہدی پر شیدا تھے۔ جہاں بھی مہدی جاتا لوگ غول در غول اس کے دیدار کے لیے جمع ہو جاتے، پہروں تکتے رہتے مگر سیری نہ ہوتی۔ مہدی جہاں کہیں جاتا اس کے ہمراہ صرف دس پندرہ غیر مسلح درویش ہوتے۔ ہر کہیں لوگ جوق در جوق اس کے دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے۔ جس مسجد میں نماز پڑھتا۔ وہاں ہر غازی کی یہ کوشش ہوتی کہ مہدی کے قریب تر بیٹھتے۔

مہدی کی تعلیمات کا منتہائے نظر یہ تھا کہ لذائذِ دنیوی سے کنارہ کشی اختیار کر کے شرعی احکام کی کما حقہ، پیروی کی جائے وہ دنیاوی معاملات میں کبھی اغماض بھی برت لیتا۔ مگر دین کے معاملات میں شرعی حد جاری کرتا۔ چاہے ملزم کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ مہدی نے اپنے تمام پیروؤں کو حکم دیا تھا کہ وہ سادگی اختیار کریں اور تمام مرید و درویش ایک ہی قسم کا لباس پہنیں۔ ہر قسم کے تعظیمی القاب و مخصوصات یکسر ترک کر دیئے گئے۔ تمام درویش ایسا لباس اور جبہ پہنتے جن میں

پیوند لگے ہوتے۔ خاکساری، درویشوں کا شیوۂ اولین تھا۔ کیونکہ کبر ونخوت درویشی کی اولین دشمن ہے۔

محمد احمد نے اسلام کے چاروں بڑے فرقوں یعنی مالکی، شافعی، حنبلی اور حنفی کی تعلیمات کو یکجا کر دیا تھا۔ اس نے چاروں آئمہ کی تعلیمات لے کر اُن کے مطابق اپنی تعلیمات مرتب کیں۔ جہاں کہیں ان چاروں میں اختلاف نمودار ہو جاتا تو وہاں پر تطبیق کرنے کی کوششیں کی جاتیں اور جو بھی اقدار مشترک طور پر سامنے آتیں انہی کو اپنا لیا جاتا۔

ہر نماز کے بعد مسجد میں چند آیتیں بیان کی جاتیں اور اُن کی تشریح عوام کے سامنے کی جاتی۔ بلا عذر، باجماعت نماز ادا نہ کرنے کی سزا میں دُرے لگائے جاتے۔ جونہی اذان ہوتی ہر کوئی جہاں کہیں وہ ہوتا قریب ترین مسجد میں جا کر نماز ادا کرتا اور کسی کی دوکان سے کبھی ایک حبہ کی شے بھی گم نہیں ہوئی کیونکہ اکثر اوقات لوگ دوکانیں خالی چھوڑ کر نماز کے لیے چلے جاتے۔

زکوٰۃ لوگوں سے وصول کی جاتی اور حکومت نے براہ راست محکمہ عشر وزکوٰۃ قائم کر رکھا تھا جو کہ غیر مسلموں سے جزیہ، اور مسلمانوں سے عُشر وزکوٰۃ وصول کرتا۔ یہ رقومات بیت المال میں جمع ہوتیں۔ مہدی اپنے خرچ کے لیے صرف تین درہم روزانہ بطور تنخواہ لیا کرتا تھا۔ مگر مرتے وقت اُس نے وصیت کی تھی کہ میری تمام جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ فروخت کر کے بیت المال میں جمع کر دی جائے۔

خرطوم کی فتح کے بعد مہدی نے خرطوم کو پایۂ تخت بنا لیا تھا۔ مہدی نے جنگوں سے تباہ شدہ شہروں کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف کافی توجہ کی۔ ہر علاقے میں ایک ایک مسجد بنوائی اور مسجدوں میں ہی مکتب قائم کیے جہاں طالب علموں کو درس دیا جاتا اور یہی مساجد مہدوی تعلیم کے بڑے مراکز تھے۔

مہدی نے سوڈان بھر میں اعلان کرا دیا تھا کہ سادگی اختیار کی جاوے اور ہرگز ہرگز کسی امر میں بھی اسراف نہ کیا جائے۔ شادی بیاہ کے مواقع پر کبھی بھی کسی نمائش یا بے جا رقم خرچ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح مہدی نے مہر کی رقم بھی مقرر کر دی تھی اور کوئی اس سے ایک حبہ بھی زائد مہر نہ باندھ سکتا تھا اور ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کا گھر بار اور مال اسباب بحق حکومت ضبط کر لیا جاتا۔ ناچ، گانے اور عیاشی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ قال اللہ اور قال الرسول پر تمام

سوڈان چل رہا تھا۔

مگر مہدی نے ملکی مصلحت کے پیش نظر یا مذہبی نکتۂ نظر سے حج بیت اللہ کی منادی کر دی تھی اور مہدی کے آغاز مہدویت سے لے کر 1899ء تک سوڈانی حج کو نہ جا سکے۔ یہ امر اب پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ مہدی اپنے پیروؤں کے مذہبی عقائد اور تصورات کو عرب تک پہنچانا نہ چاہتا تھا کیونکہ عرب میں حج کے موقع دنیا بھر کے بڑے بڑے علماء فضلاء اور ستون دین جمع ہوتے تھے۔ محمد احمد اس امر سے گریز کرتا تھا کہ اس کی مہدویت کے متعلق اقطاع عالم کے مسلمانوں میں شور وغوغا ہو یا اس کی ذات ہدف ملامت بنائی جائے یا اس پر کفر و تکفیر کے فتوے لگائے جائیں۔

بہر صورت جو بھی امر پیش نظر تھا۔ مہدی، سوڈانی نے مسلمانانِ سوڈان پر حج بند کر دیا تھا۔ چاہے اس کا منتہائے نظر یہ ہو کہ وہ جس مہم میں مصروف ہے اور انگریزوں کو سوڈان بدر کرنے کے نمایاں کام میں مصروف ہے اس میں روڑا نہ اٹکے چاہے اس کا مقصود یہ ہو کہ اس کی مہدویت فتوؤں کی زد میں نہ آئے مگر اس نے مسلمانوں کو پانچویں فرض سے بَری کر دیا تھا۔

مہدی کے آخر دَور میں یوں تو کل سوڈان اس کے زیرِ نگین تھا اور سب سوڈانی اُس پیرو اور شیدائی مگر جب کبھی کسی مسلمان عالم نے اس کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی کی یا احادیث قدیمہ کی رُو سے مہدی کے کسی حکم کو غلط اور باطل ٹھہرایا تو اُسی وقت اس کو گرفتار کر کے اُس کی گردن ماردی جاتی۔ اگر عالم صاحب اثر ہوتا تو اس کو ملک بدر کیا جاتا۔ مگر ایسے حالات شاذ ہی ظہور پذیر ہوتے۔ کیونکہ مہدی کی سیاسی کامیابیوں نے اس کے مذہبی وقار کو بہت ہی بڑا سہارا دیا۔

محمد احمد نے تمام وہ کتابیں ایک ایک جمع کروا کے نذرِ آتش کر دیں جن کے متعلق اُسے ذرا بھی شک ہو سکتا تھا کہ یہ اُس کی مہدویت پر کسی قسم کا اثر ڈال سکتیں ہیں یا اُس کی مہدویت کے کسی اُصول سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

جب اقطاع سوڈان مہدی کے زیرِ نگیں آ گئے تو درحقیقت عوام کی بہت بڑی اکثریت اس کی مہدویت کی دل و جان سے معتقد تھی۔ کیونکہ اسنے ہر وہ میدان مارا جس میں شرکت کی، ہر وہ جنگ جیتی جس میں شامل ہوا۔ ہر وہ قلعہ پست کیا جس پر حملہ آور ہوا۔ ہر وہ شہر فتح کیا جس کا محاصرہ کیا۔ مہدی موعود کی اس سے بڑھ کر اور کیا نشانی ہو سکتی تھی جو کہ صحرا نشین، بدو اور سادہ لوح سوڈانی جان اور سمجھ سکتے تھے۔

مہدی کی ذات بذات خود بڑی ولولہ انگیز سیماب صفت اور نفس کش تھی۔ اس نے عمر بھر کبھی ریشمی کپڑا نہیں پہنا۔ کبھی عورتوں کو سونے چاندی کے زیورات پہننے کی تلقین نہیں کی۔ عورت کی طرف بُری نیت سے نگاہ کرنا مہدی کے نزدیک ایک قسم کا زنا تھا۔ وہ اپنے مریدوں سے بھی اسی قسم کی جفاکشی روح پروری اور نفس کشی کی توقع رکھتا۔ احکاماتِ مذہب کی خلاف ورزی اس کے نزدیک ناقابل تلافی جُرم تھا۔

اپنی قوت کو اسی ہزار مسلح درویشوں تک پہنچانے اور سارا سوڈان فتح کرنے کے بعد مہدی کی ہمت نے مزید جولانیوں کے لیے میدان ڈھونڈا۔ اب وہ برملا کہتا تھا کہ مَیں جو کچھ کرتا ہوں وہ خدا کی مرضی اور رضا کے مطابق کرتا ہوں اور لبوں سے جو کلام کرتا ہوں وہ وحی الٰہی کے زیر اثر کہتا ہوں اب مہدی نے اپنی قوت اور بڑھانی شروع کی۔ وہ اپنے درویشوں سے کہتا مشرق و مغرب کی حکومت تم کو ملنے والی ہے اور چار دانگِ عالم کے جملہ فرمانروا میری اطاعت کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔ اس نے اب حرمین شریف اور بیت المقدس پر عملدرآمد کرنے کی ٹھانی۔

مگر انہی ایام میں مہدی کو چیچک نکل آئی اور بارہ دن بیمار رہ کر صرف سینتیس سال کی عمر میں اپنی جان جانِ آفریں کے سُپرد کردی۔

ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نَفس قبر کی شب ہائے دراز

کچنر کا انتقام

مہدی کی موت کے بعد اس کا خلیفہ عبداللہ جو کہ زندگی میں اُس کا نائب تھا مہدی کا جانشین مقرر ہوا۔ مہدی نے خود وصیت کی تھی کہ عبداللہ اُس کا جانشین ہے اس نے عبداللہ کو وصیت کی کہ انگریزوں کو مصر سے نکال دینا۔

مہدی کی موت پر ایک واویلا مچ گئی۔ لوگ زاروقطار روتے تھے اور چالیس ہزار افراد نے اس کی نعش اٹھانے میں کام کیا۔ مہدی کو اسی جگہ دفن کیا گیا۔ جہاں کہ اُس نے انتقال کیا تھا۔ اُم درمان میں مہدی کا مقبرہ بنایا گیا، خرطوم سے پتھر لا لا کر یہ مقبرہ تعمیر کیا گیا اور بہترین تعمیر کا یہ مقبرہ اپنے وقت کی ایک عظیم ترین عمارت تھی۔

دریائے نیل کے کنارے سنگ رخام اور سنگ مرمر کی اس پُرشکوہ عمارت میں مہدی کی نعش 1885ء سے 1899ء تک پڑی رہی۔

عبداللہ نے مہدی کی وصیت کے مطابق مصر پر کئی حملے کیے مگر ان میں اکثر حملوں میں اُسے نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اس سے عبداللہ کی قوت میں کافی کمزوری آتی گئی۔

ادھر مہدی کی وفات کے بعد جو شخص مہدویت سے انکار کرتا یا لنک ہوتا۔ حکومت وقت اس کو تہِ تیغ کر دیتی۔ اس طرح سے صدہا افراد نذرِ اجل ہوئے۔ اس سے بھی عام افراد میں ایک بے چینی سی پھیل گئی۔

1899ء میں لارڈ کچز نے جو کہ مصر میں انگریزی افواج کا کمانڈرِ اعظم تھا، سوڈان پر حملہ کر دیا اور سوڈانیوں کی بے اتفاقیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اُم درمان تک پہنچ گیا۔ خرطوم بھی فتح کر لیا اور مہدی کی قبر، مجروح اور زخمی درویشوں اور مہدی کی لاش سے بھیانک انتقام لیا۔ مہدی کا مقبرہ جو کہ افریقہ کی بہترین عمارت تھی، توپوں سے اڑا دی گئی۔ گرے ہوئے گنبد اور ٹوٹے ہوئے دروازے وغیرہ کے ڈھیر کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ مہدی کی قبر کھود دی گئی۔ سر کاٹ لیا گیا اور جنرل گارڈن کے بھتیجے ارل گارڈن جو کہ انگریزی فوج کے ہمراہ تھا کو بطورِ تحفہ دیا گیا۔ مہدی کی نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور ان کو تین دن تک اُم درمان کے باشندوں کے دکھانے کو بَرسرِ عام رکھا گیا۔ پھر ان ٹکڑوں کو نیل کے پانی میں بہا دیا گیا۔

کچز نے نہ صرف مہدی کی نعش کی بے حرمتی کی بلکہ اُم درمان، خرطوم اور دیگر سوڈانی شہروں کے گناہ ناآشنا باشندوں کو لوٹا گیا ہے۔ اس کی مذہبی کتب اور قرآنِ مجید شہید کیے گئے۔ ہر شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت کی اجازت تھی۔ ہر باریش شخص کو مہدوی سمجھ کر گولی ماردی جاتی۔ ہر جنگ کے بعد زخمیوں کو تلاش کر کے بندوقوں کا نشانہ بنایا جاتا۔

عوام کے ہجوم اور غیر قلعہ بند شہروں پر توپوں سے گولہ باری کی جاتی اور ہزارہا لوگوں کو تہ تیغ کیا جاتا۔

یہ سب کچھ ایک متمدن ترین اور مہذب ترین قوم کے افراد صحرانشینوں اور سادہ لوح مسلمانوں کے خلاف کر رہے تھے۔ جنہوں نے نہایت ہمت و بہادری سے کام لے کر ان کو اپنے وطنِ مقدس سے نکال دیا۔

مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ صرف سولہ سال بعد لارڈ کچز کو جب کہ وہ جنگی جہاز میں سوار بحیرۂ روم میں جا رہا تھا۔ ایک جرمن آبدوز نے تارپیڈو لگا کر غرق کر دیا۔

مہدی سوڈانی کو تو چودہ برس افریقہ کے بہترین مقبرے میں آرام نصیب ہوا اور پھر اس کے بعد نیل کے میٹھے پانی میں سکون ملا۔

مگر کچز کو موت ہی کھارے پانی میں ملی۔ جس وقت کچز غرق ہو رہا تھا اس وقت مہدی کی روح اس کو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔

گفت۔ اے کچز۔ اگر داری نظر
انتقامِ خاکِ درویشے نگر!

آسماں خاکِ ترا گورے نہ داد
مرقدے جز در یم شورے نہ داد

(اقبالؒ)

❀............❀............❀

محمد اول

تیمور کے چلے جانے کے بعد بایزید کے چار بیٹوں میں سلطنت کے لیے اختلافات شروع ہو گئے۔ آخر اُس کے چھوٹے بیٹے محمد نے اپنے بھائیوں کو شکست دے کر ملک لے لیا۔ محمد نے صرف آٹھ سال حکومت کی۔ لیکن اس عرصہ میں اس نے عثمانیوں کو پھر عزت اور اقبال کے اونچے رُتبہ پر پہنچا دیا۔ اس زمانے میں اکثر لڑائیاں بھی ہوئیں۔ لیکن محمد اول اچھی طرح جانتا تھا کہ سلطنت کو مضبوط کرنے کے لیے امن و امان کی ضرورت ہے اس لیے جب تک کوئی بہت بڑی ضرورت نہیں آ پڑتی تھی وہ میان سے تلوار نہیں نکالتا تھا۔ اُس نے بروصہ کی جگہ ایڈریانوپل کو صدر مقام بنایا۔ اور یورپ کے اکثر بادشاہوں سے بڑے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے۔

محمد بڑا نیک اور خدا ترس سلطان تھا اور شعر و شاعری کا بھی شوق رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس کا زمانہ علمی ترقی کے لیے بھی بہت مشہور ہے۔ بروصہ میں ایک خوبصورت مسجد اُس کی یادگار ہے جس کے مینار سبز رنگ کے ہیں۔ موت کے بعد اُسے اسی مسجد کے قریب دفن کیا گیا۔

محمد کا بیٹا مراد دوم جو اُس کی جگہ ترکی کے تخت سلطنت پر بیٹھا اپنے باپ کی طرح بڑا بایزید نیک اور خدا ترس حاکم تھا۔ لیکن ساتھ ہی اُسے ملک گیری کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ اُس نے ایشیائے کوچک کی بہت سی ریاستوں کو جو تیمور کے حملہ کے زمانے میں عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ پھر قسطنطنیہ کو جا گھیرا اور وہاں کے بادشاہ سے خراج لے کر واپس لوٹا۔

ادھر مراد عثمانی سلطنت کو بڑھانے کی فکر میں تھا۔ اُدھر بلقان کی ریاستوں کے حاکم اور ہنگری کا بادشاہ عثمانیوں کو یورپ سے نکالنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ سرویہ کا حاکم سٹیفن

جس کی ساری عمر ترک فرمانرواؤں کی حمایت میں گزر گئی تھی انتقال کر چکا تھا۔ اُس کے جانشین کے دل میں حب وطن کے جوش نے آزادی کی امنگ پیدا کر رکھی تھی۔ چنانچہ اُس نے بہت سی فوج جمع کر کے بوسینا، ہنگری، پولینڈ، ولیشیا اور البانیہ کے حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور بلقان کے پہاڑ جنگی نعروں سے گونج اُٹھے۔

اتفاق سے ان لوگوں کو ہنیاڈی جیسا قابل سپہ سالار مل گیا۔ وہ ولیشیا کا باشندہ تھا اور اطالوی ریاستوں کے معرکوں میں بڑی عزت اور ناموری حاصل کر چکا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر پوپ نے بھی اعلان کر دیا کہ جو لوگ خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتے ہیں وہ اس جنگ میں ضرور شریک ہوں۔ غرض عیسائی بڑے جوش خروش سے بڑھے اور عثمانیوں کے بہت سے شہروں کو لوٹ کھسوٹ کر کئی قلعوں کو فتح کر لیا۔ آخر اس شرط پر صلح ہوئی کہ ولیشیا ہنگری میں شامل کر لیا جائے اور سرویہ سے عثمانیوں کا کوئی تعلق نہ رہے۔

صلح نامہ پر دونوں طرف کے لوگوں کے دستخط ہو چکے تو سلطان مراد نے جو سلطنت کے بکھیڑوں سے تنگ آ گیا تھا۔ تخت و تاج اپنے بیٹے محمد کے حوالے کیا اور خود ایک گوشہ میں بیٹھ کر اپنا وقت یادِ الٰہی میں صَرف کرنے لگا۔ عیسائیوں کو یہ خبر ملی تو اُن کی نیتیں بدل گئیں۔ سب نے کہا کہ عثمانیوں کو یورپ سے نکالنے کے لیے یہ موقع بہت اچھا ہے۔ ایک سردار بول اُٹھا کہ ہم نے انجیل کی قسم کھا کر جو قول و قرار کیا ہے اُس کا کیا ہو گا؟ یہ سُن کر کارڈنیل جولین نے جو عیسائیوں کا مشہور مذہبی پیشوا تھا اور پوپ کی طرف سے آیا تھا۔ کہا کہ کافروں سے بدعہدی کرنا جائز ہے۔ یہ فتویٰ سُن کر سب مطمئن ہو گئے اور سلطان مراد نے عیسائیوں کی بدعہدی کا حال سُنا تو تسبیح چھوڑ کر تلوار سنبھالی اور فوج سمیت یلغار کرتا ہوا چلا۔

اس جنگ میں ترکوں نے عہد نامے کی ایک نقل نیزے پر اُٹھا رکھی تھی۔ جو عیسائیوں کے جھوٹ اور عثمانیوں کی سچائی کی جیتی جاگتی شہادت تھی۔ ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ آندھی اور جھکڑ نے ایسا زور باندھا۔ کہ عیسائیوں کے جھنڈے زمین پر آ رہے۔ لیکن انہوں نے سنبھل کر حملہ کیا۔ تو ترکوں کی پہلی دو صفیں ٹوٹ گئیں۔ اُدھر ولیشیا اور ہنگری کے سپاہیوں نے دونوں بازوؤں پر زور ڈالا۔ ساتھ ہی ہنگری کا بادشاہ جو درمیان میں تھا اپنی فوج کو لے کر بڑھا۔ اور ترکوں کے قدم ہٹانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اناطولیہ کے ایک فوجی سردار قراجہ نے باگ پکڑ لی۔ اور

عرض کیا کہ اب ہٹنا مناسب نہیں۔ یہ الفاظ سنتے ہی سلطان کی رگوں میں خون شجاعت نے جوش مارا اور اُس نے پلٹ کر ینی چری دلاروں کو للکارا۔ سلطان کی آواز سنتے ہی وہ زور دے کر بڑھے اور ہنگری کا بادشاہ جو سیلاب کی طرح چڑھا چلا آ رہا تھا۔ پہلے ہی ہلے میں کھیت رہا۔ اُس کے مرتے ہی عیسائیوں کی فوج میں بددلی پھیل گئی اوران کے قدم نہ ٹھہر سکے۔ کچھ عرصہ کے بعد مراد نے ہنیاڈی کو ایک اور معرکہ میں شکست دی اور بوسینا اور سرویہ کو پھر عثمانی قلمرو میں شامل کر کے انتقال کیا۔

89

محمد بن عامر منصور

محمد بن ابو عامر یمن کے قبیلہ معافر سے تھا۔ 275ھ میں اندلس میں مقام طرکش میں پیدا ہوا۔ ابھی وہ سات آٹھ سال کی عمر کا تھا کہ قرطبہ کے سرکاری مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ کچھ لکھ پڑھ کر اس نے ایوان شاہی کے قریب ایک دوکان کرائے پر لے لی۔ عرضی نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ اجرت لے کر لوگوں کو عرضیاں لکھ دیتا تھا۔ اتفاقاً قرطبہ کی ملکہ صبح کو ایک محرر کی ضرورت پیش آئی اور ایک خواجہ سرا کی سفارش سے یہ جگہ محمد بن ابو عامر کو مل گئی۔ اس نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ خلیفہ حکم اس کی کارگزاری سے بڑا خوش ہوا اور اسے اشبیلیہ کے محصولات کی وصولی کا افسر مقرر کر دیا۔ چونکہ اپنے کام کے سلسلے میں محمد بن عامر المنصور کو قرطبہ سے باہر رہنا پڑتا تھا اس لیے اُس نے ملکہ سے کہا کہ خلیفہ حکم سے سفارش کر کے اسے کوئی ایسی جگہ دلا دے، کہ اس کا قیام قرطبہ ہی میں رہے۔ چنانچہ اسے محکمہ دارالضرب ٹکسال کا افسر بنا دیا گیا۔ یہ بڑا اہم عہدہ تھا۔ یہاں اس نے اپنی قابلیت کے بڑے جوہر دکھائے۔ ملکہ صبح اور دوسرے اُمراء وزراء کو اس نے تحائف دے دے کر اپنا خیر خواہ بنا لیا اور بہت جلد اُن کا اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ اسے شہزادہ ہشام کا اتالیق مقرر کر دیا گیا۔

خلیفہ حکم کا انتقال ہوا تو وزیر جعفر مصحفی، سپہ سالار غالب اور ملکہ صبح امور سلطنت میں دخل دینے لگے۔ ملکہ محمد بن ابو عامر پر بہت مہربان تھی۔ خلیفہ حکم کی موت کے بعد ہشام خلیفہ بنا تو اندرونی حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ اس حالت میں شمالی عیسائیوں کے حملہ آور ہونے اور خراج کی ادائیگی سے انکار کی خبریں پہنچیں وزیر جعفر نے محمد بن ابو عامر کو فوج دے کر اُن کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اُس نے شمالی علاقے میں پہنچ کر عیسائیوں کو شکست دی اور اپنی جنگی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔

وہ ایک فاتح کی حیثیت سے واپس لوٹا تو قرطبہ میں اُس کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس کا اثر و اقتدار پہلے سے دوچند ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے سپہ سالار غالب کو اپنا ہم خیال بنا کر وزیر جعفر مصحفی کو وزارت سے برطرف کرا دیا۔

ملک کے حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ صرف ایک قابل اور دانش مند شخص ہی اُسے بہتر بنا سکتا تھا اور وہ دانش مند صرف محمد بن ابو عامر تھا۔ مگر سپہ سالار غالب کی موجودگی میں حالات بہتر نہیں بنائے جا سکتے تھے اور غالب پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ محمد بن ابو عامر المنصور نے فوجی بھرتی شروع کر دی۔ اُس نے شمالی علاقے کے کوہستانی عیسائیوں اور مراکش و طرابلس الغرب کے بربریوں کو بھی بھرتی کیا۔ اب وہ وزیر اعظم تھا۔ غالب کی وہ بڑی عزت کرتا تھا اور اُس نے اس کی لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی لہٰذا غالب کو اس کی طرف سے کوئی خدشہ نہ تھا۔ لیکن محمد بن ابو عامر المنصور اندر ہی اندر غالب کو راستے سے ہٹانے کی تدبیریں سوچتا رہا۔

اُس نے موقع پا کر سب سے پہلے تو پرانی فوج کے ایک حصے کو موقوف کر دیا اور باقی کو غیر اہم مقامات پر مامور کر کے ان کی قومی جماعت بندیوں کو درہم برہم کر دیا۔ نئی فوج کی تعداد بڑھا کر اُسے بہت مضبوط بنا لیا اور اس کی اعلیٰ پیمانے پر تنظیم کی۔ اس طرح اس نے غالب کی قوت کو بڑی ہوشیاری سے کمزور کر دیا اور اس کے بعد آسانی سے اسے راہ سے ہٹا دیا۔

خلیفہ ہشام اپنے محل کے اندر عیش و عشرت میں مصروف رہتا تھا۔ لہٰذا ہر طرح کا اختیار محمد بن ابو عامر کو حاصل ہو گیا تھا۔ جس سے وہ بہت جلد نہ صرف فوج بلکہ رعایا کا بھی محبوب قائد ہو گیا۔

اس وقت عیسائی ریاستوں نے بہت فتنہ و فساد برپا کر رکھا تھا۔ محمد بن ابو عامر نے ان کی پوری طرح سرکوبی کی اور کئی ریاستوں کو اپنی مملکت میں شامل کر کے باغیوں کو ایسی سخت سزائیں دیں کہ عیسائی بادشاہ اس کا نام سُن کر کانپنے لگتے۔ بہت سے عیسائی سردار اس کی فوج میں شامل ہو گئے اور اپنے ہم مذہبوں کے خلاف لڑے۔ محمد بن ابو عامر کی فتوحات کی سرحدیں ساحل فرانس تک جا پہنچیں۔ اس نے فرانس کے کئی ساحلی شہر فتح کر لیے اور بحر اڈریاٹک کے کئی جزیرے بھی مسخر کر لیے۔ اُس نے لیون اور ارد گرد کی دوسری عیسائی ریاستوں کو خلافتِ قرطبہ کا براہ راست ایک صوبہ بنا لیا تھا اور قسطلہ اور النوار کو فرمانبردار بنانے میں پوری کامیابی حاصل کر لی تھی۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ریاست بشکن کے والی غرسیہ کے پاس محمد بن ابو عامر کا ایک ایلچی کسی ضرورت سے گیا۔ غرسیہ نے اس کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور سارے ملک کی سیر کرائی۔ اس سیر و سیاحت کے دوران میں اس ایلچی کو معلوم ہوا کہ کسی گرجا میں کوئی مسلمان عورت قید ہے۔ ایلچی نے واپس آ کر محمد بن ابو عامر کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو محمد بن ابو عامر نے اسی وقت ریاست بشکن پر حملہ کر دیا تو غرسیہ حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا:

''حضور مجھ سے کیا گستاخی ہو گئی ہے جو آپ نے یہ فوج کشی کی ہے؟''

محمد بن ابو عامر نے کہا: ''تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ملک میں کوئی مسلمان قیدی نہیں رکھو گے پھر اُس گرجا گھر میں ایک مسلمان عورت کیوں قید ہے؟''

غرسیہ نے لاعلمی کا اظہار کیا اور اُسی وقت اس عورت کو آزاد کر دیا۔ اس کے بعد محمد بن ابو عامر نے افریقہ کی طرف توجہ کی اور افریقہ کی بیشتر ریاستیں فتح کر لیں۔ اس نے آخری ایامِ حکومت میں اپنا خطاب منصور تجویز کیا تو وہ ''منصور اعظم'' کے خطاب سے مشہور ہوا۔

محمد بن ابو عامر المنصور 394ھ میں ستائیس سال کی حکومت کے بعد قسطلہ کی جنگ سے واپس آ رہا تھا کہ مدینہ سالم میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ اس کی آخری خواہش تھی کہ جنگی وردی میں اس کی موت آئے۔ اس طرح اُس کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ اس کی ذات اُندلس کی اسلامی سلطنت کے لیے نہایت ہی مبارک و مسعود تھی۔ وہ علم و فضل کا بڑا قدر دان تھا۔ عالموں کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس نے رفاہِ عامہ کے بہت سے کام کیے۔ اس نے زندگی میں چھپن لڑائیاں لڑیں اور ہر ایک میں کامیابی حاصل کی۔ ایک مورخ محمد بن ابو عامر المنصور کے متعلق لکھتا ہے:

''جب محمد بن ابو عامر المنصور فوت ہوا تو اگرچہ خلافت بنی امیہ ہشام ثانی کی بے بسی اور نالائقی کے سبب اپنے آخری سانس لے رہی تھی لیکن اُندلس میں اسلامی عظمت و شوکت اپنے معراجِ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔''

❀..........❀..........❀

90

محمد بن قاسم

بارہ سو سال سے زیادہ گزرے کہ لنکا سے چند عرب مسافر ایک جہاز میں بیٹھ کر عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب سندھی ڈاکوؤں نے جہاز پر چھاپہ مارا۔ مال واسباب لوٹ لیا اور مسافروں کو پکڑ لیا۔ ان مسافروں میں ایک عرب لڑکی بھی تھی۔ اُس نے حجاج کی دہائی دی۔ "حجاج المدد!" تھوڑے عرصہ کے بعد جب مشرقی صوبوں کے گورنر حجاج کو اس کی خبر ہوئی۔ تو اُس پر اس کا بہت اثر ہوا، اور اُس نے جواب دیا۔ "مَیں آیا۔ مَیں آیا۔"

اور دوسرے واقعات کے ساتھ یہ چھوٹا سا واقعہ بھی سندھ کی فتح کا باعث ہوا۔ اس فتح کا سہرا محمد بن قاسم کے سر ہے جو تاریخ کا سب سے کم سن فاتح ہے۔

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ اتنی بڑی سلطنت پہلے کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا رقبہ کچھ نہیں تو ڈیڑھ کروڑ مربع میل ہوگا۔ اس کا شہنشاہ جسے خلیفہ کہتے تھے، ولید بن عبدالملک تھا، اور دارالخلافہ دمشق۔ اگرچہ دنیا کے اکثر آباد حصے اس سلطنت میں شامل ہو چکے تھے، مگر مجاہدینِ اسلام چاہتے تھے کہ نئے نئے ملکوں میں جائیں، اور عدل وانصاف کا نظام قائم کریں۔ چنانچہ دارالخلافہ سے دُور دُور جہاد کا سلسلہ شروع تھا۔ اس سلسلہ میں ایک اسلامی لشکر سندھ پر حملہ کرنے روانہ ہوا۔ اور ساحل ساحل آگے بڑھا اور بندرگاہ دیبل کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن جلد ہی یہ محاصرہ اُٹھا دینا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ بہت دور دراز تھا۔ راستے دشوار اور غیر آباد تھے۔ فوجوں پر بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ سندھ کے بارے میں لوگوں کی یہ رائے تھی، کہ وہاں کا پانی اُتھلا، پھل بدمزہ اور چور دلیر ہیں۔ اگر فوج کم ہو تو ضائع ہو جائے اور زیادہ ہو تو بھوکی رہ جائے گی۔

مگر اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ حجاج نے سندھ کو فتح کرنے کا پکا ارادہ کرلیا۔ ہوا یہ کہ چند لوگوں نے خراب قسم کی شرارتیں کیں، اور سزا کے خوف سے سندھ بھاگ گئے۔ جب اُن کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا، تو وہاں کے راجہ داہر نے انہیں واپس کردینے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ واقعہ پیش آیا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ حجاج نے راجہ کو لکھا کہ عرب مسافروں کو واپس کردو۔ اس نے جواب دیا کہ یہ کام سمندری ڈاکوؤں کا ہے۔ ان پر میرا زور نہیں چلتا۔ اس لیے مَیں مجبور ہوں۔ اس پر حجاج نے ایک چھوٹی سی فوج عرب قیدیوں کو چھڑانے کے لیے بھیجی۔ مگر اس کا سردار ایک لڑائی میں شہید ہو گیا۔ دوسرا لشکر عمان کے حاکم بدیل کی ماتحتی میں بھیجا گیا۔ راجہ داہر کا بیٹا ایک بڑی فوج لے کر مقابلہ کے لیے آیا۔ شہر نیرون کے قریب جنگ ہوئی اور عرب سردار مارا گیا۔ حجاج کو جب اس کی خبر ملی، تو اُسے بے انتہا رنج ہوا۔ اور اُس نے قسم کھائی کہ بدیل کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہوں گا۔ اُسی وقت سے اُس نے سندھ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

تیاریاں تو شروع ہو گئیں۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ فوج کا سپہ سالار کسے مقرر کیا جائے۔ حجاج نے کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ محمد بن قاسم سے زیادہ موزوں شخص اِس ذمہ داری کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ محمد بن قاسم حجاج کا داماد اور اِس وقت فارس کا گورنر تھا۔ وہ اگرچہ بالکل نوجوان تھا۔ یعنی اس کی عمر سولہ سترہ برس سے زائد نہیں تھی۔ مگر فارس کی فرمانروائی میں بڑی دانش مندی اور قابلیت کا اظہار کر چکا تھا۔ وہ نہایت خلیق، بردبار، شیریں گفتار، دُور اندیش اور مستقل مزاج تھا۔ ان خوبیوں کے علاوہ جنگی قابلیت تو خدا نے اسے خاص طور سے ودیعت کی تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کے خون کے ایک ایک قطرے کو عزیز جانتا تھا۔ اِسی وجہ سے فوج میں اس کو ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ اور ہر سپاہی اس کے ایک اشارے پر جان قربان کر دینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ سندھ پر حملہ کرنے کے لیے جو فوج تیار کی جارہی تھی محمد بن قاسم کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ اُس نے جس خوبی سے یہ کام انجام دیا اور جس طرح بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے، اس کی مثال نہیں ملتی۔

حجاج نے اس مہم کے لیے ضروری سازوسامان جمع کرنے میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ تعجب ہے کہ سوئی دھاگہ تک ساتھ کر دیا تھا۔ تاکہ کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔ پانچ منجنیقیں جہاز پر لاد کر بصرہ سے روانہ کیں ان میں سے سب سے بڑی منجنیق کا نام عروس تھا۔ اس کے وزنی پتھر کو کھینچ

کر چلانے کے لیے پانچ سو آدمی مقرر تھے۔ فوج کی کل تعداد چھ ہزار تھی۔ بار برداری اور کھانے پینے کا سامان لے جانے کے لیے تین ہزار اُونٹ ایران سے منگوائے گئے تھے۔

جب تیاری مکمل ہو گئی، تو محمد بن قاسم خدا کا نام لے کر پہلے ایران اور وہاں سے مکران گیا۔ اور 712ء میں دیبل کی بندرگاہ کا محاصرہ کر لیا۔ دیبل کا شہر بڑا مضبوط تھا۔ اردگرد پکے مورچے تھے، جن پر سندھیوں کو بڑا ناز تھا۔ شہر میں کھانے پینے کے سامان اور سپاہیوں کی کمی نہ تھی۔ اس لیے اس کا فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ شہریوں کا خیال تھا کہ محاصرہ کرنے والے کچھ عرصے کے بعد تنگ آ کر چلے جائیں گے۔ مگر محمد بن قاسم واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ چھ مہینے محاصرہ جاری رہا۔ شہر والے تنگ آ گئے۔ کئی شہری چھپ چھپ کر اسلامی لشکر میں آتے اور امان کا وعدہ لے کر چلے جاتے تھے۔

دیبل فتح ہوا۔ شہر کو امان دے دی گئی۔ وہاں کا حاکم بچ کر نکل گیا۔ بے شمار سپاہی مارے گئے اور ہزاروں قید ہوئے۔ بعض برہمن اپنی مرضی سے مسلمان ہو گئے۔ انہیں اُن کے عہدوں پر بحال رکھا گیا۔

فتح کے بعد محمد بن قاسم نے اہلِ شہر کے سامنے ایک پُر جوش تقریر کی اور کہا:

"مَیں کوئی ظالم اور سنگ دل فاتح نہیں ہوں بلکہ حق اور انصاف کے ساتھ مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی کے لیے اس ملک میں آیا ہوں۔ میرا مذہب اسلام ہے اور اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام مخلوقات کا خالق خدائے وحدہٗ لاشریک ہے۔ ساری دنیا کے آدمی اُس کے بندے ہیں اور اچھا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ کسی پر ظلم کرنا اسلام کی تعلیم نہیں۔ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے ہاں جو حق اور انصاف کے دشمن ہیں، ہم اُن کے دشمن ہیں۔ اور ان سے لڑنا اور ان کے ظلم کو مٹانا ہمارا فرض ہے۔ راجہ داہر نے ہمارے بھائیوں پر ظلم کیا ہے وہ فتنہ و فساد برپا کرتا ہے۔ ہم اس کو مغلوب کرنے اور امن و امان قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔ مَیں تم پر جبر و تشدد نہیں کروں گا۔ مَیں تمہاری جائیدادوں اور دولت کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ تم آزاد ہو۔ تمہاری جائیدادیں آزاد ہیں، تمہاری دولت آزاد ہے!"

تھوڑی مدت کے بعد چار ہزار عرب شہر میں بسائے گئے۔ ان عرب قیدیوں کو بھی رہا کر کے بسایا گیا، جو وہاں قید تھے۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھی جس نے حجاج کی دہائی دی تھی۔ محمد بن

قاسم نے شہر میں ایک خوب صورت جامع مسجد بنوائی۔ ارد گرد کا انتظام ایسا اچھا کر دیا، کہ ڈاکوؤں اور چوروں کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی جرأت نہ رہی۔

دیبل سے تھوڑی دُور ایک مقام نیرون تھا۔ یہاں کے راجہ بھدر کن نے جب یہ دیکھا کہ دیبل والوں کا کیا انجام ہوا ہے، تو اس نے محمد بن قاسم سے صلح کر لی۔ محمد بن قاسم نیرون پہنچا تو راجہ نے اس کا بڑا شان دار استقبال کیا۔ مسلمانوں کی دعوت کی۔ ان کے مویشیوں کے لیے چارہ کا بندوبست کیا اور انہیں بہت سے قیمتی تحفے بھی دیئے۔

نیرون سے اِسلامی لشکر نے آگے کوچ کیا۔ راستہ میں کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بلکہ سندھ کے بہت سے رئیسوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کا سپہ سالار اتنا اچھا، نیک اور ہمدرد ہے تو وہ خود بخود اسلامی جھنڈے کی پناہ میں آ گئے۔ اِس طرح نیرون سے دریائے سندھ کی شاخ تک کا سارا علاقہ آسانی کے ساتھ فتح ہو گیا۔

یہاں سے محمد بن قاسم سیوستان کی طرف روانہ ہوا۔ نیرون کا راجہ بھدر کن بھی ساتھ تھا۔ راستہ میں ایک علاقہ تھا جسے بہرج کہتے تھے۔ یہاں راجہ داہر کے بھتیجے بجرا کی حکومت تھی۔ آبادی بُدھ مذہب کی پیرو تھی اور جیسا کہ سب جانتے ہیں، بُدھ لوگ خون بہنے بہانے کو بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان اس طرف آ رہے ہیں، تو انہوں نے بجرا سے کہا ''ہم لوگ امن و امان کو پسند کرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے دُور رہنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نے مسلمانوں سے مقابلہ کیا تو تباہ ہو جائیں گے۔ کیوں نہ ان سے صلح کر لیں۔ اگر ہم نے ان سے صلح کر لی تو وہ ہمیں کچھ نہ کہیں گے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ جو وعدہ کرتے ہیں اسے ہر صورت میں پورا کرتے ہیں۔'' مگر بجرا کو اپنی قوت پر گھمنڈ تھا۔ وہ لڑائی پر اڑا ہوا تھا۔

محمد بن قاسم کو پتہ چل گیا کہ بہرج کے باشندے ہرگز لڑنا نہیں چاہتے اِس لیے اُس نے انہیں کچھ نہ کہا، اور سیدھا سیوستان کی طرف بڑھا راجہ بجرا قلعہ میں محفوظ ہو کر بیٹھ گیا۔ مسلمانوں نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ دن رات فصیل پر پتھر پھینکے جانے لگے۔ ایک ہفتہ کے مقابلے کے بعد بجرا کی فوج کی ہمت چھوٹ گئی۔ یہ صورت دیکھ کر بجرا ایک رات چھپ کر قلعہ سے نکل بھاگا، اور ریاست بودھیا کے حاکم کاکا کے یہاں پناہ لی۔ چونکہ کاکا راجہ داہر کا ماتحت تھا، اس لیے اُس نے بجرا کی بڑی آؤ بھگت کی۔ بجرا کے بھاگنے کے بعد سیوستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور محمد

بن قاسم نے یہاں ضروری انتظامات کر دیئے۔

بجرا بڑا اکھڑ اور ضدی تھا۔ اب اس نے اکاک کے دارالخلافہ سیسم کو اپنی جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا۔ محمد بن قاسم کو مجبوراً اُدھر کا رُخ کرنا پڑا جن علاقوں کو اب تک مسلمانوں نے فتح کیا تھا، وہاں کے باشندوں پر محمد بن قاسم کے اچھے سلوک کا اتنا اچھا اثر پڑا تھا کہ جب وہ سیسم کی طرف روانہ ہوا تو بہت سے سردار اس کے ساتھ ہو گئے۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں، بجرا راجہ داہر کا بھتیجا تھا، اِس لیے کاکا اُسے پناہ دینے پر مجبور تھا۔ مگر وہ خود محمد بن قاسم سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ جب اُسے خبر ملی کہ مسلمان سیسم کی طرف آرہے ہیں، تو وہ بلا کسی خوف کے محمد بن قاسم کے پاس آیا اور اُسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ محمد بن قاسم نے اس کی بڑی عزت کی اور اُسے ایک خلعت بھی دیا۔

بجرا سیسم کے قلعہ میں مسلمانوں سے لڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ محمد بن قاسم نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ بجرا نے اپنے سرداروں سمیت مقابلہ کیا۔ کئی سرداروں نے لڑ کر جان دے دی اور کئی بھاگ گئے۔ آخر میں قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

محمد بن قاسم آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ حجاج کا حکم آیا کہ نیرون واپس جا کر راجہ داہر کے پایہ تخت پر حملہ کر دو۔ چنانچہ وہ نیرون واپس آیا اور چند روز آرام کرنے کے بعد راجہ داہر کی طرف بڑھا۔ راستے میں بیٹ کے راجہ موکا نے اطاعت قبول کی۔ محمد بن قاسم کا مقصد یہ نہیں تھا کہ خواہ مخواہ راجہ داہر سے لڑے۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ راجہ اس کی اطاعت قبول کر لے، اور ملک کا انتظام ایسا کر دے کہ مسلمان آرام و چین سے زندگی بسر کر سکیں۔ محمد بن قاسم نے ایک وفد راجہ داہر کے پاس بھیجا تا کہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ مگر راجہ داہر کو اپنے ساز و سامان اور فوج پر بڑا غرور تھا۔ آٹھ دس ہزار عرب جن کا سپہ سالار ایک سترہ سال کا لڑکا تھا، اس کی نظر میں کچھ جچتے نہ تھے۔ ساز و سامان اور فوج کے علاوہ راجہ جنگ کے فن میں خود بھی بڑا ماہر تھا۔ اس کی سخت کمان کسی سے نہ کھنچتی تھی۔ اس کی کمند میں لوہے کا چکر لگا ہوا تھا۔ جس کی دھار چاقو سے زیادہ تیز تھی۔ جب وہ کمند پھینک کر کھینچتا تو دشمن کی گردن اُڑا دیتا تھا۔ لڑنے سے پہلے محمد بن قاسم نے صلح کی ایک اور کوشش کی۔ مگر راجہ داہر نے جواب دیا۔ ہمارا فیصلہ تلوار کرے گی۔ جب یہ جواب آیا، تو محمد بن قاسم مقابلے کے لیے روانہ ہو گیا اور ایک ایسی جگہ ڈیرے ڈال دیئے جہاں دونوں فوجوں کے درمیان

دریائے سندھ تھا۔ راجہ داہر نے جگہ جگہ تیر انداز مقرر کر دیئے تھے تا کہ مسلمان کشتی کا پل نہ بنا سکیں۔ جیسے ہی مسلمان سپاہی پل بنانے کی کوشش کرتے۔ ان پر تیروں کی بوچھاڑ ہوتی، اور انہیں مجبوراً وہاں سے ہٹنا پڑتا۔ یہ حالت دیکھ کر مسلمانوں نے رات کے اندھیرے میں ایک لمبا پل بنایا، اور راتوں رات دریا کو پار کر کے اِس زور شور سے سندھیوں پر حملہ کیا کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور بھاگ اُٹھے۔ محمد بن قاسم آگے بڑھا اور جیسور پر قبضہ کر کے وہاں فوجیں اُتار دیں۔ اب راجہ داہر مقابلہ کے لیے نکلا اور نکلا بھی اس شان سے کہ آگے آگے جنگی ہاتھی تھے۔ ان کے بعد دس ہزار سوار زرہ پہنے ہوئے، پھر تیس ہزار پیادے جن کے پاس بہترین ہتھیار تھے۔ لشکر کے عین بیچ میں چنے ہوئے سردار اور خاص ملازم راجہ کے سفید ہاتھی کو گھیرے ہوئے۔ ہاتھی پر داہر قیمتی زرہ بکتر پہنے بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ پان کھلانے اور تیر دینے کے لیے دو لونڈیاں بھی ساتھ تھیں۔

اِدھر مسلمان مجاہدوں نے صبح کی نماز پڑھی اور خدا سے فتح کی دعا مانگی۔ محمد بن قاسم نے ایک پُر جوش تقریر کی، اور فوج کے پانچ حصے کیے۔ دو رسالے آگے بھیجے تا کہ چکر کاٹ کر دشمن کے بازوؤں پر جا گریں۔ آگ کے گولے پھینکنے والے نو سو بہادر تین ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیئے۔ جنگی ہاتھیوں کو ڈرانے میں آگ کے یہ گولے بہت کام آئے۔ اب ایک دوسرے پر حملہ شروع ہو گیا۔ راجہ داہر کے من چلے سوار گھوڑے دوڑاتے اسلامی فوج پر بڑھے مگر نقصان اُٹھا کر پیچھے ہٹ گئے۔ ایک حبشی نے جس کا نام شجاع تھا، محمد بن قاسم کے سامنے قسم کھائی تھی کہ خاص راجہ پر حملہ کروں گا یا اس کا سر لاؤں گا یا اپنا سر کٹوا دوں گا۔ لڑتے لڑتے اس نے راجہ کے ہاتھی کو دیکھا۔ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا۔ عین وقت پر پگڑی کے پیچ کھل کر آنکھوں پر آ گئے۔ تلوار ہاتھی کی سونڈ پر پڑی۔ اتنے میں راجہ نے ایک تیر ایسا مارا کہ گردن میں گڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں۔ قیامت کا رن پڑا۔ راجہ کے سپاہی بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ محمد بن قاسم اور اُس کے ساتھی بھی بڑی دلیری سے کام لے رہے تھے۔ آخر خدا کی راہ میں شہید ہونے کا جذبہ غالب آ گیا۔ دن ڈھلتے ڈھلتے سندھی فوجوں کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ ایک گولہ پھینکنے والے نے تاک کر ایک گولہ راجہ کے سفید ہاتھی کو مارا۔ ہاتھی زخمی ہو گیا اور بھاگ کر ندی میں جا گھسا۔ اس ندی کے کنارے راجہ داہر مارا گیا۔ برہمنوں نے اس کی لاش دلدل میں چھپا دی تھی۔ مگر دن چھپنے سے پہلے وہ نکل آئی اور پہچان لی گئی۔ ہر گوشے سے اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے لگے۔ محمد بن

قاسم کو اس عظیم الشان فتح پر ہر طرف سے مبارک بادیں ملیں۔

محمد بن قاسم نے جگہ جگہ عرب حاکم مقرر کر دیئے۔ اس سے سندھیوں کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ محض لُوٹ مار کے لیے نہیں بلکہ مستقل قبضہ کرنے آیا ہے۔ مغربی سندھ کے سینکڑوں سپاہی پہلے ہی مسلمان فوج میں بھرتی ہو چکے تھے۔ داہر کے مارے جانے سے مشرقی سندھ کے کئی امیر اور وزیر بھی اس کے ماتحت ہو گئے۔ مگر ابھی تک داہر کا لڑکا جے سنگھ موجود تھا۔ اس نے ایک بڑی فوج کو ارور میں جمع کر کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ بعد کو اپنے وزیر کے مشورے پر وہ برہمن آباد چلا گیا۔ کیونکہ جنگ کے لیے وہ مقام زیادہ بہتر تھا۔

محمد بن قاسم نے پہلے ارور فتح کیا، اور پھر برہمن آباد پہنچا۔ جے سنگھ مقابلہ کے تمام انتظامات مکمل کر چکا تھا اور اپنے نامور سرداروں کو ذمہ دار بنا کر کسی جنگی ضرورت سے برہمن آباد سے باہر چلا گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے جنگ شروع کرنے سے پہلے شہر کے باشندوں سے کہا کہ مسلمان ہو جاؤ یا خراج دے کر اطاعت قبول کر لو۔ جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو اس نے محاصرہ کر کے جنگ کی ابتدا کر دی جے سنگھ کی فوج قلعہ میں بند بہادری سے مقابلہ کرتی رہی۔ اِس دوران میں جے سنگھ بھی واپس آ گیا۔ مگر وہ قلعہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کیونکہ چاروں طرف اسلامی لشکر تھا۔ اس نے باہر ہی خیمے گاڑ دیئے اور ناکہ بندی کر کے مسلمانوں کی رسد کا سامان بند کر دیا۔ محمد بن قاسم نے یہ دیکھ کر ایک فوج اس پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی۔ جے سنگھ کو شکست ہوئی، وہ اپنے بھائی گوپی کو اپنا نائب بنا کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک برہمن آباد کی فوج مقابلہ کرتی رہی۔ مگر وہاں کے باشندے گھبرا گئے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ نے مسلمانوں سے سازش کر کے قلعہ کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ مسلمان اندر داخل ہو گئے اور محمد بن قاسم نے عام امن کا اعلان کر دیا۔

برہمن آباد کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد گوپی ارور چلا گیا۔ وہاں کے باشندوں کو اُس نے یقین دلایا کہ راجہ داہر قتل نہیں ہوا بلکہ ہندوستان چلا گیا ہے، تاکہ وہاں کے راجاؤں کی مدد سے مسلمانوں کو سندھ سے باہر نکال دے۔ یہ بات سُن کر لوگوں نے زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ محمد بن قاسم ارور کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں کئی چھوٹے چھوٹے مقامات فتح ہوئے۔ ارور پہنچتے ہی محمد بن قاسم نے وہاں کا محاصرہ کر لیا۔ لوگ اس اُمید پر کہ راجہ داہر عنقریب

واپس آجائے گا، بڑی سرگرمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ جب محمد بن قاسم نے انہیں یقین دلایا کہ راجہ قتل ہو چکا ہے تو انہوں نے شہر کے دروازے کھول دیئے۔

اگر محمد بن قاسم نے صرف وہی کیا ہوتا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے تو اس کی شہرت کے لیے کافی تھا۔ لیکن جنگی کامیابیوں سے بھی زیادہ تعجب انگیز وہ نظم وضبط ہے، جو اس نوجوان فاتح نے قائم کیا۔ ایک دشمن ملک میں تین سال کے اندر ہی سندھی اور مسلمان اس طرح گھل مل کر رہنے لگے۔ جیسے صدیوں سے اکٹھے رہتے ہوں۔ اس کامیابی کا اصلی سبب محمد بن قاسم کی شرافت اور فراست ہے۔ اُس نے اہلِ سندھ کے ساتھ نہایت نرمی اور فیاضی کا برتاؤ کیا۔ اِن کے رسم ورواج میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جو انہیں ناپسند ہوتی۔ انہیں کامل مذہبی آزادی عطا کی۔ برہمنوں کے حقوق برقرار رکھے۔ نئے مندر بنانے کی بھی اجازت دے دی۔ غرض ان سے انتہائی رواداری کا برتاؤ کیا۔ نئی حکومت کے سایہ میں چھوٹے بڑے سب برابر ہو گئے۔ ملک بھر میں امن وامان کا دور دورہ تھا، اور ہر طرف ترقی ہو رہی تھی۔ محمد بن قاسم کو سندھ کے باشندے اتنا چاہنے لگے اور اس سے اتنا پیار کرنے لگے کہ جب معزول کر کے اسے گرفتار کیا گیا، تو لوگ بے اختیار رونے لگے۔ ایک جگہ تو لوگوں نے اس کی مورتی بھی بنالی اور مدتوں تک اُس کی پوجا کرتے رہے۔

محمد بن قاسم نہایت وجیہہ اور خوب صورت تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، اوسط درجہ کا قد، بدن چھریرا تھا، بازو گول، کلائیاں چوڑی اور تمام اعضاء متناسب تھے۔ رنگ سُرخ و سفید تھا۔ آواز گرج دار تھی۔ وہ بڑا پکا مسلمان تھا۔ ہر حال میں وہ مذہبی فرائض کی پابندی ضروری سمجھتا تھا۔ وہ اکثر اوقات فوجی اور ملکی انتظام میں مصروف رہتا تھا۔ مگر جتنا وقت بھی بچتا تھا وہ اسلام کی تبلیغ واشاعت میں صَرف کرتا تھا۔ اس کا نصب العین ہمیشہ یہی رہا کہ جس طرح ممکن ہو اسلام ترقی کرے۔

❁..........❁..........❁

جنرل محمود خاں

1857ء کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والی تمام دوسری شخصیتوں کی طرح جنرل محمود خاں کے حالات پر بھی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جنرل صاحب سے روشناس ہونے کے لیے صرف سرسید کی ایک کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' ہے۔اس کے علاوہ جس مورخ نے قلم اٹھایا وقتی مصالح کی بناء پر اسی کتاب سے استفادہ کیا۔ کیونکہ خوف تھا۔ کہ کہیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔

حد یہ کہ مصنف ''نجیب التوارخ'' جنہوں نے جنرل محمود خاں کے عروج وزوال کا پورا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اپنی تاریخ میں ان کے کارہائے نمایاں کے لیے صرف نصف صفحہ دے سکے اور وہ بھی سرسید کی کتاب سے خوشہ چینی کرنے کے بعد لیکن

من اندازِ قدت را می شناسم

انہیں مخالفانہ اور معاندانہ تحریروں کو پڑھ کر انکی کوہ وقار شخصیت اپنے اصلی خدوخال میں آسانی سے بے نقاب ہو جاتی ہے اور ایک گہرا اور دیرپا نقش چھوڑ جاتی ہے۔

جنرل محمود خاں کے تفصیلی حالات دانستہ منظر عام پر نہ لانے کی کوشش کا ثبوت نواب عبدالسلام خاں مصنف ''نسب افاغنہ'' کی ایک تحریر سے بھی ملتا ہے۔ جو مرحوم کی مرتبہ فہرست کتب موجودہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی میں نظر سے گزری۔ ''نجیب التوارخ'' کے خانہ کیفیت میں لکھتے ہیں:

''حالات تباہی خاندان (محمود خاں) زمانہ غدر اور بعض واقعی اعتراضات کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' مؤلفہ سرسید احمد خاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو

ناگوار واقعات کتاب مذکور میں درج تھے۔ یہ انتخاب کیا گیا مگر مرزا صاحب (نصیر محمد خاں برلاس) کو ہمت نہ ہوئی۔ کہ سر سید صاحب کی وجاہت کی وجہ سے اپنی کتاب لکھ کر چھپواتے۔ میری استدعا پر مجھے عنایت کی یہ انتخاب اس حالت میں نہیں ہے۔ کہ کوئی تصنیف بغیر دوسری کتابوں کی مدد کے مکمل ہو سکے۔

اس کتاب کے ساتھ ساتھ ایک روزنامچہ ضلع بجنور زمانہ غدر مرزا صاحب نے عنایت کیا۔ اس کا پتہ مجھے کچھ نہیں معلوم ہوا کہ اس کا مصنف کون ہے۔"

بہرحال اب جنرل محمود خاں کا حال سنیے۔

حسب ونسب

محمود خاں نجیب الطرفین یوسف زئی روہیلہ پٹھان تھے۔ نواب معین خاں عرف بھنو خاں ابن نواب ضابطہ خاں ابن نواب نجیب الدولہ کے لڑکے تھے۔ نجیب آباد ضلع بجنور کی کوٹھی مبارک محل میں پیدا ہوئے۔ اس محل اور نواب کی دوسری عمارتوں کے بارے میں مصنف نجیب التواریخ رقم طراز ہیں:

"راقم نے قبل از غدر جبکہ میری عمر 19 برس کی تھی سیر قلعہ اور مہتاب باغ کی کی تھی اور جس احاطہ میں تحصیل نجیب آباد اور تھانہ پولیس واقع ہے وہ محل سرائے نواب کی تھی۔ دروازہ نہایت عجیب اور باشوکت تھا۔ باغ میں ایک مکان مچھی بھون تھا۔ ایام گرما میں اس کی چھت سے باریک بوندیاں مینہ کی سی برسائی جاتی تھیں۔"

تعلیم وتربیت اور ابتدائی حالات

نواب بھنو خاں نے محمود خاں کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کیا۔ جب سنِ شعور کو پہنچے تو علاقے کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ ایک دوسری بیگم سے نواب بھنو خاں کے ایک اور صاحبزادے جلال الدین خاں مخاطب بخطاب محافظ الملک جلال الدین خاں بہادر تھے۔ والد کے

انتقال کے بعد دونوں بھائیوں میں تقسیم ترکہ کرتے وقت باہمی نزاع ہو گیا جو آخر تک قائم رہا۔ چنانچہ روشن الدولہ نواب محمد سعد اللہ خاں منصف اودھ جو نواب عبدالقادر خاں شہید کے متبنیٰ اور نواب بھنو خاں کے داماد تھے، تقسیم ترکہ کے لیے منحصر علیہ قرار پائے۔ انہوں نے کل جائیداد کے پانچ حصے قرار دے کر تین حصوں کا مالک نواب محمود خاں کو (اس سبب سے کہ وہ بڑے اور رئیس خاندان تھے) قرار دیا اور دو حصے جلال الدین خاں کو دیئے۔ بڑے بھائی کے حصے کی بیشی رنج و ملال کا باعث ہوئی۔ پھر بھی دونوں بھائی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ نواب محمود خاں فیاض اور فضول خرچ تھے۔ داد و دہش کے باعث ہمیشہ مقروض رہتے۔ یہاں تک کہ 1261ھ بمطابق 1845ء میں اپنی کثیر جائیداد نواب محمد سعید خاں بہادر والئے رامپور کے پاس مرہون کر دی۔ نواب محمود خاں نہایت خوش طبع یار باش اور مہمان نواز تھے۔ سپاہیانہ مزاج رکھتے تھے۔ شکار کا بہت شوق تھا۔ اکثر وقت اسی شغل میں بسر ہوتا۔ گولی کا نشانہ خوب لگاتے۔ انگریز حکام مرزا شاہ فرخ شاہزادہ دہلی اور کبھی کبھی مہاراجہ ہندوراؤ ساتھ ہوتے۔

غدر 1857ء اور جنرل محمود خاں کی حکومت

مئی سے لے کر جون 1857ء تک تمام ملک میں برٹش (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جوش و خروش کا ایک سیلاب تھا۔ جو امنڈ امنڈ کر اس کے اقتدار کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ عوام بغیر کسی امیر با اختیار کے ہر جگہ محمدی جھنڈا بلند کر کے جہاد کا اعلان کرتے تھے۔ کمپنی نے مغل بادشاہ کی جو توہین و تحقیر کی تھی اور اس کے اختیارات کم کرنے کے لیے جو پرفریب جال بچھایا تھا اس کا جواب ان کے خیال میں صرف یہ تھا کہ ایسے ناموافق حالات اس کے خلاف کروائے جائیں کہ بالآخر وہ رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہو جائے۔ اسی صورتِ حال کا اعادہ نجیب آباد میں بھی ہوا۔ مولوی منیر خاں کا چار سو جہادیوں کے ساتھ نجیب آباد آنا تھا کہ عوام میں انگریزوں کے خلاف سخت اشتعال پھیل گیا۔ ملا اخون یوسف کو مسلمانوں نے اپنا مرشد بنا کر جہاد کے لیے تیاری کی اور جلال آباد جا کر محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ احمد اللہ خاں اور محمد شفیع خاں بھی آ گئے۔

سرسید رقم طراز ہیں:

''مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹنے کی خبر سنتے ہی بجنور میں کسی کے دل میں عہدہ داروں کی دہشت باقی نہیں رہی۔ بڑا اندیشہ ہم کو حُکام انگریزی کا تھا۔ کیوں کہ یہ تلنگے ہندوستانیوں سے چنداں سروکار نہیں رکھتے تھے۔''

انگریزوں کا فرار

نجیب آباد میں حالات سرعت کے ساتھ بگڑ رہے تھے۔ سپاہ حاصل کرنے کی تمام کوششیں ناکامیاب ہو چکی تھیں۔ اس لیے انگریزوں نے خاموشی کے ساتھ بجنور کو خالی کر دیا۔ نواب شجاع لکھتے ہیں:

''کلکٹر نے سو آدمی نواب محمود خاں سے طلب کیے اور نواب سے کہا کہ ہم بسبب ہنگامہ پردازوں کے یہاں سے میرٹھ جاتے ہیں اور ضلع کا بندوبست بوجہ قدیم رئیس ہونے کے تمہارے سپرد کیا جاتا ہے۔ انتظام ضلع کا کرو۔''

انگریزوں کے چلے جانے کے بعد، سرسید لکھتے ہیں:

''اس وقت تمام ضلع کی نظر محمود خاں پر تھی جو گرد و پیش کی فضاء سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔''

خود سرسید بھی ہوا کا رُک پلٹتے ہی جنرل صاحب کے موافقین میں شامل ہو کر ان کی خیر خواہی کا دم بھرنے لگے۔

چنانچہ نواب شجاع اللہ خاں رقم طراز ہیں:

''سید احمد خاں آئے اور محمود خاں سے کہا کہ آپ کو خوب معلوم ہے۔ کہ ڈپٹی رحمت خاں ہندو چودھریوں کو ضلع سپرد کرائے دیتے تھے۔ لیکن مَیں نے کوشش کر کے آپ کے سپرد کرا دیا اور بلا شرکت آپ کو رئیس کرا دیا۔''

اعلان امارت

5 جون 1857ء کو نجیب آباد میں جنرل صاحب نے اپنی امارت کا اعلان کیا۔ احمد اللہ خاں نے نجیب آباد کے باہر محمدی جھنڈا اٹھایا اور جلال آباد کے قریب مورچہ لگایا۔ ان کے ساتھ شفیع

اللہ خاں بھی درستی سامان جنگ میں مصروف تھے۔ اس وقت ان کے پاس چار ہزار آدمی ملازم تھے۔ تمام ضلع میں نواب محمود خاں کی بے کھٹکے حکومت قائم ہوگئی اور ان کے جملہ مشیر انتظام ضلع کی طرف متوجہ ہو گئے۔ احمد اللہ خاں مختار کل قرار پائے۔ اس کے دھام پور پہنچنے پر سب ہندو اور مسلمان اس سے متفق ہوئے اور ہر طرح اس کی اطاعت اختیار کی۔ بقول مصنف گزیٹر ضلع بجنور، یکا یک لوگوں کی قسمت ایک ایسی متشدد پارٹی کے ہاتھ میں آگئی جو اسلام کی ماننے والی اور تخت دہلی سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتی تھی۔ ایک بہادر پٹھان سردار ماڑے خاں کی سرکردگی میں بھی ایک فوج بنائی گئی تھی۔

شاہ دہلی کی اطاعت

محمود خاں نے 12 جولائی کو محمد خاں کے ہاتھ ایک عرضداشت دہلی روانہ کی۔ اس کے جواب میں بہادر شاہ نے امیر الدولہ ضیاء الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ کا خطاب مرحمت فرمایا۔ یہ بھی تحریر کیا کہ تم نے جو حال ضلع اور پرگنوں کی بدنظمی کا لکھا ہے اس کا انتظام کرو۔ تمہارے باپ دادا کے حال پر بادشاہان دہلی کی مہربانی رہی ہے۔ خزانہ کا حال بھی لکھ کر روانہ کرو۔

''تم ہمارے دولت خواہ ہو۔ تین مغل شہزادے بھی دہلی سے نجیب آباد آئے۔''

اس دوران میں جنرل صاحب اندرونی ملکی و مالی انتظام میں اس درجہ منہمک رہے کہ انگریزوں کے پٹھو ڈپٹی رحمت خاں کی موجودگی کو چنداں اہمیت نہیں دی۔ ڈپٹی رحمت خاں خیر خواہی کے پردے میں ہندو چودھریوں کو ان کے خلاف بغاوت کرنے پر ابھار رہے تھے۔

یہ ہی وہ فتنہ تھا جو آگے چل کر محمود خاں کی حکومت کے لیے سب سے بڑا خطرہ اور انگریزی حکومت کے دوبار قیام کا سبب بنا۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن کرد آنچہ آشنا کرد

سرسید لکھتے ہیں کہ:

''درحقیقت خفیہ خط و کتابت جان کرافٹ ولسن بہادر سے تھی۔ محمود خاں انگریزوں کی اس چال کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ اس لیے وہ بدستور ڈپٹی رحمت خاں بہادر سے سرد مہری سے پیش آتے تھے۔''

چنانچہ سرسید رقم طراز ہیں کہ:

"5 جون کو تیسری مرتبہ محمود خاں نے ہنگامہ برپا کرنا طے کیا۔ مَیں اسی وقت محمود خاں کے پاس گیا جو پٹھانوں کے غول میں بیٹھا ہوا تھا۔ مَیں نے اس سے کہا مجھ کو کچھ علیحدہ عرض کرنا ہے۔ اس نے عجب غرور سے کہا یہاں کون غیر بیٹھا ہے۔ سب اپنے بھائی ہیں۔ مگر میرے اصرار پر اٹھ آیا۔"

محمود خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے چودھریوں کی جماعت پر بدستور سابق پدرانہ شفقت جاری رکھی اور احمد اللہ خاں نے مندروں پر پہرے لگوا دیئے۔ تا کہ کوئی مسلمان ان کو گزند نہ پہنچائے۔ جس سے آپس میں جھگڑے کی صورت پیدا ہو۔ آخر کیوں نہ ہو یہ لوگ نواب نجیب الدولہ جیسی پر عظمت شخصیت کے نام لیوا تھے۔ جن کے بارے میں مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی لکھتے ہیں:

"نواب نجیب الدولہ نے نجیب آباد کے بازار خاص میں کوئی مسجد تعمیر نہیں کی۔ کہ مبادا ہندو دوکانداروں کو تکلیف ہو۔ نیز جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ تو قبر کے لیے جو جگہ تجویز ہوئی وہ ایک ہندو جاٹ کی ملکیت تھی۔ اس نے انکار کر دیا۔ تو دوسری جگہ تجویز ہوئی۔ وہ بھی کسی ہندو کی تھی۔ اِسی طرح معلوم ہوا کہ تمام موالی ہندوؤں کو عطا کیے ہوئے ہیں۔ مجبور ہو کر نواب نے کہا چلو جنازہ مانسری لے چلیں۔ آخر ایک ہندو کو رحم آیا اور اس نے اجازت دی کہ مقبرہ اس کی زمین پر بنایا جائے۔"

یہ ہی وہ چودھری تھے جن کو بلاوجہ مشتعل کر کے انگریزوں کے حامیوں نے ہلدور میں مسلمانوں کا قتلِ عام کرایا۔ سرسید لکھتے ہیں:

"قبل طلوع آفتاب سے شام تک مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا اور اس کے بعد تمام مکانات جلا دیئے گئے۔ کوئی گھر باقی نہیں بچا۔"

لیکن سیر چشمی اور وسیع القلبی میں محمود خاں اپنے پردادا نجیب الدولہ کے قدم بہ قدم تھے۔ چودھریوں کے خلاف کوئی منتقمانہ کارروائی عمل میں لانے کی انہوں نے اجازت نہیں دی۔ حالانکہ مسلم عوام بہت زیادہ مشتعل تھے۔

سرسید لکھتے ہیں:

''چاند پور میں اس سے زیادہ مصیبت دیکھنی تھی۔ جب وہاں پہنچے اور مسلمانوں کو معلوم ہوا تو صدہا آدمی گنڈاسہ، تلوار، بندوقیں لے کر چڑھ آئے اور سب بلوائی پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ چودھریوں نے سازش کر کے مسلمانوں کو مروا دیا۔ مسلمانوں کو ذبح کرایا۔ اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔''

لیکن آفرین ہے جنرل صاحب پر جن کی ہمت بلند نے چودھریوں اور رحمت خاں سے کوئی باز پرس نہیں کی اور اصلی دشمن کو بیخ وبُن سے اُکھاڑنے پر ہی اپنی تمام تر توجہ مبذول رکھی۔

نجیب آباد اور اس کے نواح کا بخوبی انتظام کرنے کے بعد جنرل صاحب نے اپنی کثیر التعداد فوج کو امروہہ، مراد آباد، بریلی اور اودھ روانہ کیا۔ جہاں علماء اور مجاہدین اپنے خون سے ہولی کھیل کر ایک فیصلہ کن جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کی فوج کو بالعموم نجیب آبادی تلنگے کہا جاتا تھا۔

چنانچہ جب امروہہ میں سیدوں نے بغاوت کا عَلم بلند کیا تو سید گلزار علی صاحب ہلدور گئے اور مجاہدین کی کافی تعداد لے کر امروہہ آئے اور اعلان کیا کہ ''ماڑے خاں بھی آئیں گے۔''

فیروز شاہ نے جب مراد آباد کا محاصرہ کیا۔ تو ان کے ہمراہ نجیب آباد کی فوج تھی۔ مولوی منشی قربان علی ساکن دھام پور اپنے معتقدین کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ لکھنؤ گئے اور احمد اللہ شاہ کے ساتھ مصروف کارزار رہے۔ مصنف قیصر التواریخ رقمطراز ہے۔

''گرمی صاحب ظالموں کو ہلاک کرنے میں پتھر سے زیادہ سخت اور فولاد سے زیادہ کٹھور تھے۔''

اس قومی بدنصیبی اور ہولناکی کے زمانے میں عوام پر یہ مظالم کچھ تعجب خیز نہ تھے۔ ان کے سرتاج شہنشاہ ہند بہادر شاہ تک رنگون کی قید فرنگ اور جلاوطنی کی حالت میں جب کہ ان کے پوست واستخوان پر سایہ کا گمان ہوتا تھا، دل ہلا دینے والے مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے۔

ایک انگریز پارلیمنٹ رقمطراز ہے:

''مَیں نے بہادر شاہ کو ایک کھرّی چارپائی پر پڑا ہوا دیکھا۔ ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا ٹاٹ انہوں نے اوڑھ رکھا تھا۔ اوپر کے ٹاٹ کو ہٹا کر اپنے بازو دکھائے جو بے فرش کی چارپائی پر پڑے رہنے کے باعث زخمی ہو گئے تھے اور زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے۔''

92

محمود مصلح

محمود مصلح 1808ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس وقت عثمانی خلافت کی حالت بہت نازک تھی۔ ایک طرف روس سے جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ دوسری طرف مختلف صوبوں کے حاکم اپنے اپنے علاقوں میں خود مختاری کے نشان لہرا رہے تھے۔ ان میں دو شخصوں نے بڑی طاقت حاصل کر لی تھی۔ ایک تو مصر کا حاکم محمد علی پاشا، دوسرا البانیہ کا والی علی پاشا۔ اتفاقاً انہیں دنوں روس پر فرانس نے حملہ کر دیا۔ اس لیے اسے مجبور ہو کر ترکی سے صلح کر لینی پڑی۔ اب سلطان نے باغی صوبیداروں کی طرف توجہ کی۔ کئی سال کے معرکوں کے بعد علی پاشا تو مارا گیا۔ لیکن محمد علی پاشا قابو نہ آیا۔

ینی چری بڑے خودسر تھے۔ بادشاہوں کو تخت پر بٹھانا اور اتارنا ان کے لیے روز کا کھیل تھا۔ سلطان محمود کے زمانے میں بھی انہوں نے بغاوت کی۔ وہ ان گستاخوں کو سزا دینے کے لیے مدت سے چپکے چپکے تیاریاں کر رہا تھا۔ فوراً علم لہرا کر باغیوں پر بزن بول دیا۔ بہت سے ینی چری مارے گئے اور ان کی بارکیں توپوں سے اڑا دی گئیں۔ جو باقی بچے انہیں سزائے موت دی گئی۔ اس طرح ینی چریوں کا نام و نشان بالکل مٹ گیا۔

سلطان نے ان کی جگہ نئی فوج بھرتی کی۔ جس کا انتظام یورپ کی دوسری فوجوں کے طریقہ پر کیا گیا۔ ملکی انتظام کے دوسرے صیغوں میں بھی اصلاحیں ہوئیں اور ان اصلاحوں کے ساتھ ساتھ ترکوں کا لباس بھی بدلا۔ یعنی شلوار کی جگہ پتلون اور عمامہ کی جگہ ٹوپی نے رواج پایا۔

سلطان محمود بڑا قابل اور عقل مند حکمران تھا اور اگر اسے چند سال اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع ملتا تو ترکی کی حالت بہت سدھر جاتی لیکن دشمنوں نے چین نہ لینے دیا۔ ابھی اُس

نے ملکی انتظام کی طرف توجہ کی ہی تھی کہ یونان نے بغاوت کر دی اور یورپ کے اکثر ملکوں کے لوگ مذہبی ہمدردی کے جوش میں یونانیوں کی مدد کو پہنچنے لگے۔ اگر چہ پہلے پہل یورپ کی سلطنتیں چپ چاپ لڑائی کا تماشا دیکھتی رہیں لیکن دراصل ان سب کے دل یونان کے ساتھ تھے۔ چنانچہ جب یونانیوں کو کئی لڑائیوں میں شکست ہوئی۔ تو روس، فرانس اور برطانیہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ روس نے تو جنگ کا اعلان کر دیا اور برطانیہ اور فرانس نے سلطان پر ایسا دباؤ ڈالا کہ اسے مجبور ہو کر ان کی بات ماننی پڑی۔ یعنی یونان کو آزاد کر دیا۔

اَب مصر کے حاکم محمد علی پاشا نے بڑا زور باندھا۔ یورپ کی سلطنتیں تو اس خیال سے ایسے موقعوں کے انتظار میں رہتی تھیں کہ اس چھینا جھپٹی میں شاید عثمانی سلطنت کا کوئی ٹکڑا ہمارے ہاتھ بھی آ جائے۔ فرانس نے محمد علی پاشا کا ساتھ دیا۔ انگلستان نے ترکی کی حمایت کی اور محمد علی پاشا کو روکنے کے لیے اپنا جنگی بیڑا بھیج دیا۔ ابھی اس جھگڑے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ سلطان محمود مصلح نے اکتیس سال حکومت کر کے انتقال کیا۔ اور اس کی موت کے ساتھ ہی ترکی کے ابھرنے اور طاقت حاصل کرنے کی امیدیں ملیامیٹ ہو گئیں۔

❀............❀............❀

93

مُرادِاعظم

مُرادِاعظم الجزائر کے آخر زمانے کے امراءِ بحر میں سب سے زیادہ تجربہ کار، نڈر اور اولوالعزم تھا۔ مُرادِاعظم کی رگوں میں یورپین خون تھا۔ یہ البانیہ کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ بچپن میں اس نے اسلام قبول کرلیا۔ الجزائر کے گورنر مصطفیٰ پاشا نے اس کی پرورش کی۔ یہ بارہ برس کا تھا کہ اس نے اپنے محسن و مربی کو اپنی دلیری اور جرأت کا ثبوت دیا۔

مالٹا کے بحری محاصرے میں یہ مصطفیٰ پاشا کے بہت کام آیا۔ یہ جنگ کے زمانہ میں جاسوس بن کر سمندر میں اِدھر اُدھر تاک میں پھر رہا تھا کہ اس کی چھوٹی سی کشتی چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ مُرادِاعظم کو اس بات سے غیرت آئی کہ واپس جا کر اپنے محسن و مربی کو کیا جواب دے گا۔

یہاں سے وہ الجزائر آیا اور ایک کشتی لے کر شکار کی تلاش میں نکلا۔ بربر کے ناتجربہ کار اور نوآموز بحری سپاہی اسپین کے ساحل کو تختہ مشق بنایا کرتے تھے۔ مُرادِاعظم نے اس چھوٹی سی کشتی سے تقریباً ڈیڑھ سو آدمی گرفتار کیے۔ اب تک بربر کے کسی کپتان نے سمندر کے اندرونی حصوں میں سفر نہ کیا تھا۔ لیکن مراد اعظم ایک دفعہ بحرِ ظلمات میں اس قدر دور نکل گیا کہ زمین نظر سے غائب ہوگئی۔ راستے میں جزیرہ الترا روٹ پر جو افریقہ کے مغرب میں جزائر کیزی میں سے ہے، حملہ کیا اور شہر اور گورنر کے محل سرا کو لُوٹ لیا۔

اِسی طرح اس نے 1589ء میں ایک دفعہ مالٹا کے پاس دورہ کرتے ہوئے کسی قوم کے دو تین تجارتی جہاز پکڑ لیے اور ان کو لے کر الجزائر کو لَوٹا۔ اِدھر مالٹا کے بحری لیٹروں نے ترکی کے دو جہاز پکڑ لیے اور انہیں مالٹا لے آئے۔ ان سے راستہ میں مقابلہ ہوا۔ اس زمانے میں صلیبی جھنڈا جہاز رانوں کے لیے موت کا پیغام ہوتا تھا لیکن مُرادِاعظم اس دل گردے کا آدمی نہ تھا کہ ڈر

کر بھاگ جاتا۔ وہ بلا خوف وخطر دشمن کے جہاز پر عقاب کی طرح جھپٹتا۔ جہاز کو پکڑ کر قبضہ میں کر لیا۔ آگے بڑھا تو جزیرہ مجارکا کے لٹیرے جہازوں سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ اُس نے ان جہازوں کو بھی پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے کر فاتحانہ شان سے الجزائر کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ الجزائر کے باشندوں نے بڑی خوشیاں منائیں۔ الجزائر میں چراغاں کیا گیا۔ لوگوں نے مراد کو "اعظم" کا خطاب دیا اور امیر البحر منتخب کیا۔ امیر البحر بننے کے بعد مُرادِ اعظم نے جہاز رانی میں کمال پیدا کیا۔

1594ء میں چار ہلکے کشتی نما جہاز لے کر سمندر کا دورہ کیا۔ راستے میں بحری لٹیروں کے جہاز دکھائی دیئے۔ اُس نے اپنے جہازوں کے مستول گرا کر ان کو الگ کر دیا۔ یورپ کے ڈاکو جہازوں نے یہ سمجھا کہ تجارتی جہاز ہیں۔ وہ خوشی خوشی ان کی طرف بڑھے۔ مقابلہ ہوا۔ مرادِ اعظم نے سمندری لٹیروں کا اچھی طرح صفایا کیا اور اُن کے جہازوں پر قبضہ کر لیا۔

مُرادِ اعظم نے بحیرۂ روم میں ترکوں کے بحری بیڑے کی تنظیم کی اور اُسے ترقی بھی دی۔

انہوں نے صلیبی بحری سپاہیوں سے کئی دفعہ مقابلے کیے۔ جس میں اُسے کامیابی نصیب ہوئی۔

مُرادِ اعظم نے تراسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ وہ بڑا بہادر، نڈر اور اولوالعزم امیر البحر تھا۔

❀.........❀.........❀

مراد چہارم

جب مراد کے سر پر تاج سلطانی رکھا گیا تو اس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ کچھ عرصہ تک تو اس کی ماں جو بڑی عقل مند خاتون تھی حکومت کا کاروبار چلاتی رہی۔ پھر نوجوان سلطان جو تخت نشینی کے زمانے سے برابر حکومت کے معاملات پر نظر رکھتا تھا خود سلطنت کا انتظام کرنے لگا لیکن فوج کے سامنے کسی کی پیش نہ چلتی تھی۔ ایک دفعہ ساری فوج بگڑ کھڑی ہوئی اور وزیر اعظم کو سلطان کی آنکھوں کے سامنے قتل کر ڈالا۔ اب تک تو مراد نے اپنے سپاہیوں کی دلجوئی میں کوئی کمی نہیں کی تھی لیکن وزیر کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر ضبط کی طاقت نہ رہی اور تھوڑے سے جاں نثار سمیٹ باغیوں پر حملہ کر دیا۔ سلطان کو ننگی تلوار ہاتھ میں لیے فوج کے آگے دیکھ کر بہت سے لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ باغی سپاہی اس کثرت سے مارے گئے کہ آبنائے باسفورس میں لاشیں ہی لاشیں نظر آنے لگیں۔

جب ہر طرف امن و امان ہو گیا تو مراد نے تلوار نیام میں کی اور حکومت کے انتظام کی طرف متوجہ ہوا۔ جن محکموں میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں بددیانت اور نالائق اہل کاروں سے پاک کر کے ان کی جگہ لائق اور بھروسے کے آدمی مقرر کیے۔ اِدھر سے فارغ ہو کر ایشیائے کوچک کا رُخ کیا۔ اور اس علاقے کے سرکشوں کو زیر کر کے سخت سزائیں دیں۔ یہاں سے بغداد کی طرف بڑھا اور ایرانیوں کو شکست دے کر اس شہر کو گھیر لیا۔ مراد نے بغداد کے محاصرہ کا سارا انتظام خود کیا تھا۔ وہ خود خندقیں کھودتا۔ خود حملہ کے لیے حکم احکام جاری کرتا اور سپاہیوں کے دل بڑھاتا تھا۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق بغداد سے ہر روز ایرانی سپاہی ایک ایک کر کے نکلتے اور ترکوں کو اپنے مقابلے میں بلاتے تھے۔ ایک دفعہ ایرانیوں نے اپنی طرف کے ایک نامی شہسوار کو بھیجا جو بڑے قد وقامت کا جوان تھا۔ ادھر سے مراد خود اس کے مقابلہ پر نکلا۔ اور ایسی دودستی تلوار ماری جو سر کو چیر کر ٹھوڑی تک اُتر آئی۔ آخر ایرانی ترکوں کے حملوں کی تاب نہ لا سکے اور مراد نے آسانی سے بغداد فتح کر لیا۔

سلطان مراد اس فتح کے بعد یورپ پر لشکر کشی کی تیاریاں کر رہا تھا کہ موت کا پیغام آ گیا اور یہ لہلہاتا ہوا پھول عین بہار کے موسم میں گر پڑا۔ موت کے وقت مراد کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔

❀............❀............❀

95

غازی مصطفےٰ کمال پاشا

عثمانی ترکوں نے ٹرکی پر ساڑھے چھ سو سال حکومت کی۔ تین سو سال تو انہوں نے وہ شان وشوکت دکھائی کہ ساری دنیا انہیں عزت واحترام سے دیکھتی تھی۔ اس کے بعد حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہونے لگیں۔ اٹھارہویں صدی میں ٹرکی کی حالت بہت خراب ہوگئی اور یورپ کی دوسری حکومتیں ٹرکی کو یورپ کا ''مرد بیمار'' کہنے لگیں۔ یہ طاقتیں ٹرکی کے خاتمے کے انتظار میں تھیں۔ اُس وقت سلطان عبدالحمید ملک پر حکومت کرتا تھا۔ اُس کی موت کے بعد ہر طرف بغاوتیں اور شورشیں شروع ہوگئیں روس ہاتھ پاؤں پھیلانے لگا۔ یہاں تک کہ ٹرکی سے جنگ چھڑ گئی۔ آخر 1878ء میں برلن میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس کی رو سے ٹرکی کے پاس یورپ کا صرف تھوڑا سا علاقہ رہ گیا یہ ایک ایسا دھچکا تھا جس سے ترک چونک اُٹھے۔ لوگ حکومت سے بیزار ہوگئے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام ''انجمن اتحاد وترقی'' رکھا۔ اس کا مقصد لوگوں میں وطن کی سچی محبت پیدا کرنا اور حکومت میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں انہیں دُور کرنا تھا۔ 1914ء میں پہلی جنگ عالمگیر شروع ہوگئی۔ اس میں جرمنی، آسٹریا اور ٹرکی ایک طرف تھے اور روس، برطانیہ اور فرانس دوسری جانب یہ جنگ چار سال تک جاری رہی۔ آخر 1918ء میں جرمنی اور اس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح عرب فلسطین اور عراق جن پر ترکوں کی حکومت تھی اُن کے قبضے سے نکل گئے۔ مصر پہلے ہی برائے نام ان کے ماتحت تھا۔ اب وہ تعلق بھی ختم ہوگیا۔ ایشیائے کوچک اور یورپ سے بھی ترکوں کا اقتدار اُٹھ گیا۔ ایسی حالت میں کہ ٹرکی حکومت کا خاتمہ ہورہا تھا ایک ترک مجاہد قسطنطنیہ سے اناطولیہ پہنچا اور چند ساتھیوں کو اکٹھا کر کے ملک وقوم کو بچانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ یہ اس کی شجاعت اور تدبر کا نتیجہ ہے کہ آج ٹرکی یورپ کی بڑی طاقتوں

میں شمار ہوتا ہے۔ اِس ترک مجاہد کا نام نامی مصطفیٰ کمال پاشا تھا جسے ترک اُتا ترک، یعنی اپنا باپ کہہ کر کے یاد کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

مصطفیٰ کمال پاشا کے باپ کا نام علی رضا آفندی تھا۔ وہ ایک غیر معروف آدمی تھا۔ مصطفیٰ کمال 1880ء میں سالونیکا میں پیدا ہوئے۔ علی رضا چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا مولوی بنے۔ مگر اُس خواہش کے پورا ہونے سے پہلے ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی والدہ زبیدہ خانم اپنے بیٹے کے ساتھ سالونیکا کے قریب ایک گاؤں میں چلی گئیں جہاں ان کا ایک عزیز رہتا تھا۔ یہاں مصطفیٰ کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کریں۔ انہوں نے یہ کام بڑی محنت اور چستی سے انجام دیا۔ ایک دن ان کی والدہ کو خیال آیا کہ اس طرح تو اُن کے بچے کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ اُن کی خالہ کی کوشش سے مصطفیٰ کمال کو ایک فوجی مدرسے میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں اُن کی بہادری اور قابلیت کے جوہر کھلے۔ یہیں اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ٹرکی کو یورپ کی قوموں کے پنجۂ استبداد سے چھڑائیں گے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سلطان عبدالحمید کو تخت سے اتار دیا جائے۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے کالج میں انجمن اتحاد وطن کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور انجمن کی طرف سے ایک اخبار بھی نکالا۔ جس میں انہوں نے بڑے زوردار مضمون لکھے۔ جب حکومت کو اس کی خبر ہوئی تو بہت سے نوجوانوں کو جن میں مصطفےٰ کمال بھی تھے گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن چند ہفتوں کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا اور سلطان کے حکم سے کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ بھیجا جاتا رہا اور آخر سالونیکا میں تبادلہ ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سلطان کو معزول کر دیا گیا اور انجمن اتحاد و ترقی نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مصطفیٰ کمال کو اگرچہ اس انجمن کی بعض باتوں سے اختلاف تھا، لیکن جب انہیں جنگی وزارت میں ایک عہدہ پیش کیا گیا، تو انہوں نے قبول کر لیا۔

مصطفےٰ کمال یہ چاہتے تھے، کہ اس عہدے سے فائدہ اٹھا کر کوئی بڑا کام کریں۔ اتنے میں جنگ بلقان شروع ہو گئی اور ٹرکی پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بلغاری فوجوں نے ٹرکی کے مشہور شہر ایڈریانوپل (اُدرنہ) کا محاصرہ کر لیا اور قلعوں پر قلعے فتح کرتی ہوئیں دارالخلافت کے قریب پہنچ گئیں۔ یونانیوں نے مقدونیہ کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ٹرکی کے پاس یورپ کا صرف

تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا۔ مگر انور پاشا اور کمال پاشا کی جنگی تدبیروں نے اس شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ یہ جنگ ختم ہوئی تو 1914ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔

اس لڑائی میں جیسے پہلے بتایا جا چکا ہے، جرمنی، آسٹریا اور ترکی ایک طرف تھے اور برطانیہ، روس اور فرانس دوسری طرف، انہیں "اتحادی" کہا جاتا تھا۔ اتحادیوں نے اپنی بحری برتری کو قائم رکھنے کے لیے درّہ دانیال پر حملہ کر دیا۔ ابتدا میں اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی اور ترکوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر جلد ہی ترکوں کے جوابی حملوں سے اتحادی فوجوں کے چھکے چھوٹ گئے اور انہیں کئی شکستیں ہوئیں ان شکستوں کے بعد اور اتنا نقصان اٹھا کر اتحادیوں کو معلوم ہو گیا کہ جب تک جزیرہ نما گیلی پولی کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر فوجیں نہ اتاری جائیں گی، درّہ دانیال کا فتح کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے بہت بڑی تعداد میں اپنی بہترین فوجیں گیلی پولی کے ساحل پر اتار دیں اور تین چار حملوں کے بعد ایک بڑی اچھی جگہ قبضہ کر کے چناق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ چناق درۂ دانیال کی کنجی تھی اور درۂ دانیال پر قبضہ کرنا گویا قسطنطنیہ پر قابض ہو جانا تھا۔

اس نازک موقعے پر اس محاذ کی کمان مصطفیٰ کمال کے سپرد ہوئی۔ انہوں نے ترکی فوجوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور ترک سپاہیوں نے بھی ایسی شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ لڑائی کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ آخر مصطفیٰ کمال نے اتحادیوں کو گیلی پولی کے محاذ پر نہایت عبرت ناک شکست دی جس نے مصطفیٰ کمال کی فوجی قابلیت کو چار چاند لگا دیئے۔

اس جنگ کے دوران میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جس سے کمال اتاترک کی بہادری اور جرأت پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ وہ اس روز ایک خندق کے پاس کھڑے تھے کہ دشمن کی ایک توپ کے گولے اُن کے پاس آ کر گرنے لگے۔ مگر انہوں نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ ان کے ماتحت افسروں نے کہا کہ یہاں کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔ آپ یہاں سے ہٹ جائیں۔ یہ سن کر انہوں نے جواب دیا کہ اگر میں یہاں سے ہٹ جاؤں تو میری فوج کے سپاہی اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ افسر کو اپنے ماتحتوں کے لیے مثال قائم کرنی چاہیے۔

اس کے بعد مصطفیٰ کمال کو روسی محاذ پر بھیجا گیا۔ انہی دنوں میں روس میں زار کی حکومت کا

تختہ اُلٹ دیا گیا تھا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر مصطفیٰ کمال نے روسیوں سے کئی علاقے واپس لے لیے۔ ابھی وہاں سے پوری طرح فراغت نہ ہوئی تھی کہ انہیں شام کے محاذ پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پہنچ کر ان کے فوجی وزارت کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے اور انہیں طویل رخصت مل گئی۔

1918ء میں جرمنی اور اُس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور عارضی صلح کی شرطوں کے مطابق ٹرکی کی فوجیں غیر مسلح کر دی گئیں۔ ٹرکی کی ساری سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور ترکوں کے پاس یورپ اور ایشیا کا تھوڑا سا علاقہ باقی رہ گیا اتحادیوں کا خیال تھا کہ ٹرکی اب کوئی دن کا مہمان ہے اور انہوں نے اُس کے حصے بخرے آپس میں بانٹنے شروع کر دیئے۔ انگریزوں نے عارضی طور پر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ کچھ علاقے اٹلی اور فرانس نے ہتھیا لیے۔ یونانیوں کو ان کی خدمت کا صلہ دینا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ انہیں سمرقند پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ یونانی فوج برطانوی، فرانسیسی اور امریکی جنگی جہازوں کے ساتھ سمرنا پہنچی اور اُس نے ساحل سے اترنے کے بعد فوراً ہی قتل عام اور غارت گری شروع کر دی۔ سمرنا کے بعد یونانی آگے بڑھے اور مکانوں کو آگ لگاتے، لوٹ مار کرتے اور عورتوں کی بے عزتی کرتے ہوئے دُور دُور تک پھیل گئے۔

اس وقت مصطفیٰ کمال اناطولیہ پہنچ گئے۔ لوگ سرفروشی کے لیے تیار تھے اور جگہ جگہ وطن کی آزادی کی خاطر انجمنیں قائم ہو رہی تھیں۔ مصطفیٰ کمال نے ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوجی تنظیم شروع کر دی۔ لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ انہیں اتفاق و اتحاد کے رشتے میں جوڑا۔ ٹوٹی پھوٹی توپوں اور ناقص ہتھیاروں کی مرمت کی۔ قوم نے بھی جنگ آزادی کے لیے مصطفیٰ کمال کو اپنا لیڈر چن لیا اور انگورہ جسے آج کل انقرہ کہتے ہیں جنگِ آزادی کا مرکز بنایا۔

اِسی اثناء میں اناطولیہ کی ترکی فوج جو جنرل کاظم قرہ بکر پاشا کے ماتحت تھی کمال اتاترک سے آملی۔ اس سے کمال اتاترک کی فوجی سرگرمیوں کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس کے علاوہ ترکوں کے بڑے بڑے جرنیل بھی ملک کے مختلف گوشوں سے اناطولیہ پہنچ گئے۔ ان میں رؤف بے، عصمت انونو پاشا اور فوزی پاشا بڑے مشہور تھے۔

یونانی فوجیں سمرقند پر قبضہ کرنے کے بعد اندرونی علاقے کی طرف بڑھ رہی تھیں ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی اور یہ جدید ہتھیاروں اور فوجی سامان سے پوری طرح لیس تھیں۔

یونانی اپنی ابتدائی کامیابی کے نشے میں یلغار کرتے ہوئے انگورہ سے چالیس میل دُور رہ گئے۔ ان کے تین لاکھ سپاہی ستر میل لمبے محاذ پر پھیل گئے۔ لیکن مصطفیٰ کمال ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے خفیہ طور پر پوری تیاری کر رکھی تھی۔ انگورہ کے قریب ہی بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ جس کو جنگ سقاریہ کہتے ہیں۔ سقاریہ ایک دریا ہے۔ جو سمرنا کے پہاڑی علاقے میں بہتا ہے۔ متواتر اکیس روز خوں ریز جنگ ہوتی رہی اور بائیسویں روز اس کا فیصلہ ہو گیا۔

یہ جنگ دنیا کی دس بڑی جنگوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے۔ مصطفیٰ کمال کی غیر معمولی جنگی قابلیت اور ترک سپاہیوں کی بہادری سے یونانیوں کو سخت شکست ہوئی۔ ایک ایسی ذلت آمیز شکست کہ ان کے پاؤں پھر کہیں نہ جم سکے اور انہیں ہمیشہ کے لیے سمرنا سے نکل جانا پڑا۔

اس عظیم الشان فتح سے ترکوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ انگریزوں کو سخت پریشانی ہوئی۔ انہوں نے چاہا کہ کسی طرح مصطفےٰ کمال کو ان کی کوششوں میں ناکام رکھیں چنانچہ ان کے کہنے سے سلطان عبدالحمید نے مصطفیٰ کمال پاشا کو دارالخلافہ میں طلب کیا۔ مگر انہوں نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔

اس حکومت کو جو اتحادیوں کے رحم و کرم پر تھی اور ترکوں کی جنگِ آزادی کے خلاف تھی، ختم کرنے کے لیے سیواس میں ایک مجلس منعقد کی گئی جس میں مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے ساتھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ٹرکی میں بادشاہت کی بجائے جمہوریت قائم کی جائے اور مصطفیٰ کمال کو اس کا پہلا صدر مقرر کیا گیا۔ اس اعلان کو سنتے ہی سلطان نے مخالفت کی۔ مصطفےٰ کمال کو باغی قرار دیا۔ مگر آزادی کی تحریک برابر جاری رہی۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اٹلی اور فرانس خود بخود ترکی کے علاقے چھوڑ گئے اور آخر میں اتحادیوں نے بھی قسطنطنیہ خالی کر دیا اور اس طرح سے سارا ملک مصطفیٰ کمال کے قبضے میں آ گیا۔ انہوں نے اس کام کی تکمیل کے بعد ملکی انتظامات کی طرف توجہ کی اور اپنی اَن تھک کوششوں سے ٹرکی کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے برابر لا کھڑا کیا۔ ان کی فتوحات بھی تعجب انگیز تھیں اور ان کے ملکی و ملّی کارنامے بھی حیرت خیز تھے۔

انہوں نے پندرہ سولہ سال کی قلیل مدت میں ٹرکی کو نیا جنم دیا۔ اس میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ جگہ جگہ سکول کھل گئے، کالج قائم ہو گئے۔ جن میں لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے پڑھنے

لگے۔ پرانی سڑکوں اور پلوں کی مرمت کی گئی۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نئی سڑکوں کا جال بچھ گیا۔ تجارت اور صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لیے سینکڑوں کارخانے بنائے گئے۔ جن میں ضروریات زندگی تیار ہونے لگیں اور ترک بیرونی ملکوں کے محتاج نہ رہے۔ انہوں نے انقرہ کے چھوٹے سے قصبے کو اتنی ترقی دی کہ آج وہ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

یونان، بلغاریہ اور بلقان کی دوسری ریاستوں میں بہت سے ترک خاندان آباد تھے۔ جن کے افراد کی تعداد لاکھوں تک تھی۔ مصطفیٰ کمال نے اُن سب کو ترکی واپس بلا لیا۔ ان کا بسانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن غازی نے ایسا انتظام کیا کہ انہیں ذرا بھی تکلیف نہ ہوئی۔

ملکی وملی مصروفیتوں نے مصطفیٰ کمال کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا۔ 1938ء میں اُن پر فالج کا حملہ ہوا اور ڈاکٹروں کی کوششوں کے باوجود کچھ عرصے بعد اس مجاہد کا انتقال ہو گیا۔ میت کو شاہی لباس پہنا کر تین دن تک کھلے تابوت میں رکھا گیا تا کہ ترک اتاترک کا آخری دیدار کر سکیں۔ تیسرے دن تابوت اٹھایا گیا۔ تقریباً پانچ لاکھ انسان جنازے کے ہمراہ تھے۔ دنیا کی تمام حکومتوں کے نمائندے اور سفیر بھی شریک تھے۔ لوگ جنازے کے ساتھ زاروقطار روتے جا رہے تھے۔ عورتیں چلا چلا کر کہہ رہی تھیں:

"اتاترک آپ کہاں ہیں؟"

میت دفنانے کے بعد تین منٹ تک جمہوریہ ترکی میں خاموشی منائی گئی۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک مرے نہیں، زندہ جاوید ہیں۔ وہ ترکی کی قوم کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مصطفیٰ کمال کو حضرت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ گہری عقیدت اور محبت تھی وہ کہا کرتے تھے کہ مادرِ عالم نے ایسا عظیم انسان آج تک پیدا نہیں کیا اور نہ آئندہ پیدا کر سکے گی۔

"پیارے دوست! تم فکر نہ کرو۔ مَیں راضی برضائے حق ہوں۔ اگر خدا کو مجھ سے کام لینا منظور ہے اور مسلمانوں کی خدمت کرنا میری قسمت میں ہے تو مَیں ہرگز نہ مروں گا اور اگر میرا وقت آ گیا ہے تو مَیں خوشی سے دنیا کو خیر باد کہنے کو تیار ہوں۔ اگر مَیں مر جاؤں تو دنیائے اسلام کو میرا پیغام

پہنچا دینا کہ زندگی حرکت کا نام ہے مسلمانوں کو اگر زندہ رہنا ہے تو رسول عربی ﷺ کے نقشِ قدم پر چلیں سادہ زندگی اختیار کریں۔ محنت اور مشقت کو اپنا شعار بنائیں فوجی نظام کے ساتھ رہیں۔ جس طرح حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فوجی نظام کی تاکید کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق علم حاصل کریں اور زندگی کا کوئی بھی لمحہ بیکار ضائع نہ کریں۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو مصطفیٰ کمال اتاترک نے اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے اپنے دوست رفیق رشدی سے کہے تھے۔

❁............❁............❁

موسیٰ بن نصیر

حکومت بنی اُمیہ کے ابتدائی زمانے میں جب مسلمان داخلی انتشار اور پریشانیوں میں مبتلا تھے تو افریقہ کے مقبوضہ علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے، مگر عبدالملک بن مروان نے جب بنی اُمیہ کے مخالف عناصر کی قوتوں کو توڑ دیا اور ملک میں داخلی امن وامان کی فضا پیدا ہوگئی تو انہیں افریقہ کی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ فتح کرنے کا خیال آیا۔ عبدالملک نے اس مقصد کے لیے حضرت زبیر بن قیس کا انتخاب کیا۔ جو افریقہ کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ 69ھ میں وہ بڑے اہتمام سے روانہ ہوئے۔ انہوں نے بربریوں کے سردار کسیلہ کو شکست دی لیکن اسلامی حکومت کی نیو ابھی گہری اور مضبوط نہ تھی کہ مشتعل بربریوں نے جو کسیلہ کی شکست کا انتقام لینے کی آگ میں جل رہے تھے برقہ کے مقام پر مسلمانوں کے سپہ سالار کو گھیر کر شہید کر ڈالا۔

حضرت زبیر بن قیس کی شہادت اگرچہ ایک ناگہانی واقعہ تھی، لیکن عبدالملک بن مروان اس سانحہ پر افریقہ کو دوبارہ فتح کرنے کے خیال سے دست بردار نہیں ہوئے۔ انہوں نے حسان بن نعمان کو یہ اہم خدمت سپرد کر کے فوراً افریقہ روانہ ہونے کا حکم دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس مردِ مومن نے جس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے شرارے بھڑک رہے تھے، افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں، چٹیل میدانوں اور ناقابلِ عبور گھاٹیوں کو عربی نژاد گھوڑوں کے سموں سے روندڈالا اور ایک بار پھر اسلام کا پرچم دریائے نیل کی سرسبز و شاداب وادیوں پر لہرانے لگا اور صحرائے افریقہ اللہ اکبر کے پُرجوش نعروں سے گونج اُٹھا۔

مشہور کاہنہ دامیہ جو بربریوں کے دل کی حسین وجمیل ملکہ بھی تھی ایک زبردست لشکر کے ساتھ حسان بن نعمان کے مقابلہ کو نکلی اور دامیہ کے عشق میں مخمور بربریوں نے جو اس کے

اشارہ پر اپنا سر، اپنا گھر اور اپنا مال قربان کر دینے کی آرزو رکھتے تھے، مسلمانوں پر بے پناہ حملہ کیا اور اُن کے حوصلہ شکن تیز جوابی حملوں کے باوجود بہت سے مفتوحہ علاقوں کو ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔

حسان بن نعمان موقع کی نزاکتوں کو محسوس کر رہے تھے، مسلمانوں کی تعداد ہر حملہ کے بعد گھٹ رہی تھی۔ سامانِ رسد ختم ہو رہا تھا اور پورے لشکر کے تباہ و برباد ہو جانے کی نازک گھڑی سامنے تھی لیکن محبتِ اسلام کے جوش میں ڈوبا ہوا یہ نڈر اور بہادر انسان فولاد کی چٹان بن کر دشمن کے سامنے کھڑا رہا اور اس کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔

حسان نے اپنے بچے کھچے ساتھیوں کو جمع کیا، اُن کے درمیان کھڑے ہو کر انہوں نے پر جوش تقریر کی، خدا سے فتح کی دعا مانگی اور اپنے سر سے کفن باندھ کر دامیہ کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ دامیہ کو فتح ہوتی تو کوئی اہم بات نہ ہوتی اس کا لشکر تعدد کے اعتبار سے بہت زیادہ طاقت ور تھا لیکن حسان بن نعمان کی فتح تاریخِ عالم کا ایک اہم ترین واقعہ بن گئی کیونکہ مٹھی بھر سپاہ نے اپنے حوصلہ مند سپہ سالار کی رہنمائی اور قیادت میں اس فوج پر غلبہ پایا جو اگر ایک ایک مٹھی خاک بھی پھینکتی تو مسلمانوں کی فوج مٹی کے ڈھیر میں دب جاتی۔

حسان بن نعمان نے دامیہ کو قتل کر دیا۔ اس کے قتل ہوتے ہی رومیوں اور بربریوں کے حوصلے پست ہو گئے، سارے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور حسان بن نعمان نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کی فتح کا اعلان کیا اور اس عظیم اسلامی سلطنت کی گہری اور مضبوط بنیاد رکھی جو آج بھی شمالی افریقہ کی مسلمان حکومتوں اور مسلمان آبادیوں کی صورت میں اس مردِ مجاہد کی یادگار کے طور پر باقی ہے۔

اس عظیم الشان فتح کے بعد حسان بن نعمان بے اندازہ مالِ غنیمت اور ملکہ دامیہ کا سر لے کر عبدالملک بن مروان کے پاس پہنچے اور عبدالملک نے خوش ہو کر انہیں بارقہ کی حکومت کا پروانہ دیا، مگر عبدالملک کے بھائی عبدالعزیز بن مروان نے جو اس وقت مصر کے گورنر تھے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر انہیں بارقہ کی حکومت سے محروم کر دیا اور ان کی جگہ موسیٰ بن نصیر کو مقرر کیا جو اس سے پیشتر عراق میں بشیر بن مروان کے مشیر کی خدمات انجام دیتے رہے تھے۔

حجاج بن یوسف نے جب انہیں بیت المال کی رقم میں خُرد بُرد کرنے کا الزام لگا کر عراق سے نکال دیا اور عبدالملک بن مروان نے ان پر پچاس ہزار اشرفی جرمانہ کیا تو عبدالعزیز بن

مروان اپنی جیب سے یہ رقم ادا کر کے موسیٰ بن نصیر کو اپنے ہمراہ مصر لے آئے اور پھران کی ضربت شمشیر نے فراعنہ کفر والحاد کے خون کا دریا بہا کر سرزمین افریقہ پر اسلام کا سبز ہلالی پرچم لہرایا اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے فراعنہ مصر کے مقبروں، اسرائیلی معبدوں اور نصرانی کلیساؤں میں گونج اُٹھے اور مسلمان اپنے زبردست سپہ سالار کی زیرِ قیادت افریقہ کی اونچی اونچی پہاڑیوں پر چڑھ کر براعظم یورپ کے زرخیز میدانوں، دریاؤں کی گھاٹیوں اور برف پوش پہاڑوں کے نظر کش مناظر کو دیکھنے لگے جو دعوتِ حق دینے کے لیے اپنی طرف آنے کا خاموش اشارہ کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے حوصلے بلند تھے۔ وہ اللہ کا نام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا تہیہ کر کے اٹھے تھے۔

ان کی تلواریں نیاموں میں مچل رہی تھیں۔ ان کے بازوؤں کی رگوں میں خونِ شجاعت کروٹیں لے رہا تھا اور وہ اپنے والی وامیر اور سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کے چشم وابرو کے اشاروں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے کہ کب حکم ہو اور کب ان کی تلواریں نیاموں سے نکل کر یورپ کی زمین سے کفر وشرک کی ان جڑوں کو نکال پھینکیں جو بہت گہری ہو چکی تھیں۔

قسمت نے راستہ پیدا کیا اور مراقش کے شمالی ساحل پر واقع قلعہ بستہ کا امیر یولیان (کاؤنٹ جولین) والئ افریقہ موسیٰ بن نصیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اُس نے شاہِ اندلس رذریق (راڈرک) کے مظالم کی دردناک کہانی سنائی کہ شرافت کو چاہنے والی آنکھیں اُمنڈ آئیں اور رحم و کرم سے لبریز دل غم سے چھلک پڑا۔

کہا جاتا ہے کہ شاہِ اندلس ویٹزا (Witiza) کے لڑکے کو اس کے ایک سردار رذریق (راڈرک) نے پادریوں کی حمایت حاصل کر کے معزول کر دیا تھا اور خود اندلس کا حاکم بن بیٹھا تھا۔ ویٹزا پر یہود نواز ہونے کا الزام تھا۔ چونکہ وہ ملک میں اصلاحات نافذ کرنا چاہتا تھا مگر پادریوں کے اقتدار کو ہاتھ لگانا جرم تھا۔

ویٹزا نے اپنی بہن کی شادی قلعہ بستہ کے امیر یولیان سے کی تھی جس کے بطن سے ایک حور پیکر لڑکی فلورنڈا پیدا ہوئی جو رواج کے مطابق ایوان شاہی میں پرورش پا رہی تھی۔ رذریق نے جس کے سر پر اس حسین وجمیل لڑکی کو دیکھ کر شیطان سوار تھا سابق شاہی خاندان کو اور زیادہ ذلیل ورسوا کرنے کے لیے اس کا دامنِ عصمت داغ دار کر دیا۔

فلورنڈا نے اس مصیبت کی اطلاع اپنے باپ امیر یولیان کو دی جو غصہ میں آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ فوراً رذریق کے دربار میں حاضر ہوا اور کمال ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنی بیوی کی شدید علالت کا بہانہ کر کے فلورنڈا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب وہ رخصت ہو رہا تھا تو رذریق نے اس سے کہا کہ میرے شکار کے لیے بہترین باز بھیجنا۔ اس نے جواب دیا "ایسے باز لاؤں گا جو بادشاہ نے دیکھے نہ ہوں۔"

امیرِ یولیان واپس آ کر موسیٰ بن نصیر کے دربار میں پہنچا اور اس نے اسپین کی دولت، سیاسی صورتِ حال، حکومت کی کمزوری اور رذریق کے مظالم کی بناء پر شہریوں کی بددلی کا ذکر کر کے انہیں اسپین پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی۔

موسیٰ بن نصیر امیر یولیان کے قول کی صداقت کو پرکھے بغیر کوئی بڑی مہم شروع کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے ایک سردار طریف کے ہمراہ پانچ سو مجاہدین کی ایک جمعیت (چار سو سوار اور ایک سو پیدل) کو اسپین کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا۔ یہ جمعیت امیر یولیان کے جہازوں پر سوار ہو کر 91ھ بمطابق 710ء اس چھوٹے سے جزیرہ نما طریفہ پر اُتری جو اقلیمِ یورپ کا تقریباً انتہائی سرا ہے۔ اندلس پر یہ پہلا حملہ تھا۔

اس جمعیت نے واپس آ کر جو اپنے ساتھ کثیر دولت بھی لائی تھی امیرِ یولیان کے قول کی تصدیق کی۔ اب راستہ صاف اور ہموار تھا۔ تقریباً ایک سال بعد موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد مراکشی کو جو اس وقت طنجہ کے گورنر تھے اندلس پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

طارق جن کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ ظاہر ہونے کے لیے کروٹیں بدل رہا تھا سات ہزار کے لشکر کو لے کر جس میں زیادہ تر تعداد بربریوں کی تھی اس عظیم الشان چٹان یعنی جبل الطارق (جبرالٹر) کے قریب اُترے جس نے ان کے نام کو حیاتِ جاوید بخش دی۔ طارق نے امیر یولیان کی فراہم کردہ کشتیوں کو آگ لگا دی۔ اور اب مسلمان فوج کے لیے دو ہی راستے تھے، فتح یا شہادت۔ تیسرا کوئی راستہ نہ تھا۔ ان کے سامنے اندلس کا خوبصورت ملک تھا اور ان کے پیچھے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔

شاہِ اندلس رذریق نے مجاہدِ اسلام طارق کی فوج سے جن کی تعداد اب بارہ ہزار ہو چکی تھی جندہ (Janda) کے کنارے دریائے بکہ (Saloda) کے دہانہ پر 19 جولائی 711ء کو

مقابلہ کیا لیکن اسے شکستِ فاش ہوئی اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ اپنی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی گاڑی پر بیٹھ کر جس پر سونے چاندی کا کام بنا ہوا تھا کہاں غائب ہو گیا۔ دریا کے کنارے اس کی گاڑی کے کچھ اجزاء ملے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔

طارق اپنے جرار لشکر کے ہمراہ آگے بڑھ رہے تھے اور ایک ایک شہر فتح کر رہے تھے۔ انہیں اپنے سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کا یہ حکم ملا کہ وہ اسلامی لشکر کی حفاظت کے پیشِ نظر آگے نہ بڑھیں۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ کا یہ حکم خلیفۂ وقت ولید بن عبدالملک کی ہدایت کے مطابق تھا لیکن فوجی اور سیاسی حالات کے اعتبار سے طارق نے جب اپنے ساتھی افسروں سے مشورہ کیا تو فوجوں کی پیش قدمی کو روکنا خلافِ مصلحت قرار دیا گیا اور طارق آگے بڑھتے رہے۔

آخر کار جون 712ء میں خود موسیٰ بن نصیر نے ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا اور مدن شذونہ اور قرمونہ کے مستحکم قلعوں اور شہروں کو جنہیں طارق نے چھوڑ دیا تھا یا جو اُن کی زد میں نہ آئے تھے اپنے حملوں کے لیے منتخب کیا۔ موسیٰ کی لڑائیوں میں اشبیلیہ اور ماردہ (*Merida*) کا محاصرہ بڑی شہرت رکھتا ہے۔ جون 713ء میں ایک سال کے محاصرہ کے بعد یہ دونوں شہر فتح کر لیے گئے۔ ماردہ کی لڑائی میں رذریق کی بہن اے جی لونا بھی موسیٰ کے ہاتھ آئی جس کی شادی انہوں نے اپنے بیٹے عبدالعزیز سے کر دی۔

موسیٰ ایک طرف سے اور طارق دوسری جانب سے فتوحات کرتے چلے آ رہے تھے کہ اندلس کے دارالخلافہ طلیطلہ یا اس کے نواح میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ طارق نے اپنے سپہ سالار کا پرتپاک خیر مقدم اور شاہانہ استقبال کیا لیکن موسیٰ نے اپنی حکم عدولی کی بنا پر انہیں تادیب کی اور یہ طارق کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہیں اتنی عظیم الشان فتوحات کے باوجود اپنے سردار کی تادیبی کارروائی کے سامنے سر جھکانے پر تامل نہ ہوا۔

خلیفۂ وقت ولید بن عبدالمالک نے موسیٰ کو حکم دیا تھا کہ وہ اسپین کی فتح کے دوران میں اسلامی لشکر کی حفاظت کو پیشِ نگاہ رکھیں۔ خلیفہ کا یہ حکم جہاں تک مورخین کے قیاس کا تعلق ہے اس خیال کے ماتحت تھا کہ اسپین مرکزِ خلافت سے بہت دُور تھا جس پر انتظامی نقطہ نگاہ سے مضبوط تسلط رکھنا آسان نہیں تھا۔ موسیٰ خلیفہ کی ہدایت پر عمل نہ کر سکے اور اسپین کے فوجی اور سیاسی حالات اور ضروریات کے مطابق مسلمانوں کا لشکر مسلسل آگے بڑھتا رہا۔

چنانچہ خلیفہ نے موسیٰ کو دمشق طلب کیا اور وہ بلا عذر اپنے نئے مفتوحہ علاقوں کا انتظام اپنے لڑکے عبدالعزیز کے سپرد کر کے خشکی کے راستے شام روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ چار سو شہزادے تھے جو سروں پر تاج پہنے تھے اور کمر میں سنہری پٹکے باندھے تھے۔ بے شمار غلام اور لاتعداد جنگی قیدی تھے جو مالِ غنیمت اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ جلوس جو شمالی افریقہ سے گزرتا ہوا شام جا رہا تھا اتنا عظیم الشان جلوس تھا کہ اس کی کہانیاں مغرب سے مشرق تک مؤرخین کا دلچسپ موضوع بن گئیں۔

اس فیروز مندانہ اور شاہانہ جلوس کی آمد کی خبر موسیٰ سے پہلے دمشق پہنچ چکی تھی جہاں خلیفہ ولید بن عبدالملک سخت علیل تھے۔ سلیمان بن عبدالملک نے جو مسندِ خلافت کے ولی عہد اور ولید کے بھائی تھے موسیٰ کو کہلوایا کہ وہ دمشق پہنچنے میں ذرا تاخیر سے کام لیں۔ موسیٰ کو خلیفہ کی علالت کی خبر مل چکی تھی اور وہ جلد سے جلد دمشق پہنچ کر ولید کی عیادت کرنے کے لیے بے قرار تھے لہٰذا انہوں نے ولی عہد کے حکم کی تعمیل اپنے لیے ضروری نہ سمجھی اور وہ سلیمان بن عبدالملک کی مرضی کے خلاف دمشق پہنچ گئے۔

حسنِ اتفاق کہ دمشق میں ان کا داخلہ جمعہ کے دن اس وقت ہوا جب ولید بن عبدالملک جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد خطبہ پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سپہ سالار کا جو عظیم الشان فتوحات کر کے واپس آیا تھا پُر جوش خیر مقدم کیا اور انہیں نہ صرف یہ کہ انعام و اکرام دیا بلکہ ان کے لڑکوں کے لیے وظائف بھی مقرر کیے۔

سلیمان بن عبدالمالک جب مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے موسیٰ سے فتوحاتِ افریقہ کی باز پرس کی اور خراج کی رقم کا حساب طلب کیا جو خلیفۂ وقت کی حیثیت سے ان کا فرض منصبی تھا۔ موسیٰ کا پیش کردہ حساب خلیفہ کو مطمئن نہ کر سکا اور انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے دمشق میں داخلہ سے متعلق اپنے حکم کو نہ ماننے کی بناء پر موسیٰ کے خلاف یہ انتقامی کارروائی کی۔

موسیٰ بن نصیر نے تقریباً اسی سال کی عمر میں انتقال کیا، انتقال کے وقت بھی وہ نظر بند تھے سلیمان بن عبدالملک پر مؤرخین کا ایک الزام یہ بھی ہے کہ انہوں نے اسپین میں موسیٰ کے لڑکے عبدالعزیز کو قتل کرا دیا۔

موسیٰ بن نصیر جنگ عین التمر میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے، حضرت خالد ﷜ نے جنگ عین التمر میں ایک عجمی سردار مہران کے قلعہ کو فتح کیا۔ اس قلعہ میں ایک گرجا تھا جس میں چالیس لڑکے انجیل کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے، حضرت خالد ﷜ نے جب ان لڑکوں کو گرفتار کر کے دریافت کیا کہ تم کون ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس کلیسا کے لیے وقف ہیں، حضرت خالد ﷜ نے ان لڑکوں کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ نصیر ابو موسیٰ بن نصیر، سیرین ابو محمد بن سیرین عثمان کے حصہ میں آئے اور بعد میں انہوں نے اسلامی حکومت کے استحکام کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

موسیٰ بن نصیر بڑے ہی مدبر جری اور فطرت شناس سپہ سالار تھے، انہوں نے طرابلس ٹیونس، الجزائر اور مراکش کے علاقے ایک ایک کر کے فتح کر لیے اور 84ھ مطابق 703ء میں وہاں نہایت ہی مضبوط اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی، انہوں نے شمالی افریقہ کو فتح کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہاں کی بربری اور مور اقوام کو جو سب سے زیادہ بہادر اور فتنہ پرداز قومیں تھیں اپنے ساتھ ملا لیا اور انہیں اپنی فوج میں بھرتی کر کے اپنا ماتحت اور فرمانبردار بنا لیا، یہ ان کے تدبر اور ہوش مندی کا ایک ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ٹیونس میں بہت بڑی بندرگاہ بنائی اور جہاز سازی کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا جس کی بنائی ہوئی کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ مسلمانوں کی ایک فوج نے 85ھ مطابق 704ء میں جزیرہ سارڈینا اور سسلی پر حملہ کیا اور رومی فوج مسلمانوں کے مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گئی۔

❁............❁............❁

نادر شاہ

نادر شاہ ملکِ ایران کا ایک زبردست بادشاہ تھا۔ وہ دنیا کے نہایت نامور بہادروں میں شمار ہوتا تھا۔ شروع میں وہ ایک غریب گڈریا تھا۔ لیکن ہمت اور کوشش سے ترقی کرتے کرتے وہ بادشاہی کے درجے تک پہنچ گیا۔

نادر شاہ کا باپ امام قلی بیگ ایک خانہ بدوش چرواہا تھا۔ بھیڑ بکریاں پال کر گزارہ کرتا تھا اور چارے پانی کی تلاش میں جا بجا پھرتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے ایران کے ایک سرحدی گاؤں دست گرد کے قریب ڈیرہ ڈالا۔ وہیں اپنے غریبانہ خیمے میں اُس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام نادر قلی بیگ رکھا گیا۔ وہی خوش قسمت لڑکا بعد میں نادر شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔

نادر قلی بڑا ہوا۔ تو بھیڑ بکریاں چرانے میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اُس زمانے میں ایران کی عام حالت بہت خراب تھی۔ افغانوں نے ایرانیوں کا ناک میں دَم کر رکھا تھا۔ روس والے بھی آئے دن حملے کرتے رہتے تھے۔ ترکوں نے بھی بہت سے علاقے دبائے ہوئے تھے۔ اکثر صوبے دار خود مختار ہو بیٹھتے تھے۔ ایران کے بادشاہ طہماسپ شاہ کو تو کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ الغرض جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا نقشہ جما ہوا تھا۔ ایک دفعہ ازبک قوم نے دست گرد پر ہلہ بول دیا۔ مال اسباب لوٹ کھسوٹ لیا اور لوگوں کو غلام بنا کر لے گئے۔ نادر قلی بھی گرفتار ہوا۔ لیکن وہ کوئی داؤ پیچ لڑا کر بھاگ گیا۔ اُس وقت وہ بیس برس کا تھا۔

ابی ورد دست گرد سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک قصبہ تھا۔ علی بیگ وہاں کا حاکم تھا۔ نادر قلی اپنے آبائی پیشے سے بیزار ہو گیا اور ابی ورد جا کر علی بیگ کی ملازمت اختیار کر لی اور جلد اپنی بہادری اور کارگزاری سے اُس کے پہرہ داروں کا افسر مقرر ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد علی بیگ نے اپنی

ایک بیٹی کو نادر قلی سے بیاہ دیا جب علی بیگ مرا تو وہ اُس کے علاقے اور جائیداد کا وارث بن گیا۔

گھر کا خاطر خواہ انتظام کر کے نادر قلی نے مشہد کے خود مختار حاکم ملک محمود کی نوکری کر لی۔ کچھ عرصہ کے بعد اُس نے ملک کو مشہد سے نکال باہر کرنے کا ارادہ کیا اور چند سرداروں کو اپنا ہم خیال بھی بنا لیا۔ لیکن سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا اور وہ جان بچا کر ابی ورد بھاگ گیا۔ پھر ایک بڑی جمعیت فراہم کر کے ملک محمود پر حملہ کر دیا اور چند چھوٹی بڑی لڑائیوں کے بعد اُسے مار بھگایا۔ نادر قلی کے اِس کارنامے سے طہماسپ شاہ بہت خوش ہوا اور اُسے طہماسپ قلی کا خطاب دے کر دشمنوں کے قلع قمع پر مقرر کر دیا۔

نادر قلی نے افغانوں کے مقابلے میں بہت سے میدان مارے اور اپنی بہادری کا سکہ سب کے دلوں پر بٹھا دیا۔ طہماسپ شاہ کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اُس نے نادر قلی کو اپنی فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا۔ اُس کی مراد بر آئی۔ وہ ایران کے دشمنوں کا نام نشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اَب اُس کے پاس کافی سپاہ بھی تھی اور سامان بھی۔ اُس کی خداداد جنگی قابلیت کے سامنے افغانوں کو بھاگتے ہی بنی۔ رُوسی بھی اُس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور اپنے وطن کو لوٹ گئے اُس نے ترکوں سے بھی ایران کے دبائے ہوئے علاقے واپس لے لیے۔ غرض کہ ملک میں امن وامان قائم ہو گیا اور نادر قلی کے رعب داب سے طہماسپ شاہ کے حکم احکام پھر مانے جانے لگے۔

طہماسپ شاہ حکومت کے ناقابل تھا۔ امن وامان ہوتے ہی وہ عیش عشرت میں ڈوب گیا اور اپنے وفادار جاں نثار نادر قلی کی طرف سے بھی بے پرواہ ہو گیا۔ سلطنت کا انتظام پھر بگڑنے لگا۔ ایران کے خیر خواہ سردار اُس سے بیزار ہو گئے اور اُسے تخت سے اُتار دیا۔ پھر ایک جلسہ میں سب نے یک زبان ہو کر نادر قلی کو اپنا بادشاہ مان لیا۔ وہ نادر شاہ کے لقب سے ایران کا مالک بن گیا۔

قندھار پر ابھی افغان قابض تھے۔ ایک مختصر سے محاصرے سے نادر شاہ نے اُسے سَر کر لیا اور افغانوں کے تعاقب میں کابل کا رُخ کیا۔ کابل میں ہندوستان کے بادشاہ محمد شاہ کی طرف سے ناصر خاں صوبہ دار تھا۔ اُس نے نادری لشکر کی آمد آمد کا حال سُنا۔ تو محمد شاہ سے امداد مانگ بھیجی۔ محمد شاہ عیش کا بندہ تھا۔ اُسے دن رات شراب و کباب اور راگ رنگ سے کام تھا اور محمد شاہ رنگیلا کہلاتا تھا۔ امداد تو درکنار جواب بھی نہ بھیجا اور نادر شاہ کابل پر چڑھ آیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ناصر خاں نے اپنی تھوڑی بہت فوج سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ نادر شاہ نے اُس کی بہادری سے

خوش ہو کر اُسے پھر کابل کا صوبہ دار بنا دیا۔

کابل سے نادر شاہ نے ایک ایلچی محمد شاہ کے پاس بھیجا کہ جو افغان ہندوستان میں پناہ گزیں ہیں۔ انہیں نکال دیا جائے۔ وہ رنگ رلیوں میں محو تھا۔ کوئی جواب نہ بھیجا۔ نادر شاہ کو غصہ آیا۔ اُس نے ہندوستان کی طرف کوچ کر دیا۔ پشاور کے باشندوں نے فتح مند حملہ آور کا شاندار استقبال کیا اور اطاعت قبول کر لی۔ پھر راستے کے ندی نالے اور دریا عبور کرتا اور شہروں اور قصبوں کو لوٹتا کھسوٹتا نادر شاہی لشکر لاہور کے قریب آ پہنچا۔ یہاں کے صوبے دار نواب زکریا خاں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ نذر دے کر اپنے شہر کو بچا لیا۔

جب محمد شاہ نے سُنا کہ نادر شاہ بڑھتا ہی چلا آتا ہے۔ تو اُس کی آنکھیں کھلیں۔ اِدھر اُدھر سے اَسّی ہزار فوج اکٹھی کر کے کرنال کے قریب ڈیرے ڈال دیئے۔ نادر شاہ بھی آن پہنچا۔ اُس نے ترتیب کے ساتھ اپنے لشکر کو کھڑا کر دیا۔ محمد شاہی لشکر میں نہ کوئی ترتیب تھی نہ کوئی انتظام۔ اکثر سردار ایک دوسرے سے جلتے تھے۔ پھوٹ زوروں پر تھی۔

سعادت خاں اور خان دوران محمد شاہ کے دو بڑے جرنیل تھے۔ وہ اپنی فوجیں لے کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ آصف جاہ وزیر اِن دونوں سے عار کھاتا تھا۔ اُس نے ساتھ نہ دیا اور ٹال مٹول کرتا رہا۔ ایک بجے دوپہر کو لڑائی شروع ہوئی۔ ڈھائی ہزار ایرانی اور دس ہزار ہندوستانی مارے گئے۔ سعادت خاں کا ہاتھی گولی کھا کر بے قابو ہو گیا اور اپنے سوار سمیت ایرانی کیمپ میں بے تحاشا گھس گیا۔ سعادت خاں گرفتار ہو گیا۔ خان دوران سخت زخمی ہو گیا۔ اُس کا ایک ملازم اپنی جان پر کھیل کر اُسے میدانِ جنگ سے اُٹھا کر اپنے کیمپ میں لے گیا۔ پانچ بجے شام کو لڑائی ختم ہو گئی۔ نادر شاہ جیت گیا۔

شام کو سعادت خاں نادر شاہ کے سامنے لایا گیا وہ بڑی عزت سے پیش آیا۔ باتوں باتوں میں سعادت خاں نے اُسے دو کروڑ روپیہ لے کر واپس چلے جانے پر رضا مند کر لیا اور باقاعدہ طور پر یہ معاملہ طے کرنے کے لیے آصف جاہ کو بلا بھیجا۔ اُدھر آصف جاہ خان دوران کی خبر پوچھنے گیا۔ وہ زخموں سے چور تھا اور بولنا بھی دوبھر تھا۔ تاہم بستر پر پڑے پڑے بہ ہزار دقت کہنے لگا۔ کہ ہم نے اپنا کام کر دیا۔ اَب تم جانو تمہارا کام۔ مگر یاد رہے کہ بادشاہ کو نادر کے پاس نہ لے جانا اور نہ نادر کو دہلی لے جانا۔ بلکہ کچھ دے دلا کر اس بلا کو یہیں سے ٹال دینا۔

دوسرے دن آصف جاہ سعادت خاں کے ذریعے نادر شاہ سے ملا۔ دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ آخر کار دو کروڑ روپیہ لے کر نادر شاہ وہیں سے واپس چلے جانے پر راضی ہو گیا۔ آصف جاہ نے اُسے خالص اپنا کارنامہ بیان کر کے محمد شاہ سے امیر الامرا کا خطاب پایا اور سعادت خاں کا ذکر تک نہ کیا۔

سعادت خاں نے جب آصف جاہ کی چال کا حال سُنا تو وہ جَل بھن گیا اور نادر شاہ سے کہنے لگا کہ آپ نے بڑی غلطی کی جو صرف دو کروڑ روپے پر راضی ہو گئے۔ شاہی خزانے اور کئی گھروں میں دولت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔ یہ سُن کر نادر شاہ کے منہ میں پانی بھر آیا اور دہلی جانے کا پکا ارادہ کر لیا۔

دہلی پہنچ کر نادر شاہ نے خزانے پر قبضہ کر لیا۔ اُس کے سپاہی شہر کی سیر کرنے لگے۔ اتنے میں یہ جھوٹی افواہ پھیل گئی کہ نادر شاہ مارا گیا۔ شہر والے اِکے دُکے بے خبر ایرانی سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ تین ہزار ایرانی مارے گئے۔ نادر شاہ محل میں تھا اُسے خبر بھی نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے؟ رات کو اِس اَمر کی اطلاع دی گئی۔ اُسے یقین نہ آیا۔ اگلے دن صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہو کر تحقیقات کے لیے نکلا۔ جا بجا بازاروں میں اپنے آدمیوں کی لاشیں پڑی دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بعض شامت کے مارے اُس پر بھی اینٹ پتھر برسانے لگے۔ چاندنی چوک میں اُس پر کسی نے گولی بھی چلا دی۔ وہ تو بال بال بچ گیا۔ لیکن اُس کا ایک افسر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ تب نادر شاہ تلوار کھینچ کر چاندنی چوک کی سنہری مسجد کی چھت پر بیٹھ گیا۔ ننگی تلوار قتلِ عام کا اعلان یا نشان تھی۔ نادر شاہی حکم پاتے ہی ایرانی سپاہی شہر میں گھس گئے اور نہتے شہریوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسنے لگا۔ مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ لوگوں کی چیخ وپکار، دھوئیں اور گرد وغبار سے شہر قیامت کا میدان بن گیا۔ صبح نو بجے سے تین بجے دوپہر تک یہی حال رہا۔ چھ گھنٹوں میں دہلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور دہلی والے خاک وخون میں مل گئے۔ آخر آصف جاہ نے ہاتھ جوڑ کر نادر شاہ سے رحم کی درخواست کی۔ تب اُس نے تلوار میان میں ڈال دی اور قتلِ عام بند ہو گیا۔ بیس ہزار دہلی والے تلوار کے گھاٹ اُتر گئے۔

نادر شاہ نے شاہی خزانے کی دولت سمیٹ لی۔ مشہور کوہِ نور ہیرا اور کروڑوں کی لاگت کا تختِ طاؤس بھی لے لیا۔ دہلی کی لوٹ سے بھی بے حساب دولت ہاتھ آئی۔ الغرض ستر کروڑ روپے کا مال اسباب، نقدی لے کر نادر شاہ دہلی سے نکلا اور ایران واپس چلا گیا۔

ناصر الدین محمود

ناصر الدین محمود رضیہ سلطانہ کا چھوٹا بھائی تھا وہ اُس کی موت کے سات سال بعد دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ وہ اپنے زمانے میں شجاعت، عبادت اور سخاوت میں بے مثال تھا۔ اُسے درویش بادشاہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ ہو کر بھی وہ درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ اپنی روزی آپ کماتا تھا اور شاہی خزانے سے ایک کوڑی بھی نہ لیتا تھا۔ اُسے عالموں اور صوفیوں سے بہت محبت تھی۔ وہ اُن کا بڑا اُدب لحاظ کرتا تھا۔ ہنر مندوں کا قدر دان تھا۔ شاعر تعریف کے قصیدے لکھ کر لاتے اور انعام پاتے تھے۔

سلطان ناصر الدین محمود کے وزیر کا نام غیاث الدین بَلبن تھا۔ سلطان نے اُسے خانِ اُعظم کا خطاب دیا ہوا تھا۔ وہ بڑا قابل، مدبر، منتظم اور بہادر تھا۔ سلطنت کا انتظام بہت کچھ اُس کے سپرد تھا اور بادشاہ زیادہ تر عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب سلطان نے بَلبن کو وزیر مقرر کیا تو اُس نے کہا کہ مَیں نے تمہیں اپنا نائب بنایا ہے اور سلطنت کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں دے دی ہے۔ کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ مجھے خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ بلبن نے بھی یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ وہ ہمیشہ اپنے آقا کا حق نمک وفاداری سے ادا کرتا رہا۔

لُٹیرے منگولوں کی ٹڈی دَل فوجیں آئے دن حملے کرتی رہتی تھیں۔ مغربی سرحدوں پر لوٹ مار کا بازار گرم رہتا تھا۔ ملتان اور لاہور کے صوبے دار منگولوں سے مل جاتے تھے۔ سلطان نے بَلبن کے مشورے سے ان خود غرض بے وفا امیروں کو موقوف کر کے اپنے پاس بُلا لیا۔ اور اُن کی جگہ اُن کے بیٹوں کو مقرر کر دیا۔ قلعوں اور چھاؤنیوں میں اضافہ کر دیا۔ اس سے پنجاب اور سرحدی علاقوں کا انتظام خاطر خواہ ہو گیا۔

جاہر دیوٹرور کا راجہ تھا۔ اس نے ایک قلعہ پہاڑ کے اوپر بنایا ہوا تھا۔ پانچ ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادہ فوج اُس کے پاس تھی اور سرکشی پر تلا ہوا تھا۔ بادشاہ نے ایک جرار لشکر کے ساتھ اُس پر دھاوا بول دیا۔ ایک خون ریز لڑائی کے بعد راجہ ہار کر بھاگ گیا اور اُس کا قلعہ اور تمام علاقہ سلطان کے قبضے میں آ گیا۔

ہلاکو خان ایران کا زبردست بادشاہ تھا۔ اُس کا ایلچی دہلی میں آیا۔ اُس کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ دو ہزار ہاتھی اور تین ہزار توپیں تھیں۔ پچاس ہزار سوار اور دو لاکھ پیادہ سپاہی چمک دار ہتھیاروں سے سجے ہوئے کھڑے تھے۔ نقاروں کی آواز، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ہتھیاروں کی جھنکار سے میدان گونج اُٹھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ایلچی سلطان کے حضور میں آیا۔ شاہی محل سونے چاندی کے سامان سے جگمگا رہا تھا۔ امیر وزیر راجے اور شہزادے تخت کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ یہ کروفر دیکھ کر ایلچی اپنے آقا ہلاکو خان کی شان و شوکت کو بھول گیا۔

سلطان کا خط نہایت اچھا تھا۔ وہ سال بھر میں دو قرآن شریف لکھتا تھا۔ اور اُن کے ہدیے سے اپنا ذاتی خرچ چلاتا تھا۔ ایک دفعہ اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف کو کسی امیر نے معمولی سے زیادہ رقم ہدیہ دے کر لے لیا۔ سلطان کو یہ بات پسند نہ آئی۔ کیونکہ وہ مفت کی ایک کوڑی کا بھی روادار نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے حکم دے دیا کہ آئندہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف پوشیدہ طور پر ٹھیک واجبی ہدیے پر دیا جایا کرے اور کسی قسم کی کوئی رورعایت نہ کی جائے۔

عام طور پر بادشاہوں کی کئی کئی بیگمات ہوتی ہیں لیکن سلطان ناصر الدین محمود کے گھر میں صرف ایک ہی بیوی تھی اور کام کاج کے لیے کوئی نوکرانی یا لونڈی بھی نہ تھی۔ وہ نیک بی بی بادشاہ بیگم ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ ہی سے کھانا وانا پکاتی تھی۔ ایک دن ایندھن ذرا گیلا تھا۔ بیگم کو چولھا جلانے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ آگ بار بار بجھ جاتی تھی۔ بے چاری پھونکیں مار مار کر ہلکان ہو گئی۔ بارے کھانا پکا۔ بادشاہ کھانا کھانے محل میں آیا اور دستر خوان پر بیٹھ گیا۔ جب بادشاہ کھانا کھا چکا تو ملکہ نے کہا کہ اگر آپ کھانا پکانے کو ایک نوکرانی رکھ دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔ وہ میرا ہاتھ بٹایا کرے گی اور تکلیف کم ہو جائے گی۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ کہ خزانہ تو رعایا کے آرام اور سلطنت کے کام کے لیے ہے۔ اُس پر میرا اپنا کوئی حق نہیں ہے اور میری اپنی کمائی سے بڑی

مشکل سے گزر بسر ہوتی ہے۔ اِس میں اتنی گنجائش نہیں کہ مَیں اپنے یا تمہارے آرام کے لیے کوئی نوکر یا نوکرانی رکھ سکوں دنیا کی تکلیفیں صبر سے برداشت کرو۔ خدا اُس کا اُجر تمہیں آخرت میں دے گا۔ بیگم لاجواب ہوگئی اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔

ایک دن ایک سائل سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُس وقت قرآن شریف پڑھ رہا تھا جو اُس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ سائل ایک لفظ پر اُنگلی رکھ کر کہنے لگا کہ حضور یہ لفظ زائد ہے۔ بادشاہ مسکرا دیا اور اُس کے گرد پنسل سے ایک ہلکا سا حلقہ بنا دیا۔ پھر سائل نے اپنی حاجت بیان کی۔ بادشاہ نے حاجت پوری کر کے اُسے رخصت کر دیا اور اُس حلقے کو مٹا دیا۔ پاس ہی ایک امیر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا: ''جہاں پناہ! پہلے حلقہ بنانے اور پھر اُسے مٹا دینے میں کیا حکمت تھی؟'' بادشاہ نے فرمایا: ''یہ اعتراض کرنے والا ایک حاجت مند سوالی تھا۔ اُس کا اعتراض غلط تھا۔ مَیں نے یوں ہی اُس کا دل رکھنے کو اُس وقت حلقہ بنا دیا تھا۔ اگر مَیں اُسے کہہ دیتا کہ تمہارا اعتراض غلط ہے۔ تو وہ شرمندہ ہو جاتا اور اپنی حاجت پوری کرائے بغیر واپس چلا جاتا۔''

سلطان کے ایک مصاحب کا نام محمد تھا۔ وہ ہمیشہ اُسے اسی نام سے بلایا کرتا تھا۔ ایک روز اُس نے اُسے تاج الدین کہہ کر بلایا۔ مصاحب نے فوراً حاضر ہو کر حکم کی تعمیل کر دی۔ اس کے بعد وہ متواتر تین دن دربار میں نہ آیا۔ تب بادشاہ نے اُسے بلا بھیجا۔ جب وہ حاضر ہوا تو اس سے مسلسل غیر حاضری کا سبب پوچھا۔ اُس نے نہایت اَدب سے عرض کیا کہ جہاں پناہ! آپ ہمیشہ مجھے محمد کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اُس روز آپ نے مجھے تاج الدین کہہ کر بلایا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ مَیں نے حیرانی اور پریشانی سے اِسی سوچ بچار میں بے کھائے پیئے تین دن گزار دیئے اور دربار میں نہ آ سکا۔ بادشاہ نے اُسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ کہ خاطر جمع رکھو۔ مَیں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں بے شک اُس روز مَیں نے تمہیں تاج الدین کہہ کر بلایا تھا۔ بات یہ تھی کہ اُس وقت مَیں وضو سے نہ تھا اور بلا وضو محمد کا پاک نام اپنی زبان سے لیتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی۔ آخر کار یہ پاکباز بادشاہ چند مہینے بیمار رہ کر رحلت کر گیا۔ اُس کی بادشاہی کا زمانہ بیس برس تھا۔

❀..........❀..........❀

ہمایوں

ہمایوں 23 سال کا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کی قسمت میں زندگی کی تلخیاں ہی تھیں۔ مرتے دم تک پریشانیوں اور مصیبتوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ یوں وہ خدا سے ایک مرنجاں مرنج طبیعت لے کر آیا تھا۔ جو عیش وعشرت کی دلدادہ تھی۔ وہ باپ کی طرح نہایت شائستہ اور مہذب تھا۔ اس کی گفتار دل پذیر اور شخصیت بے حد جاذبیت رکھتی تھی۔ بابو اس کی باتوں سے لطف اٹھاتا۔ علم وادب سے اس کی وابستگی عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ میدانِ جنگ میں ایک چیدہ لائبریری اس کے ہم رکاب ہوتی۔ فارسی عربی اور ترکی، تینوں زبانوں میں اسے یدطولیٰ حاصل تھا۔ بابر کی طرح وہ بھی شاعر تھا اور برمحل شعر موزوں کرتا تھا۔

میدانِ جنگ میں ہمایوں کے کارنامے بابر کی فتوحات کے مقابلے میں ہیچ میں مگر ہندوستانی تہذیب اور کلچر پر ہمایوں نے اپنے باپ سے کہیں زیادہ گہرا اثر چھوڑا، شاہ طہماسب کے دربار میں رہ کر ہمایوں نے جو اثرات قبول کیے اس سے ہندوستانی تہذیب وتمدن نے بہت کچھ سیکھا۔ ہماری طرز معاشرت میں ایرانی کلچر کا جو امتزاج نظر آتا ہے اس کی ابتدا دراصل ہمایوں کے عہد سے ہوئی۔

ہمایوں کے دل میں ایک دردمند انسان کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ محض دوسروں سے بھلائی کرنا جانتا تھا۔ دوسرے اس سے برا سلوک کرتے رہے مگر وہ ہمیشہ انہیں اپنے سینے سے لگاتا رہا۔ ساری زندگی اس کے بھائی اور دوسرے رشتہ دار اس کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ ہر دفعہ انہوں نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا چاہا۔ اس کے راہ میں روڑے اٹکائے دراصل یہی تخریب پسند ہمایوں کی جلاوطنی کا سبب بنے ورنہ افغانوں کا مقابلہ کرنا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔

اگر کامران عسکری اور ہندال اس کا ہاتھ بٹاتے تو بابر کا خاندان کبھی یوں خانماں برباد نہ ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے ہمایوں کو بیک وقت متعدد محاذوں پر لڑنا پڑا۔ اس کے وسائل محدود تھے۔ اور کمک کی کوئی صورت نہ تھی ہمایوں سے زیادہ طاقت ور اور قابل آدمی بھی ان گونا گوں مشکلات سے عہدہ برآنہ ہوسکتا۔ وہ ساری عمر مخالفتوں کے طوفان سے دست وگریباں رہا اور کبھی ہمت نہ ہاری یہ بات اس کے بلند کردار اور اس کی عالی حوصلگی کی دلیل ہے کہ اس نے جلاوطنی کے بعد بھی جب وہ بے یارومددگار تھا، ہندوستان میں اپنی سلطنت بحال کرنے کا ارادہ کبھی ترک نہ کیا۔

ہمایوں کو بیک وقت مختلف محاذوں پر لڑنا پڑا۔ شمال مغرب میں کامران تھا۔ جس کے ارادوں کے متعلق ہمایوں کو کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اور کامران کے درمیان دودھ کی جو ندی بہتی ہے۔ وہ اسے پار کرے۔ گجرات میں بہادر شاہ کی سرگرمیاں خطرناک صورت اختیار کررہی تھیں۔ بہار میں شیر شاہ سوری افغانوں کی پراگندہ قوتوں کو ازسرنو ایک منظم شکل دے رہا تھا۔ ہمایوں ان تمام خطرات میں بُری طرح پھنس کر رہ گیا۔ بابر اس کے برعکس بڑے آرام سے یکے بعد دیگرے اپنے دشمنوں سے نپٹتا رہا۔ جب تک ابراہیم لودھی کو شکست نہ ہوئی۔ رانا سانگا میدان میں نہ آیا مگر ہمایوں کے ساتھ واقعات بڑی تیزی سے پیش آئے اور بیک وقت مختلف اطراف سے اسے چیلنج پیش کیا گیا۔

اسے ایسی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا جو نہایت کٹھن اور حوصلہ شکن تھیں۔ ہمایوں شجاعت ودلیری میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے پہلو میں چیتے کا جگر اور بازوؤں میں عقاب کی جھپٹ تھی۔ چمپانیر کے محاصرے کے وقت اس کی فوج حیران ہورہی تھی کہ قلعہ بند دشمن پر کیسے قابو پائے۔ قلعہ کی بند دیواروں سے تیروں کی بارش ہورہی تھی اور قلعہ کی طرف رُخ کرنا مشکل تھا۔ اس عالم میں ہمایوں بے دریغ آگے بڑھا۔ تلوار دانتوں سے دبائی اور ڈھال کی اوٹ پر قلعہ کی دیوار پر چڑھنا شروع کردیا۔ اس کی فوج نے اس کی تقلید کی۔ وہ سب سے پہلے دیوار پر پہنچا اور دشمنوں پر ہلہ بول دیا۔ میدانِ جنگ میں اس سے اس نوع کے کارنامے ظہور پذیر ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ ہر مغل شہزادے کی طرح داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھا۔

بابر کے متعلق مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ اس کی سلطنت کا ڈھانچہ صرف جنگ کی صورت میں قائم رہ سکتا تھا۔ ورنہ اس کی طاقت اتنے مختلف النوع عناصر پر مبنی تھی کہ ان کے مابین

سوائے بابر کی ذات کے اتحاد و یگانگت کا سبب اور کچھ نہ تھا۔ ازبک، مغل، افغان، ایرانی، چغتائی اور ہندو سبھی فوج میں شامل تھے۔ بابر کی شخصیت نے ان سب کو اپنے جھنڈے تلے جمع رکھا۔ جونہی اس نے آنکھ بند کی فوج کا شیرازہ بکھر گیا۔ لوگ مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور اپنے اپنے مفاد کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ ہمایوں کا تخت دراصل ریت کی بنیادوں پر قائم تھا۔

ہمایوں نے باپ کی وصیت پر نہایت فرمانبرداری سے عمل کیا۔ کامران کو کابل اور قندھار کا علاقہ دیا۔ عسکری کو سنبھل اور ہندال کو الور کا گورنر بنایا۔ مگران میں سے کوئی بھی اس تقسیم پر راضی نہیں تھا۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ ہمایوں کی بجائے آگرہ کے تخت پر میں ہی بیٹھوں۔

ہمایوں بیس سال کا تھا۔ جب اس کے باپ نے اسے بدخشاں کی گورنری سونپی ازبکوں کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود ہمایوں نہایت کامیابی سے اس صوبے کا نظم ونسق چلاتا رہا۔ جب بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ تو ہمایوں اسکے ہمرکاب تھا۔ اسنے حصار فیروزہ کے مقام پر افغانوں کی ایک فوج کو شکست دی۔ بابر نے خوش ہو کر حصار فیروزہ کی جاگیر اسے بخشی۔ پانی پت اور کنواہہ کے مقام پر ہمایوں نے اپنے آپ کو ایک قابل جرنیل ثابت کیا۔ اس نے بہار میں افغانوں کا قلع قمع کیا۔ اور مغل سلطنت کی حدود غازی پوری، قنوج اور جونپور تک پھیلا دیں۔ بابر کے دور حکومت میں اس کے پاس سنبھل کا صوبہ رہا کچھ عرصہ کے لیے بدخشاں کی گورنری بھی اسے سونپی گئی۔ لوگ اسے ایک قابل منتظم اور سلیقہ شعار حکمران کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اس نے 1530ء میں جب تخت سنبھالا تو عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی بہت سے امرأ ایک روشن مستقبل کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ مگر ہمایوں کا عہد بدامنی اور کشت وخون کا ایک لامتناعی سلسلہ ثابت ہوا۔

کالنجر کا راجہ افغانوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ ہمایوں اس پر حملہ آور ہوا مگر ابھی لڑائی نے کوئی فیصلہ کن شکل اختیار نہیں کی تھی کہ شمال مغرب سے اسے کامران کی پیش قدمی کی اطلاع ملی۔ کامران اپنی فوج لے کر پنجاب میں داخل ہوا اور سارا صوبہ اپنے انتظام میں لے لیا۔ ہمایوں کو فوراً شمال مغرب کی طرف متوجہ ہونا پڑا پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد کامران نے ہمایوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ ہمایوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ پنجاب پر بھی اپنے بھائی کا قبضہ تسلیم کو لے۔ پنجاب کابل اور قندھار کامران کو دینے کے بعد ہمایوں اس تمام علاقے سے ہاتھ دھو بیٹھا جہاں سے وہ ضرورت کے وقت مزید فوج بھرتی کر سکتا تھا۔ اب ہمایوں کو بہار کے افغانوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ محمود لودھی کی سرکردگی میں افغانوں نے جونپور پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہمایوں نے

چاہا کہ پہلے اس فتنہ کا سد باب کر لے۔ دیوراہ کے مقام پر ہمایوں نے افغان فوج کو شکست دی اور ان کے لشکر کو تتر بتر کر دیا۔ اسکے بعد چنار کے قلعے کا محاصرہ کیا گیا۔ شیر خان وہاں پر پرزے نکال رہا تھا ہمایوں نے اس سے نپٹ لینا ضروری سمجھا۔ چنار کا محاصرہ طول پکڑ گیا۔ گجرات سے بری خبریں آ رہی تھیں۔ گجرات کے جواں سال بادشاہ بہادر شاہ نے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ احمد نگر، برار، مالوہ وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کالپی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بہادر شاہ کے دربار میں ہمایوں کے ان رشتہ داروں نے جا پناہ لی تھی جو اس کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ محمد زمان مرزا ان میں قابلِ ذکر ہے۔ انکے علاوہ متعدد افغان سردار وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ہمایوں نے کئی دفعہ بہادر شاہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے دربار سے مغل اور افغان سرداروں کو نکال دے۔ مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ ہمایوں کے یہ مخالفین بہادر شاہ کو اسکے خلاف بھڑکاتے رہے۔ اسے ہمایوں کی نااہلی کا یقین دلایا اور ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دکھائے۔ ہمایوں نے بہادر شاہ کے عزائم سے خطرہ محسوس کیا اور وہ شیر خان سے عارضی سی صلح کے بعد چنار کا محاصرہ ترک کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر آگرہ پہنچنے کے بعد وہ دیر تک دادِ عیش دیتا رہا۔ امرأ میں دل کھول کر دولت تقسیم کی۔ جب ہمایوں کو ہوش آیا بہادر شاہ چتوڑ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ چتوڑ کی رانی کرنادتی نے ہمایوں سے مدد کی درخواست کی۔ ہمایوں نے فوج کے ساتھ چتوڑ کی طرف کوچ کیا۔ بہادر شاہ قلعہ پر حملہ کر چکا تھا۔ اگر اس وقت ہمایوں اسے گھیرے میں لے لیتا تو بہادر شاہ کی طاقت جڑ سے اکھڑ جاتی۔ مگر بعض امرأ سے صلاح مشورے کے بعد ہمایوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ایک مسلمان فوج پر اس وقت حملہ کرے جبکہ وہ کفار کے خلاف جہاد میں مصروف ہو۔ اگر ہمایوں حملہ کر دیتا تو بہادر شاہ سے اسے نجات مل جاتی اور راجپوت بھی اس کے احسان مند ہوتے مگر اس نے ایک خاموش تماشائی کی حیثیت اختیار کرنے میں سخت غلطی کی۔ جب بہادر شاہ فارغ ہو چکا تو ہمایوں نے اس کے خلاف لڑنے کا عزم کیا۔ بہادر شاہ کی فوج تھکی ہوئی تھی۔ سامانِ رسد ختم ہو رہا تھا۔ اس نے بھاگ کر باندھو کے قلعہ میں پناہ لی۔ عسکری اس معرکے میں اپنی بھائی کی مدد کر رہا تھا۔ اس نے مالوہ فتح کیا اور گجرات پر چڑھائی کے لیے ہمایوں کا راستہ صاف کیا۔ باندھو کے بعد بہادر شاہ نے گجرات کا رُخ کیا۔ ہمایوں بڑی سرعت سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے غیر معمولی مستعدی کا ثبوت دیا۔ آخر بہادر شاہ چمپانیر میں قلعہ بند ہو گیا۔ مگر ہمایوں نے چمپانیر کا قلعہ بھی فتح کر لیا اور بہادر شاہ کو اس کی سلطنت سے باہر نکال دیا۔ اس نے دیو کے جزیرے میں پناہ لی۔ بہادر

شاہ کے خلاف ان لڑائیوں سے گجرات اور مالوہ کے دوصوبے مغل سلطنت میں شامل کیے گئے۔

شیر خان اور ہمایوں کی جنگ قنوج کے مقام پر ہوئی۔ ہمایوں کے سرداروں کو اپنی طاقت پر بھروسہ نہ تھا۔ وہ اپنے اہل وعیال کو لاہور بھجوانے کا انتظام کر رہے تھے۔ پھر اس جنگ میں ہمایوں نے سخت ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا۔ اس نے فوج کا پڑاؤ ڈھلوان میں ڈالا۔ بارش کی وجہ سے سارا کیمپ بھیگ گیا اور فوج نے اونچائی کی طرف کیمپ منتقل کرنا چاہا۔ اس نقل وحرکت کے دوران شیر خان نے مغلوں پر اپنی ساری طاقت سے حملہ کر دیا۔ مغلوں کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔ ہمایوں چند بچے کھچے سپاہیوں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ اس نے پنجاب کا رُخ کیا۔ کہ کامران کو سمجھا بجھا کر شیر خان سے جنگ پر آمادہ کرے۔ مگر اس کسمپرسی کے عالم میں کامران نے ہمایوں کی ایک نہ سُنی۔ یہاں تک کہ اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔

ہمایوں کی بدقسمتی نے ہر قدم پر اسے ٹھوکر لگائی۔ حالات ہمیشہ اس کے خلاف پلٹا کھاتے رہے۔ اگر تردی بے عسکری کی مدد کرتا تو گجرات اور مالوہ ضائع نہ ہوتے۔ گوڑ کی طرف کوچ کرنے سے پہلے ہمایوں چنار پر قبضہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ آگرہ کی شاہراہ پر واقع تھا۔ اور اہم جنگی مقام تھا۔ پھر قنوج کے مقام پر اگر اتفاقاً غیر معمولی طور پر بارشیں نہ ہوتیں تو شاید ہمایوں کو جلاوطن نہ ہونا پڑتا۔ مرزا حیدر قنوج کی جنگ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ جنگ نہ تھی بلکہ ہزیمت تھی۔ ہمایوں کا کوئی سپاہی زخمی نہ ہوا۔ افراتفری کے عالم میں سب پسپا ہو گئے بہر حال یہ سب تخیل کا تانا بانا ہے۔ خواب وخیال ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ واقعات کا دھارا خواہشات کے رُخ پر ہمیشہ نہیں بہتا۔ ہمایوں کی ناکامی نامساعد حالات اور مقدر کی پیداوار سہی، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمایوں شیر شاہ کے مقابلہ میں ناکام ہوا۔ البتہ یہ اس کی مستقل مزاجی کی دلیل ہے کہ آخر وہ شہنشاہ ہند کی حیثیت سے ہی مرا۔ اس کے کردار میں ہزار خامیاں سہی مگر وہ اخلاقی لحاظ سے ایک نہایت ہی بلند انسان تھا۔ شیر شاہ اپنی کامیابی کے لیے چالبازیاں کرتا رہا۔ ہمایوں کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا۔ اس کی سہل انگاری، عیش پرستی اور لاپرواہی میں بھی ایک طرح کی شاہانہ آن بان پائی جاتی ہے۔ اس کی کمزوریاں اور کوتاہیاں جو بہر حال انسانی فطرت کی غمازی کرتی ہیں۔ اَن گنت فرمانرواؤں میں موجود ہوں گی۔ مگر اس کی اچھائیاں تاریخ عالم کی بعض مشہور ترین ہستیوں اور عظیم شخصیتوں میں بھی نہیں پائی جاتیں۔

❀..........❀..........❀

یوسف بن تاشفین

طارق بن زیاد نے اُندلس فتح کیا اور مسلمان ایک عرصے تک وہاں بڑی شان وشوکت سے حکومت کرتے رہے۔ انہوں نے وہاں شہر بسائے، محلات بنائے، ان میں باغات لگائے، سکول اور کالج قائم کیے۔ لیکن ایک عرصے کے بعد ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ مسلمانوں میں اتفاق نہ رہا۔ وہ ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ اس وقت اُندلس میں جو مسلمان ریاستیں قائم ہوگئی تھیں، ان میں غرناطہ، طلیطلہ، اشبیلیہ اور المیریا کو بہت اہمیت حاصل تھی مگر ان میں اتفاق نہ تھا۔ ان کے حکمران ایک دوسرے کو برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اُن کا سب سے بڑا دشمن قسطلہ کا عیسائی بادشاہ الفانسو ششم تھا۔ جو بڑا چالاک اور عیار بادشاہ تھا۔ اُس نے مسلمانوں کی خانہ جنگیوں سے بڑی طاقت حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ کئی مسلمان ریاستوں سے خراج وصول کرتا تھا۔ معتمد بن عباد شاہِ اشبیلیہ بھی اس کو خراج ادا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے مسلمانوں کے کئی علاقے چھین لیے اور انہیں نہایت بے دریغی سے قتل کیا۔ اگر کچھ عرصہ اور مسلمانوں کی یہی حالت رہتی تو اندلس کے مسلمان یقیناً تباہ ہو جاتے۔

شمالی افریقہ میں بربر قبیلے آباد تھے 1056ء میں ان قبیلوں میں سے قبیلہ جدالہ کا ایک فرد بہ نام حو یرحج سے واپس آتے ہوئے افریقہ کے شہر خیردن میں ایک بزرگ ابوعمران الفاسی سے ملا اور اس کے کہنے پر ان بزرگوں نے اسے اپنے ایک مرید عبداللہ بن یٰسین الکوولی کے ہمراہ بربر قبائل کو اسلام سکھانے کو بھیج دیا۔ اس کے زیر اثر لوگ مرابطین کہلاتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ایک مرابطی جس کا نام ابویعقوب یوسف بن تاشفین تھا، مرابطین کا لیڈر چنا گیا۔ یوسف بن تاشفین نے 1069ء میں مراکش کا شہر آباد کیا اور رفتہ رفتہ سینگال سے الجزائر تک کا سارا علاقہ فتح

کرلیا۔

جب اَندُلس کے مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ چاروں طرف سے دشمن سے گھرے ہوئے ہیں، تو انہوں نے سوچا کہ ابو یعقوب یوسف بن تاشفین سے مدد کی درخواست کرنی چاہیے۔اشبیلیہ کے بادشاہ معتمد کو بھی اِس کا احساس ہوا۔اس لیے کہ الفانسو اس کے ملک پرحملہ کرنے کی بڑے زور شور سے تیاری کر رہا تھا۔آخر اَندلس کے مسلمانوں کا ایک وفد افریقہ کے حکمران ابو یعقوب یوسف بن تاشفین کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس وفد میں اَندُلس کے شہروں کے بڑے بڑے عالم، فقیہ اور مدبر شامل تھے۔ یہ ملاقات افریقہ کے شمالی شہر سیوطہ میں ہوئی۔ انہوں نے یوسف بن تاشفین کے سامنے نہایت واضح طور پر اَندُلس کے مسلمانوں کی روئیداد سُنائی۔یوسف بن تاشفین نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرے گا۔وفد کے لوگ خوشی خوشی اَندلس واپس آگئے۔یوسف بن تاشفین نے اپنی سلطنت میں جہاد کی منادی کردی۔ملک کی چاروں طرف سے ہزاروں مجاہدین پایہ تخت میں جمع ہونے لگے۔

یوسف بن تاشفین کے پاس صرف سو جہاز تھے۔ان جہازوں میں جتنی فوج بھیجی جا سکتی تھی جزیرہ الخضرا میں بھیج دی گئی۔ جب یہ خالی جہاز واپس آئے تو دوسری بار مزید پانچ ہزار فوج ادھر بھیجی گئی۔اس طرح فوج کی کل تعداد سترہ ہزار ہوگئی۔

جب سلطان یوسف بن تاشفین جزیرہ الخضرا سے اشبیلیہ کی طرف روانہ ہوا تو ہر جگہ بڑی شان سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔اشبیلیہ کے دروازے پر خود معتمد نے اُس کا استقبال کیا۔ سلطان شہر سے باہر ٹھہرا۔معتمد نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت دی اور اس کے سپاہیوں کو بہت سے تحائف دیئے۔

چند روز یہاں قیام کرنے کے بعد سلطان یوسف بن تاشفین بیس ہزار فوج کے ساتھ آگے بڑھا۔الفانسو اس وقت سرقسطہ کے محاصرے میں مشغول تھا۔اُس نے محاصرہ چھوڑا اور اپنی ریاست کے تمام سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی فوج لے کر طلیطلہ پہنچ جائیں۔

جب طلیطلہ میں عیسائی فوجیں جمع ہوئیں تو اُن کی کل تعداد ساٹھ ہزار تھی۔اُن میں کئی ہزار فرانسیسی بھی تھے۔الفانسو الاقہ کی طرف بڑھا۔جہاں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں تو سلطان یوسف بن تاشفین نے الفانسو کو پیغام بھیجا کہ وہ مسلمان ہو جائیں یا جزیہ دینا

منظور کرلے۔ الفانسو نے جواب دیا کہ اندلس کے تمام بادشاہ مجھے خراج دیتے ہیں۔ مَیں تمہیں خراج نہیں دے سکتا۔ میرے پاس ایسی فوج ہے جو تمہیں تباہ کردے گی۔ جب سلطان یوسف بن تاشفین کے پاس یہ جواب پہنچا تو اس نے کہا:

''جو کچھ ہونے والا ہے اسے خود الفانسو دیکھے گا۔''

لڑائی شروع ہوئی۔ مسلمان فوجوں میں اُندلسی مسلمانوں کی فوج آگے تھی اور سلطان یوسف بن تاشفین کی فوج پیچھے پہاڑیوں میں رکھی گئی تھی۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ جس میں عیسائیوں کا پلہ بھاری تھا۔ قریب تھا کہ اُندلسی مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ جائیں، کہ الفانسو کی فوج کے پیچھے سے سلطان یوسف بن تاشفین کی فوجوں نے ہلہ بول دیا۔ یہ حملہ بڑے زوروں کا تھا۔ الفانسو کے سپاہی اس کی تاب نہ لاسکے۔ ہزاروں کھیت رہے ان کے خیموں میں آگ لگ گئی۔

عیسائیوں نے جب یہ دیکھا کہ اُن کا سارا سامان جل گیا ہے اور جو کچھ بچا تھا اُسے لُوٹ لیا گیا ہے تو اُن میں بڑی بددلی پھیل گئی۔ شام ہونے تک عیسائیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ وہ میدان سے بھاگ نکلے۔ اس معرکے میں الفانسو بُری طرح زخمی ہوا۔ مگر کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ یہ 1186ء کا واقعہ ہے۔ ہسپانیہ میں عرصے تک سال الاقہ سے تاریخ شمار کی جاتی رہی۔

یہ مسلمانوں کی بہت بڑی فتح تھی۔ جو انہیں ایک عرصے کے بعد اُندلس کے عیسائیوں پر حاصل ہوئی تھیں۔ سلطان یوسف بن تاشفین آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے اپنے جوان بیٹے کی موت کی خبر ملی۔ اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کردیا اور تین ہزار سپاہی معتمد کے پاس چھوڑ کر اپنے ملک واپس لوٹ گیا۔

اس فتح کے کچھ عرصہ بعد عیسائیوں نے پھر ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کردیئے انہوں نے حصن اللیط کو اپنا مرکز بنایا۔ یہاں سے وہ اردگرد کے علاقوں پر حملہ کرتے۔ بستیوں کو لوٹتے اور جلا دیتے۔ مسلمان بادشاہ یہ سب کچھ دیکھتے مگر خاموش رہتے۔ انہیں اپنی رنگ رلیوں ہی سے فرصت نہ تھی۔

اندلس کے مسلمانوں نے ایک بار پھر سلطان یوسف بن تاشفین کی خدمت میں ایک وفد بھیجا اور سلطان سے درخواست کی کہ اُن کی مدد کرے۔ سلطان کو اُندلس کے لوگوں کے ساتھ پوری ہمدردی تھی۔ مگر وہ اندلس کے مسلمان بادشاہوں کی مرضی کے خلاف وہاں جانا نہ چاہتا تھا۔

اُس نے وفد سے کہا:

"مَیں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں، مگر اپنے بادشاہوں سے کہو کہ وہ مجھے بلائیں۔"

وفد کے اراکین نے اس کی اطلاع بادشاہوں کو پہنچائی۔ چنانچہ خود معتمد افریقہ گیا اور سلطان سے امداد طلب کی۔ لہٰذا سلطان ایک بھر اُندلس پہنچا۔ اشبیلیہ کے باہر پھر اس کا استقبال کیا گیا۔ وہیں تمام مسلمان بادشاہوں کی فوجیں اُس کے پاس آگئیں اور وہ انہیں ساتھ لے کر حصن اللیط کی طرف بڑھا۔ تو عیسائی اس کے آنے کی خبر سُن کر قلعہ بند ہو گئے۔ سلطان نے اُن کا محاصرہ کر لیا۔ مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ قلعے کی دیواریں بڑی مضبوط تھیں۔ محاصرہ چار ماہ تک جاری رہا۔ سلطان کو دن رات یہ فکر لاحق تھی کہ قلعہ کیسے سَر کیا جائے جبکہ دوسری طرف مسلمان بادشاہ بدستور رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ ان کی محفلوں میں دن رات موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور شاعر اپنے اشعار سناتے۔ شراب نوشی کی لعنت ان میں عام تھی۔

اُندلس کے لوگ یہ دیکھتے کہ ان کے حکمران ہر قسم کے عیب کرتے ہیں جبکہ افریقہ کا سلطان بڑا پرہیز گار ہے تو انہوں نے سلطان سے درخواست کی کہ وہ اُندلس ہی میں رہ جائے۔ اور بادشاہ بن کر حکومت کرے کیونکہ اس میں اُندلس کی بھلائی ہے۔ سلطان یہ سُن کر سوچنے لگا کہ کیا مسلمانوں کی بقاء کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں؟ اِسی دوران غرناطہ کا قاضی ابو جعفر اس کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ غرناطہ کا بادشاہ بڑا ظالم اور عیاش ہے، عوام کے اس خلاف ہیں اس لیے وہ عوام کی مدد کرے۔ سلطان یوسف بن تاشفین اُندلس کے مسلمان بادشاہوں سے سخت بددل ہو گیا۔ اُس نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنی فوج لے کر الگ ہو جائے اس وقت حصین اللیط کی مضبوط فصیل آدھی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھی اور بارہ ہزار سپاہیوں میں سے گیارہ ہزار نو سو سپاہی بھوک سے مر چکے تھے۔

اِسی اثناء میں خبر ملی کہ انفانسو حصن اللیط کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جونہی معتمد اور اس کے ساتھیوں نے یہ خبر سُنی وہاں سے بھاگ گئے۔

سلطان یوسف بن تاشفین نے غرناطہ کا محاصرہ کر کے وہاں بادشاہ کو تخت سے علیحدہ کر دیا اور وہاں کے عوام کے اصرار پر غرناطہ کی بادشاہت قبول کر لی اور ایک محضر افریقہ کے عالموں اور فقیہوں کے پاس بھیج دیا کہ اُندلس کے مسلمان حکمران عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ نہ

انہیں اپنی رعایا کا کچھ خیال ہے اور نہ اپنی سلطنت کا۔ مَیں آپ سے فتویٰ لینا چاہتا ہوں کہ کیا انہیں برطرف کر دینا شریعت کی رُو سے جائز ہے؟ عالموں اور فقیہوں نے فتویٰ دیا کہ جائز ہے تو سلطان یوسف بن تاشفین نے اَندلس میں اپنی فوجوں کے نام حکم جاری کر دیا کہ اَندلس کے تمام مسلمان بادشاہوں کے علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ بس پھر تھوڑی مدت میں المریسہ، طریف اور قرطبہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ پھر اشبیلیہ کی باری آئی۔ اُس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ الفانسو نے ایک بڑی فوج معتمد کی مدد کے لیے بھیجی لیکن سلطان یوسف بن تاشفین کی فوج نے اسے بری طرح شکست دی اور اس کے تھوڑے دنوں بعد اشبیلیہ بھی فتح ہو گیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ سارے اسلامی علاقے سلطان یوسف بن تاشفین کے قبضہ میں آ گئے تو ایک عرصے کے بعد اَندلس میں پھر خوشحالی و فارغ البالی کا دور آیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہونے لگی۔ ہر فیصلہ قرآن و سنتِ رسول ﷺ کی روشنی میں ہونے لگا۔ سلطان یوسف بن تاشفین نے فوجی مسائل کے علاوہ باقی تمام کام علماء کے سپرد کر دیئے۔

سلطان یوسف بن تاشفین کی سلطنت کا رقبہ اب اتنا ہو گیا تھا جتنا کہ بنی امیہ اور بنو عباس دونوں کی سلطنتوں کا مل کر ہوتا تھا۔ تمام شمالی افریقہ میں ٹیونس سے لے کر بحر اوقیانوس تک اس کا سکہ چلتا تھا۔ ہر جمعہ کو کم از کم تین لاکھ مسجدوں کے ممبروں پر اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اُس کے دورِ حکومت میں روٹی کی قیمت برائے نام تھی۔ مٹھی بھر ترکاری اور میوے چند کوڑیوں کے عوض مل جاتے تھے۔

سلطان یوسف بن تاشفین ایک سو سال زندہ رہا۔ اس کی تمام عمر مسلمانوں کی بھلائی و بہتری میں گزری۔ وہ اتنا رحم دل تھا کہ اپنی زندگی میں کسی مجرم کے سزائے موت کے حکم پر دستخط نہیں کیے۔

❋..........❋..........❋

تاریخِ اسلام کے عظیم مجاہدوں کے حیرت انگیز، جنگی معرکوں کی تاریخ

حافظ محمد احسن

دارُالشُعور

37۔مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور